جلد ۲ شمارہ ۱۰] لاھور [جنوری ۱۹۵۴ء

اس شمارہ میں

مدیر : بشیر ہاشمی

معاونین : عبدالغفور چودھری
فضل احمد

ادبی تعلیمی ماہ نامہ

آموزش
لاہور

جنوری ۱۹۵۴ء

جلد ——— ۶

شمارہ ——— ۱۰

سالانہ چندہ

پاکستان کے لئے ۶ روپے

غیر ممالک کے لئے ۸ روپے

قیمت فی پرچہ دس آنے

پبلشرز

یونیورسٹی بک ایجنسی لاہور

ایچ ڈی خالد پرنٹر پبلشر نے دین محمدی پریس لاہور میں طبع کرا کے
یونی ورسٹی بک ایجنسی ۲ کچہری روڈ لاہور سے شائع کیا

اُستادوں کی ذمّہ داری

بغیر دل ہمہ نقش و نگار بے معنی است
ہمہ ورق کہ سیہ گشت ۔ مدعا اینجا است

صحت مند تعلیم اور پائدار قومی تعمیر کے لئے موزوں قسم کے استادوں کی بہم رسانی آج ہماری شدید و ناگزیر ضرورت ہے۔ بلند صفات استادوں کے بغیر ایسے شہری تیار کرنا ممکن نہیں جو ایک اسلامی جمہوریت میں مؤثر اور خوش و خرم زندگی بسر کر سکیں۔ بعض لوگ ایسے استادوں کی فراہمی کی ساری ذمہ داری تربیتی درس گاہوں پر ڈال دیں گے۔ اس میں کلام نہیں کہ ان درس گاہوں کا تعلیمی نصاب حقیقت پسند اور رجحان دار ہونا چاہیئے۔ لیکن صرف ان کی دی ہوئی تربیت زیادہ بار آور ثابت نہیں ہو سکتی۔ اسے کارگر بنانے کے لئے دو اور معاونوں کی ضرورت ہے۔ ان میں سے ایک امیدواروں کا صحیح انتخاب اور دوسری اطمینان بخش پیشہ ورانہ فضا جس میں تربیت یافتہ استادوں کو کام کرنا ہے۔

ان دونوں ضروری شرطوں میں سے زیادہ اہم پیشہ ورانہ فضا ہے۔ اس فضا کے لئے لازمی ہے کہ اس میں موزوں اوصاف کے لوگوں کو اپنی طرف کھینچنے کی قوت موجود ہو۔ اب تک اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے جو کوششیں کی گئی ہیں، ان کا سارا زور استاد کی معاشی حالت بلند کرنے پر صرف ہوا ہے

اس کے حق میں یہ دلیل دی جاتی رہی ہے کہ اگر استاد کی تنخواہ دوسرے لوگوں کے مادی معاوضوں کے ساتھ بخوبی مقابلہ کرے گی تو اچھی صفات کے لوگ معلّمی کی طرف کھنچنے لگیں گے۔ یہ دلیل نفسیاتی وجوہ اور عام مشاہدہ پر مبنی ہے۔ لیکن بلند تر معاشی سطح ناپسندیدہ لوگوں کو بھی اپنی طرف اسی قوت سے کھینچ سکتی ہے جس طرح پسندیدہ لوگوں کو، ہمارے مدرسوں اور کالجوں میں پڑھانے والے لوگوں کی تنخواہوں میں جو اضافے ہوئے ہیں ان سے ابھی کوئی فیصلہ کن نتیجہ اخذ کرنا ممکن نہیں لیکن یہ خطرہ بالکل حقیقی ہے کہ یہ اضافے پیشے کو معنوی بلندی بخشنے کی بجائے محض زیادہ امیدواروں کو کھینچنے کا سبب ہی بن کر رہ جائیں۔

تربیتی درس گاہوں کے متعلّم تدریسی مشق کے لئے مدرسوں میں جاتے ہیں۔ مدرسوں کے استاد ان کے لئے کیسی تصویر پیش کرتے ہیں ؟ یہ کہنا کوئی مبالغہ نہیں کہ آج بھی یہ تصویر زیادہ تر بیکسی بددلی۔ افسردگی۔ بے توجہی اور بدسلیقگی کی ایک تصویر ہے۔ جسے دیکھ کر بہت سے متعلّم اساتذہ بے چینی سے یہ سوال پوچھنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ کیا جدید تعلیمی نظریے ان مدرسوں کی دنیا میں بالکل بے کار ہیں ؟ کیا ہمیں بھی چارو ناچار اسی بے کیف ماحول کے سامنے سر جھکانا ہوگا ؟ کیا ہمارے جذبۂ عمل اور جوش اصلاح کو اس لئے جگایا جارہا ہے کہ وہ یاس و جمود کے اس سنگلاخ ویرانے میں سر ٹکرا ٹکرا کر ختم ہو جائیں ؟

صرف یہی نہیں۔ خود مدرسوں کے طالب علم اپنے استادوں سے کیا تاثرات لیتے ہیں ؟ عموماً پانچویں چھٹی جماعت تک کے بچے اپنے استادوں کو کافی اہم شخصیتیں خیال کرتے ہیں لیکن جوں ہی ان میں تنقیدی نگاہ پیدا ہونے لگتی ہے، استاد کی یہ عظمت تخیلات بن کر اڑنے لگتی ہے، اب طالب علم اس قابل ہوتے ہیں کہ استادوں کے پیہم شکوہ و شکایت کا مطلب سمجھ سکیں۔ ہمارے مدرسوں میں ایسے استادوں کی کمی نہیں جو اٹھتے بیٹھتے دوسرے محکموں پر رشک کرنے اور اپنی مجبوریوں کی داستانیں سناتے نہیں تھکتے، وہ اپنے طالب علموں میں سے کسی کو دیانت داری کے ساتھ استاد بننے کا مشورہ نہیں دے سکتے، ان کے یہ رنگ ڈھنگ دیکھ کر بھلا کون سا باصفات طالب علم ایسا ہوگا جو بہ طیب خاطر

تربیتی درس گاہ کا رخ کرے گا؛ ہر طالب علم کی پہلی پسند وہ محکمے ہوں گے جن کی طرف اس کے استاد للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھتے رہے ہیں اور وہ صرف ہر طرف سے مایوس ہونے کے بعد ہی معلم بننے کے امکان پر غور کرے گا۔

ہر پیشے میں قدرتی طور پر محاسن بھی ہوں گے اور عیوب بھی، ہر پیشہ ور کے لئے اپنے پیشہ کے عیوب کو دیکھنا نسبتاً زیادہ سہل ہے، کیوں کہ وہ ذاتی طور پر ان کی تلخی کا مزہ چکھتا ہے لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ محاسن کی طرف کبھی دھیان نہ جائے اور نگاہ ہمیشہ عیوب پر ہی جمی رہے۔ اگر دوسرے پیشہ ور ایسا کریں بھی تو انہیں زیادہ گزند پہونچنے کا احتمال نہیں کیوں کہ یہ تذلیل نفس ان کی اپنی ہی محفل تک محدود رہے گی، لیکن جب استاد یہ طریق اختیار کرتا ہے تو اس کی ذلت کا ڈھنڈورا ساری قوم میں پٹ جاتا ہے، آنے والی پود کے اثر پذیر ہونے والے کان اس کی ہر آواز کو سنتے ہیں، اور جب استاد تحقیر نفس کے سوا انھیں اپنے متعلق کوئی دوسرا پیغام ہی نہ دے۔ تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ ان میں سے کوئی اس امکان کے باوجود کہ وہ کوئی اور ذریعہ معاش اختیار کر سکتا ہو بخوشی اس کی جگہ سنبھالنے کے لئے تیار ہو۔ ان حالات میں بلند صفات امیدواروں کا تربیتی درس گاہوں میں داخل ہونے کے لئے آنا زیادہ ممکن ہو تو کیوں کر؟

پیشہ معلمی کی عام فضا کا یہ پہلو واضح طور پر امیدواروں کے صحیح انتخاب پر بری طرح اثر انداز ہوتا ہے، تربیتی درس گاہیں انتخاب و امتحان کے خواہ کیسے ہی کڑے معیار قائم کریں بالآخر نہیں انہی لوگوں میں سے انتخاب کرنا ہوگا جو داخلہ کے لئے آئیں گے۔ اس ضمن میں ایک اور قابل توجہ امر یہ ہے کہ کوئی امتحان یا آزمائش سو فی صدی صحت انتخاب کی ضمانت نہیں ہو سکتی۔ ہر تربیت گاہ انتخاب کے کچھ عرصہ بعد ایسے متعلم اساتذہ سے دوچار ہوگی جو اس کی تربیت کے لئے موزوں نہیں۔ ایسے لوگوں کو کسی اور جگہ جذب کرنے کی کوئی خاطر خواہ صورت ہونی چاہیئے۔ الغرض اساتذہ کی تربیت گاہیں اسی صورت میں موزوں قسم کے استاد تیار کر سکتی ہیں جب پیشہ معلمی کی عام فضا

اتنی روح پرور ہو کہ وہ بلند صفات طلبہ کو آسانی سے متوجہ کر سکے اور صحیح انتخاب کے لئے کافی سہولتیں مہیا ہوں۔

ان تمام باتوں کو نگاہ میں رکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ آنے والے استادوں کی خوبی اور موزونیت کا مدار بڑی حد تک موجودہ استادوں پر ہے، صرف تنخواہ کا بڑھ جانا یا تربیتی درس گاہوں کے نصابوں میں رد و بدل کافی نہیں۔ معلمی کا پیشہ اگر سربلندی اور وقار چاہتا ہے تو اسے اپنے کام کی اہمیت اور بلندی کا مخلصانہ احساس ہونا چاہیئے، استاد کا دل اپنے اونچے مقام کے بجا فخر سے معمور ہونا چاہیئے۔ اسے اپنے کام کا ذکر بہ گرمی اور اعتماد کے ساتھ کرنا چاہیئے، یہ جوش اور ولولہ پیدا کرنے کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ استاد کو اپنے کام سے دلی محبت ہو۔ اسے بچوں کی بہبود کا والہانہ شغف ہو۔ اسے یہ یقین ہو کہ اس کی اپنی تعلیم ایک کبھی نہ ختم ہونے والا شغل ہے اور ہر تازہ تجربہ اور ہر نئی واقفیت اسے بہتر استاد بناتی ہے۔ نقطۂ نگاہ کی یہ تبدیلی اور دلی کیفیت کا یہ انقلاب ہی وہ جادو ہے جو استاد کی حیثیت کو بلندی اور آنے والے استادوں کو اعلیٰ صفات عطا کر سکتا ہے۔ کیا ہمارے استاد ان گذارشات پر توجہ فرمائیں گے۔

فریاد حافظ ایں ہمہ آخر بہرزہ نیست
ہم قصۂ عجیب و حدیثے غریب ہست

آموزش

ہندی اسلامی
فن تعمیر کی تدریجی ترقی

بشیر احمد ہاشمی

مذہبی ادوار کی بنا پر ہندی تہذیب وتمدن کے آداب و معاشرت اور ادب وفنون کو چار قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے یعنی (۱) ہندی طرز تعمیر (۲) جینی طرز تعمیر (۳) برہمنی طرز تعمیر اور (۴) اسلامی یا ہندی اسلامی طرز تعمیر۔

مندرجہ بالا ادوار میں سے ہر ایک دور علیحدہ علیحدہ مدنی اور جغرافیائی اصولوں کے ماتحت پیدا ہونے والی خصوصیات کے مطابق دیگر حصص میں منقسم ہو سکتا ہے، اور ہر حصے میں مشترک و مخلوط عناصر نمایاں طور پر دیکھے جا سکتے ہیں، اس مضمون میں ہم صرف ہندی اسلامی فن تعمیر پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔

ہندوستان کے اسلامی فن تعمیر کی ان گنت اور انوکھی رنگینیاں اور ضروری مواد کا فقدان اس بات پر مجبور کرتا ہے کہ صرف دہلی اور آگرہ کی تاریخی عمارات تک ہی نظر کو محدود رکھا جائے اور ہندی اسلامی فن تعمیر کے جملہ مباحث کے لئے صرف ان دو شہروں کو ہی چن لیا جائے۔ حقیقتاً مجھے دلی اور آگرے سے دور جانے کی ضرورت بھی نہیں کیوں کہ یہی دو شہر ایسے ہیں جو اسلامی شان و شوکت کے مزار ہیں۔ اور اسلامی ہندی فن تعمیر کے متعلق ضرورت سے زیادہ مواد کو اپنے دامن میں لئے ہوئے ہیں۔

ساتویں صدی عیسوی میں جن عربوں نے بحیرۂ روم اور اس کے متعلقہ ممالک پر قبضہ کیا۔ وہ فن کار یعنی آرٹسٹ نہ تھے اور نہ وہ عثمانی ترک جن کی آب دار تلواریں ایک عالم کی نظروں کو خیرہ کئے دیتی تھیں کسی مخصوص فن تعمیر کے ماہر تھے، اسی طرح وہ مسلمان بھی جنھوں نے ہندوستان کو فتح کیا کسی مسلمہ قومی فن تعمیر کے حامل نہ تھے، شروع شروع میں انھوں نے محکوم ممالک کے مقامی کاریگروں سے

مساجد و محلات وغیرہ تعمیر کرائے، یہی سبب ہے کہ ابتداً جس قدر عمارات تعمیر ہوئیں ان میں رائج الوقت مقامی فن تعمیر اپنی جھلکیاں دکھاتا ہے۔ لیکن جوں جوں زمانہ گذرتا گیا فاتحین نے ایک ایسے موزوں تر طرز تعمیر کی بنیاد ڈالی جو ان کے مخصوص ذوق کا حامل تھا چناں چہ اسلامی فن تعمیر کی ہیئت رفتہ رفتہ ان فنون سے بالکل مختلف ہوگئی جن پر ابتداء میں اس کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ گویا صورت اور سیرت مختلف ہونے سے ان کی روح بھی بدل گئی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ اس معاملے میں مسلمانوں نے بہت رواداری سے کام لیا۔ انھوں نے نہایت فراخ دلی سے محکوم ممالک کی ایسی فنی روایات کو اپنے مخصوص فن تعمیر میں شامل کر لیا۔ جو ممالک مفبوضہ کے فن عمارت کا زیور تھیں۔

یہ اسی رواداری کا نتیجہ ہے کہ اسلامی فن تعمیر میں جداگانہ بارہ مختلف اسلوب پائے جاتے ہیں جن میں سے بعض نسلی امتیازات کی بنا پر ہیں مثلاً سامی عربوں ورموروعربوں کے۔ تاتاری اور آریاؤں کے ایرانیوں اور ہندیوں کے بعض امتیازات مقامی اثرات کا نتیجہ ہیں۔ تاہم اکثر خصوصیات ایسی ہیں جو تمام اسالیب میں موجود ہیں۔

اسلامی فن تعمیر کی ایک نمایاں خصوصیت جذبۂ آرائش ہے۔ نازک اور لطیف عناصر اس کی دلکشی میں اضافہ کرتے ہیں۔ مختلف رنگوں کے توافق سے اس میں ایک ایسی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے کہ بعض اوقات وسیع سطوح جن پر زنگار رنگ نقوش سے مرصع کاری کی ہوتی ہے۔ انسانی جذبات کے ترجمان معلوم ہوتے ہیں۔ مصوری اور بت تراشی کے فنون سے اسلامی فن تعمیر بالکل خالی ہے۔ اس لئے کہ یہ فنون بت پرستی سے متعلق ہیں اور اسلام بت پرستی سے دور کا تعلق رکھنے والے اسباب کو بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ اسی سبب سے عرب کے ماہرین فن تعمیر نے عمارات کی آرائش ہندسی اشکال سے کرنی شروع کی لیکن معدودے چند ہندسی اشکال بھلا ان بے شمار عظیم الشان عمارتوں کے لئے کب تک کفایت کرتیں، نتیجہ یہ ہوا کہ ان اشکال کے کثرت استعمال سے طبیعتیں بہت جلد اکتا گئیں۔ عمارتوں کو بڑھ چڑھ کر دلکش بنانے کا جذبہ زوروں پر تھا۔ اس لئے دوسرے وسائل ڈھونڈ نکالے گئے کتبات کی طرف رجوع کیا۔ یہ فن ان عربوں کی ایجاد ہے جو قرون اولیٰ میں مصر جاکر آباد ہوگئے تھے۔

مصر سے یہ فن شمالی افریقہ۔ ہسپانیہ اور ایران پہونچا۔ ایران میں پچی کاری پتھر پر ہونے کی بجائے ڈھلے ہوئے ٹائیلوں پر ہونے لگی اور اس میں مختلف قسم کے دل کش رنگوں کی آمیزش سے ایک نیا حسن پیدا کیا گیا۔ پٹھانوں کے ابتدائی طرز تعمیر میں بھی یہ نقش و نگار نمایاں ہیں۔

برج اور محرابیں اسلامی فن تعمیر کی مابہ الامتیاز خصوصیات ہیں۔ مصری اور عربی اسالیب تعمیر میں یہی نوکدار محراب متساوی الاضلاع ہے اور پیازی برج ہر سمت جانب سے آراستہ و پیراستہ ہے۔ مینار چوکور ہیں۔ لیکن بعد کے زمانے میں کثیر الاضلاع ہو گئے ہیں۔ مور مسلمانوں کے طرز تعمیر میں محراب کی شکل گھوڑے کے نعل جیسی ہوتی تھی اور اندرونی آرائش پلستر اور پچی کاری سے کی جاتی تھی۔

جس وقت مسلمان فاتحین کی حیثیت سے ہندوستان میں آئے۔ انھیں فن تعمیر کے مذکورۂ بالا اسالیب سے کماحقہٗ واقفیت تھی۔ ہندوستان میں قدم جمانے کے تھوڑی ہی دیر بعد انھوں نے اپنے مخصوص فن تعمیر کی بنیاد رکھ دی۔ انھوں نے رواداری اور محبت کی وجہ سے مفتوحہ اقوام کے فن تعمیر سے بھی استفادہ کیا۔

سب سے پہلے مسلمانوں نے آٹھویں صدی عیسوی میں ہندوستان پر حملہ کیا۔ لیکن اس حملے کا اثر دیر تک قائم نہ رہا۔ ۱۱۹۳ء میں شہاب الدین غوری نے ہندوستان پر حملہ کیا۔ اور پرتھی راج کو شکست دے کر دہلی اور قنوج پر قابض ہو گیا۔ شہاب الدین غوری کے انتقال کے بعد ہندوستان پر قطب الدین ایبک کا قبضہ ہوا۔ قطب الدین کے بعد التوتمش تخت نشین ہوا۔ درحقیقت اسی زمانے میں شمالی ہند ہندوؤں کے ہاتھ سے نکل کر مسلمان فاتحین کے قبضے میں آیا۔

اسی دور میں اس اسلامی سلطنت کی بنیاد پڑی جو صدیوں قائم رہی۔ اگرچہ مذکورہ سلطنت ہمیشہ کے لئے ختم ہو چکی ہے۔ لیکن اس نے اپنے جاہ و جلال کی نشانیاں بہت سی عظیم الشان عمارتوں کی شکل میں چھوڑی ہیں۔ یہ عمارتیں شائع نہیں ہوئیں۔ صدیاں گذر چکی ہیں لیکن وہ بدستور اپنی دیرینہ عظمت کی یاد تازہ کر رہی ہیں۔ ان عمارات میں مساجد۔ قلعے۔ مقابر اور باغات وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اضلاع یہ ہے کہ ایسی عمارتیں ہندوستان کے ہر حصے میں پائی جاتی ہیں۔

کئی ایک خاندانوں نے اپنے دور کی مروجہ طرز پر جو عمارتیں بنوائیں ان کے طرزِ تعمیر میں بھی اختلافات پائے جاتے ہیں۔ یہ اختلافات مدنی اور جغرافیائی اثرات سے وجود میں آئے ہیں ابتدائی پٹھان بادشاہوں کی یادگاروں میں ہندوؤں کے طرز تعمیر کا اثر بہت نمایاں ہے۔ مثال کے طور پر التوت مش کے مقبرے اور علائی دروازے ہی کو دیکھئے۔ ان دونوں تعمیروں میں ہندو فن تعمیر کا اثر بالکل صاف نظر آتا ہے۔

بارھویں اور سولھویں صدی کے درمیان تعمیر کے مختلف مقامی اسلوب پیدا ہوئے۔ یہ اسالیب۔ جونپور۔ گجرات احمد آباد۔ گلبرگہ اور بیجاپور کی عمارات میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ لیکن حق یہ ہے کہ یہ سب نئے اسالیب اس عظیم الشان اسلوب تعمیر میں گم ہو کر رہ گئے ہیں۔ جس کو مغل اسلوب تعمیر کہا جاتا ہے اگر آپ کو ان عمارات کے دیکھنے کا موقعہ ملے جو ۱۵۹۵ء سے لے کر ۱۶۷۰ء تک تعمیر ہوئی ہیں تو آپ کو خود ہی معلوم ہو جائے گا کہ یہی وہ اسلوب تعمیر ہے جس میں ایرانی روایات ہندی اشکال پر پوری طرح چھا گئی ہیں۔

ایرانی پیازی برج۔ وسیع دالان اور مدور میناروں کے مقابلے میں ہندوؤں کے توڑے دار ستون۔ پٹاؤ دار محرابیں اور پٹھانوں کے راسی برج کامیاب نہ ہو سکے، یہی سبب ہے کہ ان کا رواج کم ہو تا گیا۔ آخر دہلی لاہور اور فتح پور سیکری میں خوش نما محلوں۔ دل کشا باغوں اور عظیم الشان قبروں اور دروازوں کا وہ سلسلہ قائم ہوا جس کی انتہا اس حسین ترین عمارت پر ہوئی جیسے تاج محل کہتے ہیں۔ یہ وہ عمارت ہے جو اسلامی فن تعمیر کا شاہ کار ہے۔

المختصر اسلامی عمارات کو تاریخی حیثیت سے مندرجہ ذیل حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(۱) ۱۱۹۳ء ـ ۱۵۵۴ء پٹھانوں کا طرز تعمیر

یہ عمارات زیادہ تر شمالی ہند میں ہیں، مثلاً قطب مینار۔ مسجد قوت الاسلام۔ علائی دروازہ۔ کلاں محل میں اسی طرز کی اور عمارتیں بھی ہیں۔ خلجی تغلق اور لودھی سلاطین نے اس مخصوص طرز تعمیر کو ذرا ترقی دے کر زیادہ نمایاں کر دیا ہے۔

(۲) ۱۳۹۴ء ۔ ۱۴۷۶ء جونپور کے مشرقی سلاطین کا طرز تعمیر۔

اس طرز کے آثار عموماً مساجد کی شکل میں ملتے ہیں۔ ان میں اٹالا دیوی کی مسجد زیادہ مشہور ہے مسجد کے دروازے کی پیشانی پر محراب قائم کرکے دروازے کی شان وشوکت دوبالا کرنا اور برجوں کو بغیر میناروں کے قائم کرنا اس طرز تعمیر کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

(۳) ۱۳۹۱ء ۔ ۱۵۷۲ء ۔ گجراتی طرز تعمیر۔

اس طرز کی مساجد میں ہندوانہ آرائش موجود ہے۔

(۴) ۱۳۴۷ء ۔ ۱۵۲۵ء بہمن طرز تعمیر

بہمن طرز تعمیر کی عمارات گلبرگہ اور بیدر میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

(۵) ۱۴۹۱ء ۔ ۱۶۶۰ء بیجاپور کا طرز تعمیر۔

یہ طرز تعمیر مسلمہ طور پر ایرانی طرز تعمیر کا نقش ثانی ہے۔ اپنے غیر معمولی برجوں کی وجہ سے نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔

(۶) ۱۴۹۴ء ۔ ۱۸۰۰ء مغل طرز تعمیر

ان پچھلے مذکورہ اسالیب پر ہندی فن تعمیر کا کافی اثر پڑا۔ اور لطف یہ ہے کہ ہندی اثر سے ان اسالیب کو چار چاند لگ گئے ہیں۔ ہندی اور ایرانی میل سے جو عمارات تعمیر ہوئیں بقول سر جان مارشل ان کے طفیل دو خصوصیتیں ہندی فن تعمیر میں ضرور پیدا ہوگئیں۔ ایک پائے داری اور دوسرا حسن۔ ان خصوصیتوں کے ساتھ اسلامی اصول تعمیر کے ملاپ سے جو ہندو مسلم طرز تعمیر پیدا ہوا وہ درحقیقت گذشتہ اسالیب سے کہیں زیادہ اعلیٰ وارفع تھا۔ مسلم سلاطین کی ہمیشہ یہی آرزو رہی کہ وہ عظیم الشان عمارات بنوائیں۔ لیکن ذرائع محدود تھے۔ یہ لوگ سپاہی پیشہ تھے۔ گھر سے ملک مارنے نکلے تھے؛ عمارات بنانے۔ اپنے ساتھ معماروں اور صنعت گروں کو نہیں لئے پھرتے تھے۔ لیکن پھر بھی فطرتاً میں تعمیر کا شوق تھا۔ جہاں جاتے تھے اپنے مطلب کے کاریگر تلاش کرلیتے تھے۔ ہندوستان میں بھی اچھے کاریگروں کی کمی نہ تھی۔ یہاں ایسے کاریگر انھیں کافی مل گئے جو ان کے تخیلات

صورت گری کر سکتے تھے۔

سر جان مارشل کہتے ہیں کہ فنِ تعمیر کی تاریخ میں منجملہ دیگر اہم واقعات کے ایک اہم واقعہ یہ بھی ہے کہ مسلمان فاتحین نے نہایت حیرت انگیز طریق سے بعض مندروں کو مساجد میں تبدیل کر دیا اور یہ کیا کم صنعت گری ہے کہ انھوں نے ہندی کاری گروں اور حروف کنوں کی امداد سے اپنی عمارتوں میں خوبصورت کتبوں کا اضافہ کیا۔ مگر اس کے ساتھ ہی اپنے فنی خصائص کو ٹھیس نہ لگنے دی۔ بے شک یہ ان کے تصورات کی وسعت کا ایک کھلا ہوا ثبوت ہے۔

غیر ملکی مسالے سے جس کی حقیقت اور اصلیت سے وہ بالکل ناواقف تھے ایک حسین و جمیل عمارت بنا کر کھڑی کر دینا اور دو ایسے اسالیب کو جن کی نوعیت میں اختلاف ہو ملا کر ایک کر دینا۔ پھر اسلامی فنِ تعمیر کے اصولوں کو بھی برقرار رکھنا بظاہر غیر ممکن معلوم ہوتا ہے، اس لئے کہ مندر اور مسجد میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ہنود کی عبادت گاہ ایک مختصر اور تنگ سی عمارت ہوتی تھی۔ لیکن اس کے برعکس مسلمان اپنی عبادت گاہیں وسیع اور فراخ بناتے تھے۔ مندر ایک پراسرار اور تاریک عمارت تھی۔ مسجد روشن اور ہوادار۔ گویا نسیم خلد کے جھونکوں کے لئے ہر طرف سے کھلی رہتی تھی۔ ہندوؤں کا طرز تعمیر ستونوں اور توڑے دار پٹاو پر مشتمل تھا۔ اسلامی فنِ عمارت میں محراب نمایاں حیثیت رکھتی تھی۔

عموماً مندر کی چوٹی پر نازک اور نوکدار کلس بنایا جاتا تھا اور ان کی عمارتیں اہرامِ مصر کی طرز پر ہوتی تھیں۔ برخلاف اس کے مسجد کے برج نہایت کشادہ ہوتے تھے۔ ہنود مادی اجسام کی پوجا کرتے تھے اس لئے ان کی عبادت گاہیں بے شمار دیوتاؤں اور دیویوں کی مورتیوں سے بھری رہتی تھیں۔ اسلام شروع ہی سے بت پرستی کا سخت مخالف تھا۔ اسی سبب سے مسلمانوں میں کسی ذی روح کا مجسمہ بنانا بالکل ممنوع تھا۔ ہنود کی عمارات میں ذوقِ آرائش مختلف مجسموں کی صورت میں ظاہر ہو کر پیدا ہو جاتا تھا۔ اور ان میں آرائش بالکل اسی طرح قدرتی اشیا کے مطابق ہوتی تھی، جیسے گوتھک عمارات میں ہوا کرتی تھی۔ لیکن اس آرائش کی تفصیلات

نہایت دلچسپ اور معنی خیز ہوتی تھیں۔ برعکس اس کے مسلمان اپنی عمارات کو گوناں گوں رنگوں و تفریب خطوں اور سیدھی سطح پر نقش و نگار بنا کر آرائش دیتے تھے۔ آخر کار اس شوق نے قدیم عربی خطاطی یا ہندی اشکال کی صورت اختیار کر لی۔

باوجود ان ہمہ گیر اختلافات کے ہندی اور اسلامی فنون عمارت میں بعض مشترک عناصر موجود ہیں جن کی موجودگی سے ہر دو اسالیب میں اختلاط ممکن ہو گیا ہے۔ مندروں اور مسجدوں میں ایک بڑی مشترک خصوصیت یہ ہے کہ ان میں ایک وسیع اور کشادہ صحن ہوتا ہے۔ چاروں طرف حجرے، رواقیں یا دالان۔ یہی وجہ ہے کہ اس اسلوب پر بنے ہوئے مندر نہایت آسانی سے مساجد میں تبدیل کر دیئے گئے۔

دوسری بنیادی خصوصیت جو ہر دو اسالیب میں ایک مشترک کڑی کی حیثیت رکھتی ہے یہ ہے کہ ہندی اور اسلامی فنون شروع سے ہی آرائش پسند واقع ہوئے ہیں۔ گویا دونوں اسالیب کو آرائش کا ذوق ورثے میں ملا تھا۔ اس لئے دونوں کے نزدیک آرائش عمارت کی جان ہے۔ ہندوستانیوں کے خمیر میں آرائش کا شوق تھا اور ہندوؤں کو یہ ذوق آریوں سے ملا تھا۔

مسلمانوں نے ذوق آرائش ساسانی یا ذیلیمی حکومتوں سے اخذ کیا، اپنے خداداد ذوق سلیم سے وہ فنی تزئین کا اس قدر برمحل استعمال کرتے تھے کہ اس کی قدر و قیمت ہندی ذوق سے کسی طرح کم نہ تھی، جب ہندوستان ان کے قبضے میں آیا اور ان کی آنکھوں نے فن تعمیرات کی ایک نئی دنیا دیکھی تو انھوں نے اس سے خاطر خواہ استفادہ کیا۔

منجملہ دیگر اسلامی عمارات کے ایک عمارت مسجد قوۃ الاسلام بھی ہے۔ اس مسجد کے کتبے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسے قطب الدین ایبک نے تعمیر کیا تھا، یہ مسجد ایک وسیع گوشہ صحن پر مشتمل ہے جس کا طول ۱۴۲ افٹ اور عرض ۱۰۸ انٹ ہے صحن کے چاروں طرف حجرے ہیں، مشرقی حجرے پورے پتھر کے چار چار ستونوں پر قائم ہیں۔ اور مغربی شمالی جنوبی تین تین پتھروں پر مغرب کی جانب ایک بڑا دالان ہے۔ اس کی پیشانی پر پانچ محرابیں سرخ اور زرد سنگ خارا کی بنی ہوئی ہیں۔

پتھروں پر ہندی طرز کے ابھرے ہوئے نقوش ہیں۔ خط نسخ میں کچھ عبارت کندہ ہے۔ وہ بڑا دروازہ جس میں سے ہوکر مسجد میں آتے ہیں شمال مشرق اور جنوب تینوں طرفوں کی عمارتوں کے عین وسط میں واقع ہے۔ اس قدر عمارت تو ایبک کی اصلی مسجد قوۃ الاسلام کی ہے۔ باقی عمارات میں کچھ التوتمش نے اضافہ کیا اور کچھ علاؤالدین خلجی نے تقریباً نوے سال بعد اس سے عمارت کی وسعت اصل وسعت سے دگنی ہوگئی، وہ نامکمل مینار جس کی محض ایک منزل تعمیر ہو سکی اسی بادشاہ کے حکم سے تعمیر ہونا شروع ہوا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ قطب مینار کے مقابل ایک اور مینار بطور ماذنہ تعمیر کرکے مسجد کی شان کو دوبالا کردے۔

قطب مینار مسجد قوۃ الاسلام کی مشرقی عمارات کے جنوبی گوشے پر واقع ہے حق یہ ہے کہ یہ مینار پٹھان بادشاہوں کی بہترین عمارت ہے۔ مینار مذکور کی تاریخ اس کے کتبے ہی میں کندہ ہے اسے قطب الدین ایبک نے بنوانا شروع کیا تھا لیکن ابھی صرف ایک منزل تعمیر ہوئی تھی کہ اس کا وقت آ لگا۔ اس منزل پر اس نے اپنے آقا محمد بن سام غوری کا نام نامی کندہ کرایا، آخر اس مینار کو شمس الدین التوتمش نے مکمل کرایا۔ پھر فیروز شاہ تغلق نے نہ صرف اس کی ضروری مرمت کرائی بلکہ پانچویں منزل بھی بنوائی۔ کہا جاتا ہے کہ مینار کی چوٹی پر ایک گول سنگین چھتری لگی ہوئی تھی۔ یہ چھتری ۱۷۹۴ء تک موجود تھی۔ ۱۸۰۳ء میں ایک شدید زلزلہ آیا اور یہ چھتری زمین پر آرہی۔ پھر ۱۸۲۳ء سے ۱۸۲۸ء کے درمیان یہ چھتری مغل اسلوب تعمیر کے مطابق تیار کی گئی کہتے ہیں اس کا نقشہ میجر سمتھ نے تیار کیا تھا۔ اس چھتری پر انگریزی پرچم لہراتا رہا۔ لارڈ ہارڈنگ نے میجر موصوف کے ذوق تعمیر سے اختلاف کرتے ہوئے اس برجی کو ۱۸۴۸ء میں اتروا دیا اور اسے مسجد کے شمال میں ایک چبوترے پر بطور نمونہ رکھوا دیا، چوں کہ یہ چھتری اس مقام پر رکھی ہوئی بدنما معلوم ہوتی تھی۔ اس لئے اسے اٹھوا کر مینار کے جنوب مشرقی میدان میں رکھوا دیا گیا، اس مقام پر یہ چھتری اب تک موجود ہے اور میجر سمتھ کے ذوق سلیم کی گواہی دے رہی ہے۔ میجر موصوف نے مینار کے دروازے کی مرمت بھی کروائی لیکن اس مرمت میں کچھ خامیاں رہ گئیں۔ سنگین کتبات کے طویل ٹکڑے

جو زلزلے سے گر گئے تھے غیر موزوں مقامات پر نصب ہو گئے۔ شکستہ حصوں کی مرمت بھی کچھ خوبصورتی سے نہ ہوئی۔

بعض لوگ اور کچھ مؤرخ بھی یہ کہتے ہیں کہ یہ مینار دراصل پرتھی راج نے تعمیر کرایا تھا۔ اس مینار کی تعمیر کا مقصد یہ تھا کہ پرتھی راج کی لڑکی اس پر چڑھ کر جمنا جی کے درشن کیا کرے۔ جنرل کننگھم نے اس نظریئے کی تردید میں بہت سی دلیلیں پیش کی ہیں اور انھوں نے ثابت کر دیا ہے کہ گو اس مینار کی ابتدائی منازل ہندو معماروں نے بنائی ہوں۔ لیکن یہ عمارت مسلمانوں نے بنوائی ہوئی ہے۔ مسلمانوں نے اس قسم کے مینار غزنی میں بھی تعمیر کئے تھے۔ بے شک چتوڑ میں ہندوؤں کا بنایا ہوا ایک مینار موجود ہے۔ لیکن قطب مینار اور چتوڑ کے "منارۂ فتح" میں بہت اختلاف ہے۔ بدیہی طور پر یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ مینار مسجد قوۃ الاسلام کے ماذنہ کے طور پر تعمیر کیا گیا ہو گا۔

اسی زمانے کی ایک اور عمارت بھی قابل توجہ ہے اور وہ التوت مش کا مقبرہ ہے۔ بقول فرگسن "یہ مقبرہ اس ہندی فن کاری کی بہترین مثال ہے جو پرانی دلّی میں مسلمانوں کی عمارات میں پائی جاتی ہے" حق یہ ہے کہ یہ عمارت اپنی جگہ لاجواب ہے۔

فرگسن کا خیال ہے کہ یہ عمارت ہندوستان کا قدیم ترین مقبرہ ہے، لیکن اس نے سلطان غازی کے مقبرے کو جو ۶۲۹ھ کی تعمیر ہے بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔ سلطان غازی کا مقبرہ التوت مش کی وفات سے چار سال قبل تعمیر ہوا تھا، اغلب یہی ہے کہ یہ مقبرہ اپنے بانی التوت مش کی حیات ہی میں تعمیر ہو چکا تھا لیکن سر سید احمد خاں مرحوم لکھتے ہیں کہ یہ عمارت سلطانہ رضیہ کی بنوائی ہوئی ہے۔ جو التوت مش کی بدقسمت دختر تھی۔

یہ مربع شکل کے ایک کمرے پر مشتمل ہے جو سرخ رنگ کے سنگ خارا کا بنا ہوا ہے۔ اس پر نہایت عمدہ نقش و نگار کندہ ہیں۔ اس میں کہیں کہیں سنگ مرمر بھی استعمال ہوا ہے، اس وقت اس عمارت پر کوئی برج نہیں لیکن عمارت بناتے وقت خیال تھا کہ اس پر ایک برج بنایا جائے گا۔ تمام اندرونی حاشیہ کو چھوڑ کر باقی سطح اعلیٰ قسم کی عربی خطاطی اور خوبصورت طغروں سے پُر ہے نہ زون کے

قرآنی آیات کندہ ہیں۔ ہندسی اشکال بھی پائی جاتی ہیں۔ نازک ستون جن پر وتر نما محرابیں قائم ہیں اور جو مربع شمہ بنیاد ہی ہیں۔ فن کاری کی نازک ترین مثالیں ہیں۔ نیچے کے حصے کی ساخت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک ہندی کاریگر اسلامی طرز تعمیر کی مطابقت نہیں کر سکتے تھے۔

علائی دروازہ | یہ شاندار دروازہ جس پر ایک برج قائم ہے علاؤالدین خلجی نے بنوایا تھا۔ اسی دروازے میں سے گذر کر مسجد کے صحن میں داخل ہوتے ہیں، یہ ایک مربع شکل کی عمارت ہے جس کا ایک ضلع ۵۶ فٹ ۶ انچ کا ہے۔ دیواریں ۱۱ چوڑی ہیں، اس میں داخل ہونے کے لئے چار دروازے ہیں۔ عمارت میں سنگ مرمر اور سنگ سرخ استعمال کیا گیا ہے۔ عربی خطاطی اور حسین نقش و نگار سے اس کی تزئین کی گئی ہے۔

یہ دروازہ پٹھانوں کے اسلوب تعمیر کی نہایت شاندار مثال ہے۔ مسٹر بگلر اس کے نقش و نگار پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ ہندو فن کاری کی آخری کوشش تھی، میرے نزدیک اس کی تزئین میں دروازے کا سارا حسن سمٹ آیا ہے۔ شاید بعض لوگ کہیں کہ اس تزئین کو اس قدر اہمیت دینے کے یہ معنی ہیں کہ محرابوں کے تناسب کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ نہایت دلکش نقش و نگار ساری عمارت کو ڈھانپے ہوئے ہیں۔ عمارت کی دونوں منزلوں پر عظیم الشان دروازے قائم ہیں۔ اور ان دروازوں پر خوبصورت مرمریں خطوط ہیں۔

شمالی محرابیں بجز ایک کے سب گھوڑے کے نعل کی شکل کی ہیں، وہ نہایت نازک مگر پائیدار ستونوں پر قائم ہیں۔ اندرونی دیواریں سارا سینی نقش و نگار سے آراستہ ہیں۔ فرگسن کہتا ہے اس نبت کاری میں بعض چیزیں ایسی ہیں جو اپنی نوعیت میں بے نظیر ہیں۔ برج کی اندرونی سطح صاف ہے، اس کی صاف سطح اور حسین نقش و نگار سے جو تضاد پیدا ہوا ہے وہ انتہا درجہ نظر فریب ہے مربع نما عمارت پر مثمن برج محرابچوں کے ذریعے تعمیر کیا گیا ہے۔

فرگسن نے عمارت کے اس حصے کے متعلق لکھا ہے کہ میں نے اس سے زیادہ حسین اور متناسب عمارت ہندوستان بھر میں کہیں اور نہیں دیکھی۔

بغرضِ اختصار خیال تھا کہ تغلق فنِ تعمیر کے متعلق کچھ نہ کہوں۔ لیکن خان جہاں مقبول تلنگانی کا مقبرہ تفصیل پر مجبور کرتا ہے، خان جہاں فیروز شاہ تغلق کا وزیرِ اعظم تھا۔ اس کا مقبرہ ایسے نئے اسلوب پر تعمیر ہوا کہ شاہی انجینیروں نے بھی شاہی مقبرے اسی اسلوب پر تعمیر کرانے شروع کر دیئے۔ یہ مقبرہ چوکور ہونے کی بجائے ہشت پہلو ہے، اس کے وسطی حجرے پر ایک برج ہے جس کی گردنی نمایاں نہیں، بلکہ فنی اعتبار سے اس میں کچھ عیب پائے جاتے ہیں۔ مثلاً برج پست اور دھنسا ہوا ہے، محرابیں نیچی اور بے حقیقت سی ہیں۔ اس عمارت کو فضیلت محض اس وجہ سے حاصل ہے کہ بعد کے معماروں نے اس سے بہت کچھ سیکھا ہے۔

اگر مبارک شاہ کے مقبرے کو بیچ کی کڑی تصور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ محمد شاہ سید ۱۴۴۵ء ۱۴۴۶ء کا مقبرہ فنی حیثیت سے اس مقبرے کی نسبت کس قدر آگے بڑھا ہوا ہے۔ مقبرے میں ہشت پہلو حجرہ ہے، اس کے گرداگرد ایک برآمدہ ہے۔ ہر پہلو کے برآمدے پر تین تین محرابیں قائم ہیں۔ اور ہر پہلو کی وسطی محراب پر ایک ہشت پہلو چھتری کھڑی ہے۔ اندرونی حجرے پر ایک برج ہے جو پہلے برجوں سے زیادہ اُبھرا ہوا ہے۔

پیٹے دار دیواریں جو ابتدائی عمارتوں میں پائی جاتی ہیں اس میں موجود ہیں ہشتمن کے سارے گوشے عمودی ہیں البتہ پیٹے دار ہیں، محرابوں پر ایک چھجہ ہے اور وہ سنگین توڑوں پر قائم ہے چھجے کے اوپر ایک چھوٹی سی دیوار ہے، دیوار کے ہر گوشے پر ایک گلدستہ بنا ہوا ہے۔

ان تبدیلیوں سے فنِ تعمیر میں ایک نمایاں تغیر واقع ہوا۔ لیکن فروعی تغیرات کو چھوڑ کر فنِ عمارت کے دو نہایت ضروری عناصر میں بھی کچھ اصولی تبدیلیاں ہوئیں، اور یہ محراب اور برج کی صورت میں ظاہر ہوئیں، محراب بنانے کا حقیقی مقصد یہ تھا کہ عمارت میں ایک دروازہ تعمیر کیا جائے جو عمارت کی شان کو دوبالا کر دے، ہندوستانی کاریگر فنِ محراب سے واقف تھے اور اسے استعمال بھی کرتے تھے لیکن اسے اپنا دشمن سمجھتے تھے۔ ان کا اعتقاد تھا کہ محراب کبھی نہیں سوتی۔ اسی اعتقاد نے انہیں مجبور کیا کہ تعمیرات میں کچھ ایسے اسلوب پیدا کریں جن سے

محراب پر قبضہ ہو جائے۔ عموماً دیکھا گیا ہے کہ محراب کے بازو باہر کی جانب نکل پڑتے ہیں۔ اور ان کے باہر نکلتے ہی ساری عمارت زمین پر آرہتی ہے جس عمارت میں محرابیں ہوں اس میں یہی خطرہ لگا رہتا ہے، چناں چہ ہندوؤں نے اس خطرے سے محفوظ رہنے کے لئے تعمیر کی بنیاد دیٹیا اور چڑھاؤ پر قائم کی۔

مسلمان معماروں کا محراب تعمیر کرنے کا اصول اس ہندو اصول سے بالکل مختلف تھا ہندوانہ اصول تعمیر جابی دار ڈاٹ پر قائم تھا۔ اس زمانے کی عمارتوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو افقی محراب کی بجائے اصلی محراب کے اصول کو اختیار کرنے میں کافی مدت لگی ہوگی۔ سبب اس کا ظاہر ہے، ہندو کاریگر ایسی محرابیں تعمیر نہیں کر سکتے تھے۔ ہندو کاریگروں کی ناواقفیت کی وجہ سے برج کی تعمیر میں بھی کچھ اصولی تبدیلیاں واقع ہوئیں، مخروطی برج جو پٹھانوں کے ابتدائی زمانے میں مروج تھے اس ناواقفیت سے متاثر ہوئے۔ لیکن مخروطی شکل کو چوڑے برجوں میں تبدیل کرنے میں زیادہ عرصہ نہیں لگا۔ ان چوڑے برجوں نے بہت جلد نصف دائرے کی صورت اختیار کرلی اور بعد میں یہی برج ایک گردنی برج پر نصب کئے جانے لگے۔ برج بھی دیر تک قائم نہ رہے، ان کی جگہ پیازی برج رائج ہوئے۔ پیازنما برج کی ساخت ایران سے چلی تھی، یہ امر بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ جب تک گردنی کا رواج نہ ہوا تھا۔ برج کا خلا بدنما معلوم نہیں ہوتا تھا۔ نیز عرض کے مقابلے میں ارتفاع نسبتاً زیادہ بلند ہوتی تھی، لیکن جوں ہی وعصی ہوئی حالت سے اٹھ کر برج زیادہ بلند اور متناسب ہوا۔ برج کا خلا زیادہ نمایاں اور بدنما معلوم دینے لگا، اس عیب کو دور کرنے کے لئے دوسرے برج تعمیر ہوئے اور یہ سب سے پہلے ۱۵۰۱ء میں شہاب الدین تاج خاں کے مقبرے میں استعمال ہوئے۔ یہ مقبرہ دہلی میں موجود ہے۔ پھر ارتقائی مدارج طے کر کے شاہ جہاں کے زمانے میں ان برجوں نے نہایت متناسب اور دل کش صورت اختیار کرلی۔ میں پٹھانوں کے فن تعمیر کے متعلق یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا، وہ اپنی عمارات جناتوں کی طرح بنانے تھے۔ اور سناروں کی طرح ختم کرتے تھے۔

فن تعمیر میں مغل طرز تعمیر بڑی اہمیت رکھتا ہے، کیوں کہ یہی وہ دور ہے جس میں بہتر سے بہتر عمارتیں ہمارے ملک میں تعمیر ہوئیں، سلطنت مغلیہ کا بانی اپنی تزک میں رقمطراز ہے کہ میں نے

اپنے محلات بنوانے کے لئے صرف آگرے میں ۔ ۹۸ سنگ تراش لگا رکھے تھے ۔سیکری بیانہ ۔ دھولپور۔ گوالیار اور کوئلی (علی گڑھ) میں تیری عمارات کی تعمیر کے لئے ہر روز ۱۴۹۱ سنگ تراش کام کرتے تھے۔ افسوس ہے کہ اس کی بنوائی ہوئی کسی عمارت کا بھی نشان باقی نہیں رہا ۔ہمایوں کی تعمیر کردہ عمارات میں سے بھی کوئی باقی نہیں ۔ اس لئے اس دور کے اسلوب تعمیر کا کچھ اندازہ نہیں ہوسکتا تاہم یہ بات کہ اس نے دلی کے پرانے قلعے میں ایک محل تعمیر کرایا تھا پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے ۔ خیال ہے کہ شیر شاہ کی عمارات کا جو حشر آگرے میں ہوا وہی حال بابر اور ہمایوں کی عمارات کا بھی ہوا ہوگا یعنی دونوں تباہ و برباد ہوگئیں ۔

فرگسن ان شاہی محلات پر نوحہ کرتا ہوا لکھتا ہے "موجودہ حکومت نے بارگیں بنانے کے لئے اس مقام کو مناسب خیال کیا اور اس مطلب کے لئے اس قصر عالی شان کو صفحۂ ہستی سے مٹا کر اس کی جگہ معمولی سی بدنما اینٹوں کی ایک عمارت کھڑی کر دی ۔ یہ نئی عمارت آج کل بطور گودام استعمال کی جاتی ہے مغلوں کے مرمریں محلات کی جگہ اب غلاظت اور گندگی کا ایک بڑا ڈھیر موجود ہے جس سے دو قوموں کے مذاق کا صحیح اندازہ کیا جا سکتا ہے"

چوں کہ ہمایوں اور بابر کے زمانے کی کوئی عمارت موجود نہیں ، اس لئے ہم ہمایوں کے مقبرے کی طرف رجوع کرنے پر مجبور ہیں ، یہ عمارت مغلوں کی نہایت ابتدائی عمارتوں میں سے ایک ہے یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ مقبرۂ ہمایوں ۔ہمایوں کی بیگم حمیدہ بانو نے تعمیر کرایا تھا ۔اس بیگم کو عام طور پر نواب حاجی بیگم کہا جاتا تھا ۔ یہ عمارت پندرہ لاکھ روپے کی لاگت سے ۱۵۶۵ء میں بن کر تیار ہوئی تھی ۔

یہ مقبرہ جسے خاندان مغلیہ کی خواب گاہ کہنا چاہئے ایک وسیع باغ کے وسط میں واقع ہے ، اس باغ کو چار حصوں میں اس طرح تقسیم کیا گیا ہے کہ ہر جانب ایک راستہ (جانب دروا) بنایا گیا ہے اور دو رویہ پٹڑیوں کے بیچ میں ایک نہر ہے ۔ باغ کے وسط میں ایک چبوترہ ہے جس ہلکے ہلکے تراشے ہوئے ہیں ، اس چبوترے پر ایک اور چبوترا ہے اس کے گوشے بھی اسی طرح کے ہیں ، ہر ج

پہلے چبوترے کی سطح سے ۲۲ فٹ بلند ہے، یہ دوسرا چبوترا درحقیقت وہ کرسی ہے جس پر سارا مقبرہ قائم ہے۔
مقبرے کی بیرونی جانب سنگ سرخ لگایا گیا ہے، سنگ سرخ میں سنگ مرمر کی آمیزش نہایت لطف دیتی ہے، دوسرے چبوترے کے چاروں پہلوؤں کے وسط میں کچھ سیڑھیاں بنائی گئی ہیں، ان کے ذریعے مقبرے کے اوپر پہونچتے ہیں۔ اس چبوترے کے عین وسط میں وہ کمرہ ہے جس میں شاہنشاہ ہمایوں کی آخری آرام گاہ ہے، اس کمرے کا دروازہ جنوب کی جانب ہے اور اس میں ایک نہایت نفیس نمونہ ہے جس پر شفاف پلاسٹر کیا گیا ہے، یہ عمارت دراصل اسی اسلوب پر بنائی گئی ہے جس پر بعد میں تاج تعمیر ہوا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اس میں وہ حسن و شعریت نہیں جو تاج میں پائی جاتی ہے۔
فرگسن کا خیال ہے کہ بادی النظر میں ایسا معلوم ہوتا ہے، گویا یہ عمارت ایک صدی بعد کی بنائی ہوئی عمارات میں سے ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ عمارت ان جدید عمارتوں سے ایک سو سال قبل تعمیر ہوئی تھی۔
اسی قسم کا خیال جنرل کننگھم نے بھی ظاہر کیا ہے، ان کے نزدیک یہ عمارت نہ صرف مغل اسلوبِ تعمیر کا ابتدائی نمونہ ہے۔ بلکہ یہ وہ عمارت ہے جس میں عمارت کے چاروں گوشوں پر چھوٹے چھوٹے مینار بنائے گئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ برج کے چاروں طرف چھتریاں تعمیر کرنے کا رواج بودھیوں کے زمانے کی یادگار ہے، اور یہ سچ ہے، کیوں کہ محمد شاہ سید کے مقبرے میں چھتریاں ہوتی ہیں اور عمارات مابعد میں بھی اس کے نمونے پائے جاتے ہیں۔ ان عمارات میں نیز مقبرۂ ہمایوں میں ان کا استعمال ایک اہم جدت خیال کیا جاتا ہے، یہ جدت رفتہ رفتہ ترقی کرتی گئی۔ اور آخرکار چھتریوں نے تاج کے میناروں کا جامہ پہن لیا۔ لیکن مینار کے ارتقائی مدارج کا پہلا درجہ تو اعتمادالدولہ کے مقبرے کے ایک منزلہ مینار ہیں۔ دوسرا درجہ مقبرۂ اکبر (سکندرہ) کا دروازہ جس کے چاروں طرف دو منزلہ مینار بنائے گئے ہیں۔ تیسرا درجہ مقبرۂ جہاں گیر (لاہور) جس کے مینار سہ منزلہ ہیں۔ ان تینوں عمارتوں میں مینار مقبرے کی اصلی یعنی وسطی عمارت سے

ط یہ مقبرہ آگرے میں ہے۔

ملے ہوئے ہیں. لیکن تاج محل میں یہ مینار چبوترے کے چاروں زاویوں پر نصب کئے ہیں دوسری جدت اس عمارت میں یہ ہے کہ برج کو گول اور بلند گردنی پر قائم کیا ہے۔ اور یہ وہ جدت ہے جس کا اتباع بعد کی ہر عمارت میں کیا گیا۔

اکبر کی عمارتیں اس کی ملکی پالیسی کی طرح ہندو طرز تعمیر کا بہت کچھ اثر لئے ہوئے ہیں اس نے اپنی طویل پنجاہ سالہ حکومت کے دوران میں خوبصورت اور پائے دار عمارات کی تعمیر کا سلسلہ پورے جوش و خروش سے جاری رکھا۔ اس کی عمارتوں کا نچوڑ آگرے کا قلعہ. جودھ بائی. مریم زمانی اور رومی سلطانہ کے محلات. فتح پور سیکری کی جامع مسجد. بلند دروازہ وغیرہ کی عمارات ہیں، یہ عمارات اکبر اعظم کے ذوق تعمیر کی زندہ جاوید مثالیں ہیں۔ آخری دو عمارتوں کو چھوڑ کر باقی عمارتوں کی نمایاں خصوصیت ہندوانہ طرز تعمیر ہے، محرابوں کی بجائے ہر جگہ ہندوؤں کا وہ افقی طرز تعمیر پایا جاتا ہے جس کا ہم تفصیل سے ذکر کر چکے ہیں۔

وسیع سطوحات پر جو منبت کاری کی گئی ہے وہ بھی سوائے اکبری عمارات کے کسی اور عمارت میں نہیں پائی جاتی. رومی سلطانہ کے محل کے وہ منقش ستون اپنی طرز و خوبی میں بے مثل سہی لیکن یہ ستون اسلامی طرز آرائش سے بالکل مختلف ہیں۔

فتح پور سیکری کی جامع مسجد بے شبہ ایک نفیس عمارت ہے. لیکن میں بلند دروازہ کو اس پر ترجیح دیتا ہوں۔ فرگسن اس عمارت کے فنی محاسن ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

جنوبی دروازہ شان و شوکت میں جامع مسجد سے بھی آگے بڑھ گیا ہے، اس کا طول ۱۳۰ فٹ اور عرض ۸۵ فٹ ہے. بلندی بھی طول و عرض کی مناسبت سے ہے۔ چوں کہ یہ دروازہ ایک قدرتی بلندی پر بنایا گیا ہے، اس لئے جب اسے نیچے کھڑے ہو کر دیکھا جاتا ہے تو اس کی عظمت اور شان کے آگے ہندوستان کا کوئی دروازہ نظروں میں نہیں جچتا اور میرے خیال میں تو دنیا کا کوئی دروازہ نہیں جو اس کی عظمت کا مقابلہ کر سکے جس اہم اور لاینحل عقدے نے ماہرین فن عمارات کے دماغوں کو ہر دور میں پریشان کیا تھا اس عمارت نے اس کا مکمل اور کامیاب طریقے سے حل کر دیا. اگرچہ سارا سینی

معماروں نے بھی اس عقدے کو کامیاب ترین طریقہ پر حل کیا ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ کسی عظیم الشان عمارت کے دروازے کو عمارت کی جسامت کی مناسبت سے تعمیر کرنا نہ صرف شکل بلکہ مضحکہ خیز بھی تھا اس لئے ایسے ابواب قائم کرنا جن میں سے ہاتھی معہ ہودے کے گزر جائیں کچھ زیادہ موزوں نہ تھا۔ اس قباحت کو دور کرنے کی بہترین ترکیب سارسینی معماروں نے نکالی۔ انھوں نے اپنی عمارات کے دروازوں کو خواہ وہ ایک ہو، تین ہوں یا پانچ ہوں۔ نہایت موزوں تناسب کے ساتھ نصف برج کی کرسی پر قائم کرنا شروع کیا۔ اس خصوصیت نے ڈیوڑھی کی صورت اختیار کر لی مگر اس کی جسامت وہی دروازے جیسی رہی چنانچہ یہ عمارت جس پر دروازے کا بھی اطلاق ہونے لگا حقیقی مدخل کی جسامت کے تناسب سے بہت بڑھ گئی۔ اس دروازے کو دیکھ کر معمولی سمجھ کا آدمی بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ دروازہ داخل ہونے کے لئے بنایا ہے۔ نیز کوئی شخص اس چھوٹے سے دروازے کے قدوقامت اور تناسب کا خیال نہیں کرتا جو اس دیوہیکل دروازے کے قاعدے میں بنایا گیا ہے۔

اس دور کے دروازوں کی تعمیر اسی اصول پر ہوئی ہے اور یہ اصول ان اصولوں میں بہترین تسلیم کیا گیا ہے جو اب تک دریافت ہو چکے ہیں۔ اکبری عمارات کا بہترین نمونہ خود اکبر کا مقبرہ (سکندرہ میں) ہے۔ اس مقبرے کو اس نے اپنی زندگی میں تعمیر کرانا شروع کر دیا تھا۔ فرگسن کا خیال ہے کہ یہ عمارت اپنی قسم کی ایک ہی عمارت ہے۔ اس کی تعمیر کا اسلوب بلاشبہ بدھ طرز تعمیر سے مستعار لیا گیا ہے۔ ہمایوں کے مقبرے کی طرح یہ عمارت بھی ایک وسیع اور خوش نما باغ کے وسط میں بنائی گئی ہے۔ چہار منزلہ ہے لیکن ساخت زبان حال سے کہہ رہی ہے کہ مجھے بنانے والوں کا ارادہ ایک برج بنانے کا تھا جو کسی وجہ سے پورا نہیں ہو سکا۔ اگر کہیں یہ برج بن جاتا تو عمارت کی قدروقیمت کہیں سے کہیں پہونچ جاتی۔

جہانگیر کی عمارات کا مقابلہ اگر اکبر یا شاہجہاں کی عمارات سے کیا جائے تو ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے باپ اور بیٹے سے بہت پیچھے ہے۔ دہلی اور آگرے میں تو اس کی کوئی عمارت ہی نہیں۔ مقبرۂ اعتمادالدولہ آگرے میں نورجہاں نے تعمیر کرایا تھا۔ اس کی عمارت میں کوئی خاص

قابل ذکر نہیں۔ نہ اس کے طرز تعمیر میں کوئی جدت ہے۔ نہ اس کے کاری گروں نے اپنی صناعی سے اس میں کوئی خاص خوبی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن پھر بھی دو چیزیں اس میں نمایاں نظر آتی ہیں۔ اول یہ کہ ساری عمارت عمدہ قسم کے سنگ مرمر کی ہے، دوسرے ہندوستان میں پہلی مرتبہ پچی کاری کا کام اس عمارت میں کیا گیا ہے۔

یہ مسئلہ کہ ہندوستان میں پچی کاری کی ابتدا کس دور میں ہوئی، متنازعہ فیہ ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ مغل بادشاہوں کے مقبرے اور محلات کی آرائش میں اٹلی کے باشندوں کی صنعت کو دخل ہے۔ بہرکیف یہ بات اب پایۂ ثبوت کو پہونچ چکی ہے کہ اگر اس قسم کی آرائش کی ابتدا اٹلی کے کاری گروں کے ہاتھوں ہوئی لیکن ہندوستانی صناعوں نے جلد ہی اس ہنر کو حاصل کرلیا، اور اس میں نہایت کامیاب اختراعیں کیں۔ ہندی کاری گروں نے محض اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ انھوں نے اسے ہند و مسلم فن تعمیر کی ضروریات کے مطابق ڈھال لیا، چناں چہ اس صناعی کی جیتی جاگتی مثال تاج محل کی حسین ترین عمارت ہے۔

فن تعمیرات کی تاریخ اٹھا کر دیکھیے۔ آپ کو ایک فرد بھی ایسا نظر نہیں آئے گا جو حسین و جمیل عمارات کی تعمیر میں شاہ جہاں کا مد مقابل ہو سکے، حقیقت امر یہ ہے کہ دہلی اور آگرے کے محلات حسن و معصومیت کی زندہ تصویریں ہیں۔ دہلی کی جامع مسجد اور آگرے کی موتی مسجد صرف عبادت گاہیں ہی نہیں۔ بلکہ جناب باری کی عظمت و جبروت کے مجسمے ہیں، ان کے محاسن کا احاطہ کرنا انسان کے بس کی بات نہیں ہے۔

تاج محل ایک ایسی عمارت ہے جس کی تفصیلات بیان کرنے کے خیال سے مجھے اپنی ہمیدانی کا احساس ہونے لگتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس عمارت میں اس قدر خوبیاں مجتمع ہیں اور اس کا اسلوب تعمیر تکمیل کے اس درجے کو پہونچ گیا ہے کہ دیکھنے والے اس کو دیکھ کر انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں۔ بلاشبہ ساری دنیا اس کی نظیر پیش نہیں کرسکی، یہ وہ لاجواب عمارت ہے جو ہر عالم و عامی کو مسحور کر دیتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ لوگ جو اس بات کے قائل نہیں کہ اینٹوں اور پتھروں کا

مجموعہ انسان کے دل پر اثر انداز ہو سکتا ہے۔ اس سے غیر معمولی طور پر متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ میں بلا خوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ ہر وہ شخص جس نے تاج محل کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا، اس کا صحیح تصور ہی نہیں کر سکتا۔

تاج محل کا خوبصورت دروازہ اس کا چوطرفہ خوش نما باغ اور مرمریں فوارے بہشتی نہریں جن کے کناروں پر صنوبر کے خوش قامت درخت، اس کا نہایت بلند چبوترہ جس کے چاروں گوشوں پر نہایت خوبصورت اور نازک مرمریں مینارہیں۔ اس کا شفاف مرمر۔ اس کی نظر فریب منبت کاری کاغذی مرمریں جالیاں اور پھر ان سب سے زیادہ متناسب اور مکمل برج جسے حسن کا ابھار کہنا چاہیئے ایسی چیزیں ہیں جو حسن کاری کی تاریخ میں صرف ایک بار تاج کی صورت میں مجتمع ہو سکی ہیں۔

میرے نزدیک اس عمارت کا کامیاب سے کامیاب فوٹو گرافر بھی ایک بے جان خاکے کی حیثیت رکھتا ہے، اگر آپ نے اس کی صاف و شفاف سطح سے آبی بخارات کو فضا میں ضو فشاں ہوتے نہیں دیکھا۔ اگر آپ نے غروب آفتاب کے وقت اس کے مرمریں رخساروں کو عنبریں رنگ کا غازہ چڑھتے نہیں دیکھا۔ اگر آپ نے اس کی نرم نرم اور گوری گوری پیشانی کو نورین کر فضائے بسیط میں تحلیل ہوتے نہیں دیکھا تو یقین جانیئے آپ نے دنیا میں کچھ بھی نہیں دیکھا۔

اب ہمیں اس زمانے کی طرف لوٹنا چاہیئے جسے تعمیرات کی تاریخ میں تباہی و بربادی کا زمانہ کہتے ہیں۔ تعجب کی بات ہے کہ پرانی دلی نے ایک طرف مغل طرز تعمیر کا ایک عمدہ ترین نمونہ ہمایوں کے مقبرے کی صورت میں دیکھا اور اس کے مقابلے میں صفدر جنگ کے مقبرے کی پست تعمیر سے اپنی شان کو بٹا لگایا۔ یہ مقبرہ مغل طرز تعمیر کی تباہی و بربادی کی ایک دل گداز مثال ہے، اس وقت کہنے کو سلطنت مغلیہ قائم تھی لیکن اس سلطنت کی بنیادیں گذشتہ سو سال کے عرصے میں کھوکھلی ہو چکی تھیں۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اورنگ زیب کو جو شاہجہان کے بعد سلطنت مغلیہ کا وارث ہوا سلطنت کے اندوہ ناک انجام کا احساس ہو چکا تھا، پھر بھی اس نے اپنی تمام توتوں کو سلطنت میں

نئی روح پھونک دینے پر صرف کیا۔ بہرکیف اس نے کوئی عمارت نہیں بنوائی۔ اور اگر بنوائی بھی تو ایک مسجد یا قلعہ وہ بھی ضرورت پوری کرنے کے لئے۔ اورنگ زیب کے بعد تو گویا سلطنت کا شیرازہ ہی بکھر گیا ۱۷۵۴ء میں نواب شجاع الدولہ نے صفدر جنگ کا مقبرہ تعمیر کرایا۔ شجاع الدولہ مرزا مقیم ابو منصور خاں صفدر جنگ کا بیٹا تھا اور صفدر جنگ سعادت خاں برہان الملک صوبہ دار اودھ کا بھتیجا اور داماد تھا۔ برہان الملک کے انتقال کے بعد محمد شاہ رنگیلے نے صفدر جنگ کو برہان الملک کا جانشین مقرر کیا تھا۔ احمد شاہ ابدالی کے حملے کے بعد طوائف الملوکی پھیلی۔ اس کے کسی قدر دب جانے کے بعد احمد شاہ نے صفدر جنگ کو وزیر اعظم کے عہدے پر سرفراز کیا لیکن دربار کی سازشوں نے اسے مجبور کیا کہ وہ اس عہدے سے مستعفی ہو کر اودھ چلا جائے چنانچہ وہ ستمبر ۱۷۵۴ء میں فیض آباد کے مقام پر انتقال کر گیا۔ وہاں سے اس کی نعش دہلی لائی گئی اور اس مقبرے میں دفن کی گئی جو آج تک اسی کے نام سے موسوم ہے، یہ مقبرہ ایک وسیع باغ کے وسط میں بنایا گیا ہے، باغ کے چاروں طرف ایک پختہ دیوار ہے۔ اور دیوار کے اندرونی جانب ہمایوں کے مقبرے کی طرح محراب دار بارہ دریاں بنی ہوئی ہیں، مقبرے میں داخل ہونے کا صرف ایک دروازہ ہے، اس میں متعدد حجرے اور دالان ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ چاروں بارہ دریاں اور یہ حجرے بطور جماعت کے کمروں کے استعمال ہوتے تھے، دلی والے اس عمارت کو منصور کا مدرسہ کہتے ہیں اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ عمارت بطور مدرسہ ضرور استعمال ہوتی رہی ہے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ عمارت مہمان خانہ تھی لیکن اس کا کوئی عمدہ ثبوت موجود نہیں۔ مسٹر بیچ لکھتے ہیں کہ یہ عمارت ہرگز مہمان خانہ نہ تھی۔

عمارت مذکور کی تعمیر ہمایوں کے مقبرہ کے ڈھنگ پر ہوئی ہے لیکن دونوں عمارتوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے، مثال کے طور پر سنگ مرمر ہی کو لے لیجئے۔ مدرسۂ منصور میں سنگ مرمر نہایت معمولی قسم کا استعمال ہوا ہے۔ نیز برجوں پر جو پتھر نصب کئے گئے ہیں ان سے بھی بے قاعدگی اور بے ڈھنگا پن ظاہر ہوتا ہے۔ اس عمارت کو دیکھ کر ہم بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ دہلی کی مغلیہ عمارات

کی مثال ایک چراغ کی ہے جو آخری مرتبہ اس عمارت میں ٹمٹمایا اور گل ہو گیا۔

مختصر یہ کہ یہ عمارت ان تمام معائب اور اسقام کا آئینہ ہے جو فن تعمیر میں مغل سلطنت کے انحطاط کے ساتھ ساتھ پیدا ہوتے چلے گئے تھے۔ اس عمارت میں اول تو آرائش بہت ہی خفیف ہے اور جس قدر ہے بھی اس میں بھی زیادہ تر نمود اور ظاہر پرستی کا عنصر بھرا ہوا ہے۔ گویا اس عمارت میں اس وقار اور تمکنت کی بھی کمی ہے جو اس سے پہلے کی بنی ہوئی عمارات میں نمایاں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس عمارت میں اس ناقص اصول پر عمل کیا گیا ہے۔ جسے تعمیری آرائش کہتے ہیں اور اس زریں اصول کو نظر انداز کر دیا گیا ہے جسے آرائش تعمیر کہا جاتا ہے۔ بہر حال یہ عمارت مغل عمارات کے اس سلسلے کی آخری کڑی ہے جو ہمیں یہ کہنے پر مجبور کرتی ہے ؎

آثار پدید است صنادید عجم را

جماعت کے کمرے کا جذباتی ماحول

فضل احمد

ہر مدرس اس بات کا قائل ہے کہ موثر تدریس کے لیے تھوڑا بہت سازوسامان اشد ضروری ہے۔ مثلاً طالب علموں کے بیٹھنے کے لیے نہ صرف صاف ستھری جگہ چاہیئے۔ بلکہ کچھ ڈیسک۔ بنچ یا ٹاٹ بھی۔ اسی طرح تختۂ سیاہ اور اس قسم کی چند دوسری تعلیمی امدادوں کا ہونا بھی ضروری ہے۔ طالب علم کے پاس کتابیں موجود ہوں اور وہ پڑھنے اور سیکھنے کے لیے خاصی حد تک آمادہ ہو تو بھی ان ضروری مادی سہولتوں کے بغیر تدریس اپنا پورا اثر نہ دکھا سکے گی۔

ہم جانتے ہیں کہ سیکھنا اور سکھانا خالص ذہنی عمل ہیں۔ انسانی ذہن اپنے گردوپیش کے مادی ماحول سے بہت کچھ متاثر ہوتا ہے۔ اسی لیے ہم ضروری مادی سہولتوں کی فراہمی پر زور دیتے ہیں۔ مگر کیا اکیلی مادی سہولتیں موزوں ذہنی فضا پیدا کر سکتی ہیں؟ اس سوال کا جواب صریح نفی میں ہوگا۔ کیونکہ کمرۂ جماعت کی ذہنی فضا کا ایک بہت ضروری جزو اس کی جذباتی فضا ہے، جب تک کوئی تدریسی عمل مناسب جذباتی ماحول میں انجام نہیں پاتا۔ مادی سازوسامان اکیلے کچھ کام نہیں دیتے۔ استاد کے لیے اس نکتہ کو اچھی طرح سمجھنا بے حد اہم ہے، کیونکہ تحکم پسند نظریۂ ضبط نے اسے لگاتار نظر انداز کیے رکھا ہے۔ آج بھی ایسے استادوں کی کمی نہیں جو بڑے فخر سے یہ دعویٰ کرتے سنے جائیں گے کہ ان کا ضبط اس حد تک مکمل ہے کہ کمرۂ جماعت میں سوئی گرے تو اس کی آواز بھی سنی جائے۔

حال ہی میں ایک دوست نے اس قسم کا دلچسپ واقعہ سنایا۔ ایک ڈسٹرکٹ انسپکٹر صاحب معائنہ فرما رہے تھے، دسویں جماعت کی انگریزی دیکھتے وقت دفعتہً ٹوک تعلّی چھیڑی تو استاد سے فرمانے لگے۔ بھئی آپ کے کمرے میں ہم چاہت سی سنائی دے رہی ہے، ہم دسویں جماعت کا انگریزی

پڑھایا کرتے تھے تو طلبہ پر ایسا سناٹا چھایا ہوتا تھا جیسے انھیں سانپ سونگھ گیا ہو۔ بہتر ہوتا اگر "یا ہر تعلیم" لگے ہاتھوں یہ صراحت بھی کر دیتے کہ سانپ وہ خود ہی تھے، کیوں کہ ان کی موجودگی جو سکوت مرگ پیدا کرتی تھی وہ ان کی جادو بیانی کی پیداوار قطعاً نہ تھا۔ ایسا سکوت صرف دیوانہ وار چیخ و پکار، گرج کڑک، گالی گلوچ، رکیک تمسخر، ڈنڈے بازی اور جرمانے سے ہی پیدا کیا جا سکتا ہے۔

اس وضع کے بزرگوار اپنی پُر تاثیر تدریس کے ثبوت میں امتحانی نتائج کا سہارا ڈھونڈا کرتے ہیں، یہ ماننا پڑے گا کہ ڈر اور خوف وقتی طور پر دل و دماغ پر کچھ بوجھ لادنے میں خوب کامیاب ہو جاتے ہیں اور یہ شعبدہ بے خبر عوام کو دھوکہ دینے کے لئے کافی ہے۔ ایسے استادوں کی نیک نیتی پر شبہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں، لیکن ان کی بے بصارتی حد درجہ قابل افسوس ہے، کیوں کہ سطحی اور عارضی نتائج کے لئے وہ جو قیمت ادا کرتے ہیں وہ بہت بڑی ہے۔ طالب علم کے دل میں مدرسے، استاد اور بعض اوقات تعلیم کے لئے تنفر پیدا ہو جاتا ہے جو مدت العمر باقی رہتا ہے۔ بمصداق ع

اے بدمعاملہ ہمہ ہیچ ہے خری

کوئی دو سال کی بات ہے کہ قلیل المیعاد تدریسی شق کے سلسلے میں مجھے لاہور کے ایک ثانوی مدرسے میں جانا پڑا۔ ایک دن مدرسے میں ہیجان پھیل گیا۔ جب ایک طالب علم سرپرست مدرسے میں آیا۔ ایک استاد کو کمرے سے باہر بلایا اور چھوٹتے ہی اس کے منہ پر ایک زور کا تھپڑ رسید کیا۔ وجہ یہ تھی کہ استاد صاحب نے اس کے لڑکے کو پیٹا تھا۔ اسی طرح ایک اور واقعہ بھی مجھے یاد ہے۔ ایک ثانوی مدرسے نے سالانہ ترقی کا نتیجہ سنایا تو نویں جماعت کے بہت سے طالب علم ناکام تھے۔ کسی طرح انھیں یہ یقین ہو گیا کہ یہ ناکامی ریاضی میں رہ جانے کی وجہ سے ہے۔ ریاضی کے معلم مدرسے سے نکلنے لگے تو دروازے میں ہی گھیر لئے گئے اور دو چار گھونسے کھا کر دوبارہ مدرسے کی محفوظ حدود میں داخل ہو سکے۔ اس کے بعد مسلسل کئی دنوں تک وہ ایک "حفاظتی دستے" کی چھاؤں میں مدرسے آتے جاتے رہے۔

کمرۂ جماعت میں بنیادی تناؤ جب اس حد کو پہونچ جائے تو پڑھنے اور سیکھنے کا کام

ڈھونگ کے سوا کچھ باقی نہیں رہتا سچی تدریس کے لئے جذباتی سکون ایک ضروری شرط ہے جہاں جذباتی فضا میں کھچاؤ پیدا ہوا صحت مند تعلیم کا امکان جاتا رہا جذباتی ماحول کی یہ حد سے بڑھی ہوئی اہمیت جدید نفسیاتی تحقیقات نے اس طرح واضح طور پر ثابت کر دی ہے کہ کسی استاد کے لئے اس کا نظر انداز کرنا خود اپنے آپ کو دھوکہ دینا ہوگا۔

جذبات کیا ہیں؟ اس جگہ علم النفسیات کی باریکیوں میں جانا مقصود نہیں بلکہ صرف یہ جتلانا مقصود ہے کہ جذبات کے بارے میں استاد کو کم از کم کن باتوں کا جاننا ضروری ہے، غالباً یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ جذبہ اس ذہنی کیفیت کا نام ہے جس میں ہیجان و خلجان کے عناصر موجود ہوں، یہ ذہنی تلاطم اس وقت بھی پیدا ہوگا جب کوئی رکاوٹ کسی پسندیدہ عمل کا راستہ روکے اور اس وقت بھی جب اس رکاوٹ پر قابو پالیا جائے، لیکن ان دونوں کیفیتوں کی نوعیت میں فرق ہے پہلی کیفیت رنج اور غصہ کی ہے، دوسری جوش مسرت کی، ان دونوں جذبات کی کمیت بھی ایک سی نہیں رہتی۔ بلکہ اسباب کی مناسبت سے کم و بیش ہوسکتی ہے اور ہوتی ہے۔

اس تجزیہ سے ظاہر ہے کہ انسانی عمل کی کوئی شق جذبات کی چاشنی سے خالی نہیں، کیوں کہ عمل کا وجود ہی اس بات کی دلیل ہے کہ ذہنی کیفیت میں اس قدر ابھار تھا کہ وہ شخص عمل پر مائل ہوا، جب ہم جذبات پر بحث کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہ لینا چاہئے کہ کوئی کام جذبات کے بغیر بھی پورا ہوسکتا ہو۔ بحث صرف جذبات کی تیزی اور تندی سے ہوتی ہے۔

جذبات کا بھڑکنا جس قوت کو پیدا کرتا ہے اس سے طرح طرح کے کام لئے جاسکتے ہیں مثلاً اس سے ایک کام یہ لیا جاسکتا ہے کہ کوشش کی رفتار تیز ہو جائے تاکہ راستہ روکنے والی رکاوٹ کو پاش پاش کیا جاسکے، دوسری صورت یہ ہوسکتی ہے کہ یہ قوت بے سبب سدِّ راہ کے ساتھ اس بدسلیقگی سے ٹکرائے کہ خود ہی تھک ہار کر ختم ہو جائے۔ تیسری صورت یہ ہے کہ رکاوٹ سے بددل ہو کر یہ اپنا رخ بدل لے اور دوسری چیزوں کو اپنے ریلے میں لے لے، چوتھی صورت یہ ہے کہ یہ منبع کی طرف لوٹ آئے اور ناکام تمناؤں کو احساس کمتری اور احساس گناہ کا شکار کر کے رکھ دے۔

جذباتی کیفیتیں تقلید کے ذریعے بڑی آسانی سے دوسروں تک پہونچ سکتی ہیں۔ مثلاً ایک بچہ اگر کسی بڑے کو ڈرا ہوا پاتا ہے تو وجہ سمجھے بغیر وہ بھی اس کی ظاہری شکل وصورت اختیار کر کے سہم جاتا ہے۔ اسی طرح اگر وہ آس پاس کے لوگوں کو ہنسی مذاق میں قہقہے لگاتا سنتا ہے تو وجہ سمجھے بغیر وہ بھی اس خوشی میں شریک ہو جاتا ہے۔ ان دونوں حالتوں میں بچے کا ڈر یا اس کی خوشی بالغوں سے کسی طرح مختلف نہیں ہوتی۔ لیکن اس جذباتی کیفیت کا فوری سبب محض تقلید ہے اور بس۔ یہ ایک عام مشاہدہ ہے کہ چھوٹے بچے جب کوئی سنسنی خیز فلم دیکھتے ہیں تو ان پر وہی جذبات طاری ہو جاتے ہیں جن کی پردہ پر تصویر کشی کی گئی ہوتی ہے۔

رنج وغم کے جذبات کے ساتھ بدنی تناؤ بھی پیدا ہوتا ہے۔ جب جذباتی کھچاؤ زیادہ بڑھ جائے تو اس کے ساتھ کچھ بدنی تبدیلیاں ظاہر ہوتی ہیں جو صاف طور پر ذہنی تلاطم کا پتہ دیتی ہیں۔ استاد کو ان ظاہری علامتوں سے اچھی طرح آگاہ ہونا چاہیے۔ یہ تبدیلیاں عموماً اس قسم کی ہوتی ہیں: (۱) دل کی دھڑکن کا بڑھ جانا۔ (۲) چہرے کا زرد یا سرخ ہو جانا (۳) لعاب دہن کا خشک ہو جانا اور بعض دوسرے اندرونی افعال کا رک جانا۔ اعصاب کا سست پڑ جانا یا غیر معمولی طور پر مستعد ہو جانا۔ بچے کے منہ کا خشک ہو جانا اور بعض دوسرے اندرونی افعال کا رک جانا (۴) اعصاب کا سست پڑ جانا۔ اس کا کانپنا۔ چہرے کے رنگ کا تیزی سے بدلنا۔ ہانپنا، اٹک اٹک کر بولنا اور تھکا ہوا دکھائی دینا یہ سب علامتیں اس بات کی دلیل ہیں کہ بچے کو گھر یا جماعت میں مناسب جذباتی ماحول نہیں ملا۔

بعض اوقات بدعملی کے غیر تسلی بخش نتائج جذباتی ہیجانوں کی پیداوار ہوتے ہیں۔ لیکن والدین یا استاد یہ خیال کرنے لگتے ہیں کہ بچہ نالائق ہے۔ نفسیاتی تجربہ گاہوں کو بہت سے ایسے بچوں سے سابقہ پڑا ہے جن کے متعلق استادوں نے یہ فتویٰ دے رکھا تھا کہ وہ ناقص العقل ہیں۔ اگرچہ استادوں کی یہ رائے پوری نیک نیتی کے ساتھ قائم کی گئی تھی لیکن جب نفسیاتی علاج گاہوں نے ان بچوں کے لئے سازگار جذباتی فضا مہیا کر دی تو ان میں اکثر غیر معمولی ذہانت کے بچے ثابت ہوئے۔ ایسی صورتوں میں یہ بات یقینی ہے کہ جن استادوں سے ان بچوں کو سابقہ پڑا تھا، وہ خود

جذباتی طور پر غیر متوازن تھے۔ یہ بچے دراصل استادوں کے جذباتی عدم توازن کا شکار تھے۔ جب یہ مسموم جذباتی فضا ختم ہو گئی بچوں کی ذہنی صحت از خود بحال ہو گئی۔ مجھے ذاتی طور پر ایک ایسے طالب علم کا واقعہ معلوم ہے۔ اس کا باپ ریلوے میں ملازم تھا اور عموماً گھر سے باہر رہتا تھا۔ دسویں جماعت میں ترقی پاتے ہی باپ کا تبادلہ ہو گیا۔ اور لڑکے کو مدرسہ بدلنا پڑا۔ لڑکا طبعاً غیر معمولی طور پر حساس تھا۔ نئے کمرۂ جماعت کا جذباتی ماحول عجیب قسم کا تھا۔ صدر معلم خود انگریزی پڑھاتے تھے اور انہیں صد فی صد نتائج دکھانے کا چسکا پڑا ہوا تھا۔ اس دھن میں جماعت کا کمرہ اکثر معرکہ کارزار کا نقشہ پیش کرتا تھا۔ جہاں چند درجن مجبور و بے بس اسیران بلا پر ایک بہت بڑے دہانے کی لسانی توپ دن کے بیشتر حصے میں پوری شدت اور تیزی کے ساتھ گولہ باری کرتی رہتی۔ گالی گلوچ اور طعن و تشنیع کی گھناؤنی فضا اس لڑکے کو راس نہ آئی۔ جذباتی تناؤ کا یہ بوجھ اس کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ کیوں کہ وہ اس کا عادی نہ تھا۔ اس کا ردّعمل بہت شدید صورت میں ظاہر ہوا۔ طالب علم کچھ دنوں بعد مدرسے سے بھاگ گیا اور جب گھر سے باز پرس ہوئی تو گھر سے بھی بھاگ نکلا اور مہینوں تک جگہ جگہ کی خاک چھانتا پھرا۔ آخر وہ اس یقین دہانی پر واپس گھر آیا کہ اسے مدرسے نہیں بھیجا جائے گا۔ اس سے اگلے ہی سال اس نے خود گھر پر تیاری کر کے امتحان دیا اور بڑے امتیاز کے ساتھ درجہ اول میں کامیاب ہوا۔ اس کی شاندار کامیابی صدر معلم کے لئے ایک بہت بڑا اچنبھا تھا کیوں کہ اس کی رائے میں وہ نچلے درجے کا نالائق اور آوارہ لڑکا تھا۔

استاد کی ذمّہ داری

جذباتی ماحول سیکھنے اور پڑھنے کے کام پر جس حد تک اثر انداز ہوتا ہے اس کی وضاحت اوپر گذر چکی ہے۔ اب قدرتی طور پر اگلا سوال یہ ہو گا کہ موزوں جذباتی ماحول کے عناصر کیا ہیں اور ان عناصر کو مناسب مقدار میں فراہم کرنا کس کا کام ہے۔

جذباتی ماحول کے تمام اجزا کا جائزہ لینا ایک مشکل کام ہو گا۔ یہاں صرف اس کے زیادہ اہم عناصر کو دیکھا جائے گا۔ اہمیت کے لحاظ سے پہلا مقام استاد اور طالب علم کی شخصیتوں کی خصوصیات کو حاصل ہو گا۔ اس کے بعد ان کی ذاتی کمیوں کا درجہ آئے گا۔ ازاں بعد طالب علم کے نسلی، معاشرتی اور معاشی پس منظر کو جگہ ملے گی، یہ وہ بڑے بڑے اسباب ہیں جو طالب علموں کے دلوں میں، ڈر، خوف، ضد، غصہ، بغض، مخالفت کے

جذبے بھڑکا سکتے ہیں، جہاں تک نسلی، معاشرتی اور معاشی پس منظر کا تعلق ہے، استاد اس کے متعلق براہِ راست بہت کچھ نہیں کر سکتا، اس میں حسبِ حال ترمیم و اصلاح کے لئے مدرسے کے ساتھ گھر کا پورا تعاون چاہئے البتہ کمرۂ جماعت میں جو نفسیاتی قوتیں باہم ٹکراتی اور اپنے امتزاج سے جذباتی ماحول پیدا کرتی ہیں ان میں استاد کی شخصیت کو غیر معمولی فوقیت حاصل ہے کیوں کہ یہی وہ قوت ہے جو دوسری قوتوں کا راستہ اور سمت متعین کرنے کا کام انجام دے گی، رہنمائی کی یہ ذمہ داری استاد کی ذمہ داری ہے۔

کمرۂ جماعت کے جذباتی ماحول کا بڑا دارو مدار اس بات پر ہوگا کہ استاد رہنمائی کا کام کس طور پر انجام دیتا ہے، کیا وہ اپنے آپ کو ایک ایسے آمرِ مطلق کا درجہ دیتا ہے جس کا ہر لفظ قانون ہو یا کیا اس کی ساری توجہ اس بات پر صرف ہو رہی ہے کہ جماعت میں ایک ایسی بے تکلف اجازت دہ فضا پیدا ہو کہ خود طالب علموں کے درمیان اور استاد و طلبہ کے درمیان آزادانہ بات چیت کرنے کے بارے میں کوئی پردہ باقی نہ رہے، پہلی صورت میں خاموشی اور بے عملی سے بھرپور ضبط پیدا ہوگا لیکن یہ خاموشی قدرتی جذبات کو ایک بہت بڑے بوجھ تلے دبا کر پیدا کی جائے گی، اور اس بوجھ کے اٹھتے ہی دبے ہوئے جذبات بے قابو شدت کے ساتھ مختلف سمتوں میں نکلیں گے، دوسری صورت میں جذبات کے قدرتی بہاؤ کے راستوں کو روکا نہیں جاتا، بلکہ اس یقین کے ماتحت کہ جذبات ہی عمل کو زندگی اور رونق بخشنے والی قوتیں ہیں، انھیں بلا روک ٹوک کام کرنے دیا جاتا ہے۔ یہ اجازت دہ ماحول بہت جلد بچوں کو ایک دوسرے کے جذبات کا پاس کرنا سکھا دیتا ہے، وہ دوسروں کے جذبات کو سمجھنے لگتے ہیں، اور یوں ان کے دلوں میں اپنے ساتھیوں کا احترام پیدا ہوتا ہے، جماعت کا کمرہ اب کوئی ایسی جگہ نہیں رہتی جہاں انھیں چار و ناچار ایک بھاری بوجھ تلے پسنا پڑے بلکہ اب یہ ایک ایسی مجلس میں تبدیل ہو جاتا ہے، جہاں بہت سے شفیق دوست ایک پختہ کار ہمدرد رہنما کے ساتھ مل بیٹھتے ہیں اور باہم مل کر زندگی کے دلچسپ سوالوں کے حل ڈھونڈتے ہیں۔ یہ طریق کار طالب علموں کے دلوں میں مدرسے سے محبت، استاد کے لئے دائمی احترام اور ذمہ داری سنبھالنے کی صلاحیت پیدا کرتا ہے۔ ان دونوں طریقوں میں سے کسی ایک کو اختیار کرنا استاد کا کام ہے، لیکن کسی ایک طریقہ کو دوسرے پر ترجیح دینے سے پہلے اسے چاہیے کہ اپنی پسند کے

دوران نتائج کو اچھی طرح سمجھ لے۔

ایک تجربہ شکاگو یونی ورسٹی (امریکہ) کے ایک تجرباتی مدرسہ میں طلبہ کے جذباتی ردّعمل کی توضیح کے لیئے دو ایسی جماعتوں کا مطالعہ کیا گیا جن میں سے ایک کی تکمیل کلی طور پر استاد کے ہاتھوں میں تھی اور دوسری کی رہ نمائی کا کام بیشتر طالب علموں کے اپنے ہاتھوں میں، دونوں صورتوں میں جذباتی ردّعمل کا اندازہ کرنے کے لیئے دل کی دھڑکن اور دوسری بدنی علامتوں پر بھروسہ کیا گیا، اس طرح جو نتائج حاصل ہوئے وہ فیصلہ کن تھے جس جماعت میں معاملات کی ساری باگ ڈور استاد کے ہاتھوں میں تھی وہاں طالب علموں کے تاثرات مندرجہ ذیل قسم کے تھے۔

(۱) استاد کے احکام بجالاتے وقت مجھے یوں محسوس ہوتا تھا گویا کسی بوجھ تلے دبا ہوں۔

(۲) مجھے یوں معلوم دیتا تھا کہ استاد صاحب مجھے بے تحاشا بھگائے جا رہے ہیں۔

(۳) مجھے استاد کی باتوں میں طنز کی بُو آتی تھی۔

اس کے برعکس جس جماعت کے معاملات خود طالب علموں کے ہاتھوں میں تھے وہاں طلبہ کا عام ردّعمل کچھ اس قسم کے جملوں کی صورت میں تھا۔

(۱) میں سمجھتا ہوں کہ میرے اندر اطمینان اور بھروسہ پیدا کرنے کے لیئے استاد صاحب نے ہر ممکن کوشش کی۔

(۲) جب استاد صاحب نے مجھے ہدایات دیں تو وہ مجھے بُری معلوم نہیں ہوئیں۔

(۳) یوں محسوس ہوتا تھا کہ استاد صاحب اس بات کا یقین کرنا چاہتے ہیں کہ میں بالکل مطمئن ہوں۔

ان نتائج پر تبصرہ کرتے ہوئے تجربہ کرنے والے صاحب لکھتے ہیں "تمام حالتوں میں اصولوں کا نام بتانے، ان کی تشریح کرنے اور دوسری واقفیت کو ذہن میں حاضر کرنے کے معاملے میں ذمّہ داری کا بوجھ خود اٹھانے والے طلبہ اپنے ان ساتھیوں کی نسبت زیادہ تاک تھے جن کی انتظامی باگ ڈور پوری طرح استاد کے ہاتھ میں تھی"

اسی طرح ایک اور جماعت کے کچھ طالب علموں کا لگاتار بہت دیر تک مطالعہ کیا جاتا رہا۔ ان میں سے

کچھ ایسے استاد سے پڑھتے تھے جو تحکم پسند تھا اور کچھ دوسرے استاد سے جو تعاون کا قائل تھا، آخر الذکر جماعت کے طالب علم نسبتاً زیادہ معقول اور وزنی دلائل اور مشورے پیش کرتے تھے، اسباق سے زیادہ لطف اٹھاتے تھے اور ایک دوسرے کے ساتھ زیادہ اچھے تعلقات رکھتے تھے۔

ایک ضروری انتباہ اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ استاد کو بالکل معطل ہو کر پس منظر میں دبک جانا چاہئے۔ اور طالب علموں کو ضوابط اور حدود رہنمائی سے بے نیاز ہو کر من مانی کارروائیاں کرنے کی کھلی چھٹی دے دینی چاہئے۔ ایسا کرنے سے لازمی طور پر عدم تحفظ اور غصے کے جذبات پیدا ہوں گے سرگرمی کو جذبہ ٹھنڈا پڑ جائے گا اور جماعتی حدود پگھلنے لگے گی۔ شدید قسم کے تحکم اور مکمل دست کشی کے بین بین رہنمائی اور ضبط کی کچھ ایسی تکنیکیں موجود ہیں جن کی مدد سے طالب علم اپنی منزل مقصود کا تعین کر سکتے ہیں آپس کے مراسم استوار کر سکتے ہیں خود گروہ کے اندر سے رہنمائی کا سامان مہیا کر سکتے ہیں۔ اور قابل قدر جماعتی کام کی وساطت سے ہر ایک کے لئے دلی اطمینان کا سامان مہیا کر سکتے ہیں

صحت مند جذباتی فضا کے لئے اگرچہ تحکم کی نسبت تعاون از حد کارگر ہے۔ لیکن اس سے یہ مطلب لینا درست نہیں کہ تعاون سے مراد استاد کی ممتاز حیثیت کو ختم کرنا ہے۔ استاد کو ہر حال میں رہنمائی کا کام کرنا ہے تحکم پسند سی کام کو ایسے بھونڈے طریقے سے کرتا ہے کہ کام کا اصلی مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔ اس کے مقابلے میں تعاون پسند استاد اسی کام کو ایسی ہوش مندی سے انجام دیتا ہے کہ اس کی محنت پائدار نتائج پیدا کرتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تحکم کی بجائے تعاون سے کام لینے کے لئے بہت زیادہ پختہ طبعی اور بالغ نظری کی ضرورت ہے۔ دن بھر استاد کو بیسیوں ایسے معاملات سلجھانا ہوتے ہیں۔ جن میں سے ہر ایک بجائے خود جذباتی توازن کو درہم برہم کرنے کے لئے کافی ہو سکتا ہے۔ مثلاً ایسے طرح طرح کے جھگڑوں۔ تیز مزاجی، ہنگامہ خیز بے بسی۔ چوری۔ بد دیانتی۔ سامان مدرسہ کی توڑ پھوڑ۔ تشدد پسند منڈلیوں۔ بدتمیزی مذاق۔ مار پیٹ اور اس طرح کی کئی اور پیچ در پیچ گتھیوں کو سلجھانا پڑے گا یہ تمام چیزیں اس کے متوازن مزاج کا کڑا امتحان لیں گی، اس لگاتار جذباتی اکساہٹ میں تعاون کے

راستہ پر چلنا جس قدر مشکل ہے، اسی قدر اس کے نتائج پاکیزہ ہیں، صرف یہی ایک طریقہ ہے جو کمرۂ جماعت میں صحت مند جذباتی فضا پیدا کرنے کا ضامن ہو سکتا ہے۔

اس بحث کی روشنی میں ہم دو ایسے عناصر کا نام لے سکتے ہیں جو صحت مند جذباتی فضا کے لئے از بس ضروری ہیں (۱) آزادی جس سے مراد وہ اجازت وہ ماحول ہے جو خیالات اور جذبات کو ہر طرح کے بوجھ سے آزاد کر دیتا ہے۔ اس کا قدرتی نتیجہ اظہار کی بے ساختگی ہے۔ ایسے ماحول میں ہر فرد کو اس کی خوبیوں اور کمیوں کے ساتھ پوری طرح قبول کیا جاتا ہے اس طرح ہر فرد اپنے آپ کو ماحول کا ایک ضروری جزو خیال کرنے لگتا ہے۔ اور کوئی ڈر، خوف یا تحکم، اس کے خیالات اور جذبات کے آزادانہ اظہار کا راستہ نہیں روکتا۔

(ب) ہم آہنگی جس سے مراد وہ نظم و ضبط ہے جو خوش اسلوبی سے مل جل کر رہنے کے لئے ضروری ہے، اجتماعی زندگی کی ہر شاخ میں سلامتی اور تحفظ کا یقین بنیاد کا درجہ رکھتا ہے، ہر چند کہ بچے آزاد فضا میں پنپتے ہیں۔ آزادی عمل کی آخری حدیں مقرر کئے بغیر یہ آزاد فضا بہت جلد اس طرح مسموم ہو جائے گی کہ اس میں رہنے والوں کا دم گھٹنے لگے گا۔ یہ بات متعدد تجربوں سے ثابت ہو چکی ہے کہ بچے ناپسندیدہ افعال کے لئے مواخذہ چاہتے ہیں، کیوں کہ مواخذہ کی موجودگی ہی اس بات کا قطعی یقین پیدا کرتی ہے کہ ان کی جائز آزادی عمل محفوظ ہے۔ جس ماحول میں پسندیدہ اور ناپسندیدہ کے درمیان کوئی تمیز نہیں وہ بہت جلد ننھی روحوں کے لئے ناقابل برداشت ہو جائے گا، یہ عام مشاہدہ ہے کہ چھوٹے بچے اس استاد کو سخت ناپسند کرتے ہیں جو اچھے کام پر شاباش کہتا اور نہ بُرے کام پر ٹوکتا ہے۔

آزادی اور ہم آہنگی کے درمیان توازن قائم رکھنا استاد کی ذمہ داری ہے۔ یہی ذمہ داری اسے رہنمائی کے فرائض سونپتی ہے۔ تحکم پسند استاد آزادی کو سرے سے ختم کر دیتا ہے۔ اور کم زور طبع ناتجربہ کار استاد آزادی کی دھن میں ہم آہنگی کا خاتمہ کر سکتا ہے، یہ دونوں راستے موزوں جذباتی ماحول کے منافی ہیں، ان دونوں کے بین بین صحت مند آزاد۔ ہم آہنگ فضا کا پیدا کرنا ایک اچھے

استاد کا کام ہے۔ یہ کام پختہ طبعی اور فنی مہارت کے بغیر کامیابی سے پورا نہیں کیا جا سکتا۔ استاد حقیقی معنوں میں ایک ذمہ دار رہنما ہے، ایسا رہنما جسے ایک خام طبیعت گروہ کے انسانی مراسم کو مضبوط صحت مند بنیادوں پر استوار کرنا ہے۔ اس فرض سے عہدہ برا ہونے کے لئے ضروری ہے کہ وہ خود متوازن طبع ہو، اس کے جذبات پختہ ہوں اور وہ انسانی ذہن کی کارفرمائیوں سے اچھی طرح باخبر ہو۔ یہ اوصاف ڈنڈے، بدزبانی اور رجز ماننے کے ہتھیاروں سے مسلح ہونے سے پیدا نہیں ہو سکتے۔ بلکہ وسیع عام فنی تربیت اور عملی تجربہ سے ہی حاصل کئے جا سکتے ہیں۔

ان سب باتوں کو نگاہ میں رکھتے ہوئے کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ تحکم پسندی کا خاتمہ کرتے ہی عملی تدریس میں استاد کی اہمیت کا خاتمہ ہو جاتا ہے؟ ایسا گمان وہی لوگ کر سکتے ہیں جو طریق تعاون اور ذہنی رہنمائی کی شرائط سے بے خبر ہوں۔ سچ یہ ہے کہ طریق تعاون استاد کے کام کو پہلے سے زیادہ کٹھن بناتا اور اسی نسبت سے اس کی اہمیت میں اضافہ کرتا ہے۔ یہ طریق استاد کے کام کو ایسی بلندی بخشتا ہے جو روائتی طریق کے وہم و گمان میں بھی نہ آ سکتی تھی۔

دوسری شرائط | اگر استاد تخلیقی رہنمائی کے تصور سے اچھی طرح آگاہ ہے اور اس فن کی مختلف تکنیکوں میں دسترس رکھتا ہے تو گروہ جماعت میں مناسب جذباتی فضا پیدا کرنا چنداں مشکل کام نہیں۔ اب اس کے لئے اگلا قدم طلبہ کی انفرادی شخصیتوں کا جائزہ لینا ہوگا۔ یہ کہا جا چکا ہے کہ جذبات کو بیدار کئے بغیر کوئی عمل جوش و خروش سے انجام نہیں دیا جا سکتا۔ آزادی اور ہم آہنگی کے مناسب امتزاج کے بعد اب استاد کو یہ دیکھنا ہے کہ ہر طالب علم میں مناسب حد تک جوش و خروش پیدا کرنے کے لئے کیا کرنا چاہئے۔ جذبات میں سرگرمی پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ عمل کے راستے میں کوئی رکاوٹ حائل ہو۔ یہ رکاوٹ قوت عمل کے لئے تازیانہ کا کام کرے گی اور کوشش کے قدم کو تیز تر کر دے گی۔ لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ رکاوٹ اس قدر سخت اور بھیانک دکھائی دے کہ کوشش کرنے والا جی ہار کر بیٹھ جائے اور بددلی اور ناامیدی کا شکار ہو جائے۔ راستے کی مشکلات اور رکاوٹوں کو مناسب حد کے اندر رکھنا استاد کا کام ہے۔

اس معاملے میں بڑی مشکل یہ ہے کہ جو رکاوٹ ایک بچے کے لئے ناقابل عبور دیوار کا درجہ رکھتی ہے وہ دوسرے کے لئے عین حسب حال اور تیسرے کے لئے ناکافی ہو سکتی ہے۔

اس مشکل کا حل انفرادی مزاجوں کا تجزیہ ہے۔ موزوں جذباتی فضا میں بچے کام پر آمادہ ہوں گے لیکن کوشش جاری رکھنے کے لئے لازم ہو گا کہ تدریس کا راستہ تدریجی مشکلات پر مشتمل ہو تاکہ تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد کامیابی کا احساس حوصلوں کو بلند کرتا رہے اور نئی دشواریاں جذبہ عمل کو لگاتار ابھارتی رہیں۔ چونکہ ہر طالب علم کی مزاجی ساخت جداگانہ ہوگی اس لئے ہر ایک کی سہولت اور دشواری کا معیار بھی الگ ہوگا۔ ان حالات میں کوئی شخص ہر ایک کے لئے دشواری کا ایک سا معیار مقرر نہیں کر سکتا اس کام میں تجربہ کا طریق ہی مدد کر سکتا ہے۔ جب تک دشواری کی نوعیت ایسی ہے کہ اس پر قابو پانے کی کوشش طبیعت میں جوش اور انبساط پیدا کرتی ہے، اس وقت تک وہ دشواری عین حسب حال ہے لیکن جب معاملہ اس کے برعکس ہو تو دشواری غیر ضروری طور پر حوصلہ فرسا ہے اور اس کو سہل تر بنانا ضروری۔

اس ضمن میں ایک قابل لحاظ احتیاط یہ ہے کہ استاد کو کام کی حد سے بڑھی ہوئی دشواری اور طالب علم کی تساہل پسندی کے درمیان اچھی طرح فرق کرنا چاہیے۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ استاد بچے کو بے توجہی کا مجرم ٹھہراتا یا اسے لا علاج طور پر کند ذہن گردانتا ہے۔ لیکن یہ دونوں باتیں غلط ہوتی ہیں۔ جو چیز طالب علم کو کامیابی سے روکتی ہے، وہ کام کی حوصلہ فرسا دشواری ہوتی ہے اس بارے میں یہ دلیل بالکل لغو ہے کہ کام خود استاد کے نقطۂ نگاہ سے آسان ہے، یا بہت سے دوسرے طالب علموں کے لئے چنداں مشکل نہیں۔ کام کی دشواری یا سہولت ہر فرد کا اپنا الگ مسئلہ ہے۔ اگر کمرۂ جماعت کی جذباتی فضا سازگار ہے اور اس کے باوجود ایک طالب علم کچھ نہیں سیکھتا تو اس کی وجہ غالباً یہی ہے کہ کام یا تو اس کے لئے ضرورت سے زیادہ سہل ہے یا ضرورت سے زیادہ مشکل۔

عمل تدریس کے لئے اس اصول کی کارفرمائیاں بہت دلچسپ اور سبق آموز ہیں۔ ہمارے یہاں میٹرک میں کامیابی کے لئے بعض مضامین میں پاس ہونا لازمی ہے یعنی ان کے بارے

ب کی کوئی گنجائش نہیں۔ ایسے طالب علموں کی کمی نہیں جو ان لازمی مضامین میں سے کسی ایک
د میں کمزور ہونے کے باعث کئی کئی بار ناکام ہوتے ہیں۔ ایسے طالب علموں کے متعلق عموماً یہ
ں کر لیا جاتا ہے کہ ان کا ذہن ان مضامین میں کام نہیں کرتا۔ یہ مفروضہ سراسر بے بنیاد ہے۔ ایسی
لتوں میں ہمیشہ ہوتا یہ ہے کہ مضمون کو طالب علم کے سامنے کبھی موزوں صورت میں پیش ہی نہیں
گیا۔ اگر دسویں جماعت میں بھی ایسے طالب علموں کو پہلے متعلقہ مضامین کے بنیادی اجزا سے آگاہ
یا جائے اور بعد میں مشکل تر مسائل سے بحث کی جائے تو یہی کام ان کے لئے آسان اور دلچسپ
ن جائے۔ اس سلسلے میں اس مضحکہ خیز مفروضے کا ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا جو یار لوگوں
مسلمانوں کی حساب میں عدم صلاحیت کے متعلق بڑی شد و مد سے قائم کر رکھا تھا۔ تجزیہ کرنے پر
ں کی تہ پر بھی اس کے سوا اور کوئی حقیقت نہ تھی کہ تقسیم ملک سے پہلے ہمارے مدرسوں میں
ساب پڑھانے والے اساتذہ کی بہت بھاری اکثریت غیر مسلموں پر مشتمل تھی۔ ان لوگوں نے اپنی مصلحتوں
کے پیش نظر ایک ایسا بے سر و پا شوشہ چھوڑا اور اسے اس قدر شہرت دی کہ وہ کمرۂ حساب کی ذہنی
فضا کا لازمی جزو بن گیا اور مسلمان طلبہ کو غیر محسوس طور پر متاثر کرنے لگا۔

سلامتی کا راستہ تدریس اور جذباتی فضا کے تعلق پر بحث کرنے کے بعد ہم اب اس قابل ہیں کہ
تعلیم و تعلم کے لئے سلامتی کے راستے کا تعین کر سکیں۔ زندگی کے دوسرے امور
کی طرح یہاں بھی "خیر الامور اوسطہا" کے مصداق اعتدال اور میانہ روی کا راستہ ہی
سلامتی کا راستہ ہے۔ زندگی کی طرح تعلیم کے لئے نظم و ضبط ایک بنیادی قدر ہے۔ اس قدر کو ہم نے
ہم آہنگی کا نام دیا ہے۔ کچھ فہم اور کوتاہ اندیش استاد ڈنڈے کے خوف سے ہم آہنگی ٹھونسنا
چاہتے ہیں۔ بظاہر وہ اپنے مقصد میں کامیاب دکھائی دیتے ہیں، لیکن ہم آہنگی کی دھن میں
وہ تعلیم کے اصل مقصد کو کھو بیٹھتے ہیں۔ تعلیم کی حقیقی منزل بالیدگی اور مزید بالیدگی ہے....
تحکم پسندی کی سختی طبیعتوں میں اکثر اوقات علم کے خلاف ایسا تنفر پیدا کر دیتی ہے کہ تعلیم
یافتہ یا سابق طالب علم مدرسے اور تعلیم کے نام سے بیزار دکھائی دیتے ہیں۔ انھیں اپنے سابقہ

استادوں سے ایک کدسی ہو جاتی ہے، تعلیم کی یہ بہت بڑی ناکامی ہے۔ انتہا کی یہ ایک صورت تھی۔ اس کی دوسری صورت یہ ہے کہ ترقی پسندی اور جدت طرازی کے شوق میں طالب علموں کے سامنے بالکل ہتھیار ڈال دیئے جائیں اور ان کی ہر جائز و ناجائز خواہش کی تابعت ہو۔ یہ طرز عمل بھی ذہنی صحت کے لیے ایسا ہی نقصان دہ ہے جس طرح تحکم پسندی۔ حال ہی میں ایک اچھے گھرانے کا انگلستانی بچہ ایک نفسیاتی صحت گاہ کے حوالے کیا گیا، ماں باپ اس کی کج مزاجی سے عاجز آچکے تھے، وہ کسی کو خاطر میں نہ لاتا تھا اور جو کچھ گزرتا پیدا کر کے رہتا تھا صحت گاہ میں آئے اسے ابھی چند روز ہوئے تھے کہ ایک صبح قریب کی ایک سڑک پر بچوں کی ایک جماعت سے اس کی مڈبھیڑ ہو گئی، بے جا شوخی پر جب اینٹ کا جواب پتھر سے ملنے لگا تو اس نے بھاگ کر صحت گاہ کی چاردیواری میں پناہ لینا چاہی اور حریفوں نے پیچھا کیا۔ حسن اتفاق سے صحت گاہ کے ایک رکن عین اس وقت ادھر آنکلے، انھوں نے پیچھا کرنے والوں کو سختی سے ڈانٹا جس پر وہ بھاگ گئے۔

یہ واقعہ اس بچے کی زندگی میں ایک انقلابی موڑ ثابت ہوا۔ اس دن کے بعد صحت گاہ کا یہ رکن اس کی نگاہوں میں قوت اور پناہ کا ایک ایسا پیکر بن گیا جس کے دامن میں ہر بے انصافی کے خلاف پناہ ڈھونڈی جا سکتی تھی، اس بات نے اس کے دل میں سلامتی اور تحفظ کا ایک ایسا جیتا جاگتا احساس پیدا کر دیا جس نے اس کے بگڑے ہوئے جذباتی توازن کو درست کر کے اس کی ذہنی صحت بحال کر دی اور کچھ مہینوں بعد وہ ایک اچھا بھلا ذہین طالب علم بن گیا۔

اس بچے کی ذہنی بیماری کا سبب باپ کا بیجا لاڈ پیار تھا۔ اگرچہ باپ ایک وجیہہ و تنومند سابق بحری افسر تھا لیکن بیٹے کے دل میں اس نے پہلے دن سے اپنی مکمل بے بسی کا یقین پیدا کر دیا تھا۔ وہ اس سے کشتی لڑتا اور ہمیشہ بڑی آسانی سے پچھاڑا جاتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بچے کو گھر میں ایسا کوئی شخص دکھائی نہ دیتا تھا جس کی قوت اسے آڑے وقت میں بچا سکے، بہت کم بالغوں کو اس حقیقت کا علم ہے کہ بچے ایک فطری تقاضے کے ماتحت اپنے ماحول میں ایک قوی تر اور بالاتر ہستی کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ جو استاد ان کے اس فطری تقاضے کو پورا نہیں کرتا وہ ایک ایسی کوتاہی کرتا ہے جس کی تلافی

کسی اور طریق سے ممکن نہیں۔

ان دونوں انتہاؤں کے بیچ بیچ سلامتی اور صحت مندی کا راستہ ہے، ایک اچھا استاد محض ڈسہ اور رعب کی فضا پیدا کرنے کی کوئی کوشش نہیں کرے گا لیکن وہ اس بات کا سختی سے خیال رکھے گا کہ کوئی طالب علم کسی ایسی حرکت کا مرتکب نہ ہو جو اس کے کسی ساتھی یا ساری جماعت کے لئے تکلیف دہ ہو۔ ایسے طلبہ کے محاسبہ کا کام وہ مطلق العنانی سے انجام نہیں دیگا۔ بلکہ خود جماعت کے مقرر کردہ آئین و ضوابط کے ماتحت۔

غرض صحت مند جذباتی ماحول وہ ہے جہاں جذبات اور خیالات پر سے ہر قسم کے تحکمانہ دباؤ ختم ہو چکے ہوں۔ تاکہ جماعت کا ہر فرد اطمینان اور آزادی کے ساتھ اپنے پسندیدہ فطری رجحانوں اور دلی خیالوں کو ظاہر کر سکے، یہ اجازت وہ فضا افراد کی اندرونی قوتوں پر سے تمام پہرے اٹھا دے گی اور انھیں بڑھنے پھولنے کے لئے آزاد چھوڑ دے گی، صحت مند فطری رجحانوں کی یہ آزادی ماحول کو ایک عجیب حسن اور دلوں کو ایک نرالا کیف بخشا کرتی ہے، ہر فرد کو احساس ہونے لگتا ہے کہ اس کے سامنے مؤثر اور خوش و خرم زندگی کے بے شمار وسیع میدان کھل گئے ہیں۔ بالیدگی اور امید کا یہ ماحول روحوں میں بلندی اور فراخی پیدا کرتا ہے۔ اور قلب و نگاہ کو نئی قوتیں عطا کرتا ہے۔ اس پُرکیف جذباتی فضا کے پیدا کرنے والا سب سے اہم کردار یعنی استاد بالعموم پس منظر میں رہتا ہے لیکن ضرورت پڑنے پر وہ فوراً تصویر کے مرکز میں آن موجود ہوتا ہے اور اپنے متوازن اور منضبط عمل سے اس تصویر کے حسن کو بگڑنے سے بچاتا ہے۔

روسی نظامِ تعلیم

ادارہ

پچھلے چند مہینوں میں روسی اخبارات اپنے نظامِ تعلیم کی کوتاہیوں پر خوب بحث اور نکتہ چینی کرتے رہے ہیں۔ گذشتہ مہینے "پراودا" نے ایک مقالہ افتتاحیہ میں اس امر کی طرف توجہ دلائی تھی کہ سوویٹ یونین کی بعض جمہوری ریاستوں میں اور بعض رقبوں میں لازمی تعلیم کے پروگرام پر تسلی بخش طور پر عمل نہیں ہو رہا۔ اس نے کہا کہ بعض حالتوں میں مدرسہ کی عمر کے بچے بھاری تعداد میں سالوں تک مدرسوں سے باہر رہتے ہیں، بہت سے مدرسوں کی عمارتیں ایسے کاموں کے لئے استعمال ہو رہی ہیں جنھیں ان کے نام سے کچھ مناسبت نہیں، پڑھائی دو دو تین تین شفٹوں میں ہو رہی ہے۔ پراودا نے کہا کہ یہ عام تعلیم کا سات سالہ نصاب پورا نہیں ہو رہا اور کئی ریاستوں کے وزرائے تعلیم اس صورتِ حال پر پردہ ڈالنے کے مجرم ہیں۔

مدارس کی قسمیں روسی حکومت نے چند سالوں تک یہ جاننے کے لئے تعلیمی تجربے کئے تھے کہ اشتراکی فرد کی تخلیق کے بہترین وسائل کیا ہیں اور بالآخر ۱۹۴۳ء کے حکم کے مطابق سات سے سترہ برس کی عمر کے بچوں کے لئے ایک تعلیمی لائحہ عمل مقرر کر دیا گیا۔ اس کی رو سے تین قسم کے مدارس کا بندوبست کیا گیا ہے۔ پہلا چار سالہ ابتدائی مدرسہ ہے۔ اس میں چار جماعتیں ہیں اور سات سے گیارہ برس کے بچے یہاں پڑھتے ہیں۔ دوسرا سات سے چودہ برس کی عمر کے بچوں کے لئے سات سالہ مدرسہ ہے، یہ جزوی ثانوی تعلیم دیتا ہے۔ تیسرا مدرسہ سات سے سترہ برس کی عمر کے بچوں کے لئے دس سالہ تعلیمی نصاب پیش کرتا ہے اور ابتدائی اور مکمل ثانوی تعلیم پر مشتمل ہے۔

پچھلے اگست میں سپریم سوویٹ کو خطاب کرتے ہوئے سوویٹ وزیر مالیات مسٹر زوروف نے

ان کثیر مصارف کا ذکر کیا جو سویٹ یونین ثانوی تعلیم کے پروگرام کو پورا کرنے پر خرچ کر رہی ہے۔ یہ ثانوی تعلیم تمام روسی بچوں کو مہیا کرنا سویٹ حکومت کا نصب العین ہے۔ لیکن عملی طور پر ابھی یہ نصب العین بہت دور ہے اور جیسا پراودا نے کہا ہے، بہت سے بچوں کو ابھی بنیادی چار سالہ ابتدائی تعلیم بھی میسر نہیں۔

اٹھارہ اگست کی اشاعت میں پراودا نے لکھا کہ پچھلے سال ازبک اور ترکمان کی جمہوریتوں میں بہت سے بچے اور بالخصوص لڑکیاں بالکل مدرسوں میں نہیں گئے۔ پچھلی فروری میں جمہوریتا تاجیک کے ایک اخبار نے بیان کیا کہ ایک کارخانہ کے ۲۰۰ نوجوانوں میں سے ۵۰ نے ابتدائی تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔

باقی تمام باتوں کی طرح سویٹ یونین کے اعداد و شمار بھی پروپیگنڈے کے رنگ سے خالی نہیں ہوتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اکثر جمہوریتوں میں سات سالہ مدرسے موجود ہیں لیکن دس سالہ مدرسے زیادہ تر ماسکو، کیف، لینن گراڈ اور دوسرے بڑے شہروں میں ہی موجود ہیں۔ موجودہ پروگرام کے مطابق ایسے مدرسے ۱۹۶۰ء تک عام ہو جانے چاہئیں۔

سات سے گیارہ برس تک ابتدائی تعلیم کے نصاب میں یہ مضامین شامل ہیں:۔

پڑھائی۔ گرامر۔ علم ادب (روسی زبان) لکھائی حساب۔ تعلیم جسمانی، ڈرائنگ۔ چوتھے سال میں تاریخ، جغرافیہ اور علم الحیات کا بھی اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ پانچویں سال میں غیر ملکی زبانوں کا مطالعہ شروع ہو جاتا ہے۔ انگریزی، فرانسیسی، جرمن اور بعض حالتوں میں ہسپانوی زبان بھی پڑھائی جاتی ہے لیکن زیادہ مقبول انتخاب انگریزی ہی بیان کی جاتی ہے۔ علم الطبیعات پانچویں جماعت میں پڑھایا جاتا ہے۔ علم کیمیا چھٹی جماعت میں نفسیات نویں جماعت میں اور منطق اور علم النجوم دسویں یعنی میٹرک جماعت میں۔

ساٹھ فی صد نمبروں سے کامیابی

دس سال مدرسے میں گذارنے کے بعد میٹرک کا امتحان لازمی ہے۔ اس کا آغاز روسی زبان اور علم ادب کے امتحانوں سے

ہوتا ہے۔ بقیہ امتحان کو پورا کرنے کے لئے طالب علم کے لئے ضروری ہے کہ ان میں ۷۰ فی صد نمبر ملے
ہوا رکے زمانے کی طرح اب بھی طالب علموں کو کامیابی کے مطابق سونے چاندی کے تمغے دیئے جاتے ہیں
صنعتی ترقی کی مہم نے روسی حاکموں کو ٹیکنیکل تعلیم پر زور دینے کے لئے مجبور کر دیا ہے: تاکہ سرمایہ دار ملکوں کی صنعتی ترقی کی سطح کی ہم سری ہو سکے۔ بلکہ اس کے آگے قدم بڑھایا جائے۔ ٹیکنیکل مدرسے دو طرح کے ہیں۔ اول اعلیٰ ٹیکنیکل مدرسہ جس میں مخصوص قسم کی ثانوی تعلیم کا اہتمام موجود ہے اور دوسرا دیہ روبیبر اسکول۔ معلوم ہوتا ہے کہ پہلی قسم کے مدرسے میں زیادہ تر سات سالہ مدرسوں کے طالب علم داخل ہوتے ہیں اور دوسری قسم میں زیادہ تر ابتدائی مدرسوں کے۔

ٹیکنیکل مدرسوں میں جو مضامین پڑھائے جاتے ہیں، ان کا زیادہ تعلق کان کنی، انجینرنگ فن تعمیر، کیمیاوی صنعتوں وغیرہ سے ہوتا ہے، اس تعلیم میں کچھ عام واقفیت، فوجی اور بدنی تربیت اور قریب کے کارخانوں اور کھیتوں میں عملی تربیت شامل ہوتی ہے۔ ٹیکنیکل اسکول کے خاتمہ اور آخری امتحان میں کامیاب ہونے پر طالب علموں کو ڈپلوما ملتا ہے۔ اور وہ قانوناً اس بات پر مجبور ہوتے ہیں کہ کم از کم تین سال کے لئے اس کام کو انجام دیں جس پر انھیں لگایا جائے۔

ٹیکنیکل تربیت

لیبر ریزرو ٹیکنیکل مدرسوں میں طالب علموں کو سوویٹ ریلوں۔ کانوں، دھاتوں کے کارخانوں اور ایسے دوسرے کاموں کے لئے تربیت دی جاتی ہے۔ ان میں سے بہت سی صنعتیں خود اپنے صنعتی مدرسے چلاتی ہیں اور اپنی ضرورتوں کے مطابق نوجوانوں کو داخل کرتی ہیں۔ لیبر ریزرو مدرسوں میں ہر سال کوئی چالیس پچاس لاکھ نوجوان تربیت حاصل کرتے ہیں خالص ٹیکنیکل اور دوسرے مخصوص مدرسوں میں تربیت پانے والوں کی تعداد ہر سال سوا لاکھ کو پہونچتی ہے
ایسے نوعمروں کی تعلیم کے لئے شبینہ جماعتوں کا وسیع انتظام موجود ہے جو کارخانوں اور کھیتوں میں کام کر رہے ہوں۔ یہاں مقصد یہ ہوتا ہے کہ ان نوجوان روسی لڑکوں اور لڑکیوں کو جو نسبتاً چھوٹی عمر میں کام کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں ثانوی مدرسے کی پانچویں سے دسویں تک کی تعلیم دی جائے شبینہ جماعتیں خزاں سے لے کر بہار تک جاری رہتی ہیں اور طلبہ کو ہفتے کے پانچ دن چار گھنٹے روزانہ

پڑھائی کرنا ہوتی ہے۔ تعلیم کے خاتمہ پر طالب علم میٹرک پاس کر سکتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ پندرہ لاکھ طالب علم تبلیغی جماعتوں میں شامل ہو رہے ہیں۔

کنڈر گارٹن سے لے کر یونیورسٹی تک روسی تعلیم کا سارا نظام مارکس کے فلسفہ پر مبنی ہے اور اس کا غالب مقصد یہ ہے کہ ایسے اشتراکی پیدا کئے جائیں جو فرماں بردار۔ پابند ضبط اور بے چون و چرا حکم ماننے والے ہوں۔ اس کی روح کام کا وہ تصور ہے جسے ۱۹۵۲ء میں سٹالن نے ان الفاظ میں پیش کیا "یہ نہ صرف زندگی برقرار رکھنے کا ذریعہ ہے۔ بلکہ زندگی کا اولین مقصد" روسی نظام تعلیم پر ایک نگاہ ڈالنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ غایت پوری کی جا رہی ہے۔ اس وقت اس کا پہلا مقصد یہ ہے کہ سویٹ صنعت اور زراعت کو محنت کشوں کا ایسا انبوہ فراہم کرے جو کام کے اس نظریے کا عملی پیکر ہو۔

توقیر مرزا رازقی

مسلسل نمبر ۲۹

میرا شاگرد ایمیل بھی بس اتنے فرق کے ساتھ وہی وحشی ہے کہ اس نے زیادہ غور و خوض اور تخیلات کا مقابلہ کیا ہے اور ہماری خطاؤں کو بہت نزدیک سے دیکھا ہے، وہ اپنے نفس کے خلاف اپنی زیادہ محافظت کرتا ہے اور جس چیز کو جانتا ہے صرف اسی کے متعلق فیصلہ کرتا ہے۔ یہ ہمارے ذاتی جذبات ہوتے ہیں جو ہمیں دوسروں کے جذبات کے خلاف برافروختہ کرتے ہیں اور یہ ہمارا ذاتی مفاد ہوتا ہے جو ہمیں خبیثوں اور شریرالنفسوں سے متنفر کرتا ہے۔ اگر انھوں نے ہمیں کوئی نقصان نہ پہنچایا ہو تو نفرت کرنے کی بجائے ہمیں ان کی حالت پر زیادہ ترس آنا چاہئے۔ اگر ہم یہ معلوم کر سکیں کہ خود ان کا دل ان کی خطاؤں پر انھیں کیوں کر عذاب دیتا ہے تو ہم فوراً ہی ان کی خطاؤں کو معاف کر دیں۔ ہم تصور سے تو واقف ہو جاتے ہیں لیکن اس کی سزا کو نہیں دیکھتے ہیں۔ فائدے صاف اور صریح ہیں مگر ڈنڈہ پوشیدہ ہے۔ جو شخص یہ خیال کرتا ہے کہ وہ اپنی برائیوں کے پھل سے لطف حاصل کر رہا ہے وہ اتنا ہی بے چین اور تکلیف زدہ ہوتا ہے جتنا کہ وہ ان بدیوں کے ناکام ہونے کی صورت میں ہوتا فعل بدلے ہیں لیکن اضطراب وہی ہے۔ وہ دلی کیفیت کو پوشیدہ رکھ کر بے کار اپنی خوش نصیبی کا اظہار کرتا ہے، اس کی خودی کے باوجود اس کا چلن اس کا در فاش کر دیتا ہے، لیکن اس چیز کو بھانپنے کے لئے خود ہمارے دل اس کے دل سے بالکل مخالف ہونے چاہئیں۔ گمراہ وہ جذبات کر دیتے ہیں جن میں کہ ہم شریک ہو جاتے ہیں، اور ان جذبات سے ہم نفرت کرنے لگتے ہیں جو ہمارے مفاد کے خلاف صف آرا ہوتے ہیں اور انہی جذبات کی بدولت عقل سے محروم ہو کر ہم دوسروں میں وہ عیوب نکالنے لگتے ہیں۔

جن کی ہم خود خوشی سے نقل کرنے کو تیار ہوتے ہیں، پس جب ہم دوسروں کے ہاتھوں اس بات کو برداشت کرنے کے لئے مجبور ہو جاتے ہیں جو ہم ان کی جگہ ہونے تو خود کرتے تب نفرت اور خود فریبی ناگزیر ہو جاتی ہے۔

آدمیوں کا صحیح مطالعہ کرنے کے لئے پھر کیا چیز درکار ہے؟ لوگوں کو جاننے کی ایک بڑی آرزو فیصلے کی بڑی بے لوثی اور ایک ایسا دل جو ہر انسانی جذبے کو سمجھنے کے لئے کافی ذی حس اور ان جذبات سے آزاد رہنے کے لئے کافی پرسکون ہو۔ ہماری زندگی میں اس مطالعہ کے پسندیدہ اور دل پذیر ہونے کے امکان اغلبی ہوتے ہیں اور مابعد وہ خود ان لوگوں ہی کے مانند ہو جاتا ہے۔ روایت نے جس کے اثرات وہ پہلے ہی دیکھ چکا ہے ابھی تک اسے اپنا غلام نہیں بنایا ہے۔ جذبات نے جن کے نتائج کو وہ سمجھتا ہے ہنوز اس کے دل کو ٹھیس نہیں لگائی ہے۔ ایمیل ایک انسان ہے اور وہ اپنے بھائیوں میں دلچسپی رکھتا ہے۔ وہ ایک انصاف پسند آدمی ہے وہ اپنے برابر لوگوں کا اندازہ لگاتا اور انھیں جانچتا ہے۔ اب یہ یقینی بات ہے کہ اگر ایمیل ان کا صحیح اندازہ لگا سکتا ہے تو وہ ان میں ایک سے بھی اپنی جگہ تبدیل کرنے کو تیار نہ ہوگا اس لئے کہ ان کی جملہ پراگندہ کوششوں کی منزل مقصود ان تاثرات کا نتیجہ ہوتی ہے جن میں وہ شریک نہیں ہے اور وہ منزل مقصود ایمیل کو محض ایک خواب معلوم ہوتی ہے۔ ایمیل کی حد تک اس کی تمام ضرورتیں اس کے قابو کے اندر ہیں۔ تو پھر جب کہ وہ خود مکتفی اور تاثرات سے آزاد ہے تو وہ کسی کا محتاج کیوں کر بن سکتا ہے؟ ایمیل کے پاس مضبوط بازو۔ عمدہ صحت[1]۔ میانہ روی گنتی کی ضروریات اور انھیں پورا کرنے کے ذرائع موجود ہیں، اس نے کامل آزادی میں پرورش پائی ہے، اور غلامی کو وہ اعظم ترین لعنت خیال کرتا ہے۔ ایمیل کو ان بدنصیب بادشاہوں کے حال پر ترس آتا ہے جو ان سب کے غلام ہوتے ہیں جو ان کی اطاعت کرتے ہیں، وہ ان جھوٹے پیغمبروں کے ساتھ ہمدردی رکھتا ہے جو اپنی خالی خولی شہرت کی زنجیروں میں مقید رہتے ہیں وہ ان بے وقوف مالداروں پر ترس کھاتا ہے جو اپنی ہی شان شوکت کے شہید ہوتے ہیں، اور وہ ان نمائشی عیاشوں پر بھی ترس کھاتا ہے جو اپنی زندگی

---

[1] میرا خیال ہے کہ میں صحت اور طاقت کو ان فائدوں میں بجا طور پر شمار کر سکتا ہوں جو ایمیل نے اپنی تعلیم کے ذریعہ حاصل کئے ہیں۔ یا قدرت کی ان بخششوں میں منسوب کر سکتا ہوں جو اس کی تعلیم نے اس کے لئے محفوظ کر دی ہیں۔

ہلاکت خیز کاہلی میں بسر کرتے ہیں تاکہ وہ اس زندگی کی بہاروں سے لطف اندوز ہوتے ہوئے دکھائی دیں یہاں تک کہ ایسا اس دشمن تک پر ترس کھاتا ہے جس نے کہ اسے گزند پہنچایا ہو اس لئے کہ ایسا دشمنی کے مداوتی لباس کی تہ میں اس کی بدبختی کو بھی دیکھتا ہے اور دل میں کہتا ہے "اس بدنصیب نے مجھے ایذا پہنچانے میں اپنی خواہش کی اطاعت کی ہے اور اس کی یہ ضرورت اسے میرے رحم و کرم کے سپرد کر رہی ہے"۔

ایک قدم اور آگے بڑھائیے اور ہماری منزل مقصود حاصل ہو جاتی ہے۔ خود غرضی گو کارآمد ہے لیکن ایک ایسا مخدوش آلہ ہے جو اکثر اپنے استعمال کرنے والے کے ہاتھوں ہی کو مجروح کر دیتا ہے اور بے عیب شاید ہی کوئی مفید کام انجام دے سکتا ہے۔ ایسا جب انسانوں میں اپنی حیثیت پر نظر ڈالتا ہے اور جب وہ اپنے آپ کو ایک ایسی خوش نصیبی کی حالت میں پاتا ہے تو اسے ترغیب ہوتی ہے کہ آپ کے انجام دادہ امور کے متعلق وہ اپنی ہی عقل کی ستائش کرے اور جو حقیقتاً اس کی خوش قسمتی کا نتیجہ ہے۔ اسے اپنی ہی قابلیت پر محمول کرے، وہ اپنے دل ہی دل میں خیال کرتا ہے "میں عقل مند ہوں اور دوسرے لوگ بے وقوف ہیں"۔ پس وہ ان سب کی حالت پر ہمدردانہ افسوس اور ان سے نفرت کرنے لگتا ہے، اور اپنے آپ کو اور بھی زیادہ دلی مبارک باد دینے لگتا ہے، اور کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ وہ ان کی نسبت زیادہ خوش حال ہے، اس لئے وہ خیال کرنے لگتا ہے کہ قابلیتیں اس میں ہی زیادہ ہیں۔ یہی نقص ہے جس کا ہمیں سب سے زیادہ خدشہ ہونا چاہئے، اس لئے کہ اس کا دور کرنا بھی دشوار ہے اگر وہ اس ذہنی حالت میں رہے گا تو اس نے ہماری تمام احتیاطی تدابیر سے بہت ہی کم فائدہ اٹھایا ہوگا اور اگر مجھے حق انتخاب دیا جائے تو میں بمشکل ہی یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں کبر و رعونت کی فریب کاریوں کے مقابلے میں تاثرات کی فریب کاریوں کو پسند کروں گا یا نہیں۔

اکابر اپنی بڑائی کے متعلق کسی فریب میں نہیں ہوتے ہیں وہ اسے دیکھتے ہیں اور خوب جانتے ہیں لیکن وہ اتنے ہی منکسر المزاج بھی ہوتے ہیں، جتنا زیادہ عروج وہ حاصل کرتے ہیں اتنی ہی زیادہ اچھی طرح وہ اپنی کمزوریوں سے بھی واقف ہو جاتے ہیں، وہ اپنی برتری کا دکھاوا کم کرتے ہیں اور اپنی

کمزوریوں کے علم سے بہت نادم ہوتے ہیں اور ان عمدہ چیزوں میں جو وہ حقیقتاً اپنے قبضہ میں رکھتے ہیں وہ ایک ایسے عطیہ کے متعلق جو ان کا خود حاصل کردہ نہ ہو کبھی نادانی سے بھی فخر نہیں کرتے ہیں۔ ایک مرد صالح اپنے تقویٰ پر فخر کر سکتا ہے، اس لئے کہ وہ اس کی ذاتی چیز ہے لیکن ایک ذہین آدمی کو تکبر کرنے کا کیا حق حاصل ہے؛ راسین (RACINE) نے کیا قصور کیا جو وہ پراڈن (PRADEN) نہ بن گیا اور بوائلو (BAILEAN) کیوں کالن (CALIN) نہیں ہو گیا؟

جن حالات سے ہمیں تعلق ہے وہ بالکل مختلف ہیں، ہمیں عام سطح پر رہنا چاہئے، میں نے فرض کر لیا ہے کہ میرا شاگرد نہ تو غیر معمولی ذہانت رکھتا ہے اور نہ ناقص الفہم ہے، میں نے تو معمولی ذہانت کا شاگرد انتخاب کیا ہے، تاکہ یہ دکھا سکوں کہ آدمی کے لئے تعلیم کیا خدمت انجام دے سکتی ہے مستثنیات تمام قوانین کا مقابلہ کرتی ہیں پس اگر میری تعلیم کے ایک نتیجے کے طور پر ایمیل اپنے رہنے۔ دیکھنے اور محسوس کرنے کے طریقہ کو دوسروں کے طریقہ پر ترجیح دیتا ہے تو وہ حق پر ہے، لیکن اگر وہ اس خیال کے تحت ترجیح دیتا ہے کہ وہ اعلیٰ حسب نسب رکھتا ہے تو وہ غلطی پر ہے۔ اپنے نفس کو دھوکے میں ڈال رہا ہے اس کا یہ مغالطہ دور کرنا ضروری ہے، یا ہمیں اس غلطی کی روک تھام کر دینی چاہئے کہ مبادا اس کی اصلاح کا وقت ہی نکل جائے۔ بشرطیکہ ایک آدمی دیوانہ ہی نہ ہو تو ناسوا تمود و ریاکاری اس کا ہر ایک عیب دور کیا جا سکتا ہے تصنع اور نمود کا اگر کوئی علاج ہے تو وہ صرف تجربہ ہے ورنہ اور کوئی علاج نہیں ہے پس جب یہ ابتلاءً ظاہر ہو تو کم از کم اس کی مزید ترقی کو ہم ضرور محدود کر سکتے ہیں، لیکن اس کے متعلق یہ ثابت کرنے کے لئے کہ آپ کا نوجوان دوسرے لوگوں کے مانند ہے اور ان کی جیسی کمزوریوں کا تابع ہے۔ آپ لایعنی مباحث میں اپنا ایک لمحہ بھی ضائع نہ فرمائیں بلکہ آپ نوجوان کو یہ محسوس کرائیں ورنہ وہ اسے کبھی نہ جان سکے گا، میرے اپنے اصولوں کی یہ دوسری استثنائی صورت ہے، اپنے شاگرد کو ہر ایک حادثہ سے قصداً دوچار ہونے دینا چاہئے، تاکہ اسے یہ یقین ہو جائے کہ وہ ہم سے زیادہ عقل مند نہیں ہے شعبدہ باز سے جو قسمت آزمائی ہوئی تھی اسے مختلف طریقوں سے بار بار دہرانا چاہئے میں چاپلوس کو اس سے فائدہ اٹھانے دوں گا، اگر اس کا کوئی بداندیش ساتھی اسے کسی خطرناک مہم میں

لے جائے گا تو میں ایمیل کو اس جوکھم میں پڑنے دوں گا۔ اگر وہ گنجفے کی میز پر دغابازوں کے جال میں پھنس جائے گا تو میں ایمیل کو ان کا شکار رہنے دوں گا۔ میں ان دغابازوں کو ایمیل کی خوشامد کرنے اور اس کو ٹھگنے اور لوٹنے دوں گا اور جب وہ ایسے ٹھک کر کے ہنکال دیں گے اور اس کا مضحکہ اڑائیں گے اس وقت میں ایمیل کے سامنے ہی ان لوگوں کا الٹا شکریہ ادا کروں گا کہ انھوں نے اپنی عنایت اور مہربانی سے اس کو ایک سبق دے دیا ہے۔ میں ایمیل کو صرف ایک ہی جال سے محفوظ رکھنے کی انتہائی جدوجہد کروں گا۔ یعنی کسی چھنال اور بیسوا عورت کے دام فریب سے۔ میں ان سب میں صرف اتنی ہی احتیاط سے کام لوں گا کہ ان تمام خطرات میں جن میں وہ پڑے اور ان تمام ذلتوں میں جو وہ سہے میں بذاتِ خود اس کا شریک حال رہوں گا۔ بلا چون وچرا یا کسی ندامت کے میں ہر چیز کو خاموشی کے ساتھ برداشت کروں گا۔ اور ایمیل سے اس کے متعلق ایک لفظ بھی نہ کہوں گا۔ پھر اس کا آپ یقین رکھئے کہ اگر اس دانش مندانہ روش پر دیانتداری کے ساتھ عمل کیا گیا تو ایمیل اپنی خاطر مجھے جو کچھ برداشت کرتے ہوئے دیکھے گا اس کا ایمیل کے دل پر ان مصیبتوں سے کہیں زیادہ اثر ہو گا۔ جو اس نے خود برداشت کی ہوں گی۔

لہ علاوہ بریں ہمارا شاگرد اس جال میں بمشکل ہی پھنس سکتا ہے۔ اس کے پاس تفریحوں اور دل لگیوں کے اس قدر سامان موجود ہیں کہ وہ تمام عمر بھی ان سے کبھی اکتا نہیں سکتا اور روپے کا استعمال تو وہ بالکل جانتا ہی نہیں ہے۔ کیوں کہ بچوں کی دوہرا نمائی ان ہی دو ارادوں کے تحت ہوتی ہے۔ یعنی خود غرضی اور نمود۔ اس لئے بدمعاش اور رنڈیاں بھی انھیں مابعد ان ہی دونوں مقاصد کے ذریعے اپنے قبضہ میں لاتے ہیں۔ جب آپ انعامات اور صلوں کے باعث ان کی حرص کی ہمت افزائی ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں اور جب آپ دس سال کی عمر میں بچوں کے عام کارناموں پر اسکولوں اور کالجوں میں داد، اور ستائش ملتے ہوئے دیکھتے ہیں تو بیس سال کی عمر میں آپ یہ بھی دیکھتے ہیں کہ وہ تو عمر قمار خانے میں اپنی جیب خالی اور کسبی خانے میں اپنی صحت قربان کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں، بہ شرط آپ نہایت اطمینان کے ساتھ لگا سکتے ہیں کہ ایک مدرسے کا ذہین ترین لڑکا پڑھ ہو کر اعلیٰ ترین جواری اور حرام کار بن جائے گا۔ اب جو ذرائع طفلی میں استعمال نہ کئے گئے ہوں وہ نوجوانی میں ویسے ہی اثرات نہیں رکھتے ہیں۔ لیکن مستقل تدبیر ہمیں ذہن نشین رکھنی چاہیے، اور ہر معاملہ کو اس کی بدترین حالت میں دیکھنا چاہیے پہلے میں بدی کو روکنے کی کوشش کرتا ہوں پھر اس کا وجود فرض کر لیتا ہوں۔ تاکہ میں اس کی اصلاح کر سکوں۔

اس موقع پر میں ان اتالیقوں کے مصنوعی وقار کی جانب توجہ دلائے بغیر نہیں رہ سکتا ہوں جو حماقت
ے اپنے عقل مند ہونے کا بہانہ کرتے ہیں اور جو اپنے شاگردوں کے ساتھ نابالغ بچوں کے مانند سلوک
رنے کا اعلان کرتے رہتے اور ہر کام میں جود کرتے ہیں اپنے اور اپنے شاگردوں کے درمیانی امتیاز پر
ور دیتے. شاگردوں کی دل شکنی کرتے اور امنگیں مار دیتے ہیں. ان کی نوخیز امنگوں کو اس طرح
فسردہ کرنا تو درکنار آپ ان کی ہمت اور جرات کو جوش دلانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھیں تاکہ وہ
پ کے مساوی ہو جائیں. ان کے ساتھ ابتدا ہی سے اسی طرح کا سلوک روا رکھئے اور اگر وہ آپ کی
طح پر نہیں آسکتے ہیں تو آپ خود ان کی سطح پر بلا تامل اتر جانے میں ذرا بھی اگر مگر سے کام نہ لیں
در کھئے کہ آپ کی عزت اب آپ کے قبضہ میں ہے. آپ اس کی خطاؤں میں شریک ہوں تاکہ
پ اس کی اصلاح کر سکیں. اس کی رسوائی کو برداشت کیجئے تاکہ اس رسوائی کو اس سے آپ دور کر سکیں
پ اس بہادر رومن کی اقتدا کیجئے جو اپنے بھاگنے والے سپاہیوں کو روکنے کے قابل نہ ہونے کی وجہ سے
ڑ ان کے آگے آن کر یہ کہتا ہوا ان کی رہنمائی کرنے لگا - یہ لوگ فرار نہیں ہوئے ہیں بلکہ اپنے سردار کی
یروی کر رہے ہیں". کیا اس کی اس حرکت سے اس کی بے عزتی ہوگی ؟ نہیں بلکہ اپنی ناموری کو قربان
کے اس نے اس میں اور اضافہ کر لیا. فرائض کی قوت جو تقوے کا حسن ہے ہمارے تمام تاثرات کے
وجود ہمیں اپنا احترام کرانے پر مجبور کرتی ہے. اگر میں ایمیل کے متعلق اپنے فرائض کی انجام دہی
یں ایک گھونسہ کھا جاؤں تو انتقام کجا میں اس پر فخر کروں گا. اور مجھے شبہ ہے کہ ساری دنیا میں
بھی کوئی اس قدر کمینہ شخص مل سکتا ہے جو اس کے باعث میرے احترام میں ذرا بھی کمی کرے.

شاگرد کو استاد کے متعلق میں یہ باور کرانے کا ارادہ نہیں رکھتا کہ وہ استاد کو اپنے ہی مانند جاہل
گمراہ ہونے کے قابل خیال کرے یہ تخیل ایک ایسے بچے کے لئے بہت خوب ہو سکتا ہے جو چیزوں کو
دے سکتا ہو اور نہ ان کا مقابلہ کر سکتا ہو. اور ہر چیز کو اپنی دسترس کے اندر خیال کرتا ہو اور محض
ن لوگوں ہی پر اعتماد کرتا ہو جو اس کی سطح پر اترنا جانتے ہوں لیکن ایمیل کی عمر اور عقل کا نوعمر
شاب بے وقوف نہیں رہتا کہ ایسی غلطی کرے اور نہ ہی یہ مناسب ہے کہ وہ ایسی غلطی کرے.

ایک شاگرد کو اپنے اتالیق میں جو اعتماد رکھنا چاہیئے وہ ایک دوسری نوعیت رکھتا ہے۔ اس کا انحصار معقولیت اور اعلیٰ علم پر ہونا چاہیئے جو ایسے وصف ہوتے ہیں کہ جنھیں نوجوان جب یہ دیکھتا کہ اس کے لئے وہ کس قدر مفید ہیں تو وہ ان کی قدر کرنے کے لائق ہو جاتا ہے۔ دیرینہ تجربہ اسے یہ یقین دلا دیتا ہے کہ اس کا اتالیق اس سے محبت کرتا ہے اور یہ کہ وہ ایک دانش مند اور بھلا انسان ہے جو اس کا بہی خواہ ہے اور اچھی طرح جانتا ہے کہ اس کی بہبودی کس طرح حاصل کی جا سکتی ہے شاگرد کو یہ جان جانا چاہیئے کہ اتالیق کی نصیحت پر عمل پیرا ہونے میں اسی کا فائدہ ہے۔ لیکن اگر استاد شاگرد کو ایک مرید کی مانند تصور کرنے کی اجازت دے دے تو وہ استاد اپنے اس حق سے محروم ہو جائے گا کہ وہ شاگرد اس کا احترام کرے اور اس کی ہدایت پر عمل کرے اور اگر شاگرد یہ تصور کر لے کہ استاد بالارادہ اسے جال میں پھنسنے دے رہا ہے یا اس کی ناتجربہ کاری کے لئے گڑھے تیار کر رہا ہے تو یہ حق اور بھی بالکل ضائع ہو جاتا ہے۔ ان ہر دو دشواریوں سے کیوں کر بچا یا جائے؟ اعلیٰ ترین اور بے حد فطرتی طریقے اختیار فرمائیے۔ کشادہ دلی حق گوئی اور دیانتداری سے کام لیجئے۔ اور ان خطرات سے جن میں وہ مبتلا ہو چکا ہے اسے ہوشیار کر دیجئے۔ انھیں صراحت اور معقولیت کے ساتھ بلا اظہار غم و غصہ اور بلا کسی مبالغے یا علمی مشیخت کے ظاہر کر کے اس سے بیان فرما دیجئے۔ اور سب سے اس بات کا خیال رکھئے کہ جب تک کوئی ایسی نوبت نہ آجائے اور جب تک حکمانہ لہجہ قطعاً ناگزیر ہی نہ ہو جائے اس وقت تک اپنی رائے کسی حکم کی صورت میں نہ ظاہر فرمائیے۔ اور اگر اس پر بھی وہ مصر ہو جیسا کہ وہ اکثر ہو گا تو اسے اپنی مرضی پر چلنے کی آزادی دے دیجئے اور اس کے ساتھ ساتھ ہو لیجئے۔ جو وہ کرے آپ بھی اس کی تقلید کیجئے اور راضی خوشی کشادہ دلی سے کیجئے۔ اور اگر ممکن ہو تو آپ ان چیزوں میں اپنے آپ کو بالکل محو کر دیجئے۔ اور جس قدر وہ لطف حاصل کرے اتنا ہی آپ بھی حاصل کیجئے۔ اگر معاملات خطرناک صورت اختیار کریں گے تو آپ اسے بچانے کے لئے وہیں موجود ہوں گے۔ اور پھر جب یہ نوجوان شخص آپ کی دوربینی اور مہربانی کو اس طرح دیکھے گا تو کیا وہ اول الذکر سے سبق اور آخر الذکر سے اثر نہ لے

اس کی یہ تمام خطائیں اتنے ہی بے مدد زنجیریں ہیں جو اس نے خود آپ کو مہیا کر دی ہیں۔ تاکہ بوقت ضرورت آپ اسے روک سکیں۔ اندریں حالات ایک استاد کی سلیقہ مندی اس بات میں ہے کہ وہ حدود اوقات کو قابو میں رکھے اور اپنی پند و نصائح کو اس طرح ترتیب دے کر اسے قبل از قبل معلوم ہو جائے کہ نوجوان شاگرد اس کی کب اطاعت کرے گا اور کب نہ کرے گا۔ تاکہ تجربے کے اسباق سے شاگرد کا چاروں طرف سے محاصرہ تو کر دے لیکن کسی حالت میں بھی اسے کسی خطرۂ عظیم میں پھنسنے نہ دے۔ ارتکاب کے قبل ہی شاگرد کو اس کے قصور سے آگاہ فرما دیجئے۔ بعد از ارتکاب اسے مورد الزام نہ ٹھہرایئے۔ ورنہ آپ اس کی حب نفس کو بغاوت پر آمادہ کر دیں گے۔ جس سبق سے ہم نفرت کرتے ہیں اس سے ہم کبھی کچھ حاصل نہیں کر سکتے ہیں۔ میں اس حد سے زیادہ بڑی کسی اور نادانی سے واقف نہیں "میں نے تم سے ایسا کہہ دیا تھا" شاگرد کو وہ بات یاد دلانے کا جو آپ نے اس سے کہی ہو بہترین طریقہ یہ ہے کہ آپ اس بات کو بھولے ہوئے نظر آئیں، آپ اس سے بھی زیادہ پیش قدمی فرمائیے اور جب آپ اسے اپنی نصیحت نہ ماننے کی وجہ سے نادم اور پشیمان پائیں تو آپ نہایت مشفقانہ طور پر بڑی لطافت کے ساتھ اس پشیمانی کو دور فرما دیں۔ پھر یقین مانیئے کہ جب وہ دیکھے گا کہ آپ نے اس کی خاطر اپنی ذات کو کس طرح فراموش کر دیا اور لعنت ملامت کی بجائے آپ نے کس طرح اس کی دل جوئی کی تو آپ کو وہ اور بھی زیادہ عزیز جاننے لگے گا۔ لیکن اگر آپ اپنی لعن طعن کے ذریعہ اس کی پریشانی میں اضافہ فرما دیں گے تو وہ آپ سے نفرت کرنے لگے گا۔ اور اپنا یہ ایک اصول بنالے گا کہ آپ کی کبھی پروا نہ کرے۔ تاکہ آپ پر یہ ظاہر ہو جائے کہ آپ کی رائے کی اہمیت سے وہ بالکل متفق نہیں ہے۔

آپ نے تسلی و تشفی دینے کا جو رخ اختیار کیا ہے وہ از خود اس کے لئے ایک قسم کا سبق ہے اس لئے اور بھی کہ اس طرز روش کا اسے شان و گمان بھی نہ تھا۔ مثلاً جب آپ اس سے یہ فرماتے ہیں کہ دوسرے لوگوں نے بھی ایسی غلطی کی ہے تو یہ وہ طریقہ نہیں جس کی وہ توقع رکھتا تھا۔ آپ ہمدردی کی آڑ میں درحقیقت اس کی اصلاح کر رہے ہیں، اس لئے کہ جب کوئی شخص اپنے آپ کو

دوسروں سے بہتر خیال کرتا ہے تو اسے دوسروں کی مثال کے ذریعہ تشفی دینا بڑا پست اور عاجز کرنا ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ ہمیں یہ جان لینا چاہیے کہ زیادہ سے زیادہ ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ وہ (دوسرے) لوگ ہم سے زیادہ بہتر نہ تھے۔

جو دور لغزشوں کا ہے وہی دور قصے کہانیوں کا بھی ہوتا ہے، ہم جب ایک خطاکار کو کسی قصے کہانی کی آڑ میں مجرم ٹھہراتے ہیں تو گویا ہم اسے ناراض کئے بغیر اس کی اصلاح کرتے ہیں۔ اور وہ اس وقت یہی خیال کرتا ہے کہ قصہ غلط نہیں ہے، اس لئے کہ وہ اس قصے کی صداقت کی توثیق اپنے ذاتی حال کی مطابقت سے کر لیتا ہے، اس بات کی میں حال ہی میں جانچ کر چکا ہوں کہ جو بچہ کبھی خوشامد کے فریب میں نہ آیا ہو وہ کسی قصہ کہانی کو نہیں سمجھ سکتا ہے۔ لیکن غیر اندیش نوجوان حال ہی میں جو کسی خوشامدی کے چکر میں آ چکا ہو۔ بغور یہ جان جاتا ہے کہ کوا بے وقوف تھا۔ اس طرح وہ اس واقعہ سے ایک کلیہ حاصل کر لیتا ہے اور وہ تجربہ جسے شاید جلد ہی بھول جاتا اس قصے کے ذریعے اس کے دل پر نقش کالحجر ہو جاتا ہے، اخلاقیات کا کوئی علم ایسا نہیں ہے جو ہمارے یا دوسروں کے تجربات کے ذریعہ حاصل نہ ہو سکتا ہو۔ خطرے کے وقت نوجوان کو خود تجربہ حاصل کرنے کی بجائے ہم تاریخ سے امداد لے سکتے ہیں لیکن جب خطرہ نسبتاً خفیف ہوتا ہے تو یہ اور بھی بہتر ہے کہ خود نوجوان کو خطرہ میں پڑنے دیا جائے اور مابعد اخلاقی قصے کہانیوں کے ذریعے ان مخصوص واقعات کو جن سے کہ نوجوان اب واقف ہو چکا ہے کلیات یا اصولوں میں بدل دیا جائے۔

میرا بہرحال یہ مقصد نہیں ہے کہ ان کلیات کی تشریح کی جائے نہ یہ کہ کلیات بنائے جائیں اس سے زیادہ کوئی حماقت اور نادانی نہیں ہو سکتی کہ اکثر و بیشتر قصوں کے اختتام پر اخلاقی سبق درج کر دیئے جاتے ہیں گویا کہ خود قصہ کے اندر ایسا صاف اور صریح کوئی سبق موجود نہیں ہوتا ہے یا نہ ہونا چاہیئے کہ پڑھنے والا اسے خود بخود اخذ کرنے میں کامیاب ہو سکے۔ پھر بتائیے کہ اب قصہ کے اختتام پر اخلاقی نصیحت کا تحریری اضافہ کیوں کیا جائے، اور نوجوان کو اسے خود معلوم کرنے کے لطف سے کیوں محروم رکھا جائے۔

فن تعلیم کا گر یہ ہے کہ شاگرد میں سیکھنے کا شوق اور خواہش پیدا کر دی جائے، لیکن اگر شاگرد کو

حصولِ علم کا خواہاں ہونا چاہیئے تو اس بات کے لحاظ سے جو آپ اس سے فرماتے ہیں کہ آپ کی بات سننے کے علاوہ اسے اور کوئی کام فی الواقع کرنا نہیں ہوتا ہے، اس کے ذہن کو بھی ایسی مجہول حالت میں نہ رہنا چاہیئے۔ خیالِ استادی کو شاگردوں کے لئے ہمیشہ ترک کرنا چاہیئے اور استاد کو یہ الفاظ کہنے کے قابل ہوجانا چاہیئے۔ میں سمجھتا ہوں۔ میں دیکھتا ہوں۔ میں اس حد تک پہونچ رہا ہوں۔ میں کچھ کچھ حاصل کر رہا ہوں یا سیکھ رہا ہوں وغیرہ۔ اطالوی مزاحیہ ڈراموں میں جو چیز مسخروں کو تکلیف دہ اور ناقابل برداشت بنادیتی ہے وہ ان کی وہ جدوجہد اور مشقت ہے جو وہ عوام کو ایسی معمولی اور عام فہم باتیں سمجھانے کے لئے برداشت کرتے ہیں جن کو عوام پہلے ہی سے کافی طور پر جانتے ہیں ہمیں قابلِ فہم ہونا تو ہمیشہ ضروری ہے۔ لیکن ہمیں ہر کہنے کی بات کا کہنا ضروری نہیں ہے۔ اگر آپ باتیں زیادہ کریں گے تو آپ کہیں گے بہت کم اس لئے کہ بالآخر آپ کی کوئی بھی نہ سنے گا۔ لافانٹین کے اس مینڈک کے قصہ میں جس نے اپنے آپ کو پھلا لیا تھا۔ آخری چار سطروں کا کیا مطلب ہے۔ کیا مصنف کو یہ ڈر تھا کہ ہم کہیں اس کو سمجھ نہ سکیں، لافانٹین کی اخلاقی نصیحتوں کو کلیے کی شکل دینا تو درکنار اس نے ایک حد تک ان نصیحتوں کو انہی تمثیلات تک محدود کر دیا ہے، جو اس میں دی گئی ہیں اور انہیں دوسری جگہ استعمال کرنے سے ہمیں محروم کر دیا ہے، اس لاثانی مصنف کی کہانیوں کو ایک نوجوان کے سپرد کرنے کے قبل میں ان تمام نصیحتوں کو جو اس نے ہر کہانی کے اختتام پر درج کی ہیں حذف کر دینا چاہتا ہوں اس لئے کہ اس نے ان کے ذریعہ اس چیز کی تشریح کرنے کی کوشش کی ہے، جسے نہایت بین اور پر لطف طریقے سے وہ خود کہانی کے اندر ہی بیان کر چکا ہے، اگر آپ کا شاگرد کہانیوں کو بغیر تشریح سمجھنے سے قاصر ہے تو وہ انہیں تشریح کے بعد بھی نہ سمجھ سکے گا۔

علاوہ بریں ان کہانیوں کو زیادہ نصیحت آمیز ترتیب میں منظم کرنے کی ضرورت ہے جو سنِ آغاز نوجوان کے احساسات اور علم کے زیادہ موافق ہوں۔ کیا آپ اس سے زیادہ کسی اور حماقت کا تصور کر سکتے ہیں کہ ایک کتاب کو ہماری ضروریات اور مواقعوں کا لحاظ کئے بغیر محض اس کی عددی ترتیب کے مطابق استعمال کیا جائے۔ پہلے ٹڈی کی کہانی ہے پھر کوے کی پھر مینڈک کی پھر دو خچروں کی ہے وغیرہ

ں ان دو خطروں سے تو تنگ آ گیا ہوں، مجھے یاد ہے کہ میں نے ایک بچے کو جسے مالیات کے لئے تعلیم
ی جا رہی تھی دیکھا کہ لوگ اسے کبھی تنہا نہ چھوڑتے تھے۔ بلکہ ہمیشہ اس پیشہ پر اصرار کرنے رہتے تھے۔
ر اس بچے کو اختیار کرنا تھا۔ لوگوں نے اس بچے کو۔ کہانی پڑھنے، یاد کرنے۔ بیان کرنے اور آئندہ اس کے
پیشے کے خلاف اس کہانی میں حقیقت ترین بحث معلوم کرنے کے لئے اسے بار بار دہرانے پر مجبور کیا
ں نے نہ صرف بچوں کو ان کہانیوں سے جنہیں وہ پڑھتے ہیں کوئی حقیقی فائدہ حاصل کرتے ہوئے ہی نہیں
یکھا بلکہ میں نے کبھی کسی ایسے شخص کو بھی نہیں دیکھا جو اس بات کو دیکھنے کی زحمت گوارہ کرتا ہو کہ بچے
ن کہانیوں سے ایسا کوئی فائدہ حاصل کریں۔ یہ مطالعہ اخلاقی تربیت کا مدعی ہے۔ لیکن ماں اور بچے کا
حقیقی مقصد سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہوتا ہے کہ جب بچہ اپنی کہانیوں کو زبانی سنائے تو پوری محفل
بچے کو دیکھنے لگے، جب وہ اپنی زیادہ عمر کو پہونچ جاتا ہے کہ حفظ نہیں سنا سکتا اور اتنی کافی عمر حاصل
کر لیتا ہے کہ ان سے فائدہ حاصل کرے تو یہ کہانیاں بالکل فراموش ہو جاتی ہیں، میں پھر کہتا ہوں کہ کہانیوں
سے صرف بڑے آدمی ہی سبق حاصل کر سکتے ہیں اور اب کہانیوں کو شروع کرنے کے لئے ایمیل
کافی بڑا ہو گیا ہے۔

میں آپ سے ہر ایک بات نہیں کہنا چاہتا، اس لئے میں صرف وہی راستے نشان زد کرتا
ہوں جو راہ راست سے بھٹکتے ہیں، تاکہ آپ کو یہ معلوم ہو جائے کہ ان سے کیوں کر بچا جائے، اگر
آپ میری نشان زدہ راہ کو اختیار کریں تو میرے خیال میں آپ کا شاگرد دینی نوع انسان کا علم اور
اپنا علم نفس ارزاں ترین بازاروں میں خرید سکے گا۔ آپ اسے خوش بختوں سے حسد کئے بغیر
تقدیر کی فریب کاریاں دیکھنے کے لائق بنا دیں گے اور دوسروں سے خود کو بدتر خیال کئے بغیر
آپ اسے اس کی حالت میں قانع اور تماشا کر رہنا سکھا دیں گے، آپ نے اسے اداکار بنانے سے
ابتدا کی ہے تاکہ وہ ایک تماشائی بننا سیکھے۔ آپ کو اپنا کام جاری رکھنا چاہئے۔ اس لئے کہ تھیٹر
کے اندر سے تو تمام چیزیں اپنی اصلی حالت میں دکھائی دیتی ہیں یعنی جیسی ہوتی ہیں ویسی ہی نظر آتی
ہیں اور اسٹیج پر وہ جیسی دکھائی دیتی ہیں ویسی ہوتی ہیں یعنی مصنوعی ہوتی ہیں۔ عام اثر کے لئے

یں ایک نظارہ بعیدہ یعنی ایک شے کو دور سے دیکھنا چاہیئے، اور تفصیلات کے لئے ہمیں زیادہ
ریب سے مشاہدہ کرنا چاہیئے لیکن ایک نوجوان آدمی زندگی کے کاروبار میں کیوں کر حصہ لے سکتا
ہے، اسے زندگی کے تاریک اسراروں میں قدم رکھنے کا کیا حق ہے؟ ایک نوجوان کی دلچسپیاں
س کی ذاتی تفریحات میں محدود رہتی ہیں، اسے دوسروں پر کوئی قدرت حاصل نہیں ہوتی ہے یہ
یسا ہی ہے کہ گویا اس میں کوئی قوت ہی نہیں ہوتی ہے۔ آدمی کی بازاری قیمت اقل ترین ہر
ور ہماری تمام حقیقتوں میں حقوق شخصیت کا درجہ سب سے آخری ہے، جب میں نوجوانوں کے
طالعوں کو ان کی انتہائی عملی زندگی کے دور میں خالصتًا خیالی معاملات تک محدود دیکھتا ہوں
ور جب کہ مابعد وہ بلا کسی قسم کے تجربے کے لوگوں اور معاملات کی دنیا سے اچانک دوچار ہونے
ہیں تو یہ مجھے عقل اور فطرت دونوں کے مساویانہ طور پر مخالف معلوم ہوتا ہے، اور میری یہ حیرت
جاتی رہتی ہے کہ کس قدر محدودے چند لوگ ہی یہ جانتے ہیں کہ کیا کرنا چاہیئے۔ ہمیں اتنی بہت سی
بے کار چیزوں کی تعلیم دینا کس قدر تعجب انگیز انتخاب ہے۔ درآں حالیکہ فن عمل کا ذکر تک بھی
نہیں کیا جاتا ہے۔ لوگ ہمیں محفلوں میں اٹھنے بیٹھنے کے قابل بنانے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ لیکن تعلیم
ہمیں ایسی دی جاتی ہے کہ گویا ہم میں سے ہر ایک کو ایک تنہا کوٹھری کے اندر بیٹھ کر دھیان گیان ہی
کی زندگی بسر کرنی ہے۔ یا ایسے لوگوں سے نظریات میں بحث کرنی ہے جن سے ان نظریات کا کوئی تعلق
نہیں ہے۔ آپ خیال کرتے ہیں کہ آپ اپنے طالب علموں کو زندگی بسر کرنا سکھا رہے ہیں حالاں کہ
نہیں آپ چہرے پر چند شکنیں ڈالنا اور لایعنی الفاظوں کی چند اشکال سے واقف ہونا ہی سکھاتے
ہیں۔ میں نے بھی ایمیل کو زندگی بسر کرنا سکھایا ہے، اس لئے کہ میں نے اسے اپنی ذاتی صحبت
سے لطف اٹھانا اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ اپنی روزی آپ کمانا سکھایا ہے لیکن یہ کافی نہیں ہے،
دنیا میں زندگی بسر کرنے کے لئے ایمیل کو یہ جاننا ضروری ہے کہ وہ دوسروں کے ساتھ زندگی کیوں کر
بسر کرے اور یہ جاننا لازمی ہے کہ کون سی قوتیں ان لوگوں پر اثر انداز ہو سکتی ہیں، اعلیٰ محفلوں میں
ذاتی اغراض کے عمل اور ردعمل کا اندازہ لگانا ایمیل کے لئے ضروری ہے۔ نتائج کا اسے اس قدر صحیح اور

جنچاہیا اندازہ لگانا ضروری ہے کہ اُسے اپنے کاموں میں ناکامی کا شبہ نہ رہے۔ یا کم از کم وہ بہترین طریقہ پر اس کام کو انجام دینے کی امکانی کوشش کر سکے۔ نوجوانوں کو قانون نہ تو اپنے کاروبار کا انتظام خود انجام دینے کی اجازت دیتا ہے اور نہ انھیں اپنی ذاتی جائداد منتقل کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ لیکن ان احتیاطی تدابیر سے کیا فائدہ حاصل ہو سکتا ہے۔ اگر نوجوانوں کو تا حصول سن بلوغ کبھی کوئی تجربہ ہی حاصل نہ ہوا ہو، اس تاخیر سے انھیں کوئی فائدہ نہ حاصل ہوگا اور انھیں پچیس سال کی عمر میں بھی پندرہ سال کی عمر سے زیادہ تجربہ حاصل نہ ہو سکے گا، بے شک احتیاط ہم پر لازم ہے تاکہ ایک نوجوان جہالت سے اندھا یا جذبات سے گمراہ ہو کر اپنی ذات کو نقصان نہ پہونچا سکے لیکن ہر ایک عمر میں ایسے مواقع پیش آتے ہیں۔ جب کہ اس بدنصیب کی طرف سے جو امداد کا حاجت مند ہو ایک عقل مند آدمی کی رہنمائی میں خیرات اور ضعیفوں ناتوانوں کی خبرگیری کے کام انجام پا سکتے ہیں ؎

تعلیمی دُنیا پر ایک نظر

تعلیمی انجمنوں کی چھان بین

امریکہ میں کسی ایک مال دار انجمنیں ایسی ہیں جن کے مقاصد سراسر تعلیمی ہیں۔ ان انجمنوں کی آمدنی ہر قسم کے ٹیکس سے آزاد ہے۔ حال ہی میں امریکی کانگرس نے ایک ماتحت مجلس اس غرض سے قائم کی ہے کہ ان انجمنوں کے کارنامہ اعمال کی جانچ پڑتال کرے، دو سالوں میں یہ دوسری مرتبہ ہے کہ ان انجمنوں کو ایسے محاسبے سے سابقہ پڑا ہے۔ صدر کمیٹی کو ہدایت کی گئی ہے کہ اپنی رپورٹ جنوری ۱۹۵۴ء تک پیش کردے۔

پہلی مرتبہ جب ۱۹۵۲ء میں تعلیمی انجمنوں سے پوچھ گچھ ہوئی تو واشنگٹن کے تعلیمی حلقوں کو فکر دامن گیر ہوئی، موجودہ محاسبہ نے انہیں سخت پریشان کر دیا ہے۔ پچھلے موقعہ پر محض تحقیقاتی اداروں پر ہاتھ ڈالا گیا تھا۔ اب کی مرتبہ محاسبے کا ہاتھ براہِ راست تعلیم پر ہے۔

اس تحقیقاتی کمیٹی کی زد میں سب سے پہلے آنے والا ادارہ فورڈ فاؤنڈیشن ہے جو بے شمار تعلیمی منصوبوں کو پرورش دے رہی ہے۔ تحقیقاتی کمیٹی کے صدر مسٹر ریس کا کہنا ہے کہ فورڈ فاؤنڈیشن کے [illegible] ہیں۔ واضح طور پر اشتراکی اور اشتمالی محاذوں کے لئے ہمدردی رکھتے ہیں، اس کے کارکن مشتبہ لوگ ہیں اور یہ ایسے منصوبوں کی سرپرستی کرتے ہیں جن سے سوشلسٹ اور اشتراکی پروگرام کے ہاتھ مضبوط ہوتے ہیں، نیز یہ ادارہ کسی ایسے منصوبے کو ترقی نہیں دیتا جو امریکی مفاد کے حق میں ہو۔ مسٹر ریس کی توجہ ان اداروں پر بھی ہونے والی ہے جنہوں نے مندرجہ ذیل تعلیمی منصوبوں کی سرپرستی کی تھی۔

معاشرتی علوم کا انسائیکلوپیڈیا ۔ مسٹر ریس کا کہنا ہے کہ اس حوالہ کی کتاب کو تالیف کرتے وقت بائیں موضوعات ایسے لوگوں کے حوالے کئے گئے ..... جو بائیں بازو سے تعلق رکھتے تھے ۔ لیکن داہنے موضوعات بھی انہی لوگوں کے ذمے لگا دیئے گئے ۔ اس لئے یہ انسائیکلو پیڈیا مسٹر ریس کے قول کے مطابق اشتراکیت اور انسانیت کا پروپیگنڈا بن کر رہ گیا ہے ۔

شکاگو یونی ورسٹی کی گول میز ۔ مسٹر ریس کا کہنا ہے کہ یہ گول میز ایک تعلیمی ادارہ ہونے کی دعوے دار ہے ، لیکن یہ دعویٰ مشکوک ہے ، اکثر حالات میں اس میں شرکت کرنے والوں کے اعتقادات بائیں قسم کے تھے ، وہ یقینی طور پر غیر متوازن اور بائیں طرف جھکے ہوئے تھے ۔

ٹیچرز کالج کولمبیا کا شہریت کی تعلیم کا منصوبہ : ۔ مسٹر ریس کا کہنا ہے کہ اس منصوبے کا بڑا کارنامہ ان کتابوں اور کتابچوں کی شرح ہے جو معاشرتی علوم کے مطالعہ میں کار آمد ہیں ۱۹۵۰ء کی شرحوں کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ منتخب کردہ کتابوں کی بھاری اکثریت بائیں آزاد خیال اور بین الاقوامی رنگ کی ہے ۔ صرف دو درجن کے قریب کتابیں ایسی ہیں جو نقطہ نگاہ میں قدامت پسند ہیں ، اور ایک ہزار کتابوں میں یہ دو درجن بالکل آٹے میں نمک کے برابر ہے ۔

نیشنل ایجوکیشن ایسوسی ایشن اور پروگریسو ایجوکیشن ایسوسی ایشن : مسٹر ریس نے ان دونوں انجمنوں کو ایک ساتھ رکھا ہے اور ان پر یہ الزام لگایا ہے کہ وہ سوشلسٹ پروپیگنڈا پھیلاتی ہیں ، مسٹر ریس کا خیال ہے کہ این ۔ ای ۔ اے کی قائم کردہ ثانوی صدر معلموں کی انجمن اور معاشرتی مطالعوں کی کونسل ہر دو نے فاؤنڈیشن سے روپیہ حاصل کر کے معاشرتی معاملات پر مواد تیار کیا ہے ، یہ سارا مواد پروپاگنڈا کے کتابچے ہیں ۔

جن تعلیمی اداروں پر مسٹر ریس نے الزامات لگائے ہیں انھیں ابھی جواب دینے کا موقع نہیں ملا ۔ لیکن یقین کیا جاتا ہے کہ تحقیقاتی کمیٹی کے سامنے پیش ہو کر اپنے آپ کو تمام شکوک سے پاک کرنے کے لئے وہ وقت کا مطالبہ کریں گے ۔

برطانوی وزیر تعلیم : ۔ برطانوی وزیر تعلیم مسٹر ہورس برو کو حال ہی میں کابینہ میں شامل کرنے کا

فیصلہ کیا گیا ہے، دو سال پہلے جب مس موصوف کو وزارت تعلیم کا قلم دان سپرد ہوا تو وہ کابینہ سے باہر رکھی گئی تھیں لیکن ان دو سالوں میں تعلیمی معاملات کے ساتھ عوام کی دلچسپی اس قدر بڑھ چکی ہے کہ اب وزیر تعلیم کو کابینہ میں لئے بغیر عوامی شکوک و اعتراضات سے عہدہ برا ہونا ممکن نہیں مس ہورس برو تیسری خاتون ہیں جنھیں برطانوی کابینہ میں شریک ہونے کا امتیاز حاصل ہوا ہے ان ان تین خواتین میں سے دو کے ذمّے وزارت تعلیم کا قلم دان رہا ہے۔

سائنس کی مقبولیت

ستمبر کے مہینے میں لورپول کے مقام پر برطانوی انجمن برائے ترقی سائنس کا ایک سو پندرہواں سالانہ جلسہ ہوا جس میں سائنس دانوں کے علاوہ دوسرے لوگوں نے بھی شرکت کی۔ شرکاء کی بھاری تعداد سائنس کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کی دلیل تھی، جلسے کے صدر سر ایڈورڈ ری پیلٹن نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ سائنس بذاتِ خود مقصود ہونی چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ سائنس کا مطالعہ دلچسپ بھی ہے اور کارآمد بھی۔ یہ روشنی بہم پہونچانے والا بھی ہے اور پھل دینے والا بھی، یہ خیال کرنا غلط ہے کہ سائنس کا تعلق محض صنعتی ترقی سے ہے، اس میدان کی بہت سی فتوحات اور پیش قدمیوں کے پیچھے اور ان سے آگے سائنس دانوں کا بے پناہ جذبۂ دریافت ہوا کرتا ہے، سائنس دان کی محنت کا اصل پھل علم اور بصیرت میں اضافہ ہے، سائنس جب بذات خود مطلوب ہو تو یہ انسان کے ذہنی افقوں کو وسیع کرتی اور دنیا کے معنوی حسن میں اضافہ کرتی ہے۔ یہ نہایت پیچیدہ اور دور رس ذہنی ادراک کا درجہ رکھتی ہے اور اس کی ضروری شرط وسعتِ نگاہ بلندی فکر اور فراخ دلی ہے۔

سائنس کے ذمّے یہ الزام لگانا درست نہیں کہ اس نے کائنات کے اسرار اور اس کے حسن کو کم کر دیا ہے جسم اور روح کو دو جداگانہ چیزیں خیال کرنا اور مذہب سے روگردانی سائنس کی پیداوار نہیں بلکہ یہ ڈس کارٹس جیسے عالموں کی تعلیم کا نتیجہ ہے۔ سائنسی معلومات نے انسانی تصور میں بہت کچھ ردو بدل کیا ہے، یہ صحیح ہے کہ آغاز کار میں مادے کی اہمیت اور اس کے

بے تحاشا استعمال نے قدرتی حسن سے بے پروائی پیدا کی لیکن پچھلے پچاس سالوں کے سائنسی انکشافات نے اس چیز کی کافی سے زیادہ تلافی کر دی ہے۔ اس کی حالیہ تحقیقات نے ذرّے کے جگر سے لے کر کائنات کی آخری حدود تک ایسی ایسی نئی دنیائیں معلوم کی ہیں جنھوں نے عالم رنگ و بو کے اسرار اور اس کے حسن میں بے حد اضافہ کیا ہے۔

سر ایڈوارڈ نے کہا کہ سائنس باوجود اپنے تمام امکانات کے اکیلی کافی نہیں۔ سائنسی اقدار اور تجربات کے علاوہ اور اقدار بھی ہیں جو کبھی تبدیل ہونے والی نہیں۔ وہ فکر و نظر کے بنیادی طریقے ہیں جن کا تعلق ایسی چیزوں سے ہے جو نہ کبھی بدلتی ہیں اور نہ منسوخ ہوتی ہیں۔ آج ہمیں ان پائندہ اور زندگی بخش روحانی اقدار کی ہمیشہ سے زیادہ ضرورت ہے۔ سائنس کے میدان میں ہم جو انکشافات فراہم کر رہے ہیں وہ وقت گذرنے پر پرانے اور بے کار ہو جائیں گے لیکن روحانی صداقتیں ابدی ہیں۔ سائنس ساری زندگی کی ہم معنی نہیں ہو سکتی کیوں کہ یہ زندگی کی ساری ضرورتیں پوری نہیں کرتی۔

کنبے کا مقام

برٹش نیشنل کونسل برائے خدمت عامہ کے ایک جلسہ کو خطاب کرتے ہوئے پروفیسر ٹٹمس نے حال میں کہا تھا کہ پچھلی نصف صدی میں گھریلو زندگی میں ایک نئے دور کا سامان پیدا ہو تا رہا ہے شرح پیدائش میں متواتر کمی واقع ہوئی۔ اور اب چھوٹا کنبہ ایک عام اور مسلمہ حقیقت ہے۔ بہت بڑے بڑے کنبے جہاں بڑھتی قسم کے گھرانوں کو جنم ملتا تھا اب تیزی سے ختم ہو رہے ہیں۔ شرح پیدائش کا اضافہ جو ابتدائی مدرسوں میں درد سر پیدا کر رہا ہے چھ سال ہوئے اپنی انتہائی بلندی کو پہونچ گیا تھا۔ یہ عارضی صورت حال بھی تقلیل پیدائش کے ہمہ گیر رجحان سے بچ نہیں سکی۔ بہر حال کنبہ بطور ایک معاشرتی اکائی کے بدستور رہا ہے۔ لیکن اس پر مختلف سمتوں سے طرح طرح کے دباؤ پڑ رہے ہیں اور والدین کو دن بدن یہ احساس ہو رہا ہے کہ وہ بچوں کی تربیت اور پرورش کے معاملے میں بہت سی حد بندیوں میں گھرے ہوئے ہیں۔

سرکاری جریدہ کے اعلانات

محکمۂ تعلیم ـــــــــ شعبۂ مدارس

ای/۱۹۲ — ۲۵ دسمبر ۱۹۵۲ء — م۔ دلبر حسن میٹرک۔ بی۔ ٹی (مدرس) ایک امیدوار کو جن کی تقرری کے احکام ۶۰ ـــ ۱۴۰ کے گریڈ میں ۶۰ روپے ابتدائی تنخواہ پر بطور عارضی ورزش ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول مٹھہ ٹوانہ جاری ہو چکے تھے اسی گریڈ اور تنخواہ پر تاریخ حاضری سے م۔ غلام حسین کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے عارضی ورزش ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول بھیرہ مقرر کیا گیا۔

ای/۲۰۲۶۴ ۲۱ — ۲۲ دسمبر ۱۹۵۲ء — م۔ واحد بخش ایس وی (۶۰ ـــ ۱۴۰) اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول علی پور کو تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر م۔ عبدالغنی کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول خانیوال مقرر کیا گیا۔

ای/۲۰۲۶۶ — ۱۸ دسمبر ۱۹۵۲ء — م۔ مظفر حسین بی اے۔ بی۔ ٹی۔ عارضی انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول بھکر کو تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر م۔ عبدالحمید کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ عارضی انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول بھوچال کلاں مقرر کیا گیا۔

ای/۲۰۲۶۴ — ۱۸ دسمبر ۱۹۵۲ء — م۔ غلام حسین (۶۰ ـــ ۱۴۰) ورزش ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول بھیرہ کو تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر م۔ محمد محفوظ الحق کی جگہ جن کی خدمات ختم کر دی گئی ہیں گورنمنٹ ہائی اسکول مٹھہ ٹوانہ میں مقرر کیا گیا۔

ای/۲۰۱۱۴۳ — ۴ دسمبر ۱۹۵۲ء — م۔ عبدالحمید میٹرک (۶۰ ـــ ۱۴۰) قائم مقام ورزش ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول رینالہ خورد کو تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر م۔ غلام نبی کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے قائم مقام ورزش ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول جھنگ مقرر کیا گیا۔

〃 — س۔ منظور حسین شاہ (۶۰ ـــ ۱۴۰) ورزش ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول خانیوال کو تاریخ حاضری سے

اپنی تنخواہ پر م عبدالحمید کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے ورزش ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول پنڈ دادنخان مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ غلام نبی، میٹرک۔ پی۔ ٹی (ورانٹن) قائم مقام ورزش ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول جھنگ کو تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر س منظور حسین شاہ کی جگہ قائم مقام ورزش ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول خانیوال مقرر کیا گیا۔

ای ۱۹۲۹۳/۱ ۲ دسمبر ۵۳ء م۔ عبدالحمید بی۔ ایس سی۔ عارضی انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول بھوچال کو جو م حبیب اللہ کی جگہ کام کر رہے تھے تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر بعہدہ اسمی حیثیت میں خان ریاض لیاقت کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ عارضی انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول مری مقرر کیا گیا۔

ای ۱۹۰۴/- ۳۰ نومبر ۵۳ء م۔ عبدالحکیم بی۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ عارضی انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول عیسیٰ خیل کو تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر م۔ محمد عبداللہ کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے عارضی انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول میاں والی مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ محمد عبداللہ ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی (۱۳۰ ــ ۵۲۵ ـ ۰) انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول میانوالی کو تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر م۔ عبدالحکیم کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول عیسیٰ خیل مقرر کیا گیا۔

ای ۱۹۰۵/۴ ۳۰ نومبر ۵۳ء م۔ عبدالحکیم بی۔ اے۔ ایس۔ اے۔ وی (۱۳۰ ــ ۲۵) انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول فتح جنگ کو تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر م۔ اللہ داد خاں کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے، انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول جہلم مقرر کیا گیا۔

ای ۱۰۶۵۳/ ۲۶ نومبر ۵۳ء خان ریاض لیاقت بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (۱۳۰ ــ ۲۵) انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول مری کو جن کے تبادلہ کے احکام بطور انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول باغبان پورہ جاری ہو چکے تھے۔ م ظفر علی ملک کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول شرق پور مقرر کیا گیا۔

〃 م۔ظفر علی ملک۔ بی۔اے۔بی۔ٹی (۱۳۰ ـ ـ ۲۵۰) انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول شرق پور کو
تاریخ حاضری سے م۔عبدالمجید خاں کی جگہ جن کا تبادلہ بطور ر اے۔ ڈی۔آئی شیخوپورہ ہو چکا ہے۔
انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول باغبان پورہ مقرر کیا گیا۔

ای/۱۰۵۸۱ س۔اختر سبطین بی۔اے۔بی۔ٹی (۱۳۰ ـ ـ ۲۵۰) انگریزی مدرس گورنمنٹ نارمل اسکول پپڑر
۲۴ نومبر ۱۹۵۲ء کو تاریخ حاضری سے م۔حبیب اللہ قریشی کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے انگریزی مدرس گورنمنٹ
نارمل اسکول نارووال مقرر کیا گیا۔

ای/۱۰۴۷۹ م۔محمد سرور بی۔اے۔ایس۔اے۔وی (۱۳۰ ـ ـ ۲۵۰) انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول
۲۴ نومبر ۱۹۵۲ء امال گڑھ کو تاریخ حاضری سے م۔عزیز حسین کی جگہ جن کا تبادلہ ڈائرکٹر محکمہ تعلیم کے حکم سے
منسوخ ہو چکا ہے انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول پسرور مقرر کیا گیا۔

ای/۱۰۴۱۲ م۔بشیر خاں میٹرک۔ایس۔وی۔ایک امیدوار کو جن کی تقرری کے احکام بطور قائم مقام
۱۸ نومبر ۱۹۵۲ء اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول گجرانوالہ ڈائرکٹر تعلیم کے دفتر سے جاری ہو چکے تھے۔
تاریخ حاضری سے م۔محمود علی کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اور م۔احمد شاہ کی جگہ جو
سبکدوش ہو چکے ہیں (۶۰ ـ ـ ۱۴۰) کے گریڈ میں ۶۰/- روپے ماہوار پر قائم مقام
اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول ننکانہ مقرر کیا گیا۔

〃 م۔محمود علی خاں (۶۰ ـ ـ ۱۴۰) اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول ننکانہ کو م۔عبدالغنی کی
جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ تاریخ حاضری سے اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول گجرانوالہ مقرر
کیا گیا۔

صیغۂ نساء ــــــــ شعبۂ مدارس

ای/۸۷۴۹ سماۃ شاہ جہاں۔ایس۔وی (۶۰ ـ ـ ۱۴۰) قائم مقام معلمہ اردو گورنمنٹ ہائی اینڈ نارمل
۱۷ نومبر ۱۹۵۲ء اسکول مظفر گڑھ کو تاریخ حاضری سے ایک موجودہ خالی جگہ اور اپنی تنخواہ پر قائم مقام
اردو معلمہ گورنمنٹ زنانہ مڈل اسکول راجن پور مقرر کیا گیا۔

تعلیمی ماہنامہ

آموزش
لاہور

اگست سنہ ۱۹۵۴ء

جلد ——— ۷

شمارہ ——— ۵

سالانہ چندہ

پاکستان کے لئے ۶ روپے

غیر ممالک کے لئے ۸ روپے

قیمت فی پرچہ دس آنے

پبلشرز

یونیورسٹی بک ایجنسی لاہور

ایچ ڈی خالد پرنٹر پبلشر نے دین محمدی پریس لاہور میں طبع کراکے
یونی ورسٹی بک ایجنسی ۲ کچہری روڈ لاہور سے شائع کیا

یونی ورسٹی امتحانات کے نتیجے

ایم۔ اے۔ مخدومی

پنجاب یونی ورسٹی کے مختلف امتحانوں کے نتیجے نکل چکے ہیں ان پر ایک سرسری نگاہ ڈالنے سے ہماری تعلیمی زندگی کی جو عام تصویر آنکھ کے سامنے آتی ہے اس کا اندازہ نیچے دیئے ہوئے اعداد و شمار سے ہوگا۔

نام امتحان	شامل ہونیوالوں کی تعداد	کامیاب ہونیوالوں کی تعداد	تناسب فی صد
میٹریکولیشن	۴۱۶۳۳	۲۳۲۸۹	۵۵،۹
ایف۔ ایس سی (میڈیکل)	۲۸۴۰	۵۳۲	۳۱،۶
" " (نان میڈیکل)	۱۹۸۶	۷۱۴	۳۵،۹
ایف۔ اے	۷۳۹۴	۲۸۶۰	۳۸،۶
بی۔ ایس سی	۷۵۳	۳۰۱	۳۹،۹
بی۔ اے	۲۵۸۵	۸۴۷	۳۲،۷

یہ اعداد و شمار اپنی شرح آپ ہیں۔ یہ بات خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ اکثر صورتوں میں کامیاب امیدواروں کا فی صد تناسب پچھلے سالوں کے مقابلہ میں کافی کم ہے۔ فی صد تناسب زیادہ یا کم ہونے کو بذات خود کوئی اہمیت حاصل نہیں۔ تعلیمی طور پر اہم چیز یہ ہے کہ

حالات کی پیداوار ہے اور یہ حالات صحت مند تعلیمی زندگی کے لئے کس حد تک ساز گار ہیں۔ ان سوالوں کے صحیح جواب تلاش کرنا اور ان کی روشنی میں نظامِ تعلیم میں ضروری تبدیلیاں کرنا اس وقت قوم کی شدید ضرورتوں میں سے ایک ضرورت ہے۔

ایک قابل احترام اور ذمہ دار ماہر تعلیم نے پست تعلیمی معیاروں کے لئے بڑی حد تک سیاسی حالات کو ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔ جن کے باعث سال میں پانچ مہینے تک دماغی محنت کم و بیش ناممکن ہو جاتی ہے۔ ان کی رائے میں تمام تعلیمی اداروں کو مصنوعی طور پر ٹھنڈا رکھنے کے انتظامات ہونے چاہئیں۔ انہوں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ بی اے کا نصاب تین سالہ ہونا چاہئے۔ یونیورسٹی میں صرف چیدہ چیدہ طالب علموں کو داخل کیا جانا چاہئے۔ اور انگریزی زبان پر بہتر قدرت کے لئے مناسب انتظامات ہونے چاہئیں۔

یہ افکار ایک ایسے ذہن کی پیداوار ہیں جس نے بڑی توجہ اور دل سوزی کے ساتھ ہمارے تعلیمی مسائل کا مطالعہ کیا ہے۔ اس لئے ان پر بڑی سنجیدگی سے غور ہونا چاہئے۔ یہ حقیقت ناقابلِ انکار ہے کہ ہر نظامِ تعلیم کو گرد و پیش کے معاشی اور معاشرتی ماحول کا پورا لحاظ رکھنا چاہئے۔ تعلیمی اداروں کے لئے مصنوعی برودت کا انتظام کرنے میں دو دقتیں خاص طور پر ظاہر ہیں۔ ان میں سے پہلی مالی دشواری ہے۔ اگر اس پر کسی طرح قابو پا بھی لیا جائے تو پھر سوال یہ ہے کہ جن نوجوانوں نے ان تعلیمی سرد خانوں میں پرورش پائی ہوگی کیا وہ ان تیز و تند جھکڑوں کا مقابلہ کر سکیں گے جو ہمارے جغرافیائی اور معاشی معاشرتی ماحول کو آئے دن تہ و بالا کرتے رہتے ہیں ؛ یونیورسٹیوں میں داخلہ محدود کر دینے کا مسئلہ بھی کافی ٹیڑھا ہے۔ اگر بیشتر نوجوانوں پر یہ دروازے بند ہو جاتے ہیں تو ان کے لئے دوسرے دروازے کھلے ہونے چاہئیں۔ اس وقت ٹیکنیکل اور پیشہ ورانہ تعلیم کے ادارے کافی تعداد میں موجود نہیں۔ نوجوان اس بات پر مجبور ہیں کہ میٹرک کے بعد کالجوں کا رُخ کریں۔ یہ بھیڑ اسی صورت میں کم ہوگی جب ان کے سامنے متبادل راستے کھلے ہوں گے۔ ایسے راستے پیدا کئے بغیر اعلیٰ تعلیم کے دروازے بند کرنا اچھے نتیجے پیدا نہیں کرسکتا۔ ڈگری کا نصاب تین سالہ ہو جانے سے بھی

از خود کوئی معجزہ پیدا نہیں ہو جائے گا۔ اسے اعلیٰ تر تعلیمی معیاروں کا ضامن بنانے کے لئے نصاب اور طریقہ ہائے تدریس کی تعمیر تو ضروری ہو گی۔

ایک اور ذمہ دار ماہر تعلیم نے انگریزی زبان کے پست معیار اور پرہجوم جماعتوں کے علاوہ ایک اور سبب پر بھی انگلی دھری ہے جو اخلاقی نوعیت کا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ طلبا، اساتذہ اور والدین تینوں بے توجہی اور بددلی کا شکار ہیں۔ یہ ہمہ گیر بددلی ہی تعلیمی معیاروں کو نیچے گرانے کا سب سے بڑا سبب ہے۔

اس نقطۂ نگاہ میں کافی سچائی موجود ہے جن لوگوں نے آج سے بیس سال پہلے کے طالب علم، استاد اور والد کو دیکھا ہے۔ وہ قدرتی طور پر موجودہ حالت کو بددلی کی تصویر خیال کرتے ہیں۔ بددلی کے ان تینوں عناصر میں سے استاد کی ذمہ داری صریحاً زیادہ ہے۔ اسے ماضی کے آئینہ میں اپنی تصویر دیکھ کر چونک اٹھنا چاہیئے۔ یہ اس کی خود ذمہ داری اور قوت عمل کو ایک کھلی ہوئی دعوت ہے۔ اسے یہ دعوت قبول کرنی چاہیئے اور جماعت کے کمرے میں اور اس سے باہر اپنی ذمہ داری کو سرگرمی اور جذبہ کے ساتھ انجام دینا چاہیئے۔ ہماری تاریخ میں استادوں نے نہ صرف شاگردوں کے دل و دماغ کو متاثر کیا ہے۔ بلکہ انہوں نے لوگوں کی زندگیوں میں بھی تبدیلیاں پیدا کی ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمارے اساتذہ ان شاندار قومی روایات کو پھر سے زندہ کریں اور اپنے پیشے کے مقام کو دوبارہ پرانی بلندی پر لے جائیں۔ یہ کام ان کے آپنے کرنے کا ہے۔ کسی دوسرے کے کرنے کا نہیں۔

پاکستانی کرکٹ کی فتح

چوتھے اور آخری ٹسٹ میچ میں پاکستانی کرکٹ ٹیم نے جو فتح حاصل کی ہے وہ یادگار رہے گی۔ اس فتح نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ہمارے نوجوانوں میں لامحدود صلاحیتیں سوئی پڑی ہیں جو

تربیت اور تنظیم سے جگائی جا سکتی ہیں۔ جن لوگوں کے ہاتھ میں نوجوانوں کی تعلیم و تربیت ہے ان کے دلوں میں اس خبر سے ایک نیا یقین پیدا ہو جانا چاہیے۔ یہ فتح نہ صرف کامیابی کا ایک خوش گوار احساس پیدا کرتی ہے بلکہ ایک پیغام بھی سناتی ہے۔ وہ پیغام یہ ہے کہ مدرسے کی غیر نصابی سرگرمیاں اپنے اندر بے تحاشہ امکانات رکھتی ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ اساتذہ اس پیغام پر کان دھریں گے اور نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں کو قومی سربلندی کا ذریعہ بنانے میں پہلے سے بڑھ کر کام کریں گے۔

رہ نمائی کا فن

فضل احمد

چند برسوں کی بات ہے ایک استاد کو کلرکی کی آسامی پیش کی گئی۔ تنخواہ دس بیس روپے ز
تھی۔ اس پر اُس نے بڑے جذبے سے جواب دیا کہ واہ میں با اختیار حیثیت چھوڑ کر بے اختیار ک
بن جاؤں؟ اس وقت میں طالب علموں کو ہدایات دیتا ہوں کہ یہ کرو۔ اس طرح کرو۔ اس طرح
کرو۔ کلرک بن کر میں فائلوں کے پلندوں تلے دب جاؤں گا۔ اس سے میری روح کی شادابی ختم ہو جائے
اس قربانی کے مقابلہ میں دس بیس روپے کی کچھ حقیقت نہیں۔ کلرک کی تنخواہ پانچ سو بھی ہو تو بھ
صاحب اختیار نہیں۔ استاد کو گو پچاس روپے ملتے ہوں اس پر بھی وہ ایک با اختیار انس
ان باتوں میں غلو کا عنصر موجود ہے لیکن یہ بات ماننی پڑے گی کہ اُستاد ایک انسانی گروہ کا ر
ہوتا ہے۔ یہ حیثیت بذات خود ایک ایسی بلندی رکھتی ہے جو نا قابل انکار ہے۔ ہر استاد جو صحیح م
میں استاد ہے اپنی اس بلند حیثیت کا کچھ نہ کچھ احساس ضرور رکھتا ہے۔ جو استاد اپنی بے حیثی
رونا رویا کرتے ہیں ان میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہوتی ہے جنہیں نہ اپنے پیشے کے ساتھ ک
فطری دل بستگی ہوتی ہے اور نہ ہی انہوں نے یہ دل بستگی پیدا کرنے کی کبھی کوئی کوشش کی۔ است
دراصل ایک رہ نما ہے۔ وہ رہ نمائی کی صلاحیتیں ساتھ لے کر پیدا بھی ہو سکتا ہے اور وہ یہ صلا
کوشش کے ساتھ اخذ بھی کر سکتا ہے۔ رہ نمائی ایک مستقل فن ہے۔ اور ہر فن کی طرح اس
باقاعدہ مطالعہ اور مشق فائدہ مند نتائج پیدا کر سکتی ہے۔

رہ نمائی کی ضرورت یہ ایک عام شکایت ہے کہ ہمارے ملک میں رہ نما زیادہ ہیں اور
کرنے والے تھوڑے۔ جدھر آنکھ اٹھا کر دیکھو لیڈر ہی لیڈر نظر آتے ہیں۔ یہ صاحب فلاں
کے صدر ہیں۔ یہ اس کے سیکرٹری ہیں۔ یہ فلاں کلب کے کپتان ہیں۔ یہ بھی صاحب فلاں فلا

[illegible] وغیرہ۔ رہنمائی کی یہ بھرمار اسی دور کا خاصہ ہے۔ ورنہ پہلے پہلے زمانوں میں یہ چیز کہاں تھی [illegible] اپنے کام سے کام رکھتا تھا۔ یہ بات ہے تو درست لیکن اس پر افسوس کرنے کی کوئی وجہ نہیں [illegible] سائنس اور ٹکنالوجی نے موجودہ زمانے میں جو معاشرتی حالات پیدا کر دیئے ہیں پہلے وقتوں میں ان کا نام و نشان نہ تھا۔ پہلے حالت یہ ہوتی تھی کہ کم و بیش سارا معاشرہ ایک وحدت ہوا کرتا تھا اب اس بڑی وحدت کے تحت کئی چھوٹے بڑے دائرے پیدا ہو گئے ہیں جو اگرچہ ایک دوسرے کو کاٹتے ہیں۔ تاہم وہ اپنی اپنی جگہ الگ ہیں۔ جدید معاشی نظام کے ماتحت مختلف مفاد الگ الگ منظم ہو رہے ہیں۔ پچھلے دنوں ایک ضلعی صدر مقام میں پنجاب کے چپڑاسیوں کی سالانہ کانفرنس ہو رہی تھی۔ یہ ان مفادوں کی تنظیم کی ایک ادنیٰ مثال ہے۔ ان تنظیموں میں سے بعض مثلاً کراچی کے درآمدی بیوپاریوں کی انجمن یا پاکستان کے کارخانوں کے مالکوں کی انجمن بہت اثر و رسوخ رکھتی ہیں بعض اوقات ان کی آواز ملک کے کروڑوں خریداروں کی آواز سے زیادہ وزن دار بن جاتی ہے۔ یہ محض مثالیں ہیں بعض تنظیمیں ان کے مقابلے میں بہت چھوٹی اور کم اثر ہیں لیکن اس قدر ضرور ہے کہ ہر تنظیم ایک فرد کے مقابلے میں کہیں زیادہ طاقت ور اور با اثر ہے دورِ حاضر کا انسان اپنے آپ کو بے شمار تنظیموں سے گھرا پاتا ہے۔ ان میں سے بعض ملکی ہوں گی اور بعض غیر ملکی۔ وہ اپنے آپ کو ان کے مقابلے میں بالکل بے بس پاتا ہے۔ اس بے بسی کے علاج کی صرف ایک ہی صورت ہے۔ وہ یہ کہ وہ خود کسی تنظیم میں شریک ہو جائے۔ جہاں کسی تنظیم کی ضرورت نے سر اٹھایا وہاں رہنمائی کی ضرورت از خود پیدا ہو گئی۔ فرد کی خودی کے اچھی طرح بڑھنے پھولنے کے لئے ضروری ہے کہ جس تنظیم میں وہ شامل ہوا ہے اس کی رہنمائی مناسب ہاتھوں میں ہو۔ رہنمائی کی ضرورت کا پیدا ہونا اور بات ہے اور اس ضرورت کا پورا ہونا دوسری بات سائنسی اور ٹیکنیکل تہذیب نے جس طرح رہنمائی کی ضرورت کو عام کر دیا ہے اس کی کچھ شرح اوپر گذر چکی ہے۔ اس ضرورت کو مناسب طور پر پورا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ دورِ حاضر کا [illegible] صحیح رہنمائی کی ماہیت اور اس کے فرائض سے پوری طرح واقف ہو۔

رہ نمائی کیا شے ہے ؟ رہ نما یا لیڈر کا لفظ ایک عام ذہن میں عجیب و غریب تصورات پیدا کرتا
ہے۔ اس کی وجہ وہ سیاسی شعبدہ بازیاں ہیں جو پچھلے پچاس برس میں رہ نمائی کے نام پر لوگوں کی
آنکھوں کے سامنے آئی ہیں لیکن ہم دیکھ چکے ہیں کہ موجودہ زمانے میں زندگی کے ہر شعبے میں
کی حقیقی ضرورت ہے۔ آج رہ نماؤں کی مانگ اتنی زیادہ ہے کہ پہلے کسی دور میں نہ ہوئی تھی
ہمیں چاہیے کہ رہ نمائی کا مفہوم اچھی طرح سمجھ لیں۔ رہ نمائی کا کام گو اتنا ہی قدیم ہے جتنا انسانی
معاشرہ، تاہم اس کام کا تنقیدی تجزیہ حال ہی میں ہونے لگا ہے۔ رہ نمائی کے متعلق بے تکی
بے سروپا باتیں کہی گئی ہیں۔ اکثر یوں ہوتا رہا ہے کہ زندگی کے کسی شعبہ میں کوئی غیر معمولی شخصیت کا
انسان پیدا ہو گیا جس نے اس میدان میں اپنی رہ نمائی کا سکہ منوایا بعض لوگوں نے اس کی خصوصی
خوبیوں کو رہ نمائی کا خلاصہ سمجھ کر انہیں ہر رہ نما کے لئے ضروری قرار دے دیا۔ اب یہ بات
مان لی گئی ہے کہ رہ نما کی کامیابی میں وقتی حالات کو اتنا ہی دخل ہے جتنا اس کی ذاتی خوبیوں کو۔
حقیقی رہ نمائی خالصتہً ایک روحانی شے ہے۔ یہ اس بات کا مطالبہ کرتی ہے کہ حالات کے انسانی
عناصر کا بڑی حساس دلی کے ساتھ احترام کیا جائے۔

فن رہ نمائی کے مشہور عالم آرڈوے ٹیڈ کے الفاظ میں " رہ نمائی اس علم کا نام ہے جس کے
ذریعہ لوگوں کو کسی ایسے مقصد میں شریک ہونے کے لئے متاثر کیا جاتا ہے جسے وہ پسندیدہ سمجھنے
لگے ہوں"۔ انسانی فطرت کا ایک عجیب معمّہ یہ ہے کہ یہ گھٹیا قسم کے دنیاوی دھندوں میں الجھی رہتی
ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی نہاں خانہ دل میں چھپی ہوئی کوئی نامعلوم آواز اکثر سے بلندیوں کی طرف
پکارتی رہتی ہے۔ عام انسانوں کی صورت میں یہ آواز اتنی دھیمی اور کمزور ہوتی ہے کہ وہ انہیں
بلند سطح پر نہیں لے جا سکتی۔ تاہم اس میں اتنی چبھن ضرور ہوتی ہے جس سے دنیاوی دھندوں
کی کامیابیاں اپنا لطف کھو بیٹھتی ہیں۔ گھٹیا دنیاوی کامرانیوں کے باوجود ناکامی کا ایک ناسور
دل کو بے چین رکھتا ہے اور عام لوگ کسی ایسے شخص کے بھوکے رہتے ہیں جس کی جادو بھری
انہیں بلند تر فضاؤں میں سانس لینے کا موقع دے اور اس طرح ان کی شخصیت کی

آگے چلیں سپی رہنمائی کا کام یہ ہے کہ سوئی ہوئی قوتوں کو جگا کر انہیں گھٹیا قسم کے بندھنوں سے آزاد کر دے اور انہیں ...... ایک ایسے کام میں ڈال دے جو خودی کو ابھرنے کا موقع دے اور نفس کو گھٹیا پن کی بھاری بھرکم زنجیروں سے نجات دلائے۔

یہ ہو سکتا ہے کہ رہنما کے پیش نظر بعض اونچے مقاصد ہوں جن کے ساتھ اسے گہرا دلی لگاؤ ہو لیکن جب تک وہ دوسرے دلوں میں ان کے لئے لگاؤ پیدا نہ کر لے اسوقت تک وہ ان کو دوسروں پر تھوپ نہیں سکتا۔ رہنما کا کام اس کے الٹ یہ ہونا چاہیئے کہ وہ افراد کی دست گیری اور حوصلہ افزائی کرے تاکہ وہ مل کر جماعتی مقاصد طے کریں۔ ہر چند کہ یہ مقاصد پہلے سے رہنما کے دل میں ہوں گے وہ دوسروں کو اس طور پر اپنا ہم خیال بنا لیتا ہے کہ وہ مقاصد اب ان کے اپنے مقاصد بن جاتے ہیں، وہ اب یہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ ان مقاصد کی کامیابی میں ان کی ذاتی کامیابی ہے اور انکی ناکامی میں ان کی ذاتی ناکامی بس رہنما دوسروں کی خودی کو سہارا دے کر ان کی سوئی ہوئی قوتوں کو جگا دیتا ہے اور انہیں باہم ملا کر ایک ایسی ہم آہنگ جماعتی کوشش کی شکل دیتا ہے جو حصّہ لینے والے تمام افراد کے لئے اطمینان اور سرور کا باعث بن جاتی ہے، اس سے افراد کو نہ صرف ایک نئی مسرت محسوس ہونے لگتی ہے۔ بلکہ انہیں ایک نئی قوت کا احساس بھی ہونے لگتا ہے افراد کے اندر ایک نئی بصیرت پیدا ہو جاتی ہے جس کی روشنی میں اور نئے مقاصد پیدا ہو جاتے ہیں۔ افراد ایسی بلند فضاؤں میں پہنچ جاتے ہیں جن کا انہیں پہلے کبھی وہم و گمان نہ ہوا تھا۔ ان کی انفرادی کوششیں اپنی ساری ہوشیاری اور معاملہ فہمی کے باوجود کبھی یہ معجزہ پیدا نہیں کر سکتی تھیں۔

رہنما کی کامیابی اس میں ہے کہ وہ ایسا ماحول اور ایسی ذہنی فضا پیدا کر دے جس کی بدولت رہنما کے مقاصد دوسرے لوگوں کے دلوں میں بس جائیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ اب کسی بیرونی قوت کی فرماں برداری میں یا دل نا خواستہ مشقت نہیں اٹھائیں گے بلکہ پوری سرگرمی اور تن دہی سے ایک ایسی چیز کے لئے کام کریں گے جو ان کے اپنے دلوں کو عزیز ہے۔ اس کوشش کی کامیابی یا ناکامی اب کوئی دور دراز کی پرائی چیز نہیں بلکہ اب اس پر ان کی اپنی آبرو اور خودداری کا مدار ہے

وہ ان مقاصد کو پورا کئے بغیر فخر کے ساتھ سر اونچا نہیں کر سکتے۔ رہنمائی اور فرماں دہی میں بس اتنا ہی فرق ہے کہ اوّل الذکر جس قوت کے سہارے جیتی ہے وہ پوری رضامندی اور شوق کے ساتھ اس کے قدموں پر نچھاور کی جاتی ہے۔ جبکہ آخر الذکر اس قوت کو جبر اور اکراہ کے ساتھ حاصل کرتی ہے۔

رہنمائی اس چیز کا نام ہے کہ دوسروں پر اس طرح غیر محسوس اثر ڈالا جائے کہ وہ اسی سمت میں چلنے لگیں جس میں رہنما اس عمل سے انہیں یہ احساس ہونے لگے کہ وہ بلند تر سطح پر پہنچ گئے ہیں۔ یہ ایک ہنر ہے جو پُراسرار انسانی قوتوں اور نفسیاتی سرچشموں سے سیرابی حاصل کرتا ہے۔ ان گہرے اور پیچیدہ عناصر کو ہاتھ میں لینے اور ان سے ایک متناسب مرکب تیار کرنے کے لئے نہ صرف گہری بصیرت کی ضرورت ہے بلکہ ایک ہمہ وقت حاضر اور از خود حرکت میں آنے والی حساس دلی کی بھی حس کی سرگرمی اور بے خودی بے پناہ جذباتی کشش رکھتی ہو۔ یہ وہ کام ہے جو حقیقی رہنمائی اپنے ذمہ لیتی ہے اور جس کی بدولت لوگوں کو اپنے آپ اور اپنے ماحول میں نئے معانی نظر آنے لگتے ہیں۔ یہ کام ترغیب و تحریص سے انجام پاتا ہے جبر و اکراہ سے نہیں۔

موثر رہنمائی کی شرائط | رہنمائی کے موثر ہونے کا انحصار بہت سی باتوں پر ہے جو مختلف حالات میں مختلف اشکال اختیار کریں گی۔ تاہم انہیں تین بڑے گروہوں میں بانٹا جا سکتا ہے یعنی (۱) پس منظر اس سے یہ مراد ہے کہ گروہ جس کی قیادت زیر بحث ہے کن حالات میں سے گذر کر موجودہ حالت کو پہنچا ہے اس کی تدریجی ترقی کس طرح ہوئی ہے۔ اس کے اغراض و مقاصد میں رفتہ رفتہ کیا تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں۔ اس کی قیادت حاصل کرنے کے لئے کیا کیا ذرائع استعمال ہوتے رہے ہیں اور اس میں بااثر مقام حاصل کرنے کے لئے کیا معیار مقرر ہیں (۲) رہنمائی کا کام کن حالات میں انجام دیا جانے والا ہے۔ گروہ کی موجودہ تنظیم کس شکل کی ہے۔ اس کے موجودہ مقاصد کیا ہیں۔ رہنما کو گروہ میں کونسا درجہ حاصل ہے اور جن لوگوں کے ہاتھ میں اقتدار ہے ان کے مقابلہ میں رہنما کی سرکاری حیثیت کیا ہے (۳) تیسری شق میں وہ باتیں آئیں گی جن کا تعلق رہنما کے اپنے عمل کے ساتھ ہے مثلاً وہ کون سے طریقے استعمال کرتا ہے۔ ان سے کس قسم کا مجموعی اثر پیدا ہوتا ہے، ان کی تاثیر کن حدود تک

پہنچتا ہے۔ رہ نما گروہ کے افراد اور بیرونی دنیا کے ساتھ میل جول قائم رکھنے کے لئے کون سے ذرائع استعمال کرتا ہے۔ وہ اپنے فرائض کس فضا میں انجام دیتا ہے اور وہ کس حد تک پُر تاثیر ہیں۔

کامیاب رہ نما کو ان تمام باتوں کی طرف پوری پوری توجہ دینی ہوگی، اس سلسلے میں اسے کوئی طے شدہ اور بنا بنایا نمونہ، عمل ہاتھ نہیں لگے گا جس کی آنکھیں بند کرکے تقلید ہوتی رہے۔ پھر بھی بعض بنیادی باتوں کی طرف اسے ہر حال میں توجہ دینی ہوگی۔ ان میں سے زیادہ اہم مندرجہ ذیل ہیں

۱۔ رہ نما کو یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیئے کہ گروہ بعض نفسیاتی یا اقتصادی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے زندہ ہے۔ بلکہ اس کی زندگی کا انحصار ہی اس بات پر ہے کہ یہ ضرورتیں پوری ہوتی رہیں۔ یہ ضرورتیں وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔ رہ نما کو ان ضرورتوں کی نوعیت اور ان کے پورا کرنے کا ہر حال میں خیال رہنا چاہیئے، اسے گروہ کو اپنے عمل سے یہ یقین دلانا چاہیئے کہ وہ اس کی ضرورتوں کو سمجھنے اور انہیں پوری کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ایسا نہ ہونے کی صورت میں مذہبی اور سیاسی گروہوں میں پھوٹ پڑ جاتی ہے اور بعض اوقات وہ بالکل ختم ہو جاتے ہیں۔ بدھ مت راجپوت راجاؤں کی جنگجو فطرت کا ساتھ نہ دے سکنے کی وجہ سے ہندوستان سے بالکل مٹ گیا۔ گاندھی جی ایک ہندو کی گولی کا شکار ہو گئے کیوں کہ نئی آزادی نے ہندو قوم میں قوت اور طاقت کا ایسا نشہ پیدا کر رکھا تھا جس کے جوش میں وہ کم زور رسالوں کو ہڑپ کر جانا چاہتی تھی۔ ایسی فضا میں گاندھی جی کا عدم تشدد کا فلسفہ جس نے برطانوی شہنشاہیت کا مقابلہ کیا تھا بیکار ہو کر رہ گیا تھا۔ اس اصول کا ایک بدیہی نتیجہ یہ بھی ہے کہ رہ نما کا عمل خود غرضی سے نسبتاً پاک ہو بعض مذہبی اور سیاسی رہ نماؤں کی ساری سرگرمیاں غرض پرستی کے لئے وقف ہو کر رہ جاتی ہیں۔ ایسی رہ نمائی دیر پا ثابت نہیں ہو سکتی۔ زود و بدیر ہر گروہ کی آنکھیں کھلنے لگیں گی اور شدید ردِ عمل رہ نمائی کو ختم کرکے رکھ دے گا۔

۲۔ یہ لازمی ہے کہ رہ نما سارے گروہ میں یکتا قابلیت کا مالک ہو۔ وہ جس مخصوص میدان میں راستے دکھانے کا کام کر رہا ہے اس میں اس کی فنی مہارت مانی ہوئی ہو۔ وجہ بالکل عیاں ہے،

لوگ چاہتے ہیں کہ انہیں کسی ایسے شخص کا سہارا ہو جو ان سے بڑا ہو۔ رہنما کی ذات کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایسی بلندی کی طرف اشارہ کرے جس کی طرف دوسرے رشک اور تمنّا سے نگاہ ڈالیں۔ اس کے بغیر کوئی رہنما دوسروں میں بھروسہ اور جذبہ پیدا نہیں کرسکتا۔ ایک کارخانہ کے مزدور کے لفظوں میں "اگر نگران کو یہ خبر نہیں کہ میں کب اپنا کام بے توجہی اور بدسلیقگی سے کررہا ہوں تو وہ یقیناً یہ معلوم نہیں کرسکے گا کہ میں کب اسے دیانت داری اور جاں فشانی سے انجام دے رہا ہوں"۔ ایک اور وجہ سے بھی رہنما میں اس خوبی کا ہونا ضروری ہے۔ ہر انسان طبعاً محنت اور دیانت سے کام کرنا چاہتا ہے۔ لیکن نفس یا ماحول کی اکساہٹ بعض اوقات اسے بددلی پر آمادہ کردیتی ہے۔ وہ اس کمزوری سے بچنے کے لئے کوئی سہارا چاہتا ہے۔ یہ سہارا رہنما کی بلند درجہ قابلیت ہی ہوسکتی ہے، جب رہنما اپنی ذاتی مثال سے فنی مہارت اور قابلیت کا ایک اونچا معیار قائم کرکے دکھلاتا ہے تو اس سے گروہ کے افراد میں اطمینان اور سلامتی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔

۳۔ رہنما دوسروں میں سرگرمی اور جذبہ اسی صورت میں پھونک سکتا ہے جب اس کی اپنی شخصیت سرگرمی اور قوت کا سرچشمہ ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس میں بدنی اور اعصابی توانائی کی فراوانی ہو۔ اس کی نگاہ دور تک دیکھنے والی ہو۔ وہ ہر وقت چوکس رہ سکے اور اس کا یقین ہر جھٹکے کا مقابلہ ثابت قدمی سے کرسکتا ہو۔ ان خوبیوں کے بغیر رہنما جدوجہد کے تاریک دور میں سے نہیں گذر سکے گا۔ یہ خوبیاں عام حالات میں سرگرمی اور پرامیدی کا منبع ثابت ہوتی ہیں اور مشکلات کے دور میں پشت پناہی کا کام دیتی ہیں۔ انڈونیشیا کے جہاد آزادی میں عبدالرحیم سوکارنو کے بے پناہ عزم نے آزاد جمہوریہ کے تصور کو اس وقت بھی روشن رکھا جب استعمار کی فوجی قوت نے وطن پرستوں کا قریباً قریباً گلا ہی گھونٹ دیا تھا۔ رہنما کی غیر معمولی قوت ہر آن نئے افق پیدا کرتی رہتی ہے اور اس طرح گروہ کی سرگرمی ناامیدی کی دلدل میں تہ نشین ہونے سے بچ جاتی ہے۔

۴۔ رہنما لازماً گروہ میں ایسا نقطہ پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے جو پہلے سے موجود نہ تھا۔ اس کے لئے نہ صرف خوش خلقی اور محبت کی ضرورت ہے۔ بلکہ تدریسی مہارت کی بھی۔ رہنما کو یہ بات کبھی نہ بھولنی چاہیئے کہ ہر حالت میں ایک سے زیادہ بنیادی قوتیں معروف عمل رہتی ہیں۔ اسے چاہیئے کہ ان کی سمت اور گہرائی معلوم کرے۔ وہ مخالف قوتوں کو ملیا میٹ نہیں کر سکتا۔ ہاں وہ حوصلے، بصیرت اور دور بینی سے کام لے کر ان کے رخ میں اتنی تبدیلی ضرور پیدا کر سکتا ہے کہ وہ اس کی کوششوں پر پانی پھیرنے کی بجائے انہیں تقویت دینے والی بن جائیں۔ یہ غرض حاصل کرنے کے لئے اسے اپنی کوششوں کا رخ اس طور پر متعین کرنا چاہیئے جو قابل عمل ہو۔ اور جس کی وسعت ہمہ گیر ہو۔ مثال کے طور پر ہم ہندی مسلمانوں کی تحریک خلافت کا ذکر کر سکتے ہیں۔ یہ تحریک خالصتہً بین الاسلامی تحریک تھی جس کا گاندھی جی کی ہندو کانگرس سے دور کا تعلق نہ تھا۔ بلکہ ایک طرح یہ اس کی براہ راست ضد تھی۔ لیکن گاندھی جی کی ہوشمندی اور دور بینی نے اس مخالف قوت کو اس طرح اپنے ڈھب پر کر لیا کہ اس کی بدولت انکے ہاتھ کئی گنا مضبوط ہو گئے۔ خلافت کے رہنماؤں کی آنکھیں اس وقت کھلیں جب گاندھی جی اپنا مطلب پورا کر چکے تھے۔

مخصوص عناصر | مندرجہ بالا عناصر ہر قسم کی رہنمائی کے لئے بنیادی درجہ رکھتے ہیں۔ ان کے علاوہ بعض اور چیزیں بھی ہیں جن کا لحاظ اس صورت میں ضرور رکھا جانا چاہیئے جہاں رہنمائی روہ کا بہت بڑا سہارا ہو یعنی گروہ اس کے بغیر اپنی بنیادی ضرورتوں کو بالکل پورا ہی نہ کر سکتا ہو یسی صورت میں فیصلہ کا جلد ہو جانا اور اس پر تیزی سے عمل ہونا نہایت ضروری ہے۔ وجہ بالکل ظاہر ہے ں حالت میں ہر فیصلہ چوٹی پر کیا جاتا ہے اور وہاں سے چھن چھن کر نچلی سطحوں پر آتا ہے۔ تاخیر اور التوا ے بے یقینی اور بے عملی کا پیدا ہو جانا ناگزیر ہے۔ ایک بڑے فوجی افسر نئے نئے مقرر ہو کر آئے بڑے ستی اور دیانت دار تھے اور ہر چھوٹے سے چھوٹا کام خود کرنے کے قائل تھے۔ صبح سویرے میز پر آ بیٹھتے ہ وقت ختم ہو جانے کے بعد بھی کام میں لگے رہتے، اس کے باوجود میز پر ایسے کاغذوں کا ڈھیر لگ گیا

جن پر ابھی دستخط ہونے باقی تھے۔ ایک دن مزدوروں نے دوپہر کے وقت کام ختم کر لیا بسکن
ان کے پاسوں پر تین بجے تک دستخط نہ ہو سکے۔ اس محنتی افسر کے خلاف شکایات بڑھنے لگیں کئی کام
رک گئے اور آخر کار اسے چھٹی دینی پڑی۔

رہنمائی کی کامیابی کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کی کوششوں کا ثمر ذاتی رنگ کی بجائے
جماعتی رنگ میں رنگا ہوا ہو۔ زیادہ زور بنیادی تصور پر ہو نہ کہ چھوٹی چھوٹی تفصیلوں پر۔ اپنے کام
کو خوبی سے انجام دینے کے لئے ضروری ہے کہ کلیدی آسامیوں اور عہدوں پر اس کے بھروسہ کے
آدمی ہوں۔ اس غرض کے لئے اسے ایسے نائبوں کی ایک جماعت تیار کرنی چاہئے جن کے دلوں میں
اس کے سینے کا شعلہ پوری گرمی سے بھڑک رہا ہو۔ اس طور پر اس شعلہ کی گرمی سارے گروہ تک پہنچ
سکتی ہے۔ سرکاری افسروں کو عموماً اپنے نائب خود مقرر کرنے کا موقع زیادہ نہیں ملتا، پھر بھی اگر وہ
دوراندیشی اور بصیرت سے کام لیں تو ان نائبوں کے دلوں میں اپنی سرگرمی کی چنگاری سلگا سکتے ہیں۔

ایک اور ضروری چیز یہ ہے کہ رہنما اور گروہ کے درمیان کوئی ناقابل عبور پردے حائل نہ ہوں
تاکہ چوٹی سے ہر طرح کے تصورات اور خیالات بلا روک ٹوک نیچے جا سکیں اور نچلی سطحوں کے احساسات
پوری آزادی سے اوپر پہنچ جائیں۔ اس مطلب کے لئے رہنما اور گروہ کے مختلف حصوں کی ملاقاتیں
اکثر ہوتی رہنی چاہئیں اور اس کی تحریری ہدایات بھی سب تک پہنچتی رہنی چاہئیں۔ رہنما اور بااثر نائبوں
کے درمیان ملاقاتیں زیادہ کثرت سے ہونی چاہئیں۔ ہر شخص کے فرائض اور حقوق کی وضاحت
پوری طرح ہو جانی چاہئے۔ یہ کام تحریر کے ذریعے زیادہ اچھی طرح ہو سکتا ہے۔ بعض افسر تحریری ہدایات
کی بھرمار کے عادی ہوتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کے بارے میں لمبی تحریری ہدایات جاری کرنے کا
مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ جاری کرنے والے کے خیال میں دوسرے لوگ معمولی سوجھ بوجھ سے بھی
خالی ہیں، اس سے بددلی پیدا ہوتی ہے۔

رہنما کو چاہئے کہ اپنی سطح کا لحاظ رکھے اور اپنے دائرۂ عمل کو نیچے نہ اترنے دے۔ لوگ ایسے
رہنما کو پسند کرتے ہیں جو خوش اخلاق ہو اور ہر ایک کے ساتھ برابری سے پیش آئے لیکن انہیں

یہ بات پسند نہیں کہ وہ پستی میں اُتر آئے۔ ایک صدر معلم خوش مزاجی کی ترنگ میں گھٹیا قسم کے مذاق پر اُتر آیا کرتے تھے۔ یہ بات اساتذہ کو بہت ناگوار تھی۔ اس کی وجہ پیچھے بیان ہو چکی ہے۔ لوگ رہنما میں بلندی کے طلب گار ہوتے ہیں تاکہ انہیں سہارا ملے۔ اگر وہ خود پستی میں گرا ہوا ہے تو دوسروں کو کیا سہارا دے سکتا ہے؟

انصاف پسندی اور مضبوطی رہنما کے دو اور اہم خواص ہیں۔ لوگ دل سے یہ چاہتے ہیں کہ جو لوگ کام نہیں کرتے ان سے پوچھ گچھ ہو۔ اگر کچھ لوگ نااہل اور بدسلیقگی کے باوجود دندناتے پھرتے ہیں تو غم و غصہ کی لہر بہت تیزی سے سر اٹھانے لگے گی۔ اس ناراضگی کے لئے ضروری نہیں کہ رہنما ان بددل کارندوں کا طرف دار ہو۔ اگر وہ حد سے [بڑھی ہوئی نرم دلی] کی وجہ سے ان سے مواخذہ نہیں کرتا تو بھی ناراضگی بالکل اسی [شدت] کے ساتھ پھیلے گی۔ لوگ بجا طور پر توقع رکھتے ہیں کہ ضرورت پڑنے پر رہنما سخت اور [صاف] طریقہ اختیار کر سکے۔

رہنما کے لئے ضروری ہے کہ وہ موافق بیرونی تعلقات پیدا کرے۔ بیرونی فضا اگر سازگار ہو تو گروہ کی ہمت کو بلند رکھنے کے لئے بہت کام دے سکتی ہے۔ اس کی اہمیت اُس صورت میں اور بھی بڑھ جاتی ہے، جب گروہ بہت چھوٹا ہو اور ناموافق گھریلو رائے عامہ کے سامنے بے بس ہو۔ یا جب کسی مقصد کے حاصل کرنے میں ناکامی کا سامنا ہو۔ پاکستان کے بعض بے حد غیر مقبول مذہبی گروہ غیر ملکوں میں پروپیگنڈا کا بے حد اہتمام کرتے ہیں اور غیر ملکی اخباروں کے موافق تبصرے ملک کے گروہ میں خوب ڈھنڈورا پیٹے ہیں۔ اس سے غرض یہ ہوتی ہے کہ ڈوبتے ہوئے دلوں کو تنکے کا سہارا ہی مل جائے۔

تعلیمی رہنمائی مضمون کے شروع میں کہا گیا تھا کہ اُستاد بلاشبہ ایک گروہ کا رہنما ہے مگر یہ گروہ بچوں کا ہے۔ بچے بالغ نہیں ہوتے اور انہیں معاشی اور سیاسی امور پریشان نہیں کرتے اس لئے بعض باتیں جن پر اوپر بحث ہوئی ہے مدرسے کی زندگی پر لاگو نہیں۔ پھر بھی جہاں تک نفسیاتی حقائق کا تعلق ہے ہر استاد کو ان پر پوری نگاہ رکھنی چاہیئے۔ [illegible] وہ رہنمائی کا کام

نجام نہیں دے سکے گا۔ اس ضمن میں کسی لمبی بحث کی ضرورت نہیں۔ ہر استاد اپنے حسب حال استفادے
فذ کر سکتا ہے۔

تعلیمی رہنمائی کا زیادہ اہم کام تعلیمی افسروں کے ہاتھ میں ہے۔ ان کا کام دو واضح طور پر
تلف حصوں میں بٹا ہوا ہے۔ ایک طرف انہیں اپنے ماتحت اساتذہ کی رہنمائی کا کام انجام دینا ہے
اور دوسری طرف عوام کو اپنے ساتھ لے کر چلنا ہے۔ جہاں تک پہلے کام کا تعلق ہے اس کے متعلق
وپر کی سطروں میں بہت کچھ کہا جا چکا ہے۔ ماتحت عملے کی حیثیت ایک ایسے گروہ کی ہے جو اپنی بنیادی
معاشی اور نفسیاتی ضرورتوں کے پورا کرنے کے لئے تعلیمی رہنما کا دست نگر ہے۔ لیکن عوام کا معاملہ
لگ ہے۔ عوام بھی تعلیمی رہنمائی چاہتے ہیں۔ لیکن وہ کسی کے دست نگر نہیں۔ ہمارے مدرسوں کی
یک بڑی تعداد ایسے اداروں کے ہاتھ میں ہے جو سرکاری ادارے نہیں بلکہ عوامی ادارے یعنی
یونسپل بورڈ اور ڈسٹرکٹ بورڈ کے ممبر لوگوں کے چنے ہوئے نمائندے ہوتے ہیں۔ انگریزی دور
ں ان اداروں کی آزادی عمل صرف نام کو تھی۔ ڈپٹی کمشنر ان کے نام پر جو چاہتا کرتا تھا۔ ضلع کا تعلیمی
فسر یعنی۔ ڈی۔ آئی تعلیمی معاملات میں تقریباً تقریباً مختار کل ہوتا تھا۔ اب حالات بدل چکے ہیں۔ یہ
عوامی ادارے اپنی آزادی عمل سے پورا فائدہ اٹھانے لگے ہیں۔ اس آزادی کے ساتھ سیاسی
جوڑ توڑ اور گروہ بندیوں کا آنا لازمی تھا۔ اس لئے بورڈ مدارس کے انتظامی معاملات پر بھی
ہ دھڑے بندیاں اثر ڈالنے لگی ہیں۔

ان حالات نے ڈی۔ آئی کے لئے عجیب مشکل پیدا کر دی ہے۔ چونکہ انگریزی عہد کی خود مختاری
زیادہ دور کی بات نہیں۔ اس لئے اس بیچارے کے لئے نئی صورت حال سے عہدہ برا ہونا اور بھی
مشکل ہو رہا ہے۔ بعض ڈی۔ آئی صاحبان نے ہوشیاری سے کام لے کر سیاسی چالوں کی آڑ میں
پناہ لی ہے۔ بعض نے بے بسی کے عالم میں مدرسوں کو طاقتور دھڑوں کے رحم پر چھوڑ دیا ہے اور بعض
بیچارے بڑی تلخی سے شکایت کرتے ہیں کہ ان کی فنی قابلیت کی کچھ قیمت باقی نہیں رہی۔ دراصل
یہ تینوں صورتیں ایک بہت بڑی حقیقت کو نظر انداز کر رہی ہیں، وہ حقیقت یہ ہے کہ تعلیمی پالیسی

ہر تبدیلی فی الحقیقت ملکی پالیسی میں تبدیلی ہے اور اس کا فیصلہ کرنے کا حق سرکاری افسروں کو نہیں
عوام کے نمائندوں کو پہنچتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ڈی۔ آئی صاحبان اور دوسرے تعلیمی افسر
لیم کو بہتر اور زیادہ فائدہ مند بنانے کے لئے ہی کوشش کرتے ہیں۔ ہر تعلیمی ترقی معاشی خوش حالی
ذریعہ ہوا کرتی ہے۔ یقیناً عوام کی بھلائی اسی میں ہے کہ تعلیمی ترقی کی رفتار تیز ہو۔ لیکن اگر کسی وجہ
ے عوامی نمائندے لوگوں کے صحیح مفاد کو دیکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تو اس پر نہ بگڑنے کی
ورت ہے اور نہ ان کی بے خبری سے فائدہ اٹھانا جائز۔ صحیح طریق کار یہ ہے کہ عوامی نمائندوں
بصیرت کی تربیت ہو۔ تاکہ وہ بھی انہی اقدار سے شناسا ہونے لگیں جو تعلیمی رہ نما کو متاثر کر رہی
یں۔ یہ کام صبر طلب اور لمبا ضرور ہے لیکن اس کا پھل میٹھا بھی ہوگا اور ہمیشہ رہنے والا بھی
ب ایک دفعہ اس سمت میں قدم اٹھنے لگیں گے تو پھر ترقی کی رفتار غیر معمولی طور پر تیز ہوگی اور
تدائی تاخیر کا ازالہ کر دے گی۔

امریکی نظامِ تعلیم کے چند پہلو

عبدالغفور چودھری

مسلسل نمبر ۲

آج امریکہ دنیا میں سب سے زیادہ امیر اور طاقت ور جمہوری سلطنت ہے۔ اس کی کامیا
جمہوریت کی کامیابی ہے۔ اور اس کی ناکامی پورے جمہوری نظام کی شکست ہے۔ لیکن اس عظیم الش
ریاست میں بھی تعلیمی مواقعوں کی مساوات کا اصول ابھی ایک ایسا خواب ہے جو شرمندۂ تعبیر نہیں ہوا۔
ایک جانب ۱۹۳۹۷ طلبہ ایسے اسکولوں میں تعلیم پاتے ہیں۔ جہاں ہر جماعت پر چھ ہزار ڈالر سالا
صرف ہوتے ہیں تو دوسری طرف ۳۲۸ طلبہ ایسے فلاکت زدہ اداروں میں پڑھ رہے ہیں
۵۰۰ ڈالر سے زیادہ خرچ نہیں ہوتا۔ اور لطف یہ کہ اس حساب میں استاد کی تنخواہ۔ کتابوں کی
تعلیم کی امدادی اشیا، سبھی قسم کی چیزیں شامل ہیں۔ یہ تفاوت ہر جگہ موجود ہے اور ہر لحاظ سے ن
ہے۔ ایک طرف سفید نسل لوگوں کے اسکول ہیں، دوسری جانب حبشیوں کے مدارس ہیں۔
سمت سر بفلک عمارتوں میں چیدہ خاندانوں کے افراد تعلیم پا رہے ہیں اور دوسری طرف
طبقے کے بچے اپنے بوسیدہ تعلیمی گھروندوں میں کتابوں سے الجھ رہے ہیں، غریب کا بچہ
غربت میں تعلیم پاتا ہے اگر قسمت کا دھنی ہوا تو اس کشمکش سے چھوٹ جاتا ہے۔ ورنہ سا
کولھو کے بیل کی طرح اسی چکر میں پڑا رہتا ہے۔ والدین کی مالی اور معاشی حیثیت کا بچوں کی تعل
بڑا گہرا اثر ہے، دوران جنگ میں اس سلسلے میں جو تحقیقاتیں ہوئیں ان کے اعداد و شما
واضح ہوتا ہے کہ صرف کھاتے پیتے والدین کے بچے ہی اعلیٰ تعلیم پا سکتے ہیں اور ہونہار بچ
ایک بڑی تعداد عدم استطاعت کے باعث ہائی اسکولوں کی تعلیم جاری نہیں رکھ سکتی
امریکی نظام ایک جمہوری نظام ہے۔ اس جمہوری نظام کی عمارت اس قدر وسیع

اس میں اونچے طبقے کے عوام کے لئے سینکڑوں کیا ہزاروں محفوظ گوشے ہیں جہاں وہ اپنی طبقہ دارانہ زندگی کے حقوق اپنے خصوصی اقتدار سے پورے طور پر لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ اس اونچے طبقے کے بچوں کی تعداد کم وبیش کل طلبا کا سات فی صدی ہے۔ یہ طلبا ان مدرسوں میں تعلیم نہیں پاتے جن میں ایک عام شہری اپنے بچے کو بھیجتا ہے۔ یہ طبقہ ان نجی قسم کے اداروں میں تعلیم پاتا ہے جو انگلستان کے پبلک اسکولوں ایٹن (ETON) یا رگبی کی طرز پر بنائے گئے ہیں۔ لیکن ان اداروں اور ولایت کے پبلک اسکولوں میں ایک فرق ضرور ہے۔ فلیمنگ رپورٹ کی رو سے ولایت کے پبلک اسکولوں میں غربا کے بچوں کے لئے دروازے کھل گئے ہیں۔ آئندہ ۲۵ فی صدی جگہیں ایسے نادار طلبہ کے لئے مخصوص ہوں گی جن کا خرچ حکومت اپنی طرف سے ادا کرے گی۔ لیکن امریکہ کے نجی ادارے اب تک نجی ہیں اور رہیں گے آنے بھی ہیں۔ ان کا اجارہ دار امریکہ کا اونچا طبقہ ہے۔ اس میں امیروں کے بچے ہی تعلیم پا سکتے ہیں۔ بعض مذہبی فرقوں نے بھی اپنے نجی اسکول کھولے ہیں۔ اس طرح اگر ایک طرف دولت کی اجارہ داری ہے تو دوسری جانب مذہبی ٹھیکے داری بھی اس سے کم نہیں۔ ان مدرسوں میں بھی خاص طبقے کے بچوں کا داخلہ ہوتا ہے۔ امریکی نظام میں ہونہار لیکن نادار بچے کے لئے نہ وظیفہ ہے نہ قرض حسنہ۔ اس کے برعکس انگلستان فرانس اور روس کے نظام تعلیم میں جن بچوں کو زر امداد اور وظائف مخیرانہ طور پر دیئے جاتے ہیں اور یہ اس لحاظ سے ممالک امریکہ سے زیادہ جمہوری ہیں۔ امریکہ میں مالی کمزوریوں کی وجہ سے اکثر اچھے طلبہ اعلیٰ تعلیم نہیں پا سکتے۔ اگر کوئی غریب والدین اپنا پیٹ کاٹ کر اپنے بچے کو کسی یونی ورسٹی میں بھیج بھی دیں تو وہ یونی ورسٹی امریکہ کے اعلیٰ ترین اداروں مثلاً ہارورڈ۔ کولمبیا ییل میں سے نہیں ہوگی۔ امریکہ کی سب سے اچھی اور دیرینہ یونی ورسٹیاں ایسے خود مختار ادارے ہیں جو حکومت کی امداد سے بے نیاز ہیں اور اس لئے ان پر حکومت کی نگرانی نہیں۔ ان کی آمدنی کا بڑا ذریعہ بڑی بڑی فیسیں ہیں۔ اتنی زیادہ جتنی غریب کا بچہ ادا نہیں کر سکتا۔ ان کے داخلے کی شرائط اور امتحان کے ضوابط نہایت سخت ہیں۔ ان شرائط کو وہی لوگ پورا کر سکتے ہیں جنہوں نے کسی نجی ادارے میں تعلیم پائی ہو

ان نجی یونی ورسٹیوں تک پہنچنے کے راستے نجی مدارس میں سے ہو کر جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ امریکہ میں دوسری یونی ورسٹیاں بھی ہیں۔ جو مختلف ریاستوں کی طرف سے حکومت کے تعلیمی بورڈ کی نگرانی میں قائم ہیں۔ ان اداروں میں عام طالب علم جو کسی عام اسکول میں پڑھا ہو، داخل ہو سکتا ہے۔ لیکن پھر بھی ان یونی ورسٹیوں کی وہ حیثیت اور شان نہیں۔ جو پرانی آزاد یونی ورسٹی کی ہے۔

امریکی حبشی کی تعلیم | حبشی لوگ کل آبادی کا دس فی صدی ہیں۔ اگرچہ ان کی تعداد قلیل ہے لیکن ان کے تعلیمی مسائل امریکن نظامِ تعلیم کے لئے ایک الجھن ہو کر رہ گئے ہیں۔ نسلی تعصب کے چوچلے اکثر اس غریب اقلیت کو عام مدرسوں سے یا رہنے پر مجبور کر دیا گیا ہے۔ اور اگر کہیں کسی اکیلے دکیلے طالب علم کو داخلہ مل بھی گیا تو اسے بے شمار دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ آج دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت میں جو سلوک امریکی حبشی سے ہو رہا ہے کل اسی سلوک کی بنا پر اس جمہوریت کے اصولوں کی جانچ ہو گی۔ اگر امریکی ریاست نے اس مسئلے کو حل کر لیا تو یہ امریکہ کی جیت نہیں بلکہ ساری جمہوریت کی فتح ہے اور ناکامی کی صورت میں یہ مسئلہ خود امریکہ کے نظریۂ جمہوریت کے لئے خطرۂ عظیم کا سبب ہو سکتا ہے۔ اگر قانونی لحاظ سے دیکھا جائے تو امریکی حبشی کو دوسرے شہریوں کے برابر تمام حقوق حاصل ہیں ملکی قانون کالے اور سفید نسل کے انسان کے لئے برابر ہے۔ آزادی کی دیوی دونوں کے سروں پر امن کا پر پھیلائے ہوئے ہے۔ امن اور جنگ کے زمانہ میں دونوں کے مشاغل اور فرائض برابر ہیں لیکن قانون کے تخیل سے ہٹ کر عمل کی دنیا میں نہ ملکی قانون اس کے ساتھ انصاف برتتا ہے۔ اور نہ ہی رائے عامہ ہم دردی کا سلوک کرتی ہے۔ امریکہ میں حبشیوں کا لنچنگ (LYNCHING) پہلے بھی ہوتا تھا۔ اور اب بھی کبھی کبھار ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کے داغ ان کے جسموں پر اس شدت سے نہیں ابھرتے جتنے ان کی روحوں پر۔

جنوبی امریکہ کی سترہ ریاستوں میں حبشی بچے کو گورے بچوں کے مدرسوں میں داخل ہونے کا حق نہیں۔ حبشیوں کے لئے جو علیحدہ مدرسے ہیں ان کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ اکثر استاد لکڑی کے جھونپڑوں میں پڑھاتے ہیں جن میں محض ایک ہی کمرہ ہوتا ہے اور وہ بھی ٹوٹا پھوٹا۔ ابتدائی

اسکولوں میں سامان کی جگہ بس اللہ کا نام ہے۔ گورے بچوں کی لازمی حاضری کے لئے ریاستوں میں قانون جاری ہیں۔ لیکن یہ قانون حبشی آبادی پر عاید نہیں ہوتے ان کے بچے مدرسوں میں جائیں یا نہ جائیں حکومت کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔ حبشی استاد کی تنخواہ اوسط سے کہیں کم ہے جہاں گورے استاد کو سالانہ ۹۰۷ ڈالر ملتے ہیں وہاں حبشی استاد ایک سال میں ۴۵ ڈالر کماتا ہے حبشی مدارس میں اسکول کے سامان کا خرچ فی طالب علم ۲۴ ڈالر ہے۔ لیکن گوروں کے اسکول میں یہی خرچ ۸۳ ڈالر فی طالب علم تک جا پہنچتا ہے۔ شمال کی ریاستوں میں حالات کچھ قدرے بہتر ہیں۔ وہاں کالے بچوں کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ نہیں ہے۔ وہ گوروں کے مدرسے میں داخل ہو سکتے۔ لیکن اکثر یہ بچے دوسروں سے الگ تھلگ ہیں اور اپنی زندگی تیز و تفریق کی افسوس ناک تنہائی میں گذارتے ہیں جس کا ان کی نفسیاتی نشو و نما اور شخصیت پر گہرا اثر پڑتا ہے۔

ویسے تو حبشیوں کی تعلیم کا پس منظر نہایت تاریک ہے۔ لیکن اس میں کہیں کہیں امید کی جھلک بھی نظر آجاتی ہے۔ پچھلے سالوں میں امریکی حبشی کے مایوس افق پر دو ستارے آب و تاب سے طلوع ہوئے جن کی کرنیں ان کی زندگی میں امید اور اعتماد کا نیا پیغام لائیں۔ یہ دو ستارے ٹسکی گی (TUSKEGEE) انسٹی ٹیوٹ اور ہیمپٹن (HAMPTON) کی انسٹی ٹیوٹ ہیں، یہ دونوں ادارے حکومت کی امداد کے مرہون منت نہیں۔ بلکہ ایک رضاکارانہ تعلیمی خدمت کے نتائج ہیں۔ ٹسکی گی کا تجربہ واشنگٹن نے شروع کیا جو امریکی حبشی کے علم و آزادی کا پیغام بر ہے۔ اس نے اپنی زندگی ایک پیہم کش مکش اور مسلسل جہاد میں گذاری۔ اپنی تعلیم کے ابتدائی دور میں اس نے بڑی بڑی مصیبتیں جھیلیں، ان آزمائشوں میں گذرتے ہوئے اس نے یہ عہد صحیح کیا تھا کہ وہ ایک ایسا ادارہ تعمیر کرے گا جس میں اس کی قوم کے بچوں کو ان تلخ تجربات سے دوچار نہ ہونا پڑے جن سے اُسے سابقہ رہا۔ ٹسکی گی کا تجربہ ایک عظیم الشان تجربہ ہے۔ جسے کم سے کم سرمائے سے شروع کیا گیا۔ یہ سرمایہ جتنا مالی لحاظ سے کم تھا۔ اتنا ہی روحانی اور اخلاقی پہلو سے فراواں تھا۔ ایک غریب اور نادار قوم نے حکومت کی خبر گیری اور سرپرستی کے بغیر تعلیم کا کام شروع کیا اور اس کو کمال کامیابی سے پورا کیا۔ یہ تعلیمی تجربہ امریکی حبشی کی معاشی اور اقتصا

رگی سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔ جہاں کہیں بھی کسی مخلص کے سامنے ایسے حالات میں اپنی قوم کو تعلیم دینے کا
ال درپیش ہوا، یا کسی دردمند نے اپنی غریب قوم میں تعلیمی انقلاب پیدا کرنا چاہا تو ٹسکی گی کا تجربہ
ے تابندہ ستارے کی طرح اس کا رہنما ثابت ہوا۔

مریکی اُستاد | دوسری جنگ عظیم کیا آئی اکثر ملکوں میں تعلیمی نظام کے لئے ایک بلا بن کر چھا گئی
تاد ہمارے ہاں ہی نہیں ہر جگہ بھوکا ہے اور پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لئے کبھی کبھی اسے یہ پیشہ
ی چھوڑنا پڑتا ہے۔ جنگ کے دوران میں امریکہ میں بھی بہت سے نئے محکمے کھل گئے۔ اور تقریباً
ن لاکھ پچاس ہزار استاد اپنے پیشے کو چھوڑ کر جنگی خدمات کے مختلف محکموں میں ملازم ہو گئے۔ اور
ریننگ کالجوں میں داخل ہونے والوں کی تعداد گھٹ گئی۔ مدرسوں میں تربیت یافتہ استاد کم ہوتے
چلے گئے۔ اس خوفناک کمی کو پورا کرنے کے لئے ہر قسم کی تدابیر اختیار کی گئیں۔ گھٹیا قابلیت کے استاد رکھے
گئے۔ اکثر جگہ ٹریننگ کی شرط اڑا دی گئی۔ اس طرح تعلیمی معیار کم ہوتا چلا گیا۔ اندازہ کیا جاتا ہے کہ استادوں
کی یہ کمی کہیں دس سال میں پوری ہو گی۔ اس کا ایک بڑا سبب تو وہی تنخواہ کی کمی تھا۔ کیوں کہ ہر استاد سے
معمولی حالات میں یہ امید نہیں کی جا سکتی کہ وہ پیٹ پر پتھر باندھ کے کام کرتا چلا جائے گا۔ چنانچہ
امریکہ میں استادوں کی تعلیم اور ان کے پیشہ ورانہ معیار پر ایک قومی کمیشن قائم ہوا جس نے ان کے
مشاہرے میں معقول اضافے کی سفارش کی۔ استاد کو جنگ سے پہلے اوسطاً ۱۴۴۱ ڈالر سالانہ
ملتے تھے۔ اب اس کی تنخواہ ایک دم بڑھا کر ۲۴۰۰ ڈالر سالانہ کر دی گئی۔ جو بتدریج دس سال کے عرصہ
میں ۴ ہزار ڈالر تک پہنچ جائے گی۔ ممکن ہے مختلف ریاستیں اس بھاری میزانیہ کا بوجھ نہ برداشت
کر سکیں لیکن استادوں کی تنخواہ کے معاملے کو فیڈرل حکومت نے بڑی اہمیت دی ہے۔ اور
یہ امید کی جاتی ہے کہ انہیں فیڈرل حکومت کی جانب سے مالی امداد فراخ دلی سے ملے گی جس سے
وہ اپنے تعلیمی میزانیے کو متوازن کر سکیں گے۔

حرفہ اور پیشہ کی تعلیم | امریکہ میں ٹیکنیکل تعلیم کی داستان ہمارے لئے خاص معنی رکھتی
ہے۔ ہمارے ہاں ٹیکنیکل تعلیم کو کبھی بھی صحیح معنوں میں تعلیم نہیں سمجھا گیا۔ ہمارے اعلیٰ

حکمران اس قسم کی تعلیم کو کیسے پنپنے دیتے۔ اگر ٹیکنیکل تعلیم کی بدولت ہمارے ہاں بھی کارخانے چل پڑتے تو انکا شائد کی مشینی دنیا کس پل پوتے پر چلتی جسم خریدار تھے۔ انگریز کارخانے دار اور دکان دار تھا۔ بھلا کوئی دکان دار برداشت کرے گا کہ اس کا گاہک اور وہ بھی ہمارے جیسا گاہک سر بازار اسی کے سامنے دکان لگا کر بیٹھ جائے۔ اسی لئے انگریز حاکم نے ٹیکنیکل تعلیم کو قطعاً شعبۂ تعلیم کے ہاتھ میں نہ دیا۔ اسے ہمیشہ محکمہ صنعت و حرفت کی دُم بنائے رکھا تاکہ ایک ہی وار میں دو شکار اور ایک ہی ہتھیار سے صنعت اور صنعتی تعلیم دونوں کو ٹھنڈا کر دیا جائے۔ اس کے علاوہ ہمارے ہاں اچھی ٹیکنیکل تعلیم نہ ہونے کی ایک اور وجہ یہ بھی تھی کہ خود انگلستان میں بھی اس قسم کی تعلیم کا کبھی انتظام نہیں کیا گیا تھا۔ ایک مدت تک اس کے لئے جو کچھ بن پڑا۔ وہ محض مزدوروں کی تعلیمی انجمن (W.E.A) نے کیا۔ اس انجمن کے اداروں میں تعلیم شام کے وقت دی جاتی تھی، دن کے وقت تعلیم دینے والے ادارے بہت کم ہیں۔ کیونکہ اس تعلیم کی حیثیت کبھی بھی دوسری اصناف کے برابر تسلیم نہیں کی گئی۔ اب تک انگلستان میں ٹیکنیکل تعلیم کے لئے اساتذہ کی ٹریننگ کا تصور پیش نہیں کیا گیا۔ شام کے وقت کے ادارے اکثر ایسی جگہوں پر قائم کئے جاتے تھے۔ جہاں کارخانے تھے۔ کاریگر لوگ دن بھر کارخانوں میں کام کرنے کے بعد شام کو ان اداروں میں پڑھا بھی دیتے تھے۔ ان حالات میں تعلیم کا اچھا انتظام کیوں کر ممکن تھا۔ جنگ عظیم کا زور ٹوٹنے پر حکومت کی توجہ ادھر بھی مبذول ہوئی۔ ٹیکنیکل اسکولوں پر توجہ تو کچھ کام ہو ہی رہا تھا۔ لیکن اعلیٰ قسم کی ٹیکنیکل ٹریننگ کا معیار دوسرے ممالک خصوصاً جرمنی اور امریکہ کے مقابلے میں بہت ہی گھٹیا تھا۔ پچھلے دنوں لارڈ پرسی کی صدارت میں ایک کمیٹی نے صنعتی تعلیم کے متعلق جو رپورٹ شائع کی ہے۔ اس سے ان حالات پر بڑی دلچسپ روشنی پڑتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اجنبی کارفرماؤں کے ہاتھ کچھ ارادتاً اور کچھ بلا ارادہ ہماری ٹیکنیکل تعلیم کی حالت نہایت پست رہی۔ امریکہ میں سب سے پہلے اس تعلیم کے انتظام کا خیال پہلی جنگ عظیم کے زمانے میں پیدا ہوا۔ امریکہ ۱۹۱۷ء میں ایسے نازک مرحلے پر جنگ میں شریک ہوا

بلکہ جاپان لڑتے لڑتے تھک ہار سے گئے تھے۔ امریکہ پورے سازو سامان سے میدان میں [illegible] چاہتا تھا۔ اس لئے سمتھ ہیوگیز ایکٹ (SMITH HUGHES ACT) منظور کیا گیا۔ جس کی رو سے ایک پیشہ ورانہ تعلیم فیڈرل بورڈ مقرر ہوا۔ اس بورڈ کے تین شعبے تھے۔ ایک زرعی تعلیم کے لئے دوسرا تجارتی صنعتی اور خانہ داری کی تربیت کے لئے اور تیسرا ان مختلف مضامین کے اساتذہ کی ٹریننگ کے لئے تھا۔ دوسری جنگ کے دوران میں ٹیکنیکل تعلیم کے لئے کئی ایک تجاویز بروئے کار آئیں جن کے ماتحت جنگی ملازمین نے بڑی تعداد میں ٹیکنیکل تعلیم حاصل کی۔

پاکستان اور ٹیکنیکل تعلیم | ہمارے ملک میں ٹیکنیکل اور پیشہ ورانہ تعلیم کا مسئلہ نہایت اہم ہے بعض کی رائے میں یہ مسئلہ تعلیم کے تمام پہلوؤں پر بھاری ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر ہمیں اس دیس کی بے اندازہ قدرتی دولت کا پورا پورا فائدہ اٹھانا ہے اور مادر وطن کے پرانے اور فرسودہ نظام کو ایک نئے سائنٹیفک اور صنعتی نظام میں لانا ہے۔ اس کے رینگتے ہوئے چھکڑوں کو لپکتے ہوئے ہوائی جہازوں میں تبدیل کرنا ہے۔ اس کے چار ہزار سال پرانے ہل کے پھل کو ٹریکٹرز میں بدلنا ہے۔ ہل کے پھل کو ہی نہیں بلکہ اس انسانی ذہن کو اور اس ہاتھ کو بھی جو اس کے پیچھے کام کر رہا ہے تو ہمیں اس ملک میں صنعتی اور پیشہ ورانہ تعلیم کو نئی بنیادوں پر استوار کرنا ہوگا۔ جہاں کہیں بھی کسی قوم نے اپنی زندگی کی عمارت انقلابی خطوط پر تجویز کی ہے۔ وہاں سب سے پہلے اسی قسم کی تعلیم پر توجہ صرف ہوئی ہے۔ خواہ ملک جرمنی ہو یا جاپان روس ہو یا کوئی اور ملک اس کے سوا ترقی کا کوئی چارہ کار نہیں ہے۔ ہمیں اس تعلیم میں نئی زندگی پیدا کرنے میں بڑی مشکلات کا سامنا کرنا ہوگا۔ ہمارے پرانے کارفرما اس میدان میں کوئی اچھی روایات نہیں چھوڑ گئے۔ بلکہ وہ ہماری ان تمام پرانی اور شاندار روایات کو توڑ پھوڑ بھی گئے۔ جنہوں نے ایک زمانے میں اس دیس کو دنیا بھر کا صنعتی گودام بنا دیا تھا۔ ممکن ہے۔ آج ڈھاکے کی ململ کی داستان کو لوگ محض شعر و شاعری سے منسوب کر دیں۔ لیکن کسی کو تصور بھی نہیں ہو سکتا کہ سو سال پہلے انگلستان کی مشہور صنعت [illegible] میں جو وہاں صنعتی انقلاب کا پیش خیمہ تھی۔ ہمارے ملک کی [illegible]

حیثیت خاص اہمیت رکھتا تھا۔ اس شعبے میں ایسے ایسے نادر نمونے بھیجے گئے جن کی ساخت میں ایسی صفائی جن کے رنگوں میں وہ بانکپن تھا کہ انہیں دیکھ کر وہاں کے کاری گر دم بخود رہ گئے۔ وہ صرف حیرت زدہ ہی نہیں ہوئے۔ بلکہ ان میں سے بعض سمجھدار قسم کے کاری گروں نے ان چیزوں کی فوراً نقل اتارنا شروع کر دی، ویسے ہی نمونوں پر اسی قسم کے رنگوں سے وہاں کے کارخانوں میں چیزیں تیار ہونے لگیں اور آہستہ آہستہ ہندوستانی صنعت کا خاتمہ ہو گیا، ڈھاکہ جیسے مقامات کے علاوہ سندھ ایسے پس ماندہ علاقے میں ایسا عجیب و غریب صنعتی کام ہوتا تھا کہ ایک انگریز کہا اٹھا، ان لوگوں کو پس ماندہ کون کہہ سکتا ہے جو فنونِ لطیفہ کے لحاظ سے ہمارے ہاں کے بڑے بڑے استادوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں؟ اکبر کے زمانے میں محض ایک لاہور شہر میں ہی پارچہ بافی کے آٹھ ہزار کارخانے تھے۔ اور ہر قسم کے کپڑوں کی وہ کثرت تھی کہ کشتیوں میں بھر کر دریاؤں کے راستے یہ کپڑے دنیا بھر کی بندرگاہوں میں پہنچتے تھے۔ آج بھی مغربی پنجاب کے پرانے شہروں کے گلی کوچوں میں گذرتے وقت محض ان کے ناموں سے ہی پرانی صنعتی زندگی کی تصویر سامنے آ جاتی ہے۔ پنجاب کا ہر شہر کسی نہ کسی اچھی صنعت کے لئے مشہور تھا۔ توپ ڈھالنے سے لے کر ٹائل بنانے کا کام اور سینکڑوں صنعتیں جاری تھیں۔ ان سب کاموں میں مسلمان صنّاع اور کاری گر نہایت ذوق و شوق محبت اور خلوص، دیانت داری اور محنت کا ثبوت پیش کرتے۔ ہماری صنعتی روایات ہمیشہ شاندار رہی ہیں۔ ہمارے صنّاع اس دیس کی عزیز ترین دولت تھے۔ جسے کبھی محمود نے غزنی پہنچایا اور کبھی امیر تیمور نے سمر قند۔

ٹیکنیکل تعلیم کو نئے سرے سے چلانے کے لئے ہمیں ایک مرتبہ ان تمام پرانی روایات کو پھر تازہ کرنا ہو گا جو ہمارے غیر ملکی کارندوں کے سیاسی مقصد کی بنا پر مٹ چکی ہیں۔ ہمیں ایک مرتبہ اور عوام کی چھپی ہوئی صنعتی قابلیتوں اور حرفتی صلاحیتوں کو ڈھونڈ کر نکالنا ہو گا جنہوں نے اپنے شاندار ماضی میں اس دیس کو دنیا کی بہترین اجناس کی منڈی بنا دیا تھا۔ اگر آپ نئی صنعتی تعلیم کو محض متوسط طبقے کے لئے مخصوص کر دینا نہیں چاہتے۔ اور اس کے دروازے مزدور پیشہ لوگوں کے لئے

...مول دینا چاہتے ہیں تو پھر پرانی روایات کا جائزہ لازماً کرلینا پڑیگا۔ اگر پنجاب کی پرانی صنعتی رپیدلوں کا
...طالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ شروع شروع میں صنعتی اداروں میں مسلمان ہی کا دور دورہ تھا۔
...یا طلبہ اور کیا اساتذہ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ لیکن آہستہ آہستہ کسی سوچی سمجھی اور
...باقی بوجھی تدبیر اور لائحہ عمل کے ماتحت یہ تعداد کم ہوتی گئی اور یہ لوگ جو پرانی صنعتی روایات کے
...حافظ تھے ان کی جگہ ان اداروں میں اس قوم کے افراد کو لایا گیا جس کو دست کاری سے کوئی سروکار
...نہ تھا۔ اور جو روایتاً اور مذہبًا بھی ان پیشوں کو اختیار کرنا پسند نہیں کرتی تھی۔

ہمارے صنعتی پروگرام کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ دوسری قسم کی تعلیم میں بھی وہ کتابی رجحان
...کم کر دیا جائے جس کے باعث ہمارا تعلیمی نظام کتابوں کی گھٹری اور امتحانوں کا گورکھ دھندا بنا
...ہوا ہے۔ ہمیں عام تعلیم میں افادی مقصد کی اہمیت کو دیکھنا ہوگا۔ پیشہ ورانہ تربیت اور اس کی
...یادی کے لئے عام تعلیم میں پیشہ ورانہ رجحان پیدا کرنا ہوگا۔ اور اس افادی مقصد کو ذہنی ترقی کے
...مقصد کے ساتھ سمونا ہوگا۔ امریکی تعلیم نے دنیا کو کسی طرح کے طریق ہائے تعلیم سے متعارف کرا کر بڑا
...احسان کیا ہے اور تعلیم کے فکری نظام میں ایک انقلابی نظریہ پیش کیا ہے۔ جون ڈیوی نے جو آج
...تعلیم کے فکری اور عملی حلقوں میں ممتاز شہرت رکھتا ہے۔ ہمارے سامنے تعلیم کا ایک نظریہ پیش کیا
...ہے جس میں ذہنی تربیت اور افادیت ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ ڈیوی نے شکاگو کے مشہور تجرباتی مدرسے
...میں عملی طور پر بتا دیا تھا کہ ہاتھ کے کام میں کیا کچھ ذہنی، نفسیاتی، اخلاقی اور سماجی خوبیاں
...موجود ہیں۔ اس کے شاگرد ڈاکٹر کل پیٹرک نے اسے پروجیکٹ میتھڈ کی شکل دیکر تجربی اور
...عملی طور پر مدرسہ میں جگہ دیدی۔ یہ سچ ہے کہ ابھی تک ذہنی اور افادی مقاصد نے یکجان
...اور دو قالب کی صورت اختیار نہیں کی۔ اور ابھی تک کم آمیزی کی وجہ سے ان میں کسی حد تک
...بیگانگی سی ہے۔

امریکہ کی تعلیم میں ایک ایسا متوازن نظام پیدا نہیں ہوا جس میں ان دونوں مقاصد کو
...برابر ایک ساتھ جگہ پا سکیں۔ ابھی تک جون ڈیوی کو ڈاکٹر ہیں صدر شکاگو یونیورسٹی ...

کلاسیکی علوم کے مؤیدسے اکثر پیہم جہاد کرنا پڑ رہا ہے۔ لیکن اس صورت حال کے باوجود امریکی تجربوں نے ایک حد تک ہمارے سامنے ایسی راہیں روشن کر دی ہیں جن پر چل کر ہم اپنے ہاں بھی ایک ایسا نظام تعلیم قائم کر سکتے ہیں جس میں ان دونوں اقدار کی جگہ ہوگی جہاں پہ وہ ان دو روایتی بکریوں کی طرح ٹکر نہیں لیں گی جو ایک پُل پر ملتی ہیں۔ بلکہ دو سانقیوں کی طرح باہم مل کر تعلیم کی گاڑی کو آگے چلانے میں ایک دوسرے کی مدد و معاون ہوں گی۔

اعلیٰ ٹیکنیکل تعلیم کے لئے ہمیں امریکہ یا ماقبل جنگ کے جرمنی سے بہرنوع سبق لینا ہوگا۔ انگلستان اس لحاظ سے بہت پیچھے رہ گیا ہے۔ آج میساچوسٹ جیسی ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ انگلستان تو کیا سارے یورپ میں مشہور ہے۔

ہماری ٹیکنیکل تعلیم کی بڑی بدقسمتی یہی ہے کہ اس کو شروع سے ہی انگریزی تعلیم کے سانچے میں ڈھالا گیا ہے اور حال یہ ہے کہ خود انگلستان میں اس کی ترقی اور نشوونما محض مزدور پیشہ طبقے کی ذاتی جد وجہد اور رضاکارانہ جوش اور ولولے کی بدولت ہے۔

یہ اور اسی قسم کے صدہا مسائل نے ٹیکنیکل تعلیم کے تعمیری لائحہ عمل کو ایک نہایت ہی اہم اور مشکل پہلو دیا ہے۔ ہمارے ہاں ایک مرکزی تعلیمی مشاورتی بورڈ کے ساتھ ساتھ ایک ٹیکنیکل اور پیشہ ورانہ تعلیم کے بورڈ کی بھی ضرورت ہے جس کی ساخت کم و بیش امریکہ کے مرکزی بورڈ جیسی ہو اور ظاہر ہے کہ جہاں اس بورڈ کے اختیارات وسیع ہوں گے وہاں اس کے لئے معقول بجٹ کی بھی ضرورت ہوگی۔ اس مرکزی بورڈ کو پورا موقع ملنا چاہیے کہ وہ پورے ملک کے لئے ایک ٹیکنیکل سکیم بنا کر اس کو عملاً تشکیل دیدے۔ یہ بے حد ضروری کام ریاست کے ہاتھ میں ہو اور اس کی ذمہ داری اسی کے سر ہو۔ دوسرے ممالک میں اس قسم کا کام مزدوروں کی انجمنیں کرتی ہیں۔ لیکن ہمارے ہاں مزدوروں کی انجمنیں ابھی تک اپنی سیاسی زندگی کی تشکیل نہیں کر سکیں اس لئے تعلیمی اور سماجی مسائل حل کرنے کی ان میں سکت ہی نہیں، دوسرے ممالک میں اکثر کارخانے دار اپنے ہاں کام کرنے والوں کے ذریعے ایسی تعلیم کا انتظام کر دیتے ہیں۔ مگر ہمارے ہاں

ابھی یہ صنعتی انقلاب دھیرے دھیرے اُبھر رہا ہے۔ ایسا صنعتی نظام مرتب نہیں ہوا جس میں کچھ
پٹیکنیکل تعلیم کے ادارے کھولنے کی گنجائش ہو سکے۔ اس صنعتی انقلاب کے لئے ہمیں پورے
پاکستان کا ایک مبسوط اور مکمل جائزہ لینا ہوگا۔ ہر صوبے کی صنعتی اہلیت کو جانچنا ہوگا۔ اس کی مزد
کا اندازہ کرنا ہوگا۔ صنعت کے لئے ملک بھر میں جغرافیائی حدود متعین کرنا ہوں گی اور اس کے
بعد صنعتی اداروں کو عام کر دینا ہوگا اور یہ دیکھنا ہوگا کہ ہر جگہ کے رہنے والوں کے صنعتی رجحانات
پورے کمال کے ساتھ بروئے کار آئیں وہاں کے قدرتی وسائل سماجی مقاصد میں صنعتی وسائل بن
جائیں۔ پوری دقیق نگاہی اور دور بینی سے عاقبت اندیشی کا ثبوت دینا ہوگا کہ اس نظام کی تشکیل
میں انسانی محنت توجہ اور روپیہ کا اتلاف اور اسرافِ محض نہ ہو۔ ہو سکتا ہے کہ دو صوبے ایک قسم کے
دو بلند پایہ لیکن ایک دوسرے کے متوازی ادارے قائم کر دیں۔ یہاں مرکزی بورڈ اس قسم کے بے
اسراف اور بے کار مقابلے کو روک سکتا ہے، اس کے پیش نظر مخصوص مقامات پر مخصوص صنعتی تعلیم
کا انتظام کرنا پڑے گا۔ مثلاً پنجاب میں زرعی تعلیم اور زرعی صنعت کی بے حساب صلاحیتیں موجود ہیں
بلوچستان میں کان کنی اور معدنیات کی تعلیم کا بہترین انتظام ہو سکتا ہے۔ بحری انجینئر صرف کراچی میں
ہو اور جنگلات کی تیاری کی تعلیم مشرقی بنگال میں دی جائے۔

امریکی نظام تعلیم کے یہ شاندار کارنامے دیکھ کر اکثر یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کونسی قوت
ہے جو اس نظام کو وسیع کئے چلی جا رہی ہے اور بدلے ہوئے ماحول میں وہ نازک احساس پیدا
کر دیتی ہے جس کی امداد سے یہ نظام نئے حالات میں نیا رنگ اور نیا روپ اختیار کرتا چلا جا رہا ہے
اس حیرت انگیز ترقی کی وجہ امریکہ کے سونے کے ذخیرے نہیں جو وال سٹریٹ میں محفوظ ہیں۔ بلکہ
یہ روشن اور کندن کی طرح دمکتا ہوا احساس ہے جو ہر شہری کے دل میں جگمگا رہا ہے۔ ہر فرد وہ اقوم کی
ترقی کو اپنی ذمہ داری خیال کئے ہوئے ہے۔ وہ تعلیم نظام کو بلند کرنے میں محض تماشہ دیکھنے والا
نہیں۔ بلکہ اس کام میں باقیوں کے ساتھ برابر کا شریک ہے۔ ہر سال ملک کے طول و عرض میں تعلیمی
منایا جاتا ہے ۱۸ نومبر سے ۲۴ نومبر تک جشن منائے جاتے ہیں۔ تعلیمی مسائل عام کرنے کے لئے

[illegible]ے ہیں جلوس نکلتے ہیں۔ ریڈیائی تقاریر نشر ہوتی ہیں۔ صدر امریکہ اور دوسرے بڑے [illegible]وں کے پیغامات شائع ہوتے ہیں۔ مقامی اخبارات جلی حروف میں تعلیمی مسائل کا ذکر کرتے ہیں [illegible]ریق سے پوری قوم کے ذہن میں ایک ہفتہ تک تعلیمی ماحول اور فضا پیدا ہو جاتی ہے جس کا اثر [illegible]تا عرصہ دیرپا ہوتا ہے۔ اس ہفتے میں ایک دن استادوں کے مسائل کے لئے ہوتا ہے۔ ان کی تنخواہ [illegible] حیثیت، صحت، عمر کا بیمہ اور فنڈ وغیرہ کے بیسیوں مسائل پر گرماگرم بحثیں ہوتی ہیں۔ بازاروں [illegible] گزرگاہوں میں بڑے بڑے اشتہار لگائے جاتے ہیں۔ ان پر جلی حروف میں کچھ ایسے سوالات [illegible]ے ہوتے ہیں جو عام شہری کے ضمیر کو کبھی جھنجوڑتے اور کبھی کسمساتے ہیں۔

علم الاطفال کی نصف صدی

انور علی قریشی

موجودہ صدی کے نصف اول میں بچوں کی نفسیات کے متعلق ہماری معلومات میں جو اضافہ ہوا ہے اس نے تعلیمی دنیا میں ایک بڑا انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ تاریخ کے پیمانہ سے ناپا جائے تو پچاس برس کوئی لمبا وقت نہیں لیکن نوع انسان کی زندگی میں وقت کو گھڑی سے نہیں بلکہ واقعات کے پیمانے سے ناپنا چاہیئے۔ پچھلے پچاس سال کی تعلیمی ترقی کو سمجھنے کے لئے ہمیں بیسویں صدی کے آغاز سے پہلے کے دس سالوں کو بھی دیکھنا ہوگا۔ کیونکہ جن رجحانات نے بالآخر انقلاب پیدا کیا انہوں نے ۱۸۹۰ء کے بعد سر اٹھانا شروع کیا تھا۔

موجودہ استاد بچوں کے ساتھ اپنے تعلقات میں جن باتوں کو طے شدہ خیال کرتا ہے ان میں سے بہت سی بالکل نئی ہیں۔ کوئی ساٹھ برس گذرے بچے کڑے ضبط میں باندھ کر رکھے جاتے تھے۔ طبعی اختلافات اور رفتار ترقی کے فرق کو ناپنے کے ذرائع موجود نہ تھے اور اکثر اوقات اس بات کو کوئی توجہ نہ دی جاتی تھی کہ آیا طالب علم نے اپنے ماحول کے ساتھ پسندیدہ مفاہمت کر لی ہے یا نہیں۔ تعلیم کی تاریخ میں ان فلسفیوں کے نام سنگہائے میل کا درجہ رکھتے ہیں جنہوں نے بچوں کی فطرت کے متعلق طرح طرح کے نظریئے پیش کئے۔ تعلیم کے موجودہ تصورات ان کے نظریوں پر مبنی نہیں۔ کیونکہ یہ نظریے اتفاقیہ مشاہدات کی پیداوار تھے۔ موجودہ تعلیم کی بنیاد وہ تجربے اور مشاہدے ہیں جن کی خاطر ہزاروں انسانوں نے سالوں تک محنت اور استقلال سے کام کیا۔ جدید تعلیم چند فوق العادت ذہنوں کی اپج پر بھروسہ کرنے کی بجائے عوامی تجربہ کو معیار قرار دیتی ہے جو بے شمار کارندوں کی محنت سے ہاتھ لگا ہے۔

نقطۂ نگاہ کی تبدیلی صرف ایک صدی گذری کہ مغربی تہذیب بچوں کے مطالعہ کو پسندیدہ نگاہ سے نہیں دیکھتی تھی۔ سٹینلے ہال نے ان مشکلوں کا ذکر کیا ہے جو پچھلی صدی کے نصف میں اسے بچوں کا قد اور وزن معلوم کرنے میں پیش آئیں۔ والدین اس بات کو بچوں کے حقوق پر ناواجب حملہ خیال کرتے تھے۔ آج بچے، استاد اور والدین جسمانی معائنہ کو ایک عام رواجی چیز خیال کرتے ہیں۔

بچوں کی ذہنی کیفیتیں سمجھنے کے لئے پہلے پہل بالغوں پر تجربے کئے گئے۔ برائن اور ہارٹر نے اس عمل کا مشاہدہ کیا جس سے ٹیلیگرافی سیکھی جاتی تھی اور اس مشاہدہ کی روشنی میں اس عمل کے نقشے تیار کئے۔ ان کی یہ دریافت بہت اہم تھی کہ مواد کو بڑی بڑی اکائیوں میں پیش کرنے سے سیکھنے کا کام زیادہ آسان ہو جاتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ الفاظ کی بجائے جملوں اور حروف کی بجائے الفاظ سے آغاز ہو جانا چاہئے۔ اس دریافت نے نہ صرف تدریس قرات کے پرانے طریقوں پر اثر ڈالا بلکہ ٹائپ رائٹنگ، شارٹ ہینڈ اور دوسری بدنی اور ذہنی مہارتوں کی تدریس پر بھی۔ ان تبدیلیوں سے زیادہ انقلاب آفرین یہ دریافت تھی کہ تجربہ اور مشاہدہ سے تدریس اور تعلم کے طریقوں کو بہتر بنایا جا سکتا ہے۔ بعد کے تجربوں نے یہ بات ثابت کی کہ بچے کی رفتار ترقی پر اثر ڈالنے والے بہت سے اسباب خود اس کی اپنی ذات کے اندر موجود ہیں۔ اور محض کسی مواد کا پیش کر دینا ہی کافی نہیں۔

اُنیسویں صدی کی آخری دہائی میں ولیم جیمز نے انتقال تربیت کے متعلق سب سے پہلے تجربے کئے۔ ۱۹۰۱ء میں تھارن ڈائک اور وڈ ورتھ نے اس سے آگے قدم بڑھا کر ایسے تحقیقاتی مطالعے کئے جن کے نتائج نے رسمی ضبط کے نظریئے کی بنیادیں ہلا دیں۔ اس سے ایک لمبی بحث چھڑ گئی اور مزید تجربے ہونے لگے۔ لوگوں نے تدریس کی تاثیر اور اس کے اثرات کو جانچنے کے لئے نئے نئے طریقے دریافت کئے۔ بیسویں صدی کی پہلی دو دہائیوں میں سکھانے پڑھانے اور انتقال ضبط کے متعلق جو معلومات کی گئیں وہ بہت جلد نفسیات اور علم التعلیم کے نصابوں کا جزو بن گئیں۔ اس سے استادوں میں بھی پود کو سائنسی مطالعہ کے نتائج میں دلچسپی پیدا ہو گئی۔

ذہنی آزمائشیں بیسویں صدی کے آغاز میں ایک اور بڑی تبدیلی واقع ہوئی۔ فرانسیسی ماہر نفسیات الفریڈ بنے نے ایک کمیشن میں کام کیا جس کے ذمہ یہ فرض تھا کہ کم ذہن بچوں کی درجہ بندی کرے۔ بنے نے سوچا کہ عام تاثرات کی بنا پر درجہ بندی کرنا بے انصافی ہوگی۔ اس لئے ان بچوں کی ذہنی استعداد معلوم کرنے کے لئے کوئی بے لاگ طریق آزمائش وضع ہونا چاہئے۔ اس نے ہر عمر کے بچوں کے لئے اوسط ذہنی معیار معلوم کئے اور ہر بچے کو ان معیاروں سے ماپا۔ اس نے دیکھا کہ بچے جوں جوں عمر میں بڑھتے ہیں ان کی ذہنی استعداد بڑی تیزی سے ترقی کرتی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی عمر کی ہر سطح پر مختلف بچوں کی استعدادوں میں بڑا فرق موجود ہے۔ بنے کی آزمائشوں نے دنیا بھر میں دلچسپی پیدا کردی اور ان کی بدولت نقطۂ نگاہ میں انقلابی تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ بنے سے پہلے بھی بچوں کی ذہنی استعداد میں فرق کو تسلیم کیا جاتا تھا۔ لیکن عام خیال یہ تھا کہ اس کا سبب بچے کی محنت اس کی اخلاقی صحت مندی اور پیہم کوشش ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ تھا کہ بچے کی ذہانت ایسے اسباب کی پیداوار تھی جن پر اسے خود قابو حاصل تھا۔

بنے نے ثابت کر دکھایا کہ ذہنی استعداد کے لحاظ سے ہر بچہ مختلف ہے اور اس پر اس کا اپنا کوئی قابو نہیں۔ نیز ان استعدادوں پر کوئی استاد اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ یہ دریافت بڑی اہم ثابت ہوئی۔ اس سے ایک نتیجہ یہ نکلا کہ پہلے جو اخلاقی الزام بعض کم زور بچوں کے سر تھوپا جاتا تھا وہ جاتا رہا یہ مانا جانے لگا کہ پڑھائی میں جی لگانے کے لئے قوت ارادی کے علاوہ بعض اور چیزوں کی بھی ضرورت ہے، بچے کے نفسیاتی ذرائع کو اس میں بڑا دخل ہے۔ اس سے اگلا قدم اس حقیقت کا اعتراف تھا کہ ہر بچہ اپنی جگہ یکتا ہے اور اسے سمجھنے کے لئے اس کا انفرادی مطالعہ ہونا چاہئے تاکہ تدریس اس کی مخصوص ضرورتوں کا ساتھ دے سکے۔ بنے کی معلومات کے نتائج بڑے دوررس ثابت ہوئے۔ اب ذہین بچوں معمولی بچوں معذور بچوں اور پس ماندہ بچوں کی ذہنی پیمائش شروع ہوئی۔ ان مطالعوں سے بچوں کے متعلق بڑی کارآمد معلومات ہاتھ لگیں۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ذہنی پیمائش کو غیر ضروری اہمیت دی گئی ہے۔ لوگ اس نئے پیمانے کی

...میں ایسے کھو گئے کہ انہوں نے بچے کی بڑھتی پھولتی زندگی کے دوسرے پہلوؤں کو نظر انداز کر دیا
اس بات سے کسی کو انکار نہیں کہ اس پیمائش کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ تدریس کو انفرادی فرق وں
...سب حال بنانے کی کوشش کی گئی اور سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکنے کا دستور ختم ہو گیا۔ اس
طریقے کا دوسرا اہم نتیجہ یہ ہوا کہ مدرسوں میں رہنمائی اور مشورہ دینے کے پروگرام ناگزیر خیال کئے
جانے لگے اور بچوں کو ناکافی استعداد کی بنا پر سزا ملنی بند ہو گئی۔

تدریس کی تاثیر میں اضافہ ذہنی پیمائش نے رفتہ رفتہ ایک سائنس کا درجہ حاصل کر لیا۔ اس نے صرف بچے کی وضع کی ہوئی ذہنی آزمائشوں پر اکتفا نہیں کیا۔ تھارن ڈائک اور اس کے زیر اثر دوسرے لوگوں نے بچوں کی ہر چیز کی پیمائش شروع کر دی۔ دوسری اور تیسری دہائیوں میں طریقہ ہائے تدریس نے پیمائش کے نتائج سے عملی کام لینا شروع کیا۔ روایتی طریقوں کو تنقیدی نگاہ سے جانچا گیا اور نئے تجربوں کے نتائج و اثرات کو ترازو میں تولا گیا۔ اس طرح تعلیمی دنیا میں جو انقلاب پیدا ہوا۔ اس کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب ایک اہم موضوع پر لکھی ہوئی دو ایسی نفسیات کی کتابوں کا موازنہ کیا جائے جن میں سے ایک سنہ ۱۹۱۰ء میں چھپی ہو اور دوسری سنہ ۱۹۳۰ء میں۔ اول الذکر کتاب انفرادی اختلافات کا ذکر نہیں کرتی اور نہ ہی نشو و نما کے اختلافات کا۔ وہ اس مفروضہ سے شروع ہوتی ہے کہ تعلم ایک از خود پیدا ہونے والی شے ہے۔ نظریوں کے لئے حقائق کے اعداد و شمار غیر ضروری ہیں اور نقشوں اور گرافوں کا نام و نشان نہیں۔

پہلی عالمگیر لڑائی پہلی جنگ عظیم ایک اور انقلابی موثر ثابت ہوئی۔ بچوں کی درجہ بندی کے لئے جو طریقے برتے گئے تھے وہ اب لاکھوں سپاہیوں پر آزمائے گئے۔ اس سے یہ حیرت انگیز حقائق منظر عام پر آئے کہ بہت سے لوگوں کی ناخواندگی محض اس وجہ سے ہے کہ تعلیمی سہولتیں ان کے حسب حال نہ تھیں بعض ایسے جسمانی نقائص کے سبب محروم رہے جن کا علاج ہو سکتا تھا بعض ایسی ذہنی پریشانیوں کا شکار تھے جن پر قابو ناممکن تھا۔ جنگ ختم ہونے پر نفسیات اور تعلیم کے ہزاروں ماہر جنہوں نے فوج کے تعلیمی پروگراموں میں تربیت پائی تھی سکولوں اور دوسرے تعلیمی اداروں میں واپس آگئے

انہوں نے شخصیت کے تجزیئے کے وہ طریقے جو جنگ میں وضع ہوئے تھے بچوں پر آزمائے
کام کے نتائج موجودہ تعلیمی نظریوں کی بنیاد ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ ۱۹۲۰ء اور اس کے بعد کے
چند سال تعلیمی نظریوں کے لئے ہل چل کا زمانہ تھا۔ اس ہل چل نے علاج اور صحت کے شعبوں کو بھی
متاثر کیا۔ موزوں تعلیمی پروگرام میں صحت اور غذا کے پروگراموں کو شامل کیا گیا۔ عوام کو صحت قائم رکھنے
اور امراض کی روک تھام کے متعلق عام واقفیت دلائی گئی۔

بچوں کی نشو و نما کے متعلق تحقیقاتی مطالعے ہونے لگے۔ ساتھ ہی والدین کو تعلیم دینے کا بندوبست
ہونے لگا۔ اب تک صرف چھ سال یا اس سے زیادہ عمر کے بچوں کا مطالعہ ہوا تھا۔ اب اس سے
کم عمر بچوں کے مطالعے کے لئے نرسری اسکول کھلے۔ ان مطالعوں نے ننھے بچوں، بچوں اور نوعمروں کے
متعلق کئی اہم حقائق کو بے نقاب کیا۔ معاشی اور معاشرتی ماحول کے اثرات کا کھوج لگایا گیا۔ اور سارے
ماحول کا تجزیہ ہونے لگا۔ یہ موضوع اخباروں۔ رسالوں۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر زیر بحث آنے لگے
اور عوام میں ان باتوں سے دلچسپی پیدا ہو گئی۔ عوامی اداروں مثلاً اساتذہ اور والدین کی انجمنوں
نے بچوں کی بہبود کے لئے کام کرنا شروع کیا۔

ذہنی صحت | پہلی جنگ عظیم کی ایک اور پیداوار۔ ذہنی صحت کی تحریک تھی۔ یہ اس مفروضہ
پر مبنی ہے کہ بالغوں کی اکثر ذہنی الجھنوں کا سبب وہ ناخوش گوار واقعات ہوا کرتے ہیں۔ جو
بچپن میں پیش آئے۔ زندگی کے ساتھ پسندیدہ مفاہمت کے لئے ضروری ہے کہ لاشعور کی ان گہرائیوں
تک پہنچا جائے۔ اس نظریہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ گھروں میں گھومنے والے استاد مقرر ہوئے۔ بچوں کی
رہنمائی کے لئے علاج گاہیں قائم ہوئیں اور سرکاری مدرسوں میں بچوں کے مطالعہ کے شعبے قائم
کئے گئے۔ یہ تمام ادارے اپنا کام اس یقین کے ساتھ شروع کرتے ہیں کہ بچے کی ذہنی صحت کی
اسی صورت میں ممکن ہے جب اسے ایک کثیر الوجوہ وحدت فرض کیا جائے۔ ذہنی صحت کی
کوشش کرتی ہے کہ بچے کے کوائف کے گہرے مطالعہ اور طرح طرح کی آزمائشوں سے اس کا
ماحول کا تعلق معلوم کیا جائے۔ یہ دیکھا جائے کہ وہ مدرسہ کی ذمہ داریوں کو کس طرح

ہر میں اس کا رویہ کیا ہے۔ اس کے ساتھی کس قسم کے ہیں، دوسروں کی نگاہوں میں اس کی تصویر کیسی ہے۔ معاشرہ میں اسے کیا مقام حاصل ہے۔ وہ خود اپنے متعلق کیا رائے رکھتا ہے۔ مرض کی تشخیص اور علاج کا کام ماہرین کی ایک جماعت کے سپرد ہوتا ہے جو مل کر سارے معاملہ پر غور کرتے ہیں۔

سنہ ۱۹۲۰ء اور سنہ ۱۹۳۹ء کے درمیان شرارتی بچوں اور معمول سے ہٹے ہوئے بالغوں کی نفسیات کے جو مطالعے کیے گئے ان سے ماحول کے ساتھ عدم مفاہمت کے متعلق بڑا شدید احساس پیدا ہو گیا والدین پہلے اپنے بچوں کی شرارتوں اور قصوروں کو چھپانے کی کوشش کرتے تھے۔ اب نقطۂ نگاہ میں تبدیلی کی وجہ سے معمول سے ہٹے ہوئے رویے کو ایک ذہنی بیماری سمجھا جانے لگا جس کی تشخیص اور علاج ضروری تھا۔ اس فکری تبدیلی نے کئی اور تبدیلیاں پیدا کیں۔ اگر ذہنی بیماریوں کے اسباب موجود ہیں تو ان کا کھوج لگنا چاہیئے۔ یہ جستجو ہمیں دوبارہ بچپن کے مطالعہ کی طرف لے جاتی ہے۔ جب بچے کو تمام قصوروں کے لیے ذاتی طور پر ذمہ دار سمجھا جاتا تھا اس وقت اس کی تربیت کا مسئلہ بڑا آسان تھا۔ اسے ہر کوتاہی کی کچھ نہ کچھ سزا مل گئی اور بس۔ لیکن اگر بچہ کم از کم ایک حد تک اپنے مخصوص حالات کا شکار ہے تو ان حالات کا سراغ لگانا ضروری ہے۔ اگر اس کے مخصوص حالات محفوظ رکھے گئے ہیں تو طویل المدت اسباب کا مطالعہ ممکن ہو جاتا ہے۔ اب استاد بچے کو ایک ایسی اکائی خیال نہیں کرتا جس کا فرض پڑھنا ہے۔ بلکہ وہ اسے ایک شخص خیال کرتا ہے جو اپنے مخصوص گھریلو ماحول سے نکل کر آیا ہے۔ اور اپنے ساتھ مفاہمت کی کئی مشکلیں لے کر آیا ہے۔ اب سوال یہ بن جاتا ہے کہ بچے کو زندگی کے نئے ماحول کے ساتھ کسی طرح ہم آہنگ بنایا جائے۔

سنہ ۱۹۳۰ء کے بعد نفسیات میں ایک اور رجحان پیدا ہوا۔ یہ ان ماہرین نفسیات کے کام کا نتیجہ تھا جو بچوں کے دلوں میں ذوق پیدا کرنے کے وسائل تلاش کر رہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی جمہوری اور تحکم پسند فضا کے ذہنی اثرات کے متعلق تجربے ہونے لگے۔ اسی زمانہ میں معاشرتی ماحول کے اثرات ماپنے کی تکنیکیں وضع ہوئیں۔ ان عالموں نے اس خیال کو جنم دیا کہ معاشرتی گروہوں کے طرز عمل کا مطالعہ نظری اور عملی دونوں طور پر اہم ہے۔ ان تمام باتوں سے ظاہر ہے کہ بچوں کی نفسیات

کے متعلق جو تجربے اور مطالعے ہوتے رہتے ہیں وہ صرف ہمیں ان کے متعلق کار آمد معلومات بہم پہنچاتے ہیں بلکہ وہ زندگی کے بالغ اور سن رسیدہ دوروں پر بھی مفید روشنی ڈالتے ہیں۔ ذہنی قوا کی نشو نما کے متعلق جو معلومات ہاتھ لگی ہیں وہ ان کے زوال و انحطاط کے متعلق بھی خبر دیتی ہیں ۔

ارتقائی نقطۂ نگاہ پچھلی نصف صدی میں بچوں کی نفسیات کے متعلق جو تحقیقات ہوئی ہیں ان کا مجموعی اثر یہ ہے کہ اب تعلیم اپنی ساری بنیاد ایک ارتقائی نظریئے پر رکھتی ہے ۔ وہ بچے کو زندگی کی کسی منزل پر بھی ایک بے تعلق اور آزاد اکائی خیال نہیں کرتی بلکہ اس کے ذہنی رجحانات کو تجربے کے بہاؤ میں ایک تغیر پذیر نقطہ خیال کرتی ہے ۔ ایسا نقطہ جو ماضی میں بچپن کے ساتھ گہرے روابط رکھتا ہے اور آئندہ کے رجحانات پر گہرا اثر ڈالنے والا ہے ۔ یہ اسی یقین کا نتیجہ ہے کہ بچوں کے مکمل کوائف اور ان کے مخصوص رجحانات کا پورا ریکارڈ رکھا جاتا ہے ۔ تاکہ اس کی مدد سے ذہنی صحت گاہ کے ذمہ دار لوگ بچوں کو سمجھ سکیں اور ان کی مناسب دست گیری کر سکیں ۔ یہ ریکارڈ اور مدرسے کا مجموعی ریکارڈ دونوں تحقیقی مطالعہ کے بنیادی اوزار ہیں ۔

روایتی طریق یہ تھا کہ بچے کی ذہنی حالت کا اندازہ کسی مخصوص وقت کی کیفیت کو دیکھ کر کیا جاتا تھا ۔ اب یہ دیکھنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ موجودہ ذہنی کیفیت کس طرح پیدا ہوئی ۔ اور یہ کیفیت آگے کیا رنگ اختیار کرنے والی ہے ۔ بیتے ہوئے تجربوں اور موجودہ کیفیت کی روشنی میں اسے ایک بہتر طالب علم اور زیادہ ہم آہنگ انسان بننے میں کیا مدد دی جا سکتی ہے ۔

پچھلی نصف صدی میں اس نقطۂ نگاہ سے بعض اوقات انحراف بھی ہوا ہے مثلاً ایسے مدرسے کھلے جو بچے کی فوری خواہشات ہی کو تعلیم دینے کا واحد ذریعہ خیال کرتے تھے اور ہر قسم کے خارجی دباؤ کے مخالف تھے ۔ اس کے برعکس ارتقائی نظریہ بچے کے وسائل کا جائزہ لیتا ہے اور اس کی موجودہ ضرورتوں اور خواہشوں کو بنیاد بنا کر نئے مقاصد کی طرف بڑھتا ہے ۔ ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے وہ ماحول اور جذباتی فضا کو محرک بنانے کی کوشش کرتا ہے ۔ تاکہ سوئے ہوئے ذہنی وسائل ترقی پائیں اور موزوں شکل اختیار کر جائیں ۔ ارتقائی نظریہ بے صبری سے کام نہیں لیتا ۔ وہ وقت کو بڑا اہم عنصر سمجھتا ہے ۔

وہ یقین رکھتا ہے کہ مطلوبہ ذہنی الموار پیدا کرنے کے لئے ذانت چاہئے۔ بچے پر کوئی چیز ٹھونسی نہیں جاتی بلکہ وہ مطلوبہ اثرات کو ماحول ہی میں سے جذب کر لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ اثرات پائیدار ثابت ہوتے ہیں، ماحول جس قدر وسیع اور پربہا ہو گا اسی قدر یہ زیادہ پرتاثیر ہوگا۔ یہ ماحول بچے کو اپنے ذہنی وسائل معلوم کرنے میں مدد دے گا۔ یہاں تک کہ بلوغت کی حد کو پہنچ کر وہ اپنے مخصوص رجحانات کی روشنی میں اپنے لئے موزوں ترین کام کا انتخاب کر لے اور ایک پسندیدہ شہری کی حیثیت میں اپنی معاشرتی ذمہ داریوں کا بوجھ سنبھالے۔

غرض پچھلے پچاس سالوں میں بچوں کی نفسیاتی زندگی کے متعلق جو دریافتیں ہوئی ہیں انہوں نے تعلیمی نقطہ نگاہ میں ایک بنیادی تبدیلی پیدا کر دی ہے۔ اس تبدیلی کے طفیل طریقہ ہائے تدریس میں بھی انقلابی تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ اسی طرح والدین کا نقطہ نظر بھی بالکل بدل گیا ہے۔ ترقی یافتہ ملکوں میں یہ سارا انقلاب نفسیاتی حقائق کی دریافت اور ان کے متعلق عام آگہی کے سبب رونما ہوا۔ پسماندہ ملک ترقی پسند تعلیمی طریقوں کو رواج دینے کی کوشش تو ضرور کرتے ہیں لیکن یہ طریقے جس نفسیاتی شہادت پر مبنی ہوتے ہیں وہ عموماً عوام کی نگاہ سے اوجھل رہتی ہے۔ بعض اوقات استاد بھی اس سے آگاہ نہیں ہوتے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان طریقوں کو نہ سرگرم عوامی تائید حاصل ہوتی ہے اور نہ استاد کا دلی جذبہ۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر تعلیمی تبدیلی دراصل ایک معاشرتی تبدیلی ہوا کرتی ہے۔ اسے کامیاب بنانے کے لئے پہلے عوام کو باخبر کرنا ازبس ضروری ہے۔ پسماندہ ملک اس پہلی شرط کو نظر انداز کر جاتے ہیں جس کے سبب تعلیمی ترقی کے کئی منصوبے خاطر خواہ نتائج پیدا نہیں کرتے۔

موسیقی کی تعلیم (اسلامی دور میں)

خداداد خاں

اسلامی دَور کے عروج میں موسیقی نصاب تعلیم کی نہایت اہم شق تھی۔ سائنس دان اور طبیب اپنے
ن میں اس کی ضرورت کو مقدم خیال کرتے تھے اور یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ دورِ اوّل کے موسیقی دان
لماء کی اولین صف میں تھے۔ ان کی علمی شان۔ فلسفیانہ عظمت۔ اور حکیمانہ منزلت موسیقی کی بدولت روشن
ھی۔ اس دور کے موسیقی دانوں کی قابلیت کئی کئی فنون میں مسلّم تھی۔ وہ موسیقی کے علاوہ نجوم، ہیئت، ریاضی
غرافیہ، فلسفہ اور طب کے مسلم الثبوت استاد تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ دوسرے علوم میں وسیع اور مسلّم
ابلیتیں محض موسیقی میں مہارتِ کاملہ کی بدولت پیدا کر سکے ہیں۔ چنانچہ "ابراہیم الموصلی" متعدد علوم میں
ایاں اور درخشاں شہرت کا مالک تھا۔ اس کا ایک ہم عصر لکھتا ہے کہ وہ مختلف علوم میں انتہائی اور
ساوی قابلیت رکھتا تھا۔ جہاں وہ اپنے وقت کا بے مثال موسیقار تھا۔ وہاں اسے فلکیات، جغرافیہ
ر ادب کے دوسرے شعبوں میں کامل عبور بھی تھا، وہ خطابت، مجلسی اور سیاسی رموز و آداب، قانون اور
مول سے یہاں تک واقف تھا کہ "المامون" اس کے متعلق ہمیشہ کہا کرتا تھا کہ "الموصلی" کو قاضی القضاۃ"
ے فرائض انجام دینے کی مکمل مہارت حاصل ہے۔

اس دَور میں یہ خیال عام طور پر موجود تھا کہ فلکیات یا دوسرے سائنسی علوم میں موسیقی کے بغیر
ارت کا حصول ایک ناممکن بات ہے۔ اسی عقیدے کے تحت اس زمانے میں موسیقی اور سائنس
ب ہی چیز خیال کی جاتی تھی اور شاید یہی وجہ ہے کہ "زریاب" کے ذہن و دماغ میں بہت سے علوم
ذخائر موجود تھے۔

ان ایام میں موسیقی کی تعلیم کے مقاصد بہت جامع اور وسیع تھے۔ موسیقی تدریس کا جو عظیم تھی
اس کا اولین مقصد ذہنی ترقی تھا۔ مسلمانوں نے یہ نظریہ یونانیوں سے اخذ کیا تھا، جاحظ، اپنے

رحمۃ للعالمین میں لکھا ہے کہ موسیقی یونانیوں کا ایک اہم فن تھا کیوں کہ نفسیاتی طور پر ذہنی اور دماغی
قوت کو تیز کرنے میں موسیقی زیادہ اثر انداز ہوتی ہے۔ چناں چہ "فیثاغورث" کے بلند مرتبت نظریات
اور حسابی فارمولے موسیقی کے مرہون ہیں۔

جس دور میں طبی تعلیم یونان میں عروج پر تھی موسیقی سائنس کی مختلف شاخوں میں مدغم تھی
فلسفہ اور سائنس میں موسیقی کے کئی موضوع تھے اور یہ موضوعات عام طور پر درسی کتب کی حیثیت اختیار
کئے ہوئے تھے۔ اطبا کے نزدیک موسیقی نفسیاتی، روحانی اور جسمانی عوارض کے لئے شفا کا حامل
خیال کیا جاتا تھا۔

"اخوان الصفا" کے نزدیک زمین و آسمان کی گردشیں، نغمات اور الحان کی مرہون ہیں۔ یہ نغمات
قدرتی طور پر کائنات کی رگ و پے میں جاری و ساری رہتے ہیں۔ یہ فلسفی خیال کرتے تھے کہ ہر نغمہ اور ہر
تان کسی نہ کسی "حس" کے مطابق ہوتی ہے اور احساس کو متاثر کرتی ہے۔ چناں چہ نغمات اور الحان کے
اختلافات انسان کے احساس کے تنوع کے تحت ہی ہیں۔ چوں کہ ہر جاندار کی فطرت میں بہ مثال
اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس لئے ہر مزاج ہر فطرت اور ہر حس اپنے مطابق نغمات سے متاثر ہوتی
ہے۔ چناں چہ اسی فطری اصول کے تحت شفا خانوں میں موسیقی کی ضرورت کا خیال رکھا گیا۔ ان کا
عقیدہ تھا کہ راگ سے بیماری کی شدت میں تڑپتے ہوئے اور بے چین مریضوں کی اذیت فی الفور
زائل ہو جاتی ہے۔

موسیقی کے رائج الوقت نظریئے کے مطابق "بربط" کے چار تار انسانی مزاج کی چار خصلتوں
کو ظاہر کرتے تھے اور جب "زریاب" نے پانچویں تار کی ایجاد کی تو اس کو روح کے ساتھ منسوب کیا گیا
اور یہ نظریہ بڑی سرعت کے ساتھ مشرق قریب اور مشرق بعید میں شہرت پذیر ہوتا چلا گیا حتی کہ
ہندوستان کے موسیقی دانوں کا بھی یہ نظریہ ہو چلا کہ انسانی مزاج کی چاروں خصلتیں راگ کی مختلف
تانوں سے متاثر، متحرک اور قوت پذیر ہو سکتی ہیں۔ اطبا مختلف امراض میں موسیقی کا استفادہ
کرتے تھے اور اپنے شاگردوں کو اس طریق علاج کی مخصوص تربیت دیتے تھے۔

یعقوب بن اسحاق الکندی پہلا عرب فلسفی تھا جس نے موسیقی کو بطور سائنس ہونے کی ضرورت
اہم طور پر محسوس کیا۔ ایک بار الکندی کو ایک پڑوسی نے اپنے بیمار لڑکے کے علاج کے لئے مدعو کیا
لکندی نے اپنے چار شاگرد جو طنبور بجانے میں ماہر تھے بلائے۔ یہ چاروں مختلف نیہ اور طربیہ دھنوں
یکساں کمال کے ساتھ بجا سکتے تھے۔ وہ ، وہ دھنیں بھی بجانا جانتے تھے جن سے دل میں نئی قوت
پیدا ہوتی اور سانس کی رفتار تیز ہو جاتی ہے۔ چنانچہ الکندی نے ان چار شاگردوں کی بدولت ایک
تھوڑے وقت میں مریض کے ہوش و حواس درست کر دیئے۔

دفعیۃ الامراض کے نقطہ نظر کے علاوہ فلسفی موسیقی کو اس کے نفسیاتی اثرات کے تحت بھی
استعمال کرتے تھے۔ ہر دھن اور ہر راگ کا ہر دل پر مخصوص اثر ہوتا۔ کیوں کہ ہر ایک دل کی کیفیت
الگ ہوتی ہے۔ کچھ راگ دل کی معصومیت، پاکیزگی اور قوت کو روشن اور تیز کرتے ہیں اور کچھ تانیں
ایسی تھیں جو غم، اداسی اور تھکان پیدا کرتیں۔

طب اور فلسفہ میں موسیقی کے تجربات ابو ذکریا رازی سے زیادہ کسی نے نہیں کئے جو بذاتِ خود
طب کا بہت بڑا ماہر تھا۔ تصوّف میں موسیقی، روحانی اور اخلاقی اقدار کے پیشِ نظر کارفرما تھی۔۔۔
راسخ الاعتقاد لوگوں کے عقائد کے برعکس اصفیاء میں موسیقی تصوّف کا لازمہ تھی۔ لیکن چوں کہ
دوں فرقوں کے نزدیک موسیقی کی حیثیت مسلّم نہ تھی۔ اس لئے دینی اداروں میں موسیقی دخیل
ہو سکی۔

شاہی دربار موسیقی کی تربیت کے سب سے بڑے ادارے تھے۔ جہاں عظیم المرتبت موسیقی دان
بڑی بڑی تنخواہیں پاتے اور موسیقی کی تعلیم دیتے۔ با۔ شاہ بذاتِ خود اس فن میں کامل مہارت رکھتے
نے جعفر نے راگ کی چند مخصوص دھنیں ایجاد کیں۔ بابر بربط نوازی میں اپنی مثال آپ ہی تھا
ں نے چند دھنیں ایجاد کیں اور دوسروں کو سکھائیں۔ اکبر نے شاہی خرچ پر ایک موسیقی دان کو
ن میں عادل شاہ کے پاس محض اس لئے بھیجا تھا کہ وہ شاہزادہ بیجاپور سے وہ تانیں سیکھ کر آئے
کا وہ موجد تھا۔ درباروں میں شاگرد پیشہ لوگ بادشاہوں کی ذاتی ہدایات اور نگرانی میں تربیت

پاتے جنہیں لڑکیاں نامور استادوں کے سپرد ہوتیں تاکہ رقص وسرود کے فن سیکھیں۔ ایک بار ایک ماہر موسیقی دان نے ابراہیم المہدی کے خلاف یہ مقدمہ دائر کیا تھا کہ ایک لڑکی کی تربیت کرنے کا معاوضہ نہیں دیا گیا جسے بادشاہ نے اس کے سپرد کیا تھا۔

عباسی دور کے عروج میں موسیقی عورت کا لازمہ تھی۔ رقص وسرود اس کے گھریلو فرائض کا ایک حصہ تھے۔ ہر بیوی کا یہ فریضہ تھا کہ وہ افکار معیشت میں تھکے ہوئے خاوند کا گھر آنے پر ہلکے اور میٹھے راگ سے استقبال کرے۔ شام کے وقت تمام بغداد رقص وسرود کا گہوارہ بن جاتا تھا۔ ہر گھر سے نغمے بلند ہو کر فضا میں تحلیل ہو جاتے۔

موسیقی دان جوں جوں سوسائٹی پر اثر انداز ہوتے گئے ان کی عزت اور شہرت زیادہ ہوتی گئی فنی اشاعت اور تربیت کے پیش نظر ان نامور مغنیوں نے اپنی اپنی تربیت گاہیں قائم کر رکھی تھیں۔ اسلام کے سنہری دور میں ابراہیم الموصلی۔ اور زریاب کے موسیقی کے اسکول تاریخی حیثیت رکھتے تھے۔ ہندوستان میں اکبر کے دربار میں تان سین کا تربیتی ادارہ ملک بھر میں مشہور تھا۔ حضرت نظام الدین اولیاء دہلوی کی خانقاہ میں حضرت امیر خسرو بھی ایک موسیقی کی مجلس کے نگران تھے۔ جہاں تصوف کے اصول وضوابط کے تحت درویش اور صوفی ایک مخصوص انداز میں رقص کرتے تھے۔ اصفیاء کا خیال ہے کہ اس مخصوص رقص کے اصول حضرت جلال الدین رومی نے وضع کئے تھے۔

جن ماہرین موسیقی کا تعلق شاہی درباروں سے نہ ہوتا تھا۔ وہ اپنی قیام گاہوں پر موسیقی کے سکول قائم کئے ہوئے ہوتے تھے۔ ایسی پرائیویٹ تربیت گاہوں کی تعداد بہت ہی زیادہ تھی۔ بڑی بڑی دانش گاہوں میں بھی فلسفہ اور سائنس کے ساتھ ساتھ موسیقی برابر توجہ اور محنت سے سکھائی جاتی تھی۔ الکندی نے موسیقی کی تاریخی۔ فنی اور ریاضیاتی اہمیت کے بارے میں ایک مشہور کتاب لکھی ہے جس نے خلیفہ مستعصم باللہ کے ایک بیٹے کے لئے ایک اور کتاب لکھی جس میں صرف بربط نوازی کو اعلیٰ تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں۔ الکندی اکثر امراض کا علاج موسیقی سے کرتا تھا۔ اور اپنے شاگردوں کو اس کی خاص تربیت دیتا تھا۔

ابن سینا نے گیارہویں صدی کی مشہور تصنیف "شفاء" میں فن موسیقی پر بے مثال بحث کی ہے اور فن طب کی تکمیل کے لئے موسیقی کو ضروری قرار دیا۔ "ابن باجہ" عود بجانے میں اپنا ثانی نہ رکھتا تھا۔ عود سرائی میں اس کی بے مثال شہرت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ آج تک اسپین میں بہت سی دھنیں اور راگ اسی کے نام سے منسوب ہیں۔

بعض استاد ایسے تھے جو موسیقی کو بطور فن اختیار کئے ہوئے تھے۔ لیکن بعض کے لئے یہ فن محض لمحات فرصت کا مشغل تھا۔ "ملک العادل" کا معتمد ابن النقاش، جو دمشق میں نورالدین کے ہسپتال کا مشیر خاص تھا۔ فنی حیثیت سے موسیقی کی تعلیم دیا کرتا تھا۔ اس کا ایک شاگرد اپنے وقت کا مشہور عود نواز تھا۔

موسیقی کی تعلیم اور اس کے فنی مطالعہ کی ضرورت کو علم العروض میں بھی محسوس کیا گیا۔ چنانچہ عرب میں علم عروض کے موجد نے اپنی مشہور کتاب "کتاب النغم" میں موسیقی کے قواعد اور ضوابط پر نہایت جامع بحث کی ہے "حسین ابن اسحاق" جس نے ارسطو کی بہت سی کتابوں کا عربی ترجمہ کیا ہے تفصیل سے بیان کرتا ہے کہ یونان میں موسیقی کو سائنس اور فلسفہ کے مساوی خیال کیا جاتا تھا۔ اور اس حقیقت سے انکار نا ممکن ہے۔ کہ دورِ اسلام کے فلاسفر اور سائنس دانوں کے جو نظریات موسیقی کی اہمیت کے بارے میں تھے۔ وہ یونانی تاثر کے تحت تھے۔ بنو موسیٰ ثابت بن قرۃ ..... ابوبکر محمد بن ذکریا رازی۔ فارابی، ابن رشد، نصیرالدین طوسی، اور قطب الدین شیرازی۔ جہاں اسلام کے نامور فلسفی اور سائنس دان تھے وہاں فن موسیقی کے کامل استاد بھی تھے۔ ان میں بعض موسیقی کی فنی تعلیم بھی دیا کرتے تھے۔ "فارابی" جس کا تعلق سیف الدولہ کے دربار سے تھا موسیقی کے متعلق مسلسل لکچر دیا کرتا تھا۔

موسیقی میں "ابن مانا" کے اصول استادانہ حیثیت رکھتے ہیں۔ کمال الدین ابن مانا نے بغداد کے مدرسہ نظامیہ میں خوب شہرت حاصل کی۔ جہاں وہ ریاضیات کا پروفیسر تھا۔ وہ موسیقی کا بے مثال استاد ہونے کے علاوہ تمام سائنسی علوم میں ماہر تھا۔

وقت اور ضرورت کے تحت فن موسیقی میں مسلسل اصلاحات ہوتی رہیں۔ اسپین کے مغنی اعظم زریاب نے فنی حیثیت سے موسیقی کو نہایت کمال تک پہنچا دیا تھا۔ اس نے موسیقی کے مدارج قائم کیے اور نصاب موسیقی کو تین حصوں میں تقسیم کیا۔ پہلے حصے میں ساز پر راگ کے الفاظ کی تعلیم دی جاتی پھر مختلف سُروں کی مشق کرائی جاتی اور اس کے بعد راگ کی پختگی کا درجہ آتا تھا۔

صنف نازک میں غلام لڑکیوں کو بالخصوص اس فن میں پوری مہارت پیدا کرائی جاتی۔ ایسی لڑکیوں پر ان کے مالک زرکثیر صرف کرتے تھے۔ موسیقی کی تربیت سے ان لڑکیوں کی بازاری قیمت بیش از بیش ہو جاتی اور سوسائٹی میں بھی ان کا رتبہ بلند ہو جاتا۔ غالباً اسی وجہ سے مصر کی ہر مغنیہ آج بھی اپنے نام کے ساتھ "عالمہ" کا لفظ بڑے فخر سے لکھتی ہے (لین پول)

فن موسیقی کی ماہر عورتوں کا تعلق اگر کسی شاہی دربار سے ہوتا تو انہیں نمایاں مراعات حاصل ہوتیں۔ ان کی ہر ممکن طور پر نازبرداری کی جاتی تھی۔ ہر نئی تربیت یافتہ مغنیہ کو دربار میں تعلق پیدا کرنے کے لئے اپنے فن کا مظاہرہ کرنا پڑتا۔ جہاں سر دربار اس مظاہرے پر تنقید کی جاتی ... زریاب کے پاس دو غلام لڑکیاں تھیں۔ جن کی رہائش ان کے ساتھ تھی بعض اوقات زریاب اچانک نیند سے اٹھ بیٹھتا ان لڑکیوں کو بلاتا اور ایک مخصوص لے میں عود بجانے کی فرمائش کرتا اور کچھ وقت کے بعد انہیں رخصت کر دیتا۔

عورتوں کی اس فن میں استادانہ حیثیت کا اندازہ کچھ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ اسحاق الموصلی جو عباسی دربار کا مغنی اعظم تھا ایک عورت کا شاگرد تھا ؛

(تلخیص و ترجمہ از مقدمہ علامہ ابن خلدون)

صاحبزادہ رازق نور

تمہید علم اور تعلیم انسان کے لئے فطری اور طبعی ہے۔ انسان اپنی حیوانیت میں حس و حرکت۔ غذا اور سکونت وغیرہ کے لحاظ سے باقی حیوانات کے شریک اور برابر ہے۔ جو چیز اسے دوسرے حیوانات سے ممتاز کرتی ہے وہ فکر ہے۔ اسی فکر سے علوم کی نشو و نما ہوتی ہے۔ انسان اپنے سے سابق فی العلم اور معرفت اور ادراک میں فضل کی طرف رجوع کرتا ہے اور اس طرح تعلیم و تعلم کا سلسلہ جاری رہتا ہے اور علوم و عمران کی کثرت کے ساتھ ساتھ ترقی کرتے ہیں۔

علوم کی قسمیں علوم کی دو قسمیں ہیں (۱) طبعی اور فطری یا علوم حکمیہ فلسفیہ (۲) علوم نقلی۔ علوم حکمیہ فلسفیہ تک انسان اپنی فکر و نظر سے پہنچتا ہے۔ لیکن علوم نقلیہ کا انحصار شارع علیہ السلام کی خبر پر ہے۔ اور ان تمام علوم کا اصل ماخذ کتاب اللہ اور سنت ہے۔

علوم نقلیہ علوم نقلیہ کی اقسام کثرت سے ہیں۔ مثلاً (۱) تفسیر (۲) قرأت (۳) حدیث (۴) فقہ (۵) علم الفرائض (۶) علم الکلام (۷) تصوف اور (۸) علم تعبیر الرویا وغیرہ وغیرہ۔

قرأت ورسم الخط قرآن مجید اللہ کا کلام ہے اور امت محمدیہ میں تواتر سے چلا آتا ہے۔ لیکن چونکہ اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کئی صحابہؓ نے روایت کیا۔ اس لئے اس کے بعض الفاظ اور حروف کی ادائیگی میں لامحالہ طور پر اختلاف پیدا ہوگیا۔ چنانچہ سات قرأتیں قرار پائیں۔ اور فن قرأت بذات خود ایک الگ علم قرار پایا۔ ابوعمرو الدانی کی کتاب التیسیر اس فن میں اپنی مثال آپ ہے۔ فن قرأت میں فن رسم الخط کا اضافہ ہوگیا۔ جو کہ قرآن کریم کے حروف کی بناوٹ اور رسوم خطیہ کا نام ہے۔ اس فن میں بھی ابوعمرو الدانی کی کتاب المقنع جامع مانع تالیف ہے۔

تفسیر قرآن کی تعلیم صحابہؓ نے نبی کریمؐ سے پائی۔ صحابہؓ سے دوسروں نے اس کی روایت کی اس طرح

یہ سلسلہ پھیلتا گیا حتیٰ کہ معلومات ذہنیہ علوم بن گئے۔ اور علماء نے فن تفسیر میں بے شمار کتابیں لکھیں تفسیر کی دو قسمیں ہیں۔ (۱) نقلی۔ یہ منقولات رطب و یابس، ومعقول و مردود سے بھری ہوئی ہیں۔ چونکہ ابتدا میں اہل عرب خود لکھنے پڑھنے اور علم سے عاری تھے۔ اس لئے جب کسی چیز کی معرفت کا شوق ہوتا تو وہ یہودیوں سے استفادہ اور دریافت کرتے۔ مفسرین نے تساہل برتا اور تفسیریں اسرائیلیات اور لغو حکایات سے مملو ہوگئیں تاہم منقول تفاسیر میں سے ابو محمد بن عطیہ اور علامہ قرطبی کی تفسیریں اقرب الی الصحت ہیں، دوسری قسم کی تفسیروں میں لغت، اعراب اور بلاغت قرآن کی طرف زیادہ توجہ دی گئی ہے۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور علامہ زمخشری کی تفسیر کشاف ہے۔

حدیث | علم حدیث بہت وسیع اور کثیر التنوع ہے۔ کسی حدیث پر عمل اس وقت واجب ہوتا ہے۔ جبکہ اس کے متعلق صدق کا ظن غالب ہو جائے۔ صحیح بخاری احادیث کی کتابوں میں بہت اعلیٰ رتبہ رکھتی ہے۔ لیکن فضلاء عین اس کی شرح کا حق ادا نہ کر سکے۔ کئی ائمہ کثرت سے احادیث روایت کرتے ہیں اور بعض بہت کم۔ حضرت امام اعظم کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان کو کل سترہ حدیثیں پہنچیں۔ جن آئمہ سے کم حدیثیں مروی ہیں ان کے نزدیک جرح مقدم ہے۔ بہر کیف صحیحین (صحیح بخاری اور صحیح مسلم) سنن کی معروف کتابوں میں سے ہیں اور ان کا درجہ باقی سب پر مقدم ہے۔

فقہ | کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے احکام کے استنباط اور استخراج کا نام فقہ ہے۔ اس میں تمام دنیا میں صرف چار ائمہ امام اعظمؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کی تقلید جاری ہوئی۔ یہاں تک کہ ہر ایک شخص کسی نہ کسی امام سے تقلید میں مختص ہو گیا۔ جمہور نے ایک امام کی تقلید کو چھوڑ کر دوسرے کی تقلید کو ناجائز اور ممنوع قرار دیا۔ آج کل فقہ اسی تقلید کو کہتے ہیں۔

وراثت | وراثت کے مقررہ مفروضہ حصوں کی معرفت اور ان کی تصحیح کا نام علم الفرائض ہے۔ حساب کے بغیر وراثت میں کام نہیں چلتا، اس لئے علم الفرائض کو الگ فن قرار دیا گیا۔ اہل فن وراثت اس کی فضیلت میں اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں، جو حضرت ابوہریرہ رضؓ سے مروی ہے :-

النفس انفس ثلث العلم وانما اول ماینسی۔ کہ علم الفرائض علم کا تیسرا حصّہ ہے اور یہی
سے پہلے بھلا دیا جائے گا۔ اس فن میں بھی بہت سی کتابیں موجود ہیں۔ مذہب مالک میں کتاب ابن
، اور المختصر القاضی ابی القاسم سب سے زیادہ مشہور ہیں۔

کلام | علم الکلام کے ذریعہ عقائد ایمانیہ کو دلائل عقلیہ سے ثابت کیا جاتا ہے۔ حضرت جنید بغدادی رح
ب ان کا گذر متکلمین کے ایک گروہ کے پاس ہوا جو تنزیہ باری تعالےٰ میں غور و خوض کر رہے تھے
ہا نے دریافت کیا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ عرض کیا گیا کہ یہ لوگ اللہ کی ذات کی صفات حدوث سے
ہ بدلائل عقلیہ کر رہے ہیں۔ فرمایا "عیب کی نفی جہاں عیب محال ہو خود عیب ہے"۔ پھر بھی یہ علم مفید
ہے کیوں کہ حامل سنت کی دلائل عقلیہ سے غفلت اور نا واقفیت اچھی نہیں لگتی۔ جب کسی کو شوق ہو
ں فن میں ابو المعالی۔ بیضاوی امام غزالی اور امام رازی کی کتب کا مطالعہ کرے۔

ف | جب علوم کی کتابت اور تدوین کا زمانہ آیا اور فقہانے فقہ۔ اصول فقہ اور تفسیر وغیرہ علوم میں
، تصنیف کیں تو صوفیہ کرام نے تصوّف میں کتابیں لکھیں۔ صوفیہ کرام نفس کے مجاہدہ اور محاسبہ سے
رتے ہوئے ایک ذوق سے دوسرے ذوق کی طرف ترقی کرتے ہیں۔ امام غزالی کی کتاب احیاء العلوم
۔ میں نہایت بلند پائے کی تصنیف ہے امام قشیری نے کہا ہے کہ اسم صوفی کی صحیح وجہ اشتقاق
نہیں ہے۔ بہر حال انقطاع الی اللہ ہی اصل تصوّف ہے۔

تعبیر الرؤیا | علوم شرعیہ میں سے ایک علم تعبیر الرؤیا بھی ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا
۔ خواب نبوت کے چھیالیس اجزاء میں سے ایک جزو ہے"۔ اگر خیالی صورتیں روح عقلی مدرک سے
ہوئی ہیں۔ تو وہ رؤیا ہے۔ اگر انہیں خیال نے حالت بیداری میں حافظہ کے سپرد کیا تھا۔ اور اب
۔ خواب حافظہ سے ماخوذ ہیں تو یہ اضغاث احلام (وسوسے) ہیں۔ تعبیر کا مطلب یہ ہے۔ کہ
قلی جب ایک مدرک کا ادراک کرکے اُسے خیال کے حوالے کرتی ہے تو وہ اسے مناسب صورت دیتا
لاً عداوت کے ادراک کے وقت خیال اسے سانپ کی صورت دیتا ہے اور تعبیر کنندہ سانپ سے
ت لیتا ہے۔ علم تعبیر میں محمد بن سیرین بہت مشہور عالم ہیں۔

علوم عقلیہ | علوم عقلیہ طبعی ہیں۔ اس لئے کسی خاص مذہب یا ملت سے مختص نہیں ہیں۔ ان علوم کو علوم فلسفہ اور حکمت کہتے ہیں۔ یہ علوم فارس سے یونان پہنچے۔ جبکہ سکندر نے دارا کو قتل کرکے کیانیوں کی سلطنت پر غلبہ حاصل کیا اور وہ ان کی بہت سی کتابیں اپنے ساتھ لے گیا۔ ارسطو سکندر کا استاد ہے، فارسیوں پر غلبہ کے بعد ارسطو تمام علوم میں نہایت راسخ ہوگیا۔ ارسطو کی تعلیم ہی کو تعلیم اول کہتے ہیں۔ قیاصرہ کے زمانے میں یہ تمام علوم ترک ہو گئے۔ البتہ ان علوم کی کتابیں باقی رہیں۔ پھر اللہ تعالےٰ کے فضل سے اسلام کو ایسا غلبہ نصیب ہوا جس کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی۔ مامون الرشید کے زمانے میں مسلمانوں نے ان علوم میں مہارت تامہ حاصل کی۔ بلکہ وہ اپنے متقدمین پر ان علوم میں بڑھ گئے۔ ان علوم میں ابونصر فارابی۔ ابو علی سینا اور قاضی ابوالولید بن رشد بہت نامور ہیں۔

علم الاعداد | علوم العددیہ میں پہلا حساب ہے جس سے اعداد کے خواص بحیثیت ترکیبی معلوم ہوتے ہیں۔ الجبر المقابلہ بھی علم الاعداد کی ایک شاخ ہے۔ یہ ایک فن ہے جس سے معلوم مفروض عدد کے ذریعہ عدد مجہول کا استخراج کیا جاتا ہے۔ اس فن میں سب سے پہلے ابو عبداللہ الخوارزمی نے کتاب لکھی اس کے بعد باقی لوگوں نے تقلید کی ہے۔

علوم ہندسہ | علوم ہندسہ میں مقادیر متصلہ مثل خط سطح اور جسم کے اور منفصلہ مثل اعداد کے اور اُن کے عوارض ذاتیہ سے بحث کی جاتی ہے۔ مثلاً ہر مثلث کے زاویے دو قائموں کے برابر ہوتے ہیں وغیرہ وغیرہ یونانیوں کی جو کتاب اس فن میں ترجمہ ہوئی وہ کتاب اقلیدس ہے۔ یہ کتاب ابوجعفر منصور کے عہد میں ترجمہ ہوئی اور اس کے نسخے ترجمہ کرنے والوں کے لحاظ سے مختلف ہیں۔ علم ہندسہ سے عقل میں روشنی اور فکر میں استقامت پیدا ہوتی ہے۔ کہتے ہیں کہ افلاطون کے دروازے پر لکھا تھا کہ جو شخص علم ہندسہ سے بے بہرہ ہو اُسے اندر آنے کی اجازت نہیں ہے۔ مخروطات۔ مساحت اور مناظر ہندسہ کی فروع ہیں۔ مسلمانوں میں فن مناظر پر ابن الہیثم کی کتاب سب سے زیادہ مشہور تصنیف ہے۔

ہیئت | علم ہیئت کواکب متحرکہ ثابتہ اور متحیرہ سے بحث کرتا ہے۔ اس فن میں نہایت عمدہ کتاب المجسطی مصنفہ بطلیوس ہے۔ مسلمانوں نے اس علم کی طرف بہت کم توجہ دی۔ البتہ مامون الرشید کے

زمانے میں کسی قدر توجہ ہوئی اور آلۂ معروضۂ رصدی تیار کیا گیا مگر ناتمام رہا۔ جب مامون فوت ہوئے تو اس کا بھی نشان تک مٹ گیا۔

منطق | قوانینِ منطق کے ذریعہ دلائل فاسد اور صحیح کے مابین تمیز حاصل ہوتی ہے، ارسطو کی کتاب نص اس فن میں سب سے پہلی کتاب ہے۔ ابن سینا نے کتاب الشفاء میں تمام علومِ فلسفہ کو بالاستیعاب بیان کیا ہے۔ اس کے علاوہ مسلمان فلسفیوں نے منطق سے متعلق متعدد شرحیں اور خلاصے لکھے ہیں۔

الطبعیات | اس علم میں جسم سے بحث کی جاتی ہے۔ اس فن میں ابن سینا اور ابن رشد کی تصنیفات نہایت مفید ہیں۔ ابن سینا کی کتاب اشارات کو بالخصوص بہت پسند کیا جاتا ہے۔

علم طب | طب طبیعیات کی فروع میں سے ہے۔ اس فن میں مرض اور صحت سے بحث کی جاتی ہے بعض اوقات بعض اعضاء پر کلام کرنے کو الگ ایک فن مانا گیا ہے۔ مثلاً آنکھ اس کی بیماریاں اور اس کے سرمے وغیرہ۔ فنِ طب کا امام جالینوس ہے کہتے ہیں کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ہم عصر ہے۔ علم طب ایک ایسا فن ہے جس کے لئے حضارت اور دولت مندی نہایت ضروری ہے۔

علم زراعت | یہ فن بھی طبیعیات کی ایک شاخ ہے جس میں نباتات کی نشوونما پر بحث کی جاتی ہے۔ متاخرین نے اس فن میں بہت تالیفات کی ہیں۔ اور نباتات کے بونے پرورش اور حفاظت پر مفصل گفتگو کی ہے۔

(۲) تعلیم

حفظ کتب | تصنیفات اور تالیفات کی کثرت اور اصطلاحاتِ تعلیمی میں اختلاف نے تعلیم کو بہت نقصان پہنچایا ہے متعلم اکثر حفظ پر مجبور رہتا ہے۔ اور یہ مرض بہت پرانا ہے جس کا رفع ہونا آسان نہیں ورنہ تعلیم جتنی سہل ہوگی اتنی ہی زیادہ آسان ہوگی۔

خلاصے | اختصار پسند مصنفین نے یہ کوشش کی ہے کہ معانی کثیرہ کو قلیل الفاظ میں بیان کیا جائے تاکہ متعلمین مسائل کو آسانی سے حفظ کر سکیں۔ اس سے ملکاتِ نافعہ کو سخت نقصان پہنچا ہے اور اس تعلیم میں فساد اور تحصیل علم میں شدید خلل واقع ہوتا ہے اور یہ تعلیم کا نہایت برا طریقہ ہے۔

صحیح طریقۂ تعلیم | صحیح تعلیم کا طریقہ یہ ہے کہ جو کچھ سکھایا جائے۔ تھوڑا تھوڑا اور بتدریج سکھایا جائے نیز مبتدی کی لیاقت اور استعداد کے مطابق تعلیم دی جائے۔ ایک ہی فن کو مختلف اوقات میں نہ پڑھایا جائے کیوں کہ اس سے نسیان پیدا ہوتا ہے۔ متعلمین کا فرض ہے کہ وہ علوم مقصود بالذات کو علوم آلیہ کی نسبت زیادہ اہم سمجھیں۔

بدنی سزا | متعلم کو تعلیم میں بدنی سزا دینا سخت مضر ہے۔ خصوصاً چھوٹے بچوں کو سزا دینے سے ان میں بُرے ملکہ کی تربیت ہوتی ہے۔ ان کے نفس میں بجائے انبساط تنگی۔ بجائے نشاط کسل اور بجائے صداقت جھوٹ اور خبث پرورش پاتا ہے۔

سیر و سیاحت | طلب علم میں دوسرے ملکوں کی سیر و سیاحت نہایت ضروری ہے۔ اس طرح متعلم مختلف اصطلاحاتِ علمی اور معلمین کے مختلف طریقوں سے واقفیت حاصل کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ کتب سے اتنا کچھ حاصل نہیں ہو سکتا جتنا کہ بالمشافہ گفتگو سے حاصل ہوتا ہے۔

معلمین اور سیاست | علما کو سیاست سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا۔ ان کے نظریئے ذہنی ہوتے ہیں۔ خارجی امور ذہنی امور سے متفرق ہوتے ہیں۔ اس لئے اگر علماء عملی سیاست میں حصہ لیں گے تو غلطی میں پڑیں گے بلکہ کثرت سے غلطیاں کریں گے۔

مباحثہ | علوم میں مہارت حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ زبان کو مباحثہ اور مناظرہ میں تیز کیا جائے ہم دیکھتے ہیں کہ علمی مجالس میں بہت سی عمریں صرف کرنے کے بعد بھی طالب علم نہ بول سکتے ہیں نہ بحث و مباحثہ کر سکتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی توجہ حفظ کتب کی طرف زیادہ ہوتی ہے وہ اسی میں کمال سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ بات خلافِ واقع ہے اور یہ طرز تعلیم نہایت ناقص ہے ؛

منشیات اور نوعمر طلبہ

اویس احمد

منشیات کی روک تھام کے لئے جن لوگوں نے اپنی عمریں وقف کر رکھی ہیں ان کا کہنا ہے کہ یہ ایک بیماری ہے جو عام بیماریوں کی طرح چھوت سے پھیلتی ہے۔ اس کا موثر علاج صرف یہ ہے کہ کم عمر بچوں کو اس سے خبردار کیا جائے، بیس سال سے کم عمر کے نوجوانوں کو جب وہ مدرسوں میں ہوں خراب ماحول سے دُور رکھا جائے۔ انہیں نشہ آور چیزوں کے نقصانات کھول کر بتائے جائیں۔ یہ لوگ قانون ساز مجلسوں، سرکاری افسروں اور استادوں سے پرزور درخواست کرتے ہیں کہ ان گذارشات پر توجہ دی جائے۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ میں منشیات کے خلاف قوانین پر سختی سے عمل کرنے اور بین الاقوامی تعاون سے منشیات کی ناجائز درآمد روکنے سے اس ملک میں منشیات کے عادی لوگوں کی تعداد میں نمایاں کمی ہو گئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ استادوں نے موزوں تقریروں، رہنمائی، ریڈیو ٹیلی ویژن اور مناسب لٹریچر کی مدد سے ان گنت نوجوانوں کو منشیات کی لعنت سے بچایا ہے۔

تعداد میں کمی دوسری عالمگیر جنگ کے بعد امریکہ میں منشیات کا رواج زور پکڑ گیا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ جنگ کے درمیانی سالوں میں چین، ہندوستان، ترکی، یونان، اور اطالیہ میں منشیات کی پیداوار بہت بڑھ گئی تھی۔ اس کا بڑا حصہ ناجائز طور پر باہر جانے لگا۔ اب کمیونسٹ چین کے علاوہ باقی ملکوں نے ایک بین الاقوامی معاہدے کی رو سے منشیات کی پیداوار محدود کر دی ہے۔ اس پابندی کا اثر ہر جگہ محسوس ہوا ہے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے محکمۂ منشیات کے سب سے بڑے افسر نے حال ہی میں بتایا تھا کہ بیس سال سے کم عمر کے نوجوانوں میں منشیات کا استعمال کوئی قومی مسئلہ نہیں یہ وبا زیادہ تر بڑے بڑے شہروں تک محدود ہے سارے ملک میں منشیات کے عادی کم عمر نوجوانوں میں سے تین چوتھائی نیویارک اور شکاگو دو شہروں میں موجود ہیں۔ امریکہ کے اس محکمہ نے جو اعداد و شمار

جمع کیے ہیں۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ جہاں ۱۹۱۴ء میں ہر چار سو اشخاص میں سے ایک منشیات کا عادی تھا۔ اب تین ہزار میں سے ایک آدمی عادی ہے۔

قانون کا ہاتھ | قانون کو اگر سختی سے نافذ کیا جائے تو منشیات کی تجارت پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ امریکہ کی تقریباً تمام ریاستوں میں منشیات کے خلاف قانون موجود ہیں۔ لیکن ان سے پوری طرح کام لینا مقامی لوگوں اور مقامی عدالتوں کا کام ہے۔ عموماً یوں ہوتا ہے کہ جب کسی بستی یا علاقے میں خطرہ زیادہ شدید نظر آنے لگے تو وہاں کی عدالتیں سخت رویہ اختیار کر لیتی ہیں۔ سختی کے اس دور کے بعد عموماً پھر نرمی کا دور آجاتا ہے۔ یہ سمجھا جانے لگتا ہے کہ وبا پر قابو پا لیا گیا ہے۔ منشیات بیچنے والوں نے صاف طور پر اس بات کا اقبال کیا ہے کہ ان کا کاروبار اسی طرح کے نرمی کے دوروں میں چمکتا ہے۔ انہوں نے یہ بھی تسلیم کیا ہے کہ مختلف دفعوں میں قانون شکنی سے انہیں جو آمدنی ہوئی ہے وہ اگلی پچھلی سب کسر نکال دیتی ہے۔

حال ہی میں مرکزی حکومت نے ایک قانون کے ذریعہ سزا کو زیادہ کڑا بنا دیا ہے۔ ناجائز فروخت کے لئے زیادہ سے زیادہ دو ہزار ڈالر جرمانہ ہو سکتا ہے۔ قید کی میعاد جج کی مرضی پر موقوف ہے عموماً پہلی دفعہ دو سال کی سزا ہوتی ہے۔ دوسری دفعہ جرم کرنے پر پانچ سال اور تیسری دفعہ دس سال۔

محکمہ منشیات کے بڑے افسر نے نوعمر عادیوں کو منشیات کی لعنت سے بچانے پر زور دیا ہے۔ منشیات کا ہر عادی اس فکر میں رہتا ہے کہ کچھ اور لوگوں کو بھی اس جیسی لت پڑ جائے۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ اوسطاً ہر عادی کم از کم پانچ اور دوستوں کو نشہ کی عادت ڈالتا ہے۔ اگر قانون کی رسی ڈھیلی ہو جائے تو اس رفتار سے خوفناک نتائج پیدا ہو سکتے ہیں۔ عموماً یہ ہوتا ہے کہ کم عمر نوجوانوں کو مستی اور سرور کا مزہ چکھانے کے لئے نشہ کی کچھ مقدار یا اس کا ایک کش مفت پیش کیا جاتا ہے۔ تھوڑی دیر میں یہ نوجوان عادی بن جاتے ہیں اور خریدنے کے ذرائع نہ ہونے کی صورت میں چوری چکاری پر اتر آتے ہیں۔

مہذب دنیا میں بہت سی برائیوں کی اصلاح کے لئے معالجاتی طریقے دریافت ہو چکے ہیں۔ لیکن منشیات کے عادیوں کے لئے قید خانے کے سوا اور کوئی ٹھکانا نہیں۔ خواہ ان کی عمر چھوٹی ہو یا بڑی پہلی گرفتاری پر ان کے ساتھ یہ برتاؤ نہیں ہوتا۔ بالخصوص اگر وہ علاج کی درخواست کریں۔ بیس سال سے کم عمر کے عادی اکثر علاج معالجہ کی التماس کرتے ہیں۔ بدقسمتی سے منشیات کے عادیوں کے لئے بہت کم علاج گاہیں ہیں۔ امریکہ جیسے امیر اور ترقی یافتہ ملک میں بھی مرکزی حکومت نے اس قسم کی صرف دو علاج گاہیں قائم کی ہیں جن میں سے ایک ریاست کنٹکی میں ہے اور دوسری ٹیکساس میں۔ ان میں داخل ہونے کے لئے مریضوں کو کافی دیر انتظار کرنا پڑتا ہے۔ پورے علاج کے لئے چھ مہینے سے ایک سال تک کا وقت چاہئے۔ عادیوں کی اوسط عمر تیس برس سے کم ہے۔ اس سے یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ ان کی اکثریت قابل علاج و اصلاح ہوگی۔ لیکن ان سب علاج گاہوں کے ریکارڈ ظاہر کرتے ہیں کہ پانچ مریضوں میں سے صرف ایک کو حقیقی شفا نصیب ہوئی ہے۔ معالجوں کا بیان ہے کہ جو شخص پورے ایک سال تک عادی رہ چکا ہو اس کی صحت یابی کی کوئی امید باقی نہیں رہتی۔ دنیا میں صرف ایک عدالت ایسی ہے جو صرف منشیات کے عادیوں کے مقدمے سنتی ہے۔ یہ عدالت شکاگو کے شہر میں ہے اس عدالت کا جج یہ کوشش کرتا ہے کہ ناقابل علاج پرانے عادیوں کو کم عمر نئے عادیوں سے الگ کیا جائے۔ دوسرے گروہ میں ایسے نوخیز جوان بھی ہوتے ہیں جن کے ماں باپ کو ان کی بُری عادتوں کی خبر تک نہیں ہوتی اور جو بہت جلد مجرموں کے گروہ میں قدم رکھنے والے ہوتے ہیں۔

مدرسے کی ذمّہ داری نوجوانوں کو منشیات سے بچانے کے کام میں مدرسے بڑا حصّہ لے سکتے ہیں۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ کی اڑتالیس ریاستوں میں ایسے قانون موجود ہیں جو مدرسوں سے مطالبہ کرتے ہیں کہ بچوں کو منشیات کے متعلق صحیح واقعات اچھی طرح بتائے جائیں۔ ہر ریاست کا محکمۂ تعلیم اس ضمن میں منشیات کے مطالعہ کا ایک خاکہ تیار کرتا ہے۔ جسے نصاب مدرسہ میں شامل کیا جاتا ہے پہلے یہ مطالعہ صحت اور سائنس کی تعلیم کا جزو ہوا کرتا تھا۔ اور اس کا سارا زور شراب اور تمباکو کے مضر اثرات پر تھا۔ اب شہری علاقوں میں جہاں منشیات کا مسئلہ مشکل صورت اختیار کر گیا ہے۔

محکمۂ تعلیم نے نئی ہدایات اور اشارے جاری کئے ہیں جو کمرۂ جماعت میں استاد کی رہنمائی کرتے ہیں نیو یارک شکاگو اور لاس انجلیز میں یہ ہدایات حال ہی میں جاری ہوئی ہیں۔ اب منسیات کا تعلق صرف حفظان صحت اور سائنس کے مضامین کے ساتھ نہیں رہا۔ بلکہ دوسرے مضامین مثلاً معاشرتی علوم گھریلو زندگی اور گھریلو معاشیات کے ضمن میں بھی اس کا مطالعہ ہوتا ہے۔ استادوں کو عام ہدایات یہ ہیں کہ جب اور جہاں ضرورت محسوس ہو اور دلچسپی موجود ہو وہاں ضروری واقفیت اور بحث طبیر آنی چاہیئے۔

اس ضمن میں ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ کیا نوجوانوں کے دلوں میں منشیات کے تذکرے سن کر شوق تو چٹکیاں لینے نہیں لگے گا کہ ان کو ایک دفعہ آزما کر دیکھیں اور کیا اس سے خطرناک نتائج پیدا نہیں ہوں گے؛ ہاں یہ خطرہ ضرور موجود ہے۔ اسی لئے یہ ضروری ہے کہ اس موضوع پر بحث کرتے وقت ضرورت سے زیادہ جذباتیت سے احتراز کیا جائے۔ تاکہ بچوں کے دلوں میں ایک غیر صحت مند تجسس پیدا نہ ہو جائے۔ اکثر استادوں کا عقیدہ یہ ہے کہ واقعات کا بے لاگ بیان اور میانہ روی بہترین طریق تدریس ہے۔ استاد کے پاس تازہ ترین اعداد و شمار سائنس یا حفظان صحت کے نصاب میں موجود ہوں اور انہیں بلا وجہ دہرایا نہ جائے۔ یہ اعداد و شمار کس منزل پر آنے چاہئیں۔ اور ان کی کیا مقدار ہو؛ یہ وہ سوال ہیں جن کا فیصلہ ہر مدرسہ خود کریگا۔

جس خطرے کا اوپر ذکر ہوا ہے وہ اس قدر حقیقی ہے کہ حال ہی میں اقوام متحدہ نے منشیات کے بین الاقوامی سوال پر غور کرتے ہوئے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ کم عمر نوجوانوں کو براہِ راست منشیات پر متعلق تعلیم دینے کی سفارش نہیں کی جا سکتی کیونکہ تعلیم انہیں باز رکھنے کی بجائے الٹا ان کے تن بن شوق اور تجسس کی چنگاری اسلگا سکتی ہے جس سے اس تعلیم کا سارا مقصد فوت ہو جاتا ہے ریاہائے متحدہ امریکہ نے اس قرارداد کی حمایت کی تھی۔ اس لئے اس کے محکمہ منشیات نے سفارش کی ہے کہ حکومت کے شائع کردہ کتابچے "زندہ موت" اور "منشیات کے متعلق حقائق" نوعمروں کے پڑھنے کے لئے موزوں کتابیں ہیں۔ استادوں کا عام خیال یہ ہے کہ جن رقبوں میں منشیات کا خطرہ

موجود نہ ہو۔ وہاں سائنس اور حفظانِ صحت کے ضمن میں جو معلومات طلبہ کو ہاتھ لگ جاتی ہیں وہ کافی ہیں۔ یہ معلومات خود تجربہ کرنے کا شوق پیدا نہیں کرتیں۔

بعض استادوں کا خیال یہ ہے کہ کم عمر نوجوانوں کی نشہ خواری دراصل جرائم اطفال ہی کا ایک جز و ہے اور اسے اسی رنگ میں دیکھنا چاہئے۔ جو بچے منشیات کے عادی بن جاتے ہیں وہ اس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جو مدرسہ کے لئے دردِ سر بنا رہتا ہے۔ اگر اسی گروہ کو ایسی نفسیاتی مدد ملے جس سے وہ اپنی ذہنی مشکلوں کو حل کرلیں تو نشہ خواری کی نوبت ہی نہ آئے۔ ذہنی صحت کی قومی انجمن کے طبی مشیر ڈاکٹر جارج سٹیونس کا کہنا ہے کہ نشہ خواری کی عادت دراصل نسلی تعزیق۔ احساسِ شکست اور احساسِ بے بسی کے خلاف بغاوت کی ایک علامت ہے۔ کم عمر نشہ خواروں کی بھاری تعداد تھوڑی گنتی والے گروہوں سے تعلق رکھتی ہے۔ جو غلیظ بستیوں میں رہتے ہیں۔ اور جہاں زندگی افسردگی کی تصویر بنی رہتی ہے، وہ محروم لوگوں کے بچے ہوتے ہیں،،

یہ تجزیہ اپنی جگہ درست ہے۔ اگر مدرسوں میں ایسے رہنما موجود ہوں جو بے توجہ والدین کی جگہ لے سکیں اور پوری ہمدردی اور دل سوزی کے ساتھ بچوں کے دکھ سکھ سن سکیں تو ان بچوں کو ہر طرح کی ناپسندیدہ عادتوں سے روکا جا سکتا ہے، جماعت کے کمرے میں ایسے ہمدرد استاد کی ضرورت ہے جو بچے کی دلچسپیوں۔ اس کے ساتھیوں اور اس کے گھریلو حالات کو اچھی طرح جانتا ہو۔ ایسا استاد خطرے کی علامتوں کو بھانپ لے گا اور بروقت روک تھام کر سکے گا۔ مدرسہ ایک اور طریق پر بھی ایسے بچوں کی مدد کر سکتا ہے۔ وہ یوں کہ بعد از مدرسہ اوقات میں تفریح اور کھیلوں کا ایک ایسا پروگرام بنایا جائے جو بچوں کو گلیوں بازاروں میں آوارہ پھرنے سے روکے۔ ایسی سہولتیں بہم پہنچانے کے لئے بے شک روپیہ چاہیئے۔ لیکن قید خانوں پر بھی تو روپیہ صرف ہوتا ہے۔ پھر بے شمار انسانی زندگیوں میں جو تلخی پیدا ہوتی ہے اس کے مقابلہ میں کوئی لاگت بھی زیادہ نہیں۔

آخر میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ قانون اور مدرسہ دونوں مل کر منشیات کی پوری روک تھام کر سکتے ہیں۔ قانون ناجائز فروخت بند کر سکتا ہے اور نو عمر عادیوں کی چھان بین کرکے علاج معالجہ کا

انتظام کرسکتا ہے۔ مدرسہ بچوں کو نشہ خوری کے تباہ کن اثرات سے باخبر کرسکتا ہے۔ اور رہنمائی اور تفریح کے پروگراموں کی مدد سے بچوں کی ذہنی الجھنوں میں کمی پیدا کرسکتا ہے۔ امریکہ کی قومی تعلیمی انجمن نے ۱۹۵۲ء میں اس ضمن میں یہ قرارداد منظور کی تھی "ہم محسوس کرتے ہیں کہ مدرسوں کو منشیات کے مضر اثرات واضح کرنے کی مہم جاری رکھنی چاہیئے۔ اور اس غرض سے تحقیقات کے تازہ ترین نتائج سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ انجمن انتظامی حاکموں کی توجہ اس امر کی طرف مبذول کراتی ہے کہ منشیات سے متعلق قوانین کو پوری سختی کے ساتھ رائج کرنے کی ضرورت ہے۔ تاکہ منشیات کا رواج رک جائے۔ انجمن اس کام میں انہیں پورے تعاون کا یقین دلاتی ہے۔ انجمن مرکزی اور ریاستی قانون ساز مجلسوں سے سفارش کرتی ہے کہ نابالغوں کے ہاتھ منشیات فروخت کرنے والوں کے لئے خاص سزائیں تجویز کی جائیں۔"

پاکستانی طلبہ پاکستان میں شراب کی لعنت نسبتاً ناپید ہے۔ گو آزادی ملنے کے بعد یہاں بھی اسکا رواج لگاتار بڑھ رہا ہے۔ ہمارے یہاں کوئی اعداد و شمار موجود نہیں لیکن لاہور کے کالجوں میں شراب نوشی کے واقعات عام ہو رہے ہیں۔ مدرسہ کے طلبا تمباکو نوشی پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔ پاکستان جیسے افلاس زدہ ملک میں جہاں لاکھوں لوگوں کو دو وقت پیٹ بھر کر کھانا اور تن ڈھانپنے کو کپڑا نہیں ملتا۔ تمباکو نوشی کوئی کم لعنت نہیں۔ ہمیں اپنے بچوں کو نہ صرف تمباکو کے مضر صحت اثرات سے آگاہ کرنا چاہیئے۔ بلکہ اس کے پیدا کردہ معاشی نقصان سے بھی۔ صرف لاہور میں سگرٹوں کے ایک تھوک فروش کی روزانہ بکری ایک لاکھ روپے کو پہنچتی ہے۔ ضرورت ہے کہ سارے ملک کے لئے اعداد و شمار اکٹھے کئے جائیں اور امریکی حکومت کے کتابچوں کے نمونہ پر دو ایک موزوں کتابیں شائع کی جائیں۔ یہ کام مرکزی وزارت تعلیم کی توجہ چاہتا ہے۔ ہمارے پاس اتنے مالی وسائل نہیں کہ علاج گاہیں کھولیں۔ یا مدرسوں میں رہنمائی اور تفریح کے وافی پروگرام جاری کریں لیکن ہم کم از کم صحیح واقعات کو ایک مختصر اور موثر صورت میں ضرور پیش کر سکتے ہیں ❖

تعلیمی دُنیا پر ایک نظر

ہڑتالوں کا خاتمہ

سکاٹ لینڈ کے استادوں سے اس بات پر استصواب رائے کیا گیا ہے کہ آیا اپنے مطالبات منوانے کے لئے ہڑتال کرنا استادوں کے شایان شان ہے۔ انہوں نے ایک اچھی اکثریت کے ساتھ اس کا جواب نفی میں دیا ہے۔ اور اس طرح اپنے آپ کو ایک تہدیدی حربے سے محروم کر لیا ہے۔ جو لوگ ہمیشہ اس بات کے قائل رہے ہیں کہ اساتذہ کو اپنی قومی ذمہ داری کا احساس پہلے کرنا چاہیئے وہ اس خبر سے بہت خوش ہوئے ہیں۔ پچھلی جنوری میں انگلینڈ کے استادوں کی ایک کانفرنس نے اس قسم کی ایک قرارداد نامنظور کر دی تھی اس سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں کہ سکاٹ لینڈ کے استاد انگلینڈ کے استادوں کے مقابلہ میں زیادہ سرد مزاج ہیں۔ فرق کی وجہ غالباً یہ ہے کہ رائے شماری ہر شخص کو ٹھنڈے دل سے سوچنے کا موقع دیتی ہے۔ جب کہ کانفرنس میں بحث کی گرماگرمی عموماً جذبات کو بھڑکا دیتی ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اگلی جنوری میں اس معاملہ پر ملک بھر کے استادوں کی رائے پوچھی جائے گی۔ سکاٹ لینڈ کے بارہ ہزار استادوں کی اکثریت نے ہڑتال سے بیزاری ظاہر کی ہے بعض مبصروں کا خیال ہے کہ ان کا یہ فیصلہ وقتی حالات سے متاثر ہوا ہے ورنہ ہڑتال ایک جائز آخری ہتھیار ہے جو ہر مزدور کے پاس ہونا چاہیئے۔ ہو سکتا ہے کہ سکاٹ لینڈ کے استاد مستقبل کے بدلے ہوئے حالات میں اپنا فیصلہ بدل لیں۔

فرانسیسی اُستادوں کی تنخواہیں۔

حال ہی میں فرانس کی وزارت تعلیم نے استادوں کی تنخواہوں میں معمولی سے اضافے کا اعلان کیا تھا اس کا ذکر کرتے ہوئے وزیر تعلیم نے کہا کہ یہ اضافہ ہمارے اس عزم کی علامت ہے کہ ہم معلمی کے پیشہ کو معاشی طور پر بلند دیکھنا چاہتے ہیں۔ موجودہ اضافہ اس سمت میں پہلا قدم ہے اس کے بعد

فرانسیسی استادوں کی قومی انجمن نے اس اضافہ کو رسوا کن حد تک ناکافی قرار دیا ہے۔ فرانس بھر میں استادوں نے جو احتجاجی جلسے کئے ان میں کہا گیا کہ حکومت نے جس اضافہ کا وعدہ کیا تھا۔ اب ہمیں اس سے آدھے پر ہی ٹرخا دیا گیا ہے۔ ثانوی اور ٹیکنیکل مدرسوں کی انجمن اس سوال پر غور کر رہی ہے کہ اس مہینے کے آخر میں ہڑتال کر دی جائے۔ ابتدائی رائے شماری میں یہ تجویز ۲ ہزار کی اکثریت سے منظور ہوئی۔ عام رائے یہ تھی کہ ہڑتال زیادہ لمبی نہ ہونی چاہئے۔ اس مطلب کے لئے یہ تجویز ہوئی کہ باقی سرکاری ملازموں کے ساتھ مل کر متحدہ محاذ قائم کیا جائے۔ اس کے لئے بات چیت شروع ہو چکی ہے۔ اس سے پہلے ایک دفعہ انجمن نے پیرس میں ہونے والے امتحانوں کا مقاطعہ کیا تھا لیکن اس سے کچھ مفید مطلب نتیجہ نہ نکلا تھا کیوں کہ ایک تو انجمن کی ایک اہم شاخ نے اس اقدام کی تائید نہیں کی تھی اور دوسرے ریٹائر شدہ استاد کام کرنے پر آمادہ ہو گئے تھے۔

ناروے کی تعلیمی سیر

انگلستان سے ہر سال گرما کی تعطیلوں میں طالب علموں کے گروہ یورپ کے مختلف ملکوں کی سیر کے لئے جاتے ہیں۔ اس سال ایک گروہ نے ۲۸ اگست سے ۹ ستمبر تک جنوب مغربی ناروے کی سیاحت کی۔ ایسی سیاحتوں کا بڑا تعلیمی فائدہ یہ ہے کہ طالب علم اپنی آنکھوں سے دوسری قوموں کو زندگی کے کاموں میں مشغول دیکھتے ہیں۔ ناروے کی یہ سیر اس لحاظ سے خاص طور پر سبق آموز تھی کہ ناروے ان ملکوں میں سے ہے جو کوئلے سے محروم ہے۔ اسی محرومی نے اسے صنعتی ترقی سے روکے رکھا۔ یہاں تک کہ اچانک اسے پتھروں پر سے گرتی ہوئی پہاڑی ندیوں سے بجلی پیدا کرنے کا خیال آیا۔ ناروے کے اس حصے میں مچھلیوں اور دوسری چیزوں کو ڈبوں میں بند کرنے کے علاوہ اور بہت سی صنعتیں قائم ہیں۔

دو اور گروہوں نے اگست کے شروع میں مغربی ناروے کی سیر کی۔ انہوں نے وہاں کے کسانوں سے براہ راست روابط قائم کئے اور یونیورسٹی کو قریب سے دیکھا۔ یونیورسٹی نے

انگریز طلبا کو اپنی کشتیوں میں جمع کر دیں گی جنہیں کے شکار بڑا دکھایا اور مغربی ساحل کے متعلق علمی تحقیق کے نتائج بتائے۔ ان تعلیمی سیاحتوں کا انتظام جس کمیٹی کے سپرد ہے اس میں دونوں ملکوں کے پروفیسر، اساتذہ، طلبہ اور مدرسوں کے انسپکٹر شامل ہیں۔ گروہوں کی رہنمائی کے لئے ناروے کے ایسے لوگ مہیا کئے جاتے ہیں جو اپنے ملک کو خوب جانتے ہوں اور انگریزی زبان بول سکتے ہوں۔ دونوں ملکوں کے باہمی تعاون کے باعث ان سیروں پر زیادہ خرچ نہیں آتا۔

بڑی تعلیمی انجمنوں کی چھان بین

پچھلے دس سالوں میں امریکی تعلیم پر لگاتار دے ہوتی رہی ہے۔ پہلے ترقی پسند تعلیم نشانہ بنی ہوئی تھی۔ اس کے خلاف اسراف اور بے معنی جدتوں کی شکایت تھی۔ پھر اشتراکی رجحانات والے استادوں کی باری آئی، اب بڑی بڑی تعلیمی انجمنیں زیر عتاب ہیں۔ کانگرس نے ایک خاص کمیٹی مقرر کی ہے جو ٹیکس سے آزاد تعلیمی اداروں کی چھان بین کر رہی ہے۔ ان میں سے بعض کے خلاف یہ شکایت ہے کہ انہوں نے مرکزی اور ریاستی قوانین سے ملی ہوئی رعائتوں سے ناجائز فائدہ اٹھا کر امریکہ دشمن سرگرمیوں کو شہ دی ہے۔

اس محاسبہ کی زد میں آنے والی انجمنوں میں فورڈ فاؤنڈیشن سب سے بڑی اور سب سے با اثر ہے۔ یہ اپنے وسیع مالی ذرائع اس مقصد کے لئے وقف کئے ہوئے ہے کہ دنیا میں انسانی بہبود، امن و امان، جمہوریت اور آزادی کو ترقی ملے۔ اس کے اخراجات کی دو بڑی مدیں ہیں عام تعلیم اور بالغوں کی تعلیم۔ پچھلے تین سالوں میں پہلی مد میں دو کروڑ بیس لاکھ ڈالر خرچ کئے گئے ہیں یہ رقم سکولوں اور کالجوں کو نئے تعلیمی تجربوں اور سائنسی تحقیق کے لئے دی گئی۔ ۱۹۵۳ء میں تعلیم بالغاں پر تیس لاکھ ڈالر خرچ کئے گئے۔ مقصد یہ تھا کہ بالغوں کی تعلیم کے طریقے بہتر بنائے جائیں اور انہیں معاشی، سیاسی اور تعلیمی زندگی میں زیادہ موثر مقام دلانے کی کوشش کی جائے۔

دوسری بڑی تعلیمی انجمن کارنیجی فاؤنڈیشن ہے۔ اس کے تین بڑے حصے ہیں۔

(۱) کارنیجی کارپوریشن نیو یارک (۲) بین الاقوامی امن کے لئے کارنیجی عطیہ (۳) تدریس کی ترقی کے لئے

کارنیگی فاؤنڈیشن نیو یارک کی کارنیگی کارپوریشن ۱۹۱۱ء میں قائم ہوئی تھی۔ اس کی سالانہ آمدنی ساڑھے لاکھ ڈالر ہے اور اس کا مقصد ریاستہائے متحدہ برطانیہ اور اس کے مقبوضات میں علم و فہم کی اشاعت ہے۔ یہ تعلیمی تجربوں اور تحقیق کے لئے روپیہ صرف کرتی ہے۔ اعلیٰ تعلیم کی حوصلہ افزائی کرتی ہے اور معاشرتی علوم میں تحقیقات کے لئے جی کھول کر مالی امداد دیتی ہے۔ بین الاقوامی امن کا عطیہ ہر سال پانچ لاکھ سے زیادہ ڈالر اس مطلب کے لئے صرف کرتا ہے کہ بین الاقوامی مفاہمت میں ترقی ہو مختلف قوموں کے نقطۂ نگاہ کو سمجھا جائے۔ بین الاقوامی معاملات کی تعلیم دی جائے اور عالموں کو دنیا بھر کی سیاحت کرنے کے مواقع دیئے جائیں۔ تدریس کی ترقی کے لئے فاؤنڈیشن ۱۹۰۵ء میں قائم ہوئی تھی۔ یہ بھی تقریباً ۵ لاکھ ڈالر ہر سال خرچ کرتی ہے۔ یہ روپیہ زیادہ تر کالج اور یونیورسٹی سے سبکدوش ہونے والے استادوں کو دیا جاتا ہے لیکن اس سے اہم تعلیمی منصوبوں کی ہمت افزائی بھی کی جاتی ہے۔

تیسری بڑی انجمن راک فیلر فاؤنڈیشن ہے جو ۱۹۱۳ء میں قائم ہوئی تھی۔ اس کی سالانہ آمدنی کوئی ۵ کروڑ ڈالر ہے۔ اس کا بڑا مقصد انسانی بہبود کو ترقی دینا ہے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے یہ یونیورسٹیوں تحقیقاتی اور سائنسی اداروں اور دوسری علمی مجلسوں کو مالی امداد دیتی ہے کیلاگ فاؤنڈیشن واقع بیٹل کریک (مشی گن) اس قسم کی ایک اور انجمن ہے جو تیس لاکھ ڈالر سالانہ خرچ کرتی ہے۔ یہ روپیہ صحت۔ تیمارداری تعلیم اور انسانی بہبود کی ترقی پر خرچ ہوتا ہے بچوں کی صحت اور بہبود پر خاصی توجہ دی جاتی ہے۔ جان ہے وٹنی فاؤنڈیشن کا طریق کار قدرے مختلف ہے۔ یہ اپنے کل اخراجات کے لئے روپیہ اپنے بانی سے لیتی ہے۔ پچھلے چار سالوں میں اس نے آٹھ لاکھ ڈالر خرچ کئے ہیں جس میں سے کوئی پونے چھ لاکھ ڈالر وظائف پر صرف ہوئے یہ فاؤنڈیشن تھوڑی گنتی والے گروہوں کو وظیفے دیکر علم کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔ یہ ثانوی مدرسوں کے استادوں کو وظیفے دیکر انہیں تعلیم جاری رکھنے پر آمادہ کرتی ہے اور سبکدوش شدہ پروفیسروں کو تعلیمی مواقع دیتی ہے۔

یہ وہ بڑی بڑی تعلیمی انجمنیں ہیں جو اس وقت محاسبہ کی زد میں ہیں۔ ان کے خلاف الزام ہے کہ یہ ایسے خیالات اور سرگرمیوں کو مالی سہارا دیتی ہیں جو امریکی دستور اساسی کے بنیادی تصورات کے منافی

سرکاری جریدہ کے اعلانات

صیغہ رجال ——— شعبہ مدارس

ی/۲۰۰۷۷ میاںؔ سراج الدین ایم۔ اے۔ بی ٹی ڈاکٹر، پرنسپل گورنمنٹ کالج لاہور کو ۳ جولائی ۱۹۵۲ء
جولائی ۱۹۵۲ء قبل دوپہر سے ایس ایم شریف کی جگہ جن کی خدمات حکومت پاکستان نے لے لی ہیں ——
۱۲۵۰ — ۵۰ — ۱۵۰۰ کے گریڈ سے ۲۰۰۰ — ۷۵ — ۲۳۰۰ کے گریڈ میں ترقی
دے کر ڈائرکٹر تعلیم پنجاب مقرر کیا گیا۔

ی/۲۰۴۷۴ مسٹر محمد اسلم قاضی ایم۔ اے (کنٹب) پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور کو ۳ جولائی ۱۹۵۲ء سے
جولائی ۱۹۵۲ء میاں سراج الدین کی جگہ پرنسپل گورنمنٹ کالج لاہور مقرر کیا گیا۔

ی/۲۱۲۳۸ محمد اکرم مخدومی پیرزادہ ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی (علیگ) ایم۔ ایڈ (لیڈز) پی۔ ای۔ ایس درجہ اول
جولائی ۱۹۵۲ء انسپکٹر ٹریننگ مدارس کو بی اے۔ ہاشمی کی جگہ جو سبکدوش ہو چکے ہیں ۳ جولائی ۱۹۵۲ء
سے اپنی تنخواہ پر پرنسپل سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور مقرر کیا گیا۔

ی/۱۹۷۹۱ قاضی محمد صدیق بی۔ اے۔ بی۔ ٹی صدر معلم گورنمنٹ ہائی اسکول خوشاب کو ۱۷ جون ۱۹۵۲ء
جولائی ۱۹۵۲ء قبل دوپہر سے م۔ محمد یوسف علی خاں کی جگہ جو ڈی۔ آئی سرگودھا مقرر ہو چکے ہیں صدر معلم
گورنمنٹ ہائی اسکول چکوالی مقرر کیا گیا۔

ی/۱۹۶۸۰ م۔ محمد سعید ایس۔ وی۔ زراعت ماسٹر گورنمنٹ نارمل اسکول گجرات کو تاریخ حاضری سے م۔
جولائی ۱۹۵۲ء عبدالمجید بخاری کی جگہ جو تبدیل ہو چکے ہیں اپنی تنخواہ پر زراعت ماسٹر گورنمنٹ نارمل اسکول
شاہ پور صدر مقرر کیا گیا۔

ی/۱۹۹۱۳ م۔ رحمت اللہ۔ ڈی۔ ایم۔ ایس۔ اے (۶۰ — ۱۲۰) ڈرائنگ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول
جولائی ۱۹۵۲ء پسرور کو تاریخ حاضری سے م۔ محمد طفیل کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر ڈرائنگ

سنٹرل ماڈل اسکول لاہور مقرر کیا گیا۔

ای/۱۹۹۱۱ ۱۰ جولائی ۱۹۶۲ء — م۔ محمد طفیل ڈی۔ ایم (۱۵۰ — ۲۵۰) ڈرائنگ ماسٹر سنٹرل ماڈل اسکول لاہور کو تاریخ حاضری سے م۔ محمد اسلم کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر ڈرائنگ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول شیخوپورہ مقرر کیا گیا۔

〃 م۔ محمد اسلم (۹۰ — ۱۹۰) قائم مقام ڈرائنگ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول شیخوپورہ کو تاریخ حاضری سے م۔ رحمت اللہ کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر قائم مقام ڈرائنگ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول پسرور مقرر کیا گیا۔

ای/۱۰۹۸۹ ۹ جولائی ۱۹۶۲ء — م۔ بشیر احمد مولوی فاضل او۔ ٹی (۷۰ — ۱۲۰) عربی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول ڈسکہ کو تاریخ حاضری سے حافظ محمد نذیر شاہ کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر عربی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول چکوال مقرر کیا گیا۔

〃 حافظ محمد نذیر شاہ مولوی فاضل او۔ ٹی (۷۰ — ۱۲۰) عربی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول چکوال کو تاریخ حاضری سے م۔ بشیر احمد کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر عربی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول ڈسکہ مقرر کیا گیا۔

ای/۱۹۹۹۰ ۳ جولائی ۱۹۶۲ء — م۔ محمد اختر ایف۔ اے سی۔ ٹی قائم مقام انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول چونیاں کو تاریخ حاضری سے م۔ فضل الہٰی ایف۔ اے سی۔ ٹی کی جگہ جنہوں نے استعفیٰ دے دیا ہے -/۹۰ روپے ماہوار مقررہ پر قائم مقام انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول کمیل پور مقرر کیا گیا۔

〃 م۔ محمد اختر ایف۔ اے سی۔ ٹی ایک امیدوار کو -/۹۰ روپے ماہوار مقررہ پر قائم مقام انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول چونیاں مقرر کیا گیا۔

ای/۲۰۲۴۴ ۴ جولائی ۱۹۶۲ء — م۔ نور محمد۔ بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (۱۳۰ — ۲۵۰) ملے۔ ڈی۔ آئی ڈیرہ غازی خان کو تاریخ حاضری سے م۔ محمد حفیظ اللہ کھوکھر کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر انگریزی کا مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول مظفر گڑھ مقرر کیا گیا۔

ای/۱۲ ۲۰۷۴۷ محمد حفیظ اللہ کھوکھر بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (۱۳۰ — ۲۵۰) انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول مظفرگڑھ
۸ جولائی ۱۹۵۲ء کو تاریخ حاضری سے م۔ نور محمد کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر اے۔ ڈی۔ آئی ۔
ڈیرہ غازی خاں مقرر کیا گیا ۔

ای/۱۲ ۲۰۵۸۲ م۔ عبدالرحیم بی۔ اے۔ بی۔ ٹی انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول بھیرہ کو تاریخ حاضری سے
۸ جولائی ۱۹۵۲ء م۔ عمرالدین کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر اے۔ ڈی۔ آئی کیمبل پور مقرر کیا گیا۔

ای/۷ ۲۰۳۴۶ م۔ محمد یوسف میٹرک ایس۔ وی۔ ایک امیدوار کو تاریخ حاضری سے م۔ سیف الملوک کی جگہ
۸ جولائی ۱۹۵۲ء جو رخصت پر ہیں (۶۰ — ۱۲۰) کے پیمانہ تنخواہ میں قائم مقام اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول
پسرور مقرر کیا گیا۔

ای/۴ ۲۰۵۸۸ م۔ محمد اجمل خاں بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (۱۳۰ — ۲۵۰) اے۔ ڈی۔ آئی ملتان کو تاریخ حاضری سے
۸ جولائی ۱۹۵۲ء م۔ نذر محمد کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر اے۔ ڈی۔ آئی منٹگمری مقرر کیا گیا۔

ایضاً م۔ نذر محمد بی۔ اے۔ ایس۔ اے۔ وی (۱۳۰ — ۲۵۰) اے۔ ڈی۔ آئی منٹگمری کو تاریخ
حاضری سے م۔ محمد اجمل خاں کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اے۔ ڈی۔ آئی ملتان مقرر کیا گیا۔

ای/۲ ۲۰۸۰۲ ق۔ نواب علی۔ ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی (۱۳۰ — ۲۵۰) اے۔ ڈی۔ آئی گوجرانوالہ کو ۲۵ مئی ۱۹۵۲ء
۱۰ جولائی ۱۹۵۲ء قبل دوپہر سے مرزا فدا حسین کی جگہ جو وفات پا چکے ہیں۔ پی۔ ای۔ ایس درجہ دوم (۲۵۰ —
۷۵۰) میں ترقی دے کر ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس سیالکوٹ مقرر کیا گیا۔

ای/۲ ۲۰۸۰۲ م۔ مسعود بیگ مرزا۔ ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی ایک نئے آدمی کو ۱۰ جون ۱۹۵۲ء قبل دوپہر سے م۔ [illegible] خاں
۱۰ جولائی ۱۹۵۲ء کی جگہ جو سبکدوش ہو چکے ہیں۔ پی۔ ای۔ ایس درجہ دوم (۲۵۰ — ۷۵۰) میں صدر معلم گورنمنٹ
ہائی اسکول چونیاں مقرر کیا گیا

ایضاً مسٹر بی۔ اے۔ رولسن۔ ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی ایک نئے آدمی کو ۸ جون قبل دوپہر سے م۔ فتح شیر خاں
کی جگہ جن کا تبادلہ خوشاب میں ہو گیا ہے۔ پی۔ ای۔ ایس درجہ دوم (۲۵۰ — ۷۵۰) میں
صدر معلم گورنمنٹ ہائی اسکول حسن ابدال مقرر کیا گیا۔

۲۰۸۰۴/ ۱۲ جولائی ۱۹۵۵ء م۔ احسان الحق سلیمان۔ ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ ایک نئے آدمی کو ۱۰ جون ۱۹۵۵ء قبل دوپہر سے صوفی محمد شریف کی جگہ جن کا تبادلہ سیالکوٹ میں ہو چکا ہے۔ پی۔ ای۔ ایس درجہ دوم۔ (۲۵۰ ۔۔ ۴۵۰) میں صدر معلم گورنمنٹ ہائی اسکول جہلم مقرر کیا گیا۔

ای/ ۲۰۸۴۸ ۱۲ جولائی ۱۹۵۵ء م۔ محمد شریف۔ ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ پی۔ ای۔ ایس درجہ دوم (آنریری) صدر معلم گورنمنٹ ہائی اسکول جہلم کو ۱۷ جون ۱۹۵۵ء قبل دوپہر سے م۔ ارشاد محمد قریشی کی جگہ جو ڈی۔ آئی جہلم مقرر ہو چکے ہیں صدر معلم گورنمنٹ ہائی اسکول سیالکوٹ مقرر کیا گیا

ای/ ۲۱۰۳۰ ۱۳ جولائی ۱۹۵۵ء پیرزادہ محمد بخش ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ اے۔ ڈی۔ آئی سرگودھا کو جو انگلستان سے تعلیمی دورہ کے بعد آئے ہیں تاریخ حاضری سے م۔ فیض الحسن کی جگہ اپنی تنخواہ پر اے۔ ڈی۔ آئی کیمبل پور مقرر کیا گیا۔

ای/ ۲۱۰ ۱۲ جولائی ۱۹۵۵ء م۔ عطا محمد۔ ایس۔ وی (۶۰ ۔۔ ۱۴۰) اردو مدرس سنٹرل ماڈل اسکول لاہور کو تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر زائد اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول باغبان پورہ مقرر کیا گیا۔ وہ اپنی آسامی اپنے ساتھ لے جائیں گے۔

ای/ ۲۱۳۸۴ ۱۶ جولائی ۱۹۵۵ء م۔ کریم حیدر بی۔ اے۔ ایس۔ اے۔ وی (۱۳۰ ۔۔ ۲۵۰) اے۔ ڈی۔ آئی میانوالی کو م۔ عبد الغنی کی جن کا تبادلہ ہو چکا ہے یکم جولائی ۱۹۵۵ء قبل دوپہر سے اپنی تنخواہ پر اے۔ ڈی۔ آئی راولپنڈی مقرر کیا جاتا ہے۔

م۔ فیض الحسن بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (۱۳۰ ۔۔ ۲۵۰) اے۔ ڈی۔ آئی اٹک کو تاریخ حاضری سے م۔ کریم حیدر کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر اے۔ ڈی۔ آئی میانوالی مقرر کیا جاتا ہے۔

ای/ ۲۱۷۰۰ ۱۶ جولائی ۱۹۵۵ء م۔ محمد شفیع ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی (۲۵۰ ۔ ۳۵۵) صدر معلم گورنمنٹ ٹیکنیکل ہائی اسکول جوہرآباد کو تاریخ حاضری سے م۔ غلام نبی بٹ کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ صدر معلم گورنمنٹ نارمل اسکول مظفرگڑھ مقرر کیا گیا۔

شمارہ ۲] لاھور [ستمبر

اس شمارہ میں

تعلیمی ماہ نامہ

آموزش لاہور

ستمبر ۱۹۵۴ء

جلد ۷

شمارہ ۶

سالانہ چندہ

پاکستان کے لئے ۶ روپے

غیر ممالک کے لئے ۸ روپے

قیمت فی پرچہ دس آنے

پبلشرز

یونیورسٹی بک ایجنسی لاہور

ایچ. ڈی خالد پرنٹر پبلشر نے دین محمدی پریس لاہور میں طبع کرا کے
یونیورسٹی بک ایجنسی کچہری روڈ لاہور سے شائع کیا

تعلیمی ذمّہ داری

پروفیسر سراج الدین

میں نے پچھلا اداریہ اس انتباہ پر ختم کیا تھا کہ تعلیم میں ہمیں میکانکی ذرائع پر ضرورت سے زیادہ بھروسہ نہیں کرنا چاہئے بعض اوقات ہم خیالات کے یکجا کرنے اور ان کی اشاعت پر زیادہ توجہ دیتے ہیں لیکن اس بات پر کم کہ جو خیالات اس طرح یکجا ہو کر نشر ہو رہے ہیں۔ وہ ہمارے بہترین خیالات ہیں یا نہیں۔ سینما۔ گراموفون۔ ریڈیو۔ چھاپہ خانہ۔ غرض ہر قسم کی سمعی بصری امدادیں ا خود کوئی بری چیزیں نہیں۔ لیکن انہیں جن اغراض کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ وہ اکثر بہت ناقص ہوتی ہیں۔ ان کے اثرات اس قدر ہمہ گیر ہیں کہ بڑوں اور چھوٹوں کے دل و دماغ کو ان کے بُرے اثرات سے بچانے کے لئے ہر ممکن کوشش ہونی چاہئے۔ اس بات کا بڑا خطرہ ہے کہ ہم ایسی حالت کی طرف پیش قدمی نہ کر رہے ہوں۔ جہاں لوگ کسی اچھی بات کا نام سن کر محض کانوں سے کام لیں اور ان کے ذہن و دماغ قوت فیصلہ سے عاری ہو کر رہ جائیں۔ چوں کہ ہمیں بتایا جاتا ہے کہ ہم آزاد ہیں اس لئے ہم اپنے آپ کو آزاد سمجھتے ہیں۔ ہمیں اس بات کا کافی احساس نہیں کہ جو آدمی سچ اور جھوٹ میں فرق نہیں کر سکتا وہ کبھی آزاد نہیں ہوتا۔ خواہ وہ انگلستان کا رہنے والا ہو یا

لیکس یا پاکستان کا بس علاج بالکل واضح ہے تعلیم کا فرض ہے کہ ہمیں اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا اور پھونک پھونک کر قدم رکھنا سکھائے۔ آج تعلیم کے اس اخلاقی بحران سے آگاہی بے حد ضروری ہے۔ تاکہ انسانوں کی زندگیاں کلیتہً مایوسی اور خودکشی کی نذر نہ ہو جائیں۔ اس وقت مسلسل انکار توش فہمی کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔

اس سے یہ نتیجہ نکالنا مشکل ہو گا کہ تقدیر جن لوگوں کو تباہ کرنا چاہتی ہے وہ پہلے انہیں دیوانہ بنا دیتی ہے۔ لیکن اتنا کہہ دینا کافی ہو گا کہ بدنصیب لوگ پہلے خوش فہمی کا شکار ہوا کرتے ہیں۔ ہم اخلاقی مسئلہ سے دامن نہیں چھڑا سکتے۔ چونکہ تعلیم کا تعلق نہائی اغراض کے ساتھ ہے اس لیے استاد کو چاہیے کہ اقدار کے پیمانوں سے واسطہ رکھے۔ اسے چاہیے کہ زندگی اور معاشرہ کے متعلق خود اپنا فلسفہ تیار کرے۔ کوئی شخص اخلاق سے بے نیاز ہو کر استاد نہیں بن سکتا۔ تم ہر قسم کی تعلیم کسی مقصد کے لیے ہوا کرتی ہے۔ استاد کو یہ سوال پوچھنا چاہیے کہ تعلیم کا مقصد کیا ہے؟ اگر تعلیم ایک اچھی چیز خیال کی جاتی ہے تو پھر سوال یہ ہونا چاہیے کہ یہ کس لحاظ سے اچھی ہے؟ تعلیم بذات خود مقصود نہیں۔ یہ صرف حصول اغراض کا ذریعہ ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ تعلیمی فکر کا ایک اہم جز واغراض سے بحث کرنا ہے۔ اس سمت میں جو سوچ بچار کی جائے گی اسے فوراً اقدار کے پیمانوں سے سابقہ پڑے گا۔ استاد خود اپنی زندگی میں کن اقدار کو بلند ترین مقام دیتا ہے؟ وہ کونسی اقدار ہیں جنہیں وہ اپنے طلبہ کی زندگی اور ان کے کردار میں کارفرما دیکھنا چاہتا ہے۔ خواہ وہ مدرسہ میں پڑھتے ہوں یا کالج میں یا تعلیم ختم کر چکے ہوں؟ اس کے کام کو کونسے عملی نتائج پیدا کرنے چاہئیں؟ اخلاقی افراتفری کے موجودہ دور میں یہ بے حد ضروری ہے کہ یہ سوال پوچھے جائیں اور ان کے جوابات دیئے جائیں۔

اس سے لامحالہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ تعلیم میں گھر اور معاشرے کو کیا پارٹ ادا کرنا ہے تعلیم کے تمام ماہر اب یہ تسلیم کرتے ہیں کہ بچے کی زندگی کے پہلے پانچ چھ سال تشکیل کردار کے لئے بڑے اہم ہیں۔ اس کے بعد خوابیدگی کا دور شروع ہوتا ہے، وہ دور جس میں تخم پاشی ہوتی رہتی ہے

اور جو بالآخر آغاز بلوغت کی روئیدگی میں ختم ہوتا ہے۔ والدین خیال کرتے ہیں کہ بچوں کو مدرسہ بھیج کر وہ تعلیم کی بوجھل ذمّہ داری سے بچ گئے ہیں۔ لیکن وہ بچ نہیں سکتے۔ جب تک بچوں کو مستقل طور پر حکومت کے حوالے نہیں کر دیا جاتا (جس کا تصوّر ہی بھیانک ہے) اس وقت تک ان کی اہم ترین تربیت گھر ہی پر ہوگی۔ اور جب تک والدین بے خبری میں مبتلا ہیں اس وقت تک نوخیزوں کی تعلیم کا سوال غیر ضروری طور پر پیچیدہ بنا رہے گا۔ جدید تعلیم کو جس اصلاح کی سب سے زیادہ ضرورت ہے، وہ والدین کا نقطۂ نگاہ ہے۔ بالخصوص بچے کے ابتدائی تعمیری سالوں میں جب اس پر والدین کا اثر غالب ہوتا ہے تعلیم کی سب سے پہلی اور سب سے بنیادی منزل کنبے کے دائرے میں ختم ہو جاتی ہے۔ نفسیاتی تجزیہ کے نتائج تعلیم کے لئے جو معانی رکھتے ہیں ان کا مطالعہ خواہ مخواہ یہ یقین پیدا کرتا ہے کہ ان کی اہمیت بے اندازہ ہے اور یہ کہ بچے کی تعلیم کی اولین منزل کے لئے معقول بندوبست کیے بغیر مابعد کی تعلیمی منزلوں کے لئے نظریوں پر بحث کرنا بیکار ہے۔ یہ بات کہ اولین منزل کی دیکھ بھال محبت اور شفقت کے جذبات سے بھرپور ہوتی ہے اس بات کی ضمانت نہیں کہ یہ دیکھ بھال ضرور موثر ہوگی۔ نفسیات کی زبان میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ بچے شفقت سے بھی اسی طرح ہلاک ہو سکتے ہیں جس طرح سختی اور عدم فہمی سے۔ ماں باپ کے سامنے سب سے مشکل سوال یہ ہے کہ تحکم اور عدم مداخلت کے بین بین سنہری میانہ روی کا راستہ کونسا ہے۔ عام طور پر یوں ہوتا ہے کہ وہ یا تو بچے کی نشوونما کو روکنا چاہتے ہیں یا اسے بہ جبر پڑھنے لکھنے پر مجبور کرتے ہیں اور اس طرح ایک ہنگامہ کھڑا کر لیتے ہیں۔ میں نے بہت سے والدین کو یہ شکایت کرتے سنا ہے کہ مدرسہ اپنا فرض پورا نہیں کر رہا جب کہ حقیقت یہ ہوتی ہے کہ قصور خود گھر میں ہوتا ہے۔

(انگریزی سے ترجمہ)

شہری آزادیوں کی تعلیم

فضل احمد

شہریت اب ہماری مڈل جماعتوں کے نصاب میں شامل ہے۔ عنقریب یہ مضمون ہائی جماعتوں کو بھی پڑھایا جانے لگے گا۔ شہریت میں شہری کے حقوق اور فرائض کی بحث بنیادی سوال ہے۔ یہ مضمون نصاب میں شامل ہی اس لئے کیا گیا ہے کہ مستقبل کے شہری یہ بات اچھی طرح سمجھ لیں کہ معاشرہ سے انہیں کون کون سے حقوق کا مطالبہ کرنا چاہیئے اور ان کے مقابلہ میں ان پر کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ تقریر و تحریر کی آزادی۔ اپنی ضمیر کی آواز کے مطابق عبادت کرنے کی آزادی۔ تبادلہ خیال کے لئے اکٹھے ہونے کی آزادی اور غیر جانب دار عدالت میں اپنی بے گناہی ثابت کرنے کا حق وہ مشہور عالم حقوق ہیں جنھیں حاصل کرنے اور برقرار رکھنے کے لئے نوع انسان نے بڑی بڑی قربانیاں دی ہیں۔ کئی ملکوں میں لوگوں نے پشتوں تک ان حقوق کے لئے جہاد کیا تب کہیں جاکر وہ انھیں حاصل کر سکے۔ آج مہذب دنیا میں یہ حقوق عام طور پر کسی حیل و حجت کے بغیر تسلیم کئے جاتے ہیں۔ لیکن پھر بھی ایسے ملکوں کی کمی نہیں جن میں اس قسم کے حقوق عام لوگوں کو حاصل نہیں اور جہاں بہت سے لوگ ان سے محروم ہیں۔ موجودہ دور میں جمہوری اداروں اور جمہوری اقتدار کا بہت چرچا ہے۔ ہر حکومت اور ہر قوم کم از کم زبانی دعووں سے اپنے آپ کو جمہوریت نواز ثابت کرنا چاہتی ہے اور اپنے مخالفوں کو جمہوریت کا دشمن۔ پنڈت نہرو کشمیر کی غلامی کے لئے عوامی پسند کی جعلی سند سے دنیا کو دھوکا دینا چاہتے ہیں اور پاکستان کشمیری عوام کی آزادانہ رائے شماری کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا ہے۔ کشمیر کی مثال دیکھ کر شہریت کے کئی طالب علموں کے جی میں خیال آتا ہوگا کہ وہاں کے لوگ اپنے شہری حقوق کا استعمال کیوں نہیں کرتے؟ وہ اپنی دلی پسند کو کھلم کھلا ظاہر کیوں نہیں کرتے؟ وہ آزادی تقریر، آزادی تحریر اور آزادی ضمیر کے لئے جدوجہد کیوں نہیں کرتے؟ وہ عبادتی

سنگینوں سے ڈر کر چپ کیوں ہیں؟

یہ سوالات اپنی جگہ درست ہیں۔ لیکن شہری آزادیوں کو حاصل کرنا اور ان کی خاطر قربانی دینا اسی وقت ممکن ہے جب ان کے لئے ہر دل میں زندہ احساس موجود ہو، جب ہر شخص یہ سمجھے کہ میرے پڑوسی کی شہری آزادی پر جو چوٹ پڑی ہے وہ دراصل میری آزادی پر حملہ ہے، مجھے اس کی آزادی بچانے کے لئے اسی طرح سینہ تان کر لڑنا چاہیئے جس طرح اپنی آزادی کے لئے کوئی آئین ساز مجلس شہری آزادیوں کا قانون منظور کرتی ہے تو کرتی رہے۔ یہ قانون دستور اساسی کا جزو ہے تو ہوا کرے، جب تک تمام شہری اپنی بنیادی آزادیوں کے بچاؤ کے لئے چوکس نہیں رہتے اور انہیں ہر زد سے بچانے کے لئے ہم آواز ہونا نہیں سیکھتے اس وقت تک یہ آزادیاں ہمیشہ خطرے میں رہیں گی نیویارک میں امریکی شہری آزادیوں کے بچاؤ کے لئے ایک قومی انجمن قائم ہے جس کا بنیادی نظریہ یہ ہے کہ "لگاتار دیکھ بھال آزادی کی قیمت ہے"۔ بے شک آزادی ایسی قیمتی دولت ہے کہ لحظہ بھر کی غفلت اس کے لٹ جانے کے امکان پیدا کر سکتی ہے۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ کو بجا طور پر جمہوری اقدار کا بہت بڑا محافظ سمجھا جاتا ہے۔ کچھ سال ہوئے ایک مشہور غیر ملکی کو اس کی شہریت کے حقوق ملے۔ نئے وطن سے وفاداری کا آخری حلف اٹھاتے وقت اس نے اعلان کیا کہ یہ ملک مذہبی آزادی کی آخری امیدگاہ ہے جس اخبار میں یہ اطلاع چھپی اسی میں یہ خبر بھی درج تھی کہ ملک کے بعض حصوں میں تھوڑی گنتی والے فرقوں کو مذہبی آزادی حاصل نہیں۔ ناواقف یا متعصب آدمی اس سے یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ امریکہ میں شہری آزادیاں ناپید ہیں۔ حالاں کہ معاملہ اس کے الٹ ہے۔ بیدار رائے عامہ ان آزادیوں پر چھوٹے سے چھوٹے حملے کے خلاف آواز اٹھانے کے لئے تیار رہتی ہے۔ یہ آزادیاں اسی لگاتار تنقید کی بدولت زندہ ہیں جس ملک میں ایسی تنقیدی آوازوں کا گلا گھونٹ دیا جائے وہاں ان کا زندہ رہنا محال ہے۔

لوگوں کے دلوں میں شہری آزادیوں کے لئے والہانہ لگاؤ پیدا کرنا تعلیم کا کام ہے بچی پود کو ان کا مفہوم سمجھانا اور زندگی میں ان کی قدر و قیمت کا صحیح تصور دلانا مدرسے اور کالج کی ذمہ داری ہے

۷

... سال ایک جرمن صدر معلمہ نے ایک امریکی پروفیسر سے ملاقات کے دوران میں پوچھا "ہم ... نوجوانوں کے دلوں میں سچی جمہوری اقدار کا احساس کس طرح پیدا کریں تاکہ ضرورت پڑنے پر وہ ان کی خاطر سینہ تان کر کھڑے ہو سکیں؟" پروفیسر نے جواب دیا اس کی سب سے سہل صورت ہے کہ انہیں عملی زندگی میں ان اقدار کا مزہ چکھنے دیا جائے۔ پھر کوئی طاقت انہیں ان سے منہ موڑنے پر آمادہ نہ کر سکے گی۔ کیا آپ نے ابھی میرے طالب علموں کو میرے ساتھ باتیں کرتے نہیں دیکھا؟ کیا ایسے ماحول میں پلے ہوئے نوجوانوں کو رعب اور تحکم سے قابو میں رکھا جا سکتا ہے؟ یہ لوگ آخری دم تک لڑے بغیر اپنی آزادیوں کو ہاتھ سے نہیں دیں گے۔ آزادی کے ساتھ لگاؤ پیدا کرنے کا بس یہی ایک طریق ہے کہ لوگوں کو عملی زندگی میں اس کا خوگر بنایا جائے مدرسے کی ساری زندگی میں شہری آزادی کا عمل دخل ہونا چاہیئے۔ تمام نصابوں کو اس مرکزی نقطہ کے تابع رہنا چاہیئے۔ شہریت کی تدریس میں اس بات کا خاص اہتمام نہ چاہیئے لیکن ایسے سوجھ بوجھ والے شہری پیدا کرنا جو شہری آزادیوں کا سرگرمی سے بچاؤ کریں صرف ایک مضمون کی ذمہ داری قرار نہیں دی جا سکتی۔ ان گذارشات کے بعد شہریت کے نصاب کی ایک اکائی نیچے دی جاتی ہے اس کا مقصد طلبہ کو شہری آزادیوں کی تعلیم دینا ہے۔ فرض کیا گیا ہے کہ پڑھنے والے ہائی جماعتوں یا انٹرمیڈی ایٹ درجہ کے سمجھدار نوجوان ہیں۔ اس اکائی کو مندرجہ ذیل پانچ حصوں میں بانٹا گیا ہے جو ایک دوسرے سے کلی طور پر الگ نہیں۔ یہ اشارے استاد کی رہنمائی کے لئے ہیں:-

۱۔ ایسی سرگرمیاں جن سے شہری آزادیوں کا مفہوم ذہن نشین ہو جائے۔

۲۔ ایسی سرگرمیاں جن سے شہری آزادیوں اور اسلامی تعلیمات کا باہمی تعلق واضح ہو جائے۔

۳۔ ایسی سرگرمیاں جن سے واقعات حاضرہ اور شہری آزادیوں کا رشتہ ظاہر ہو جائے۔

۴۔ ایسی سرگرمیاں جن سے ان آزادیوں کو مدرسہ کی زندگی میں کارفرما دیکھا جائے۔

۵۔ کمرۂ جماعت میں بحث و تحقیق کے لئے بعض مجوزہ منصوبے۔

مفہوم کی توضیح | (۱) تعلیمی پالیسیوں کے کمیشن (امریکہ) نے اپنی رپورٹ مجریہ ۱۹۴۰ء میں

یہ رائے ظاہر کی ہے :-

" جمہوری تعلیم عملی زندگی میں بنیادی شہری آزادیوں کا احترام کرتی ہے۔ اور مطالعہ کے ذریعہ ان کا مفہوم واضح کرتی ہے۔ ان حقوق میں سب سے اہم یہ ہے کہ آدمی قابل اعتماد واقفیت حاصل کر سکے۔ اپنی رائے خود قائم کر سکے اور اسے بات چیت تحریر اور ووٹ کے ذریعہ ظاہر کر سکے اسے دوسروں کو ہم خیال بنانے کا حق ہو۔ پُرامن طریقہ پر جلسہ کرنیکا اختیار ہو اور استغاثہ دائر کرنے کا حق ہو۔ مذہبی آزادی ہو۔ بے لاگ انصاف اور غیر جانب دار عدالتیں میسر ہوں۔ ان آزادیوں کا حصول ہر امریکی کا حق ہے۔"

کیا اس فہرست میں تمام شہری آزادیاں آگئی ہیں ؟ تم نے اپنے ملک میں ان آزادیوں پر کس حد تک عمل ہوتے دیکھا ہے ؟ ذاتی تجربہ یا مشاہدہ کے حوالے سے تمام حقوق کا ایک ایک کرکے ذکر کرو۔

(۲) امریکی خانہ جنگی سے کچھ عرصہ پہلے ابراہیم لنکن نے ایک دوست کو خط میں لکھا تھا :-

" ہماری قوم نے زندگی کا آغاز اس اعلان سے کیا تھا کہ اللہ نے تمام انسانوں کو برابر بنایا ہے جب آزادی کا اعلان کیا گیا تو اس کلیہ کی کسی استثنائی صورت کا ذکر نہ تھا۔ لیکن اب ہم عملی طور پر یہ کہتے ہیں کہ خدا نے حبشیوں کے سوا باقی سب لوگوں کو برابر بنایا ہے۔ اگر نسلی اور جماعتی تفریق کے اس نظریہ کو مان لیا جائے تو آئندہ ہمیں یہ اعلان کرنے سے کونسی چیز روکے گی کہ حبشیوں۔ غیر ملکیوں کیتھولک، یہودیوں یا غریب لوگوں کے سوا خدا نے باقی سب کو برابر بنایا ہے "

لنکن نے مساوات اور شہری آزادیوں کو لازم و ملزوم قرار دیا ہے۔ یہ کہاں تک درست ہے اوپر کے اقتباسات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر ہم دوسروں کی آزادی پر ہاتھ ڈالیں گے تو ہماری اپنی آزادی چھن جائے گی۔ کیا اس نظریہ سے خود غرضی کی بُو تو نہیں آتی ؟

۳ - شہری آزادی کے ایک بڑے حامی نے لکھا ہے " شہری آزادی کی حمایت کسی خاص نظریے یا فرقے کی حمایت نہیں یہ دراصل تمام انسانوں کی حمایت ہے۔ اگر آج ایک جگہ ایک فرقہ کے

لوگوں پر زیادتی ہو سکتی ہے تو کل زیادتی کرنے والوں پر دوسری جگہ ظلم ہو سکتا ہے۔ عقل سلیم کا تقاضہ یہ ہے کہ لوگ اپنے عقائد اور معاشی طبقہ کو نظرانداز کر کے شہری آزادیوں کے احترام پر زور دیں۔ حق و انصاف اور پرامن زندگی کے لئے صرف یہی ایک راستہ ہے"

تمہیں ان خیالات سے کہاں تک اتفاق ہے تفصیل سے بحث کرو۔

۴۔ دوسری عالمگیر جنگ کے ابتدائی دور میں سر ونسٹن چرچل وزیراعظم برطانیہ نے اپنے پرانے مدرسے کے طلبا کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا " اس لڑائی سے ہمیں سب سے بڑا سبق یہ ملتا ہے کہ معقولیت اور یقین کے سوا ہمیں اور کسی چیز کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالنے چاہئیں" اس کے برعکس ایک بڑے نازی جرنیل نے کہا تھا "جن علاقوں پر جرمنی نے قبضہ جما لیا ہے وہاں جرمن ٹینک اور بمبار ہوائی جہاز لوگوں کو کبھی سر اٹھانے نہیں دیں گے"

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ شہری آزادی ایسی جگہ پھل پھول سکتی ہے جہاں امن و سلامتی کی فضا موجود ہو۔ سر ونسٹن چرچل نے جب اوپر دیئے گئے الفاظ کہے تھے اس وقت برطانیہ کی قومی زندگی کو بڑا خطرہ درپیش تھا۔ اس کے الٹ نازی جرمنی کی حالت اس وقت خوب مضبوط تھی کیا اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ اگر آزادی کی روح قومی ضمیر میں خوب رچی ہوئی ہو تو عدم سلامتی اسے فنا نہیں کر سکتی۔ لیکن اگر قومی ضمیر آزادی سے بے خبر ہے تو سلامتی بھی شہری آزادی کی تخم پاشی نہیں کر سکتی۔

۵۔ غیر ذمہ دارانہ تقریر کے ایک مقدمہ میں فاضل جج نے کہا "تقریر کی زیادہ سے زیادہ آزادی بھی یہ بات برداشت نہیں کرے گی کہ ایک شخص کسی ہال میں جہاں جلسہ ہو رہا ہو جھوٹ موٹ "آگ آگ" کا شور مچا دے اور لوگوں کو ڈرا کر کھلبلی پیدا کر دے۔ ہر صورت میں قابل غور سوال یہ ہوتا ہے کہ جو الفاظ منہ سے نکالے گئے ہیں آیا وہ ایسے تو نہیں کہ جو صاف طور پر اتنا فوری خطرہ پیدا کر دیں جسے روکنا چاہتا ہے"

مندرجہ بالا بیان آزادی تقریر پر کس قسم کی پابندی لگانا چاہتا ہے؟ بعض شہروں میں ایک

مقررہ جگہ پر ہر شخص کو جو جی میں آئے کہنے کی اجازت ہوتی ہے۔ مثلاً ہائیڈ پارک لندن۔ بوسٹن کامن اور نیو یارک کی سکوائر شکاگو میں ہر انتہا پسند جی کھول کر دل کی بھڑاس نکال سکتا ہے۔ ان مقامات پر عام طور پر جیسی تقریریں ہوتی ہیں ان کا کچھ حال جماعت کو بتائیے۔ یہ تقریریں امن و امان کے لئے خطرہ ثابت کیوں نہیں ہوتیں؟ کیا تمہارے خیال میں لاہور اور کراچی میں بھی ایسی تقریروں کے لئے کوئی جگہ مقرر ہونی چاہئے۔

۶ - ایک شوسلسٹ کا قول ہے کہ "میرے نزدیک جمہوریت نام ہے آزادی اور معاشی سلامتی کا۔ صاف الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم امریکی لوگ صرف اتنا نہیں چاہتے کہ اپنی مرضی کے مطابق باتیں کریں۔ سوچیں اور عبادت کریں بلکہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ ہمیں باقاعدگی سے کھانے کو ملے۔ میں یہ اس لئے کہتا ہوں کیونکہ آزادی کے متعلق بہت سی لغو باتیں کہی جاتی ہیں۔ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ خالی آزادی بے معنی ہے۔ تم دودھ پینے والے بچے کی بوتل میں دودھ کی جگہ آزادی نہیں ڈال سکتے"

اوپر پیش کئے گئے نظریہ کے حامیوں کا کہنا ہے کہ تقریر۔ تحریر اور ضمیر کی آزادی کی طرح انسان کے کچھ اور بنیادی حقوق بھی ہیں۔ اس کا یہ حق ہے کہ پیٹ بھرنے کے لئے کام کرنے کو ملے مزدوروں کو یہ حق ملنا چاہئے کہ اپنی تنظیم کریں اور اپنے حق کے لئے ہڑتالیں اور پکٹنگ کر سکیں اور سرمایہ داروں کے ساتھ اجتماعی طور پر بات چیت کر سکیں۔ ساری جماعت سے کہا جائے کہ ان خیالات کی پیدائش اور نشو و نما کی تاریخ کا ایک خاکہ تیار کرے۔

ہر طالب علم سے کہا جائے کہ وہ ان شہری حقوق کی فہرست بنائے جو اس کے خیال میں ہر پاکستانی کو ملنے چاہئیں۔ ہر حق کے متعلق چند سطریں لکھی جائیں جس میں اس کی نوعیت واضح کی جائے اور یہ بتایا جائے کہ کن مخصوص حالات میں اس حق کو محدود کیا جا سکتا ہے۔

شہری آزادیاں اور اسلامی تعلیمات ۷ - قرآن نے جس رواداری اور مذہبی آزادی کا سبق دیا ہے وہ مذاہب کی تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے، وہ نہ صرف دین کے بارے میں جبر

منع کرتا ہے بلکہ صاف لفظوں میں کہتا ہے کہ اگر اللہ چاہتا تو دنیا بھر کے لوگوں کو ہدایت پر جمع کر دیتا لیکن یہ بات اس کی منشا اور انسانی شرف کے خلاف ہے۔ اللہ صرف اس قدر حکم دیتا ہے کہ دین فطرت کے اصولوں کو کھول کر بیان کر دیا جائے، جو چاہے ان کو مان لے اور جو نہ چاہے نہ مانے۔ خدا کی یہ منشا پوری کرنے کے لئے اظہار کی آزادی پہلی شرط ہے جو لوگ اس اظہار پر پابندیاں لگاتے ہیں اور یا حق بیان کرنے والوں پر سختیاں کرتے ہیں انہیں ظالم کا نام دیا گیا ہے۔ وہ انسانیت کے ایک بنیادی حق کو ذبح کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے خلاف جہاد کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ وہ دوسروں کی آزادی تقریر کا حق مان لیں (حتیٰ یسمعو کلام اللہ سورہ توبہ) ساتھ ہی یہ تشریح بھی موجود ہے کہ یہ لوگ بے خبری اور کم عقلی کی وجہ سے ایسا رویہ اختیار کرتے ہیں۔ ان کا اپنا فائدہ بھی اسی میں ہے کہ جو لوگ ان سے مختلف رائے رکھتے ہیں انہیں دلیل پیش کرنے کی اجازت دیں اور خود اپنے خیالات کی تائید میں دلیل و حجت سے کام لیں۔

اس بنیادی شہری آزادی کو برقرار رکھنے کے لئے قرآن حکیم نے فرد اور قوم کو صریح طور پر ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔ فرد سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ جب بات کہو تو انصاف کی بات کہو خواہ یہ تمہارے اپنے بھائی بند کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ ایمان والوں کو حکم دیا گیا ہے کہ اللہ کی رضا جوئی کے لئے سچی بات کی گواہی دو خواہ یہ یا ان کے بچے یا ان کے والدین یا رشتہ داروں ہی کے خلاف کیوں نہ جائے۔ سچائی چھپانے والوں کو قرآن نے ظالم قرار دیا ہے۔ قوموں کو امن و سلامتی کا راستہ اختیار کرنے کو کہا گیا ہے اور اپنے میں سے چنے ہوئے صاحب اختیار لوگوں کی اطاعت کا بھی حکم ہے لیکن آنکھیں بند کر کے چوپاؤں کی طرح ہانکے جانے والوں کو فاسق کا لقب ملا ہے۔ ایسے لوگوں کی عبرت کے لئے فرعون کی قوم کا واقعہ بیان ہوا ہے۔ وہ اپنی قوم کو حقیر سمجھتا تھا۔ یعنی اس کی آواز کو کچھ اہمیت نہ دیتا تھا۔ قوم اس پر بھی اس کی فرماں برداری کئے جاتی تھی۔ بے شک وہ ایک فاسق قوم تھی جو اس فسق کی وجہ سے تباہ ہوئی۔

حدیث میں آیا ہے کہ سب سے بڑا جہاد جابر بادشاہ کے سامنے سچی بات کہنا ہے۔ ایک اور

حدیث میں ہے کہ جو کوئی سچی بات کہنے سے چپ رہے وہ گونگا شیطان ہے۔ ایک اور حدیث میں ایمان کے تین درجے بیان کئے گئے ہیں۔ سب سے مضبوط ایمان اس شخص کا ہے جو برائی کو دیکھتے ہی اس کے خلاف عملی جہاد میں مصروف ہو جاتا ہے۔ اس سے کم درجہ کا ایمان اس آدمی کا ہے جو برائی کو دیکھ کر زبان سے اسے برا کہتا ہے اور سب سے کمزور ایمان اس کا ہے جو ہاتھ سے کچھ کرنے کی ہمت رکھتا ہے نہ زبان کھولنے کی جرأت لیکن اس برائی کو دیکھ کر دل میں کڑھتا ہے اور اسے ناپسند کرتا ہے۔

۸ - اسلامی تاریخ میں صلح حدیبیہ کا واقعہ شہری آزادیوں کے لئے ایک بے نظیر قربانی کی مثال ہے۔ مکہ میں قریش نے آنحضرتؐ کو اللہ کا پیغام کھلم کھلا بیان کرنے سے روکا۔ مسلمانوں پر زندگی صرف اس لئے تنگ کر دی کہ وہ ایک نئے دین کو ماننے لگے تھے۔ انہیں اپنے عقیدہ کے مطابق عبادت کرنے کی اجازت نہ تھی۔ یہ بیچارے اپنا سب کچھ تج کر دو سو میل دور مدینہ میں جا بسے تو بھی قریش کا غصہ ٹھنڈا نہ ہوا۔ اور یہاں بھی ان پر تیروں تلواروں اور نیزوں کے مینہ برسنے لگے۔ قریش کے بڑے بڑے سرداروں نے سارے ملک میں اسلام کے خلاف جھوٹ کے طومار کھڑے کر رکھے تھے وہ لوگوں کو آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہونے سے روکتے۔ بعض نادان اس پروپیگنڈا سے اتنے متاثر ہوئے کہ آں حضرتؐ کے پاس سے گذرنے سے ڈرتے اور اگر گذرنا بھی پڑتا تو کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے تاکہ آپ کی کوئی بات کان میں نہ پڑ جائے۔ انسانوں کو صحیح اور بے لاگ واقفیت کے سرچشمہ سے روکنے کی یہ بدترین مثال تھی۔ یہ فضا شہری آزادیوں کے لئے موت کا پیغام تھی مسلمانوں اور کافروں کے درمیان لوہے کی دیوار حائل تھی۔ آں حضرتؐ اس دیوار کو گرا دینا چاہتے تھے۔ حدیبیہ کی صلح نے آپؐ کو اس بات کا موقع دیا۔ کافروں نے بہت کڑی شرطیں پیش کیں آپ نے ان کی شرطوں پر ہی صلح کر لی۔ بعض صحابہ کو اس پر حیرانی بھی ہوئی لیکن وحی نے ان سب کی یہ کہہ کر تسلی کر دی کہ یہ مسلمانوں کی کھلی ہوئی فتح ہے۔ بعد کے واقعات نے یہ بات لفظ بہ لفظ سچ کر دکھائی۔ حدیبیہ کی صلح سے مکہ اور مدینہ کے درمیان آنے جانے کی بندشیں اٹھ گئیں۔ کافروں کو مدینہ آنے اور آں حضرتؐ کی باتیں سننے کا موقع ملا۔ قبیلوں کے قبیلے آتے اور ایمان کی دولت لے کر لوٹتے۔ خالد بن ولیدؓ جن کی جنگی

...جنہوں نے مسلمانوں کو اُحد میں شکست دی تھی انہی دنوں اسلام لائے اور ساری عمر اللہ کی راہ میں تلواریں مارتے رہے۔

۹۔ فتح مکہ کے موقع پر آں حضرتؐ نے سہمے ہوئے قریش سرداروں کو مخاطب کر کے فرمایا تھا "ایک خدا کے سوا کوئی خدا نہیں۔ اس کا کوئی ساجی نہیں۔ اس نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ اپنے بندے کی مدد کی اور سارے جتھوں کو توڑ دیا۔ اے قریش! آج باپ دادا کی بڑائی کا گھمنڈ توڑ دیا گیا۔ تم سب آدم کی نسل سے ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے .... آج کے دن تمہارے سب قصور معاف کر دیئے گئے۔ جاؤ تم سب آزاد ہو"

۱۰۔ آخری حج کے موقع پر آپؐ نے فرمایا تھا "اے لوگو جس طرح تم آج کے دن اس مہینہ اور اس شہر کی عزت کرتے ہو۔ اسی طرح ایک دوسرے کے مال و جان اور آبرو کو حرام سمجھو۔ دوسروں پر ظلم نہ کرو تاکہ تم پر ظلم نہ کیا جائے .... آج عرب کے لوگوں کو عجم کے لوگوں پر اور عجم کے لوگوں کو عرب کے لوگوں پر کوئی فضیلت نہیں۔ سب مسلمان بھائی بھائی ہیں"

۱۱۔ آں حضرتؐ کی زندگی میں ہی رومیوں نے مسلمانوں سے چھیڑ چھاڑ شروع کر دی تھی آپؐ نے ان کے مقابلہ کے لئے ایک لشکر تیار کیا اور حضرت اسامہ بن زیدؓ کو اس لشکر کا سردار مقرر کیا۔ ابھی یہ لشکر روانہ نہیں ہوا تھا کہ آں حضرتؐ انتقال فرما گئے۔ حضرت اسامہؓ کے باپ حضرت زیدؓ بن حارثہ آنحضرتؐ کے غلام تھے۔ حضرت اسامہ رضؓ کی عمر بھی ابھی صرف سترہ برس کی تھی۔ بعض لوگوں نے حضرت ابوبکر رضؓ سے کہا اگر آپ یہ لشکر بھیجنا ہی چاہتے ہیں تو اسامہؓ کی جگہ کسی اونچے گھرانے کے تجربہ کار سپہ سالار کو اس کا سردار مقرر کیجئے۔ اس پر حضرت ابوبکر رضؓ کو غصہ آ گیا اور بولے "تم یہ کیا کہہ رہے ہو؟ جس شخص کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سردار مقرر کیا اسے کون ہٹا سکتا ہے؟" اس لشکر نے کوچ کیا تو حضرت ابوبکرؓ دور تک اس کے ساتھ گئے۔ اسامہؓ گھوڑے پر سوار تھے اور حضرت ابوبکر رضؓ ساتھ ساتھ پیدل جا رہے تھے

۱۲۔ حضرت عمر رضؓ کو زخموں نے نڈھال کر رکھا تھا۔ لیکن اس حال میں بھی اپنی ذمہ داریوں کا خیال تھا۔ وفات سے پہلے وصیت کی کہ دوسرے مذاہب کے جو لوگ ہماری رعایا میں ہیں ان سے ہمیشہ

اچھا سلوک کرنا اور ان کے حقوق کا خیال رکھنا۔

۱۳ - قبیلہ غسان کا شہزادہ جبلہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں مسلمان ہوا۔ ایک دن کعبہ کا طواف کررہا تھا کہ ایک مسلمان کا پاؤں اس کی چادر پر جا پڑا۔ جبلہ نے غصہ میں آکر اس کے ایک تھپڑ دے مارا حضرت عمرؓ کے پاس شکایت گئی۔ انہوں نے جبلہ سے صاف کہہ دیا کہ اس شخص کو راضی کرلو ورنہ اس کے ہاتھ سے تھپڑ کھانا پڑے گا۔ جبلہ نے سوچنے کے لئے ایک رات کی مہلت مانگی اور راتوں رات بھاگ کر اپنے علاقہ میں چلا گیا۔

۱۴ - پہلے چاروں خلفاء کے زمانہ میں سلطنت کے کام صحابہ کے صلاح مشورہ سے طے پاتے تھے۔ امیر معاویہؓ خلیفہ بنے تو خلافت پر بادشاہت کا رنگ چڑھنے لگا۔ دربار میں رومی اور ایرانی ٹھاٹھ داخل ہوئے اور خلیفہ لوگوں سے الگ محل میں رہنے لگا۔ یہ رنگ ڈھنگ دیکھ کر بڑے بڑے صحابی سلطنت کے کاموں سے الگ ہوکر اپنے اپنے گھروں میں جا بیٹھے۔

۱۵ - پاکستان بھی اسلامی اقدار کو زندہ کرنے کا دعویدار ہے۔ کچھ سال ہوئے رئیس مملکت کے حقوق و اختیارات کا جو خاکہ منظر عام پر آیا تھا۔ اس میں اسے ملک کی کسی عدالت میں جوابدہ ہونے سے بری قرار دیا گیا تھا۔ کیا رئیس مملکت کی یہ حیثیت اسلامی تعلیمات اور روایات کے مطابق تھی؟ جماعت سے کہا جائے کہ اس موضوع پر تاریخی مواد جمع کرے۔

۱۶ - جماعت کے مختلف گروہوں یا افراد کو کہا جائے کہ مندرجہ ذیل میں سے کسی ایک موضوع پر ضروری مواد اکٹھا کریں۔ اور شہری آزادی کے لئے اپنے منتخب کردہ موضوع کی اہمیت بتائیں۔

(۱) یزید کی ولی عہدی کا اعلان

(۲) عمر بن عبدالعزیز کی طرف سے بنو امیہ کی زیادتیوں کے ازالہ کی کوشش

(۳) خارجیوں کی شورش اس کے اسباب و اثرات۔

(۴) حجاج بن یوسف اور مہلب کی سختیاں اور ان کے نتائج۔

(۵) ہندوؤں کے ساتھ محمد بن قاسم کا برتاؤ۔

(۶) پندرھویں صدی میں ہسپانوی مسلمانوں کا خاتمہ
(۷) ہسپانیہ میں مسلمانوں کا نام ونشان مٹانے کے بعد پرتگیزی اور ہسپانوی پادریوں کی ہندوستان میں آمد اور مغل دربار میں ان کی آؤ بھگت۔
(۸) اکبری عہد میں اسلام اور مسلمانوں پر سختیاں
(۹) کمپنی کی حکومت میں عیسائی پادریوں کو بے جا رعایت اور ان کے نتائج۔
(۱۰) شہری آزادیوں کے لئے قائداعظم کی جدو جہد۔

واقعات حاضرہ اور شہری آزادیاں

۱۷۔ سرخپوش رہنما خان عبدالغفار خان کو حکومت پاکستان نے کئی سال کی نظر بندی کے بعد رہا کیا ہے۔ اب تک بھی وہ صوبہ سرحد میں نہیں جا سکتے کیا عبدالغفار خان کے معاملہ میں شہری آزادیوں کا سوال پیدا ہوتا ہے۔

۱۸۔ حال ہی میں صوبہ سرحد کی اسمبلی نے اس قانون میں ترمیم منظور کی تھی جس کے ذریعہ سیاسی طور پر مشتبہ لوگوں کو بلا مقدمہ چلائے نظر بند کیا جا سکتا ہے۔ گورنر جنرل نے اس قانون کی تصدیق کرنے سے انکار کر دیا۔ کیا یہاں شہری آزادی کا کوئی سوال پیدا ہوتا ہے؟

۱۹۔ کمیونسٹ پارٹی پاکستان میں خلاف قانون قرار دی جا چکی ہے اور اس کے سب دفتر بند کر دیئے گئے ہیں۔ حکومت کا یہ اقدام شہری آزادیوں پر کوئی زد تو نہیں ڈالتا؟

۲۰۔ معاشرتی علوم کے ایک عالم نے اپنے ایک کتابچہ میں کہا ہے کہ آزاد دنیا کی شہری آزادیوں کو آج تین خطرے درپیش ہیں (۱) جنگی تیاریوں کا جنون (۲) محنت اور سرمایہ کی ٹکر (۳) سُرخ خطرے کے نام پر حکومتوں کی دست درازیاں۔ تمہارے خیال میں یہ رائے کس حد تک درست ہے۔ تینوں اسباب پر الگ الگ بحث کرو۔

۲۱۔ مشرقی بنگال کے حالیہ چناؤ میں جگتو فرنٹ کے رہنماؤں نے کھلم کھلا ایسی باتیں کہیں جو پاکستان کی سالمیت کے خلاف تھیں۔ کیا تقریر وتحریر کی اس حد تک بڑھی ہوئی آزادی۔ شہری آزادیوں کی ذیل میں آتی ہے؟

۲۲ - مندرجہ ذیل بیانوں کو غور سے پڑھو اور شہری آزادیوں کے ساتھ ان کا تعلق بتاؤ۔ جماعت کے سامنے اپنے نقطۂ نگاہ کی مفصل توضیح کرو۔

(۱) حکومت جلسوں، جلوسوں اور دوسرے مظاہروں پر اس لئے پابندیاں عائد کرتی ہے۔ تاکہ یہ امن عامہ میں خلل ڈالنے کا سبب نہ بن جائیں۔

(۲) جو کتابچے حکومت کے نقطۂ نگاہ سے ناپسندیدہ ہوں انہیں قابل اعتراض قرار دے کر ضبط کیا جا سکتا ہے۔

(۳) جو لوگ حکومت کی آنکھوں میں کھٹکتے ہوں اُن کی زبان یہ کہہ کر بند کی جا سکتی ہے کہ وہ امن عامہ کو تباہ کرتے ہیں۔

(۴) جو لوگ سرکاری افسروں کو نہ بھاتے ہوں لیکن ان کے خلاف کوئی جرم ثابت نہ ہو سکتا ہو انہیں محض آوارہ گردی کے الزام میں گرفتار کیا جا سکتا ہے۔

۲۳ - برعظیم پاک وہند کے انگریز حکمران ہمیشہ مذہبی اختلافات کو ہوا دینے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ کیا اس وقت ملک میں کوئی ایسے آثار موجود ہیں جن سے یہ ڈر پیدا ہوتا ہو کہ مذہبی عدم رواداری ملک کے لئے مشکلیں پیدا کر دے گی۔

۲۴ - ریڈیو پاکستان ایک سرکاری ادارہ ہے۔ جو شخص حکومت کا نکتہ چین ہو اسے غالباً ریڈیو پر تقریر کرنے کا موقع نہیں مل سکتا۔ کیا یہ بات آزادی تقریر کے منافی تو نہیں؟

مدرسہ کی زندگی میں آزادی کی کارفرمائی

۲۵ - سالانہ انعامات کے موقع پر انعام پانے والے طلبہ نے چاہا کہ کتابیں خریدتے وقت ان کی پسند کا خیال رکھا جائے تاکہ وہ ایسی کتابیں چن سکیں جو ان کے مطلب کی ہوں۔ جو استاد صاحب کتابیں خریدنے پر مامور تھے انہوں نے یہ مطالبہ ٹھکرا دیا۔ انعام ملے تو بعض طلبہ کو ایسے مضامین پر کتابیں دی گئیں جو انہوں نے کبھی نہیں پڑھے تھے۔ طلبہ نے احتجاج کے لئے سکول کے ہال میں جلسہ کرنا چاہا۔ کیا ایسے جلسہ کی اجازت ہونی چاہئے۔ طلبہ کا مطالبہ کس حد تک درست تھا؟

۲۶۔ ایک استاد کے علیحدہ کیے جانے پر دوسرے استادوں نے ہڑتال کر دی۔ انتظامی انجمن نے استاد کو صدر معلّم کی شکایت پر علیحدہ کیا تھا۔ طالب علموں میں سے بعض نے استادوں کا ساتھ دیا اور بعض نے صدر معلّم کا۔ انجمن کے ذمہ دار لوگوں کو اس معاملہ میں کیا کرنا چاہیئے تھا؟ استاد اپنے اقدام میں کہاں تک حق بجانب تھے؟

۲۷۔ ایک تعلیمی ادارے نے اپنے طلبہ کے لیے ایک خاص وضع کا کوٹ مقرر کیا اور سلائی کا کام ایک خاص درزی کے حوالے کر دیا۔ غرض یہ تھی کہ یکسانیت بھی رہے اور کسی سے واجب شرح سے زیادہ اجرت بھی وصول نہ ہونے پائے۔ بعض طلبہ نے اپنے کوٹ اپنی پسند کے درزی سے سلانے چاہے۔ انہیں اس بات کی اجازت نہ ملی۔ اس پر انھوں نے احتجاجی جلسہ کرنا چاہا۔ کیا طلبہ اپنے مطالبہ میں حق بجانب تھے؟ انہیں اس صورت حال میں کیا کرنا چاہیئے تھا؟

۲۸۔ دو حریف مدرسوں کے درمیان فٹ بال کا میچ ہونے والا تھا۔ موسم خراب ہونے کے سبب میچ نہ ہو سکا۔ دونوں ٹیموں نے آپس میں طے کر لیا کہ میچ اگلے اتوار کی شام کو کھیلا جائے گا لیکن مدرسوں کے منتظمین نے میچ کو سرے سے ختم کر دیا۔ طالب علموں نے مل کر صدر معلّم کو درخواست پیش کی کہ میچ ضرور کھیلا جائے۔ صدر معلّم کو ایسی صورت میں کیا کرنا چاہیئے تھا؟

۲۹۔ جماعت کو دو گروہوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ ایک گروہ کے تمام افراد کسی متنازعہ فیہ مقامی مسئلہ پر اداریئے لکھ کر لائیں اور دوسرا گروہ ان کو سنسر کرے۔ اس سے پہلے جماعت میں اس بات پر اچھی طرح بحث ہو جانی چاہیئے کہ سنسر کے کیا فرائض اور اختیارات ہیں اور اس سے کیا نتائج پیدا ہو سکتے ہیں۔

۳۰۔ شہری آزادیوں کے مطالعہ کی اس اکائی کے خاتمہ پر جماعت کو چھوٹے چھوٹے گروہوں میں بانٹ دیا جائے اور ہر گروہ کے ذمہ مدرسے کی زندگی کے کسی خاص شعبے کی چھان بین کا کام لگا دیا جائے، وہ مطالعہ کے بعد جماعت میں رپورٹ پیش کریں کہ جس شعبہ کا انہوں نے مطالعہ کیا ہے وہ کس حد تک جمہوری اصولوں کے مطابق چل رہا ہے۔ اس طرح طالب علموں کی

مشاورتی کمیٹی قائم کردی جائے جو طلبہ کے جذبات اور خیالات کی ترجمانی کرے اور شہری آزادی
کے اصولوں کو مدرسہ میں صحیح طور پر کارفرما ہوتا دیکھے۔

مطالعہ اور تحقیق کے لئے مجوزہ منصوبے | ۳۱ - جماعت کو چند کمیٹیوں میں بانٹ دیا
جائے جن پر سب طلبہ باری باری کام کریں۔ ان میں سے ایک کے ذمہ یہ کام ہو کہ تختہ سیاہ پر
ایسی خبریں درج کیا کرے جن کا تعلق شہری آزادیوں سے ہو۔ دوسری اس قسم کے مضامین
کے بریدے جمع کرے۔ تیسری ان نشری تقریروں کی فہرست بورڈ پر درج کرے جن کا موضوع
شہری آزادی ہو۔ چوتھی کمیٹی ایسا تاریخی سواد جمع کرے جو شہری آزادیوں کی تدریجی ترقی یا
تنزل کی خبر دے۔

۳۲ - کسی مشہور وکیل یا جج یا کسی قابل افسر سے درخواست کی جائے کہ وہ جماعت کے سامنے
شہری آزادیوں کے موضوع پر تقریر کرے اور بتائے کہ اس وقت ملک میں ان آزادیوں پر
کس حد تک عمل ہو رہا ہے۔ تقریر کے خاتمہ پر سوالات کا وقفہ آنا چاہئے۔

۳۳ - اگر کوئی موزوں مقرر آنے کے قابل نہ ہو تو جماعت میں سے ایک کمیٹی مقرر کی جائے
جو اس سے ملاقات کرے۔ ملاقات سے پہلے یہ کمیٹی جماعت کے صلاح مشوروں سے وہ سوالات
بنا لے جن کے جواب معلوم کرنے ضروری ہیں۔ ملاقات کی رپورٹ جماعت میں پیش کی جائے

۳۴ - ایسے ملکی اداروں کی فہرست تیار کی جائے جن کا مقصد شہری آزادیوں کا بچاؤ اور ان کی
ترقی ہے۔ اب تک ان اداروں نے اس سلسلے میں جو خدمات انجام دی ہیں ان کا مفصل حال
لکھا جائے۔

۳۵ - ملکی زندگی میں شہری آزادیوں سے متعلق آئے دن جو سوالات پیدا ہوتے رہتے ہیں ان پر
ہمیشہ بحث ہوتی رہتی ہے۔ اس کی صورت یہ ہو کہ باری باری مختلف طلبہ کی ایک کمیٹی مقرر کی جائے
جو ہر سوال کا خاص طور پر مطالعہ کرے۔ اس مطالعہ میں اسے استاد ہر قسم کی مدد دے۔ اب یہ کمیٹی
اس سوال کے ماہروں کی کمیٹی سمجھی جائے گی، وہ جماعت کے سامنے اس سوال کے مختلف پہلوؤں

دوشنی ڈالے گی اور باقی جماعت سوال پوچھے گی۔ اس طرح ساری جماعت اور اس کمیٹی کے درمیان ایک قسم کا مقابلہ ہو جائے گا۔ استاد حکم کے فرائض انجام دے گا۔ وہ بتائے گا کہ کون سا سوال غیر متعلق ہے کون سا جواب درست ہے۔ کون سا ناکافی ہے اور کون سا غلط جس بارہ میں کمیٹی یا جماعت کے افراد میں سے کوئی بھی صحیح واقفیت نہ رکھتا ہو وہاں استاد خود واقعات بیان کرے گا، وہ جماعت اور کمیٹی دونوں کو ان کے سوالوں اور جوابوں کی خوبی کے مطابق نمبر دیتا جائے گا اور آخر میں اعلان کرے گا کہ دونوں میں کس کی جیت ہوئی ہے۔

ترقی کا اندازہ ہر قسم کی تدریس میں قدر و تاثیر کا اندازہ کام کا ایک نہایت ضروری جزو ہے یہ خیال کرنا کہ چوں کہ استاد نے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے ماتحت کام کی ایک اکائی ختم کر لی ہے اس لئے طلبہ پر ضرور اثر ہوا ہوگا درست نہیں۔ معاشرتی علوم میں تدریس کی تاثیر کا اندازہ کرنا دوسرے علموں کے مقابلہ میں زیادہ مشکل ہے پھر بھی یہ اندازہ کئے بغیر چارہ نہیں۔

اس کی اچھی صورت یہ ہوگی کہ کام شروع ہونے سے پہلے طلبہ کے علم و فہم کا امتحان لے لیا جائے جس سے یہ پتہ چل جائے کہ وہ شہری آزادیوں کے مفہوم کو کہاں تک سمجھتے ہیں۔ ان کی نگاہ میں ان کی کیا قدر و قیمت ہے اور وہ ان حقوق کے مقابلہ میں اپنے اوپر کون سی ذمہ داریاں عائد سمجھتے ہیں اس قسم کا ایک اور امتحان اکائی کے وسط میں ہو جانا چاہیئے تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ آیا تسلی بخش ترقی ہو رہی ہے۔ اگر اس کے نتائج خاطر خواہ نہ ہوں تو طریق تدریس اور ترتیب مواد میں تبدیلی ہونی چاہیئے۔ تیسرا امتحان اکائی کے خاتمہ پر ہونا چاہیئے۔ ان امتحانوں کی عام صورت جدید وضع کی آزمائشوں کی ہوگی مثلاً ایسے چھوٹے چھوٹے فقرے جن کے آگے حرف "درست" یا غلط لکھ دینا کافی ہو۔ یا دو فہرستوں میں سے دو دو لفظوں کو اکٹھا لکھنا۔ یا چند ایک قریب الحق جوابوں میں سے زیادہ موزوں جواب پر نشان کرنے ہوں یا فقروں کو مکمل کرنا ہو۔ ایسے امتحانوں کی خوبی یہ ہے کہ تھوڑے وقت اور معمولی محنت سے مضمون کے ایک وسیع حصے کا جائزہ لیا جا سکتا ہے اور فقروں کی تکمیل کے سوا باقی تمام سوالوں میں بھر دینے وقت معنوں کی ابہام... ...میں نہیں آنے پاتی۔ اس قسم کی

آزمائشوں سے واقفیت کا اندازہ بہت اچھی طرح ہو جائے گا، فہم کی گہرائی جانچنے کے لئے یہ آزمائشیں پرانی وضع کی مضمون نویسی کا مقابلہ نہیں کرتیں۔ کوشش یہ چاہیئے کہ کسی مختصر مضمون کی مدد سے فہم کا اندازہ کرلیا جائے۔ اور مضمون کو جانچنے کے وقت ممکن حد تک بے لاگ رہنے کی کوشش کی جائے۔

جہاں تک طلبہ کے رویّے اور جذبات میں تبدیلی کا تعلق ہے کوئی تحریری امتحان اس کا صحیح آئینہ نہیں ہو سکتا۔ طالب علم خواہ مخواہ ایسے جواب دیں گے جو ان کے نزدیک استاد کی پسند کے ہوں ... جماعت میں اگر تجرباتی حالات پیدا کر کے ان کے ردّ عمل کا اندازہ کیا جائے تو بھی یہ بات یقینی ہے کہ عملی زندگی میں ان کا ردّ عمل مختلف قسم کا ہوگا۔ اکائی کی عملی تاثیر جانچنے کی ایک صورت تو یہ ہے کہ ہر طالب علم کے مخصوص جذباتی ردّ عمل کا مسلسل ریکارڈ رکھا جائے۔ ترقی یافتہ ملکوں میں ایسا کیا جاتا ہے۔ اس کی دوسری صورت بعض معیاری آزمائشیں ہیں جو بعض ماہرین نفسیات نے تیار کی ہیں۔ اعتقادات اور جذباتی ردّ عمل کو جانچنے والی معیاری آزمائشیں نسبتاً کم ہیں۔ تاہم ایک ہوشمند استاد اپنے مطلب کی کوئی نہ کوئی معیاری آزمائش تلاش کر لے گا۔

استادوں کا جلسہ
کیوں کر
مفید بنایا جاسکتا ہے

اویس احمد

ہر مدرسے میں کام کرنے والے استاد عموماً ایک انجمن کی شکل میں منظم ہوتے ہیں جو عام طور پر انجمن معلمین کے نام سے پکاری جاتی ہے۔ صدر معلم اس کا صدر ہوتا ہے، اور سیکنڈ ماسٹر یا کوئی دوسرا سینیئر استاد اس کا سیکرٹری۔ اس انجمن کے اجلاس مہینے میں ایک آدھ بار ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن ان کی کیفیت عام طور پر اس کے سوا کچھ نہیں ہوتی کہ صدر معلم کے کہنے پر اجلاس بلایا گیا۔ استاد گومگو اور ذہنی خلجان کے عالم میں اکٹھے ہوئے کہ دیکھیں صدر معلم کی طرف سے کیا ارشاد ہوتا ہے، صدر معلم نے خود یا ان کے کسی مقرب نے کچھ باتیں کہیں بعض ہدایات یا مشورے پیش کیے بعض قابل اصلاح باتوں پر افسوس ظاہر کیا۔ استاد چپ چاپ بیٹھے ہاں میں ہاں ملاتے رہے اور جلسہ ختم ہونے پر اطمینان کا سانس لے کر گھروں کو چل دیئے۔ اس قسم کے جلسے صدر معلم یا اس کے بعض حواریوں کے پندار کی تشفی کر سکتے ہیں ان سے استادوں یا مدرسے کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔

ایک ساتھ کام کرنے والے استاد ایسے گروہ کی حیثیت رکھتے ہیں جو ایک مشترک مقصد کے لیے مل جل کر کام کرتا ہے۔ گروہ کے افراد ایک دوسرے سے کٹ کر سربلند نہیں رہ سکتے۔ ان سب کی نیک نامی اور بدنامی مشترک ہے۔ گروہ میں صدر معلم بھی ایک عام فرد کی حیثیت رکھتا ہے یہ امر کہ اس کی سرکاری حیثیت اسے قائدانہ درجہ دیتی ہے، اس بنیادی حیثیت کو نہیں بدلتا کہ وہ گروہ کا جزو ہے، حال ہی میں جماعتی تعلقات کے بارے میں جو تحقیقات ہوئی ہیں ان سے ان تعلقات کو صحت مند بنیادوں پر استوار کرنے کے کئی طریقے معلوم ہوئے ہیں۔ ان طریقوں کی مدد سے ہر گروہ اپنے جماعتی تعلقات کو بہتر بنا کر اپنی حالت سنوار سکتا ہے۔ استادوں کے

ہی تعلقات کے بارے میں اس تحقیقات کے نتائج بہت عملی افادیت رکھتے ہیں۔ انجمن معلمین جلسوں کو مفید بنانے کے لیے تین باتیں اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہئیں۔

- مفید جلسہ وہی ہوگا جو سازگار جذباتی فضا میں کیا جائے۔
- استادوں کا اچھا معلم وہ ہے جو اپنا معلم آپ ہو۔
- مفید جلسے کے لیے ذہانت درکار ہے۔ ذیل میں ان تینوں امور پر تفصیل سے نگاہ ڈالی جائے گی۔

سازگار جذباتی فضا:۔ جب تک استادوں اور صدر معلم کے درمیان دوستانہ تعلقات موجود نہ ہوں ے کی افادیت کا ذکر کرنا فضول ہے۔ سازگار جذباتی فضا پیدا کرنے کی سب سے بڑی ذمہ داری صدر معلم ہے۔ اس کا برتاؤ اور عام رویہ سارے مدرسے کے جماعتی تعلقات پر گہرا اثر ڈالے گا۔ انجمن معلمین کا جلسہ ن جذبات کا آئینہ ہوگا جو مدرسہ کی فضا پر ہمیشہ چھائے رہتے ہیں۔ جلسے کے سارے رنگ کا انحصار س بات پر ہے کہ صدر معلم کس قسم کا آدمی ہے اور اس کا رویہ کیسا ہے۔ اس کے زبانی دعوے اور رس فروشی کوئی شے نہیں۔ اصل چیز اس کا عمل ہے۔ ایک صدر معلم نے جو نیا نیا آیا تھا استادوں جلسہ میں بڑے فخر سے کہا کہ میں جس مدرسہ سے آ رہا ہوں وہاں استاد مجھے گھر سے لینے آتے اور مدرسہ م ہونے پر گھر تک چھوڑنے جاتے تھے آپ حضرات سے اس بات کی توقع نہیں رکھتا۔ کیونکہ ں حالات مختلف ہیں۔ ایک اور جلسہ میں اس نے کہا کہ جو استاد محنت اور دیانت داری سے کام تے ہیں ان کا مجھ پر کوئی احسان نہیں۔ انہیں اس کام کے لیے تنخواہ ملتی ہے۔ اگر وہ مجھ سے کسی ں رعایت کی امید رکھتے ہیں تو انہیں مجھے ذاتی طور پر ممنون کرنا چاہئے۔ ظاہر ہے کہ جو صدر معلم تی تعلقات کی بنیاد ایسے ٹھکانہ اور بددیانتی سے بھرے ہوئے تصورات پر رکھے گا وہ کبھی سازگار تی فضا پیدا نہیں کر سکے گا۔ اس کی عبادات اور زبانی دعوے جذباتی فضا میں رتی بھر اصلاح ا کر سکتے۔ یہ اصلاح عمل اور فقط عمل سے ہوگی۔

اگر صدر معلم دیانت داری سے تعلق رکھتا ہے کہ ہر فرد قابل احترام ہے تو اس کا عمل اس

یقین کی آبیاری کرے گا۔ یہ اس بات کا فیصلہ کرے گا کہ اس کا برتاؤ دوسروں کے ساتھ کیسا ہے۔ دوسروں سے مراد فقط وہ لوگ نہیں جو اسے پسند کرتے ہیں اور جنہیں وہ پسند کرتا ہے۔ بلکہ اس سے مراد تمام وہ لوگ ہیں جن سے اسے واسطہ پڑتا ہے۔ یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے جلسہ کا کسی اچھے منصوبہ سے مطابق ہونا اکیلا کام نہیں دے گا۔ اگر ایجنڈا پہلے سے تیار کیا گیا ہے۔ جلسہ میں بات چیت کے مواقع بہم پہنچائے گئے ہیں۔ اور اس قسم کی دوسری جدید جماعتی تکنیکوں سے کام لیا گیا ہے تو ان چیزوں سے خود بخود اچھے نتائج پیدا نہیں ہوں گے۔ یہ تکنیکیں اپنی جگہ خوب ہیں لیکن اصل چیز ان سب کے سوا کچھ اور ہے۔ جماعتی تعلقات کی نئی تکنیکیں بہتر تعلقات قائم کرنے میں امداد دے سکتی ہیں۔ لیکن اگر صرف انہی کو سب کچھ سمجھ لیا جائے اور دلی جذبات کو نظر انداز کر دیا جائے تو اس کی مثال بالکل ایسی ہو گی جیسے کوئی شخص تھالی کو صرف باہر سے دھوتا رہے اور اندرونی حصہ کو جوں کا توں غلیظ چھوڑ دے۔

اگر صدر معلم یا کوئی دوسرا شخص جلسہ کے جذباتی ماحول کی صحیح ماہیت معلوم کرنا چاہتا ہے تو اسے مندرجہ ذیل سوالوں کے جواب تلاش کرنے چاہئیں۔

۱۔ کیا صدر معلم اس بات میں لذت محسوس کرتا ہے کہ دوسرے لوگ ہر چیز اس کی منظوری کے لئے پیش کریں؟

۲۔ کیا اسے اس بات میں خوشی محسوس ہوتی ہے کہ دوسرے لوگ اس کے دست نگر ہوں؟

۳۔ کیا اسے یہ بات پسند ہے کہ وہ استادوں کے لئے مقاصد متعین کرے بجائے اس کے کہ وہ اپنے مقاصد خود متعین کریں؟

اگر ان سوالوں کے جواب ہاں میں نہیں تو ظاہر ہے کہ جماعتی تعلقات کی بنیاد خوش گوار جذبات پر نہیں۔ ایسے جذباتی ماحول میں جو جلسے ہوں گے ان کی افادیت ظاہر ہے۔ ایک صدر معلم نے ایک دفعہ ایک خاص جلسہ بلا کر استادوں سے کہا کہ میں ہرگز اس بات کو برداشت نہیں کروں گا کہ آپ میں سے کوئی میونسپل کمیٹی کے ممبروں سے ملے اور ان کے ساتھ مدرسہ کے متعلق کوئی بات چیت کرے۔ اس کے

ایک من چلے استاد نے کہا بہت خوب۔ ہم اپنے لب اس حد تک سی لیں گے کہ اگر کوئی شخص ہم سے یہ بھی پوچھے گا کہ آپ کے مدرسے میں صدر معلم کون ہے تو ہم لاعلمی ظاہر کریں گے۔" جو فضا تحکم پسندی سے یہاں تک مسموم ہو وہاں یہ دعویٰ کرنا کہ باہمی انسانی تعلقات نہایت پسندیدہ ہیں۔ اپنے آپ کو دھوکا دینے کے سوا کچھ نہیں۔

جماعتی تعلقات کے ایک ماہر کا قول ہے کہ گروہ کے ہر فرد پر انسانیت کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے اور یہ ذمہ داری رہنما پر سب سے زیادہ ہے۔ انسانی ذمہ داری کا یہ احساس جمہوری تصور کی بنیاد ہے اور یہی اسلامی اقدار کی روح۔ ایک اور عالم نے اس احساس کو "تعاون پسند تعلقات" کا نام دیا ہے قرآن حکیم نے "رحماء بینھم" کے بلیغ الفاظ میں اس جذبہ کی تشریح کی ہے۔۔۔ مدرسے کے اساتذہ۔ طلبہ اور طلبہ کے والدین جس حد تک ایک دوسرے کی مدد اور بھلائی کے لئے کوشاں رہیں گے اسی حد تک اس کی جذباتی فضا صحیح معنوں میں مل جل کر کام کرنے کے لئے سازگار ہوگی۔ حساس طبعی۔ ذمہ داری۔ اجازت دہی۔ سرگرمی اور خلوص اس فضا کے نمایاں خصائص ہونگے۔ ان خصائص پر زور دینے سے یہ مراد نہیں کہ عمر۔ تجربہ۔ مرتبہ۔ علم اور فنی مہارت کے لئے احترام کی گنجائش نہیں۔ ان تمام چیزوں کا اپنا اپنا مقام ہے جو بہر کیف باقی رہے گا۔

جلسہ کی تعلیمی افادیت:۔ استادوں کے جلسہ کا سب سے بڑا کام یہ ہونا چاہیئے کہ وہ ہر استاد کو تجربہ کا موقع دے۔ بنیادی جذبہ کے صحیح ہونے سے اس چیز کا خود بخود رونما ہونا ضروری نہیں۔ ساتھ کام کرنے والے استادوں پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ اچھی طرح مل جل کر رہنے کی مثال قائم کریں۔ سینکڑوں طالب علم اسی مثال کو دیکھ کر شہری ذمہ داری کا عملی سبق لیتے ہیں۔ مدرسہ ایک چھوٹا سا معاشرہ ہے جس کی باگ ڈور استادوں کے ہاتھ میں ہے۔ اگر رہنماؤں کے آپس کے تعلقات اچھے نہیں تو وہ قومی زندگی کو بڑا نقصان پہنچا رہے ہیں۔ استادوں کا جلسہ جماعتی تعلقات کو استوار کرنے کی تجربہ گاہ ہے۔ جلسہ کے طریق کار کے لئے کوئی بندھا ٹکا قاعدہ پیش نہیں کیا جا سکتا بعض اوقات اچانک کوئی جذباتی سوال پیدا ہو جاتا ہے۔ یا وہ نما خود پسندی پر اتر آتا ہے بعض استاد

کتہ چینی کے عادی ہوتے ہیں۔ تاہم مجموعی طور پر یہ کہنا درست ہے کہ تربیت یافتہ استاد جماعتی راہ و رسم میں خوب تاک ہوتے ہیں۔ انہیں کمرۂ جماعت میں اسی چیز سے واسطہ پڑتا ہے اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ اپنے جلسہ میں وہ ایسے مسائل کو اچھی طرح نہ طے کرسکیں۔ یہ جلسہ بہت سی باتوں میں کمرۂ جماعت سے مشابہت رکھتا ہے جس طرح استاد اور طالب علموں کا باہمی تعاون بہترین نتائج پیدا کرتا ہے اسی طرح صدر معلم اور استادوں کا تعاون اچھے نتیجے پیدا کرے گا جس طرح کامیاب سبق کے لئے نصب العین کا طے کرلینا ضروری ہے، اسی طرح جلسے کی کامیابی کے لئے بھی یہ چیز ضروری ہے۔ پھر جس طرح کوئی اچھا سبق پوری تیاری کے بغیر نہیں دیا جا سکتا اسی طرح کوئی جلسہ اس وقت تک مفید مطلب نتائج پیدا نہیں کرسکتا جب تک پہلے سے اس کے لئے خوب تیاری نہ کرلی گئی ہو جس طرح ایک اچھا استاد جماعت کے ردِّ عمل کو دیکھ کر طریقۂ تدریس کو بدلتا جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح ایک کامیاب رہنما جلسہ کے مزاج کے مطابق مختلف تکنیکوں سے کام لیتا ہے۔ مثلاً گروہ کو بحث کے لئے چھوٹی چھوٹی جماعتوں میں بانٹ دیا جاتا ہے کسی متنازعہ فیہ مسئلہ پر ماہر رائے سے استصواب کیا جاتا ہے وغیرہ۔ ایک بڑے ثانوی مدرسے کے استادوں کی ذہنی دلچسپیاں کافی مختلف ہوتی ہیں۔ اس لئے صدر معلم کو ایک یک رنگ گروہ کی بجائے مختلف رنگوں کے چھوٹے چھوٹے گروہوں سے واسطہ پڑتا ہے۔

استادوں کا اچھا جلسہ وہ ہے جو ان کی کسی حقیقی ضرورت کا حل ڈھونڈے۔ مل جل کر اچھی طرح کام اسی حالت میں ہو سکتا ہے جب پہلے اپنی ضرورتوں کا تعین کرلیا جائے۔ پھر مشترکہ کوششوں سے یہ ضرورتیں پوری کی جائیں۔ جلسہ کے ذمہ یہ فرض بھی عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنی کارکردگی کا جائزہ لیتا رہے۔ اس کے بغیر یہ معلوم کرنا مشکل ہے کہ کام تسلی بخش ہوا ہے یا نہیں۔ اس غرض کے لئے جو تکنیکیں وضع ہوئی ہیں وہ یہ ہیں۔

۱۔ جلسہ میں سے بعض لوگوں کو مبصر مقرر کردیا جاتا ہے جو آخر میں بے لاگ رائے پیش کرتے ہیں۔
۲۔ کام کے خاتمہ پر ہر شخص سے تحریری رائے طلب کی جاتی ہے

۳۔ ایک کمیٹی مقرر کی جاتی ہے جو کارکردگی کی قدر و قیمت کا اندازہ کرتی ہے۔ ان تکنیکوں کی مدد سے گروہ بڑی آسانی سے معلوم کر سکتا ہے کہ پیش قدمی کی رفتار کیسی ہے۔

جلسے کے لیے وقت چاہیے: ہر گروہ کو سر جوڑ کر بیٹھنے اور ہم آہنگی کے ساتھ قدم اٹھانے کے لیے وقت چاہیے۔ اگر جلسے کے لیے بیس تیس منٹ مقرر ہیں اور ایک مشکل سوال درپیش ہے تو اس تھوڑے وقفے میں کچھ طے نہ ہو سکے گا۔ ہر شخص کے خیالات معلوم کرنے اور سب خیالات کو ہم آہنگ کرنے کے لیے وقت درکار ہے۔ صدر معلم کے لیے سب سے اہم ذمہ داری یہ ہے کہ وہ استادوں کے اکٹھے بیٹھنے اور مل کر سوچنے کے لیے وقت نکالے۔ یہ بات چنداں اہم نہیں کہ جلسہ صبح مدرسہ لگنے سے پہلے ہوتا ہے یا مدرسہ بند ہو جانے کے بعد۔ اگر طلبہ میں ذمہ داری کا احساس پیدا کر دیا گیا ہے تو جلسہ اوقاتِ مدرسہ میں بھی ہو سکتا ہے۔ سال کے شروع میں جلسہ کے اوقات مقرر ہو جانے چاہئیں اور ان کا سختی سے لحاظ رکھا جانا چاہیے۔ جلسوں کا بار بار منسوخ ہو جانا ان کی اہمیت کو گھٹا دیتا ہے۔ باقاعدگی کے ساتھ باہم مل بیٹھنے سے آپس کے تعلقات بڑھتے ہیں اور جماعتی جذبہ کو ترقی ملتی ہے۔ ہاں یہ احتیاط لازم ہے کہ جلسہ میں صرف اہم امور پر بات چیت ہو جو تحریری طور پر طے نہ ہو سکتے ہوں۔

غرض صدر معلم اور استادوں پر باہمی ذمہ داری کا جو فرض عائد ہوتا ہے استادوں کے جلسے اسے پورا کرنے کا بہترین ذریعہ ہیں۔ ان سے دو اہم نتائج برآمد ہونے چاہئیں۔

۱۔ مشکلات کا حل ۲۔ افرادِ گروہ کی انفرادی بالیدگی۔

کامیاب جلسے ان دونوں مقاصد کو بیک وقت پورا کریں گے۔ جہاں ایسا نہ ہو وہاں سمجھ لینا چاہیے کہ جلسے سراسر ناکام رہا۔ مشکلات کا حل صدر معلم اپنے دفتر میں بیٹھ کر بھی ڈھونڈ سکتا ہے۔ وہ ایسے احکام جاری کر سکتا ہے جن کی بلا چون و چرا تعمیل ہو۔ اس سے مدرسے کا کام تو شاید چلتا رہے لیکن استادوں کی شخصیتیں پژمردہ ہو کر رہ جائیں گی۔ باہمی تعاون سے کام کرنے سے یہ ہوگا کہ کام مختلف لوگوں میں بٹ جائے گا ہر فرد ذمہ داری کا بوجھ اٹھائے گا۔ اس سے نہ صرف اس کی

اہمیت نفس کو سہارا ملے گا بلکہ عملی تربیت بھی ہوگی۔استادوں کے جلسے بشرطیکہ وہ صحیح جذبے اور موزوں تکنیکوں کے ساتھ جاری رہیں، مسائل کے حل اور انفرادی بالیدگی کا بہترین ذریعہ ہیں۔

مختلف آراء:۔ حال ہی میں ایک امریکی تعلیمی رسالے نے اس موضوع پر ایک مضمون شائع کرکے صدر معلموں اور استادوں سے درخواست کی تھی کہ اپنے ذاتی تجربہ کی روشنی میں اظہار رائے کریں۔ ان میں سے بعض آراء کا خلاصہ نیچے درج ہے۔

ایک صدر معلم نے کہا مجھے اس خیال سے پورا اتفاق ہے کہ جذباتی فضا جلسہ کی کامیابی کی پہلی شرط ہے۔ میں صرف اس قدر اور کہنا چاہتا ہوں کہ طبعی ماحول کو بالکل بھلا دینا چاہیئے۔ بالخصوص جب استاد دن بھر کے سخت کام کے بعد تھکے ہوئے ہوں۔ ایسی صورت میں ان کی تفریح اور دل لگی کا تھوڑا بہت سامان ضرور ہونا چاہیئے۔ استادوں کے جلسے صدر معلم اور استادوں کی مشترکہ منصوبہ بندی کے بہترین مواقع ہیں بعض بے خبر استاد یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ صدر معلم ذاتی ذمہ داری سے بچنے کے لئے مشترکہ منصوبہ بندی کا طریق اختیار کر رہا ہے۔ حالاں کہ غایت یہ ہوتی ہے کہ استادوں کو بھی شخصی بالیدگی کا موقع دیا جائے۔ جوں جوں جمہوری طریقہ ہائے کار کا رواج عام ہوتا جائیگا اس طرح کی غلط فہمیاں مٹتی جائیں گی۔

ایک استاد اظہار رائے کرتے ہوئے لکھتا ہے، صحت بخش جذباتی فضا کو پہلا درجہ دے کر آپ نے تعمیری جلسوں کا بہت اچھا گر بیان کر دیا ہے۔ مشترکہ ذمہ داری اس وقت تک ممکن نہیں جب تک صدر معلم اور استاد کے درمیان سرگرم اور پُرخلوص جذبۂ ہمدردی موجود نہ ہو۔ اس کی عدم موجودگی میں وہ ایک دوسرے کی دشواریوں اور کامیابیوں کو نہیں سمجھ سکتے۔ اس جذباتی فضا میں ایک اور عنصر کو بھی دخل ہے وہ ہے استاد کی انفرادی حیثیت۔ اگر استاد پر کام کرنے کا بے تحاشہ بوجھ لدا ہے۔ اسے کئی طرف سے دبایا جا رہا ہے۔ اس کے اور دوسرے استادوں کے تعلقات اچھے نہیں۔ اس کی تنخواہ بہت کم ہے تو وہ بددلی کا شکار ہو جائے گا۔ صدر معلم کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ خود استادوں کے درمیان خوش گوار تعلقات قائم کرے۔ یہ فرض ہر استاد پر بھی عائد ہوتا ہے

استادوں کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ فنی بالیدگی حاصل کریں۔ اس کے لئے انہیں صوبائی اور ملکی تعلیمی انجمنوں میں شرکت کرنی چاہیئے۔ یہ شرکت ان میں جماعتی ادب وآداب اور رہ نمائی کا شعور پیدا کرے گی جو شاف کے جلسوں میں کام آئے گا۔ پس صدرمعلم کو چاہیئے کہ اپنے استادوں کو تعلیمی انجمنوں کی رکنیت کی ترغیب دے۔

ایک اور صدرمعلم لکھتے ہیں: جلسہ کا وقت، اس کا موضوع اور اس قسم کی دوسری چیزیں بھی قابل توجہ ہیں۔ لیکن جب تک استادوں اور صدرمعلم کے مراسم ایسے نہ ہوں کہ ہر استاد یہ محسوس کرے کہ اس کی آواز سنی جاتی ہے اس وقت تک کوئی کامیابی ممکن نہیں۔ موزوں جذباتی فضا ایک ایسا جادو ہے جو ہر ماحول اور ہر قسم کے استادوں میں کامیاب ہوگا۔ کیوں کہ یہ ماحول ایک جمہوری نظامِ تعلیم میں صدرمعلم اور استادوں کو ان کا جائز مقام دیتا ہے۔ صدرمعلم کا بہت سا وقت ان مسائل کے حل کرنے میں لگ جاتا ہے جو کمرۂ جماعت میں استاد اور شاگرد کے تعلقات کے بارے میں پیدا ہو جاتے ہیں۔ اگر استاد خود مل جل کر ان مسائل کو حل کرنے لگیں تو اس سے خود انہیں بھی فائدہ پہنچے اور صدرمعلم کو بھی۔ استاد اس وقت تک دوسروں کو جمہوری اقدار نہیں سکھا سکتے جب تک وہ انہیں خود اپنی زندگیوں پر لاگو نہ دیکھیں۔ استادوں کے جلسوں کے ذریعہ مشترک منصوبہ بندی اور مل جل کوششوں کے ساتھ مسائل حل کرنے سے ہی استاد جمہوری اقدار کے سچے مبلغ بن سکتے ہیں۔

ایک صدرمعلمہ فرماتی ہیں کہ استادوں کے جلسوں کو مفید بنانے کے لئے جو گر بیان ہوئے ہیں وہ بے شک بڑے قیمتی ہیں لیکن ان دنوں مدرسوں میں کام کی جو بھرمار ہے اور جماعتوں میں طلبہ کی جو بھیڑ ہے اسے دیکھتے ہوئے استادوں اور صدرمعلموں دونوں کو ہر جلسہ سے پہلے اچھی طرح سوچ لینا چاہیئے کہ آیا فی الواقعہ اس کی ضرورت بھی ہے۔ کیا یہی مقصد کسی اور طرح حاصل نہیں ہو سکتا۔

ایک صدرمعلم نے کہا ہے کہ ہم سب کو وقت کی کمی کی شکایت ہے۔ تاہم موزوں جذباتی فضا

صرف کامیاب جلسوں ہی کے لئے ضروری نہیں یہ مدرسہ کی ساری زندگی کے لئے ضروری ہے۔ اگر یہ فضا موجود ہے تو چند استادوں کا تھوڑے وقفہ کے لئے مل بیٹھنا بھی کارآمد نتائج پیدا کر سکتا ہے۔ صحت مند جماعتی تعلقات کی تعمیر کے لئے اتفاقیہ ملاقات، مختصر بات چیت یا ایک محدود صحبت بھی کام دے سکتی ہے۔ بشرطیکہ ہم بنیادی چیز یعنی صحت مند جذباتی فضا کو قائم رکھیں۔ یہ فضا مدرسے کی پوری زندگی میں رچی بسی ہونی چاہئے۔

خاتمہ کلام:۔ صحیح قسم کی نگرانی تدریس کو موثر بنانے کے لئے نہایت ضروری ہے۔ نگرانی کا یہ کام تعلیمی افسروں سے متعلق ہے۔ اس کی بڑی ذمہ داری صدر معلم پر عائد ہوتی ہے جو ہر وقت عملی تدریس سے قریب رہتا ہے۔ وہ اس عمل کی تخلیقی رہنمائی بھی کر سکتا ہے اور ایسی رہنمائی بھی جو تدریس کو بے لوچ سانچوں میں جکڑ کر رکھ دے۔ تخلیقی رہنمائی ترقی پسند تعلیمی تحریکوں کی جان ہے۔ اس قسم کی رہنمائی میں اساتذہ کے تعلیمی جلسے بشرطیکہ وہ صحیح جذباتی ماحول میں کئے جائیں بڑا کام دے سکتے ہیں محض جلسے کا ہو جانا ہی کافی نہیں۔ اسے تعلیمی طور پر مفید بنانے کے لئے جن باتوں کا لحاظ رکھنا چاہئے۔ ان پر اختصار کے ساتھ اوپر بحث گذر چکی ہے۔ تخلیقی رہنمائی کے ان طریقوں کو پرانے طریقوں کے پہلو بہ پہلو آزما کر دیکھا گیا ہے۔ ان تجربوں نے یہ بات اچھی طرح ثابت کر دی ہے کہ پرانی وضع کی رہنمائی نہ صرف بے کار ہے بلکہ مضرت رساں ہے۔

عربی کی تدریس

محمد عبدالرشید

اسلام نے علم کی تحصیل پر جو زور دیا ہے۔ اس کا اندازہ قرآن حکیم کے مندرجہ ذیل جملے سے ہو سکتا ہے جو حضور سرورِ کونین کو خطاب کر کے کہا گیا ہے

قُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا پ ۱۶ رکوع سورہ طٰہٰ

ترجمہ:۔ (اے محبوب! صلی اللہ علیہ وسلم دعا میں) کہا کیجئے "میرے پروردگار! میرے علم میں ہر دم) اضافہ کرتا جا۔"

حدیث میں ارشاد ہے:۔ تَعَلَّمُوْا مِنَ الْعَرَبِیَّۃِ مَا تَعْرِفُوْنَ بِہٖ کِتَابَ اللّٰہِ ثُمَّ انْتَھُوْا، "تم اتنی عربی سیکھو کہ صحیح تلفظ اور صحتِ اعراب کے ساتھ قرآن مجید پڑھ سکو جس سے کتابِ الٰہی بآسانی پڑھ سمجھ لو۔"

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے (کیا) موزوں فرمایا ہے:۔ ؎

جَمِیْعُ الْعِلْمِ فِی الْقُرْآنِ لٰکِنْ ٭ تَقَاصَرَ عَنْہُ اَفْہَامُ الرِّجَالِ

ترجمہ:۔ ہر قسم کے علوم قرآن مجید میں بھرے پڑے ہیں۔ لیکن عوام سمجھنے سے قاصر ہیں"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے۔ "علم کے حصول میں مشرق اقصیٰ (چین) تک بھی چلے جاؤ" اور ہر مسلم کے لئے طلبِ علم ضروری ہے" ۔ علم سے مراد علمِ حال یعنی ایسا علم ہے جس میں حیاتِ انسانی کو پیش آنے والے واردات و حوادث سے بحث ہو۔ جیسے ایمان۔ معرفتِ احکام عبادات و معاملات وغیرہ۔ کسبِ معاش کے ذرائع و وسائل زندگی کو برقرار رکھنے کا علم۔

اسکولوں میں مڈل اور ہائی کے طلبہ کو عربی زبان کی تعلیم دینے کا اجمالی مقصد یہ ہے کہ طالبانِ علم کم از کم اتنی استعداد پیدا کی جائے کہ وہ مستند عربی کتابوں کے آسان انتخابات درست پڑھ کر

ن کے مطالب سمجھ سکیں اور آسان عربی جملے بول سکیں۔ انتخابات کسی حد تک مندرجہ ذیل نوعیت کے ہوں۔

قرآن مجید کی آیات۔ احادیث نبویؐ۔ سیرت نبویؐ۔ ادبی حکایات۔ امثال وحکم۔ آسان جملوں اور خطوں کے نمونے۔ مکالمے۔ نیز جدید عربی کے انتخابات نظم ونثر۔ مشقوں میں سادہ عربی الفاظ میں ایسے سوالات بھی دیئے جائیں جن کے جواب آسان عربی جملوں پر مشتمل ہوں۔

مولوی نذیر احمد صاحب موعظۂ حسنہ میں اپنے صاحبزادے کے نام کیا خوب تحریر فرماتے ہیں۔ "علم تو سب طرح کے ہیں اور طالب علم کو لازم ہے کہ سب کی طرف برابر توجہ کرے۔ لیکن سب پر مقدم ادب ہے جس کو انگریزی میں (LITERATURE) کہتے ہیں یعنی زبان دانی۔ کمال زبان دانی یہ ہے کہ تم کو اہل زبان کی سی قدرت حاصل ہو۔ اس کی تدبیر یہ ہے کہ زبان دانوں کی عبارتیں یاد ہوں جس طرح کے خیال اور مضمون کو جس پیرائے میں اہل زبان نے ادا کیا ہے۔ اس تقلید اور اس کی نقل کرنی چاہیے۔ غرض زبان دانی کے لئے یادداشت شرط ہے۔ محاورات اور امثال وحکایات۔ لغت اور جملوں کا استعمال سب پیش نظر رہیں۔ جس تحقیق سے مجھ سے عربی پڑھتے تھے کہ ہر ہر لفظ کا مادہ اور تعلیل اور صیغہ اور ترکیب کوئی بات چھوٹنے نہیں پاتی تھی۔ یہی تحقیق کل زبانوں میں ہے جس کسی کتاب کا سبق لے کر بیٹھو خود لفظ لفظ پر نظر کرتے جاؤ۔ جب اس انضباط سے دو چار کتابیں نکلیں اچھی خاصی استعداد ہو جائے گی۔"

کسی زبان کے سیکھنے کے لئے اس کا صحیح لب ولہجہ اور درست تلفظ سیکھنا اور اپنانا نہایت ضروری ہے۔ اس سلسلہ میں ہمارے ہم پیشہ موقر حضرات کو کمر ہمت باندھ کر طلبہ کے سر پر دست شفقت رکھنا ہوگا تاکہ پہلے یعنی (چھٹے درجے) میں ہی کتاب کے جملے پیرے اور مسلسل مضامین پڑھنے سیکھ جائیں۔ موسم گرما کی تعطیلات شروع ہونے سے پہلے صرف قراءت ہی نہیں بلکہ ساتھ ساتھ تحریر کی مشق ہوتی رہنی چاہیے۔ طرہ بر آں یہ کہ جب مفردات سے مرکبات۔ پھر مرکبات ناقصہ سے جملوں کی طرف بڑھیں تو بچوں کو پیار سے اور کھیل ہی کھیل میں معنے بتلاتے جائیں۔ پہلے دو ماہ میں بچوں کو عربی

زبان سے مانوس کرنے کے لئے اگر آپ ادھر شروع میں حروف تہجی کی مشق کرائیں تو ادھر ساتھ ساتھ
کے ذخیرۂ الفاظ میں تبدریج مندرجہ ذیل موضوعات کے متعلق الفاظ کا اضافہ ہونا جائے:
اعضائے انسانی۔ اشیائے نوشت وخواند۔ اشیائے خورد ونوش میوے۔ لباس۔ خویش واقا
عام حیوانات اور پرندے۔ عام اعمال واشغال۔ اعداد ترتیبی وکسری۔ ہندسوں کے نام۔ کیفیات طبعی
رنگ۔ عام نباتات ومعدنیات۔ ہفتے کے دن۔ اوقات۔ اطراف۔ مہینوں کے نام۔ عام صفات۔ وقت نماز
شہری اور دیہاتی فضا سے متعلق امور۔ عام امراض۔ سفر۔ جنگ۔ مذہب وغیرہ۔

یہ مسلم امر ہے کہ جو طالب علم اقتباس نثر و نظم کو صحیح طور پر پڑھ نہیں سکتا۔ اس کے متعلق یہ
اندازہ کر لیا جاتا ہے کہ وہ اس کو سمجھا بھی نہیں۔

یاد رہے کہ بچوں کو قراءت کے ضروری امتیازی نکات واضح اور ذہن نشین ہو جائیں۔ مثلاً حروف
حروف ہجا کی صورتیں۔ ان کی انفرادی آوازیں حروف متشابہ کا صوتی وتحریری فرق۔ حروف شمسی وقمری
کے تلفظ کا امتیاز۔ حرکات وسکنات تنوین وتشدید۔ حروف مد ولین ہمزہ واو فام کی مختلف صورتوں
کی قراءت۔ اس سلسلے میں دینی مدارس دینیہ کے قاری حضرات سب پر فائق رہتے ہیں۔ ہم کا اس سلسلہ میں
قراءت کے اصول وضوابط پہلے خود سیکھ کر اپنے خوشہ چینوں کو فائدہ پہنچائیں تو زیادہ بہتر ہوگا۔

طریقۂ تعلیم عربی

ہر علم کے حصول کے لئے تین واقفیتیں بہم پہنچانا ضروری ہے۔ کم از کم معلم عربی
کے لئے (۱) نفس مضمون سے آگاہی۔ استاد عربی کو اسباق متعلقہ سے کماحقہ
واقفیت ہونا ضروری ہے (۲) طالب علم کی ذہانت۔ اخلاقی فطرت اور نفسیات پر عبور ہونا۔ وقت
اور زمانہ نیز مشاہدات ذاتی اور اجتماعی تجربے اس سلسلے کی معلومات میں اضافہ کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ انگریزی
خیال کہ وقت بہترین کتب معلم زمانہ بہترین استاد ہے۔ ابھی تک جھٹلایا نہیں جا سکا۔ (۳) بچوں کی نفسیات
کا علم بھی لابدی ہے۔ جیسے یہ معلوم ہونا کہ بچے کن باتوں سے خوش ہوتے ہیں یا ان کی طبیعت کس بات
سے مکدر ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ عربی زبان میں مہارت، بچوں کے ذہنی تصورات کا خیال۔ ان کی قوت مدرکہ کا

کیا حال ہے۔ خود اعتمادی استاذ عربی کے لئے اسی طرح لازم ہے جیسے ایک ترقی پسند شخص۔ ہمدرد قوم یا استاد یا معمار ملت کے لئے۔

کسی غیر ملکی زبان سیکھنے سکھلانے کے لئے مندرجہ ذیل طریقے رائج چلے آرہے ہیں۔ اور حسب ضرورت استاد صاحبان ان میں ترمیم و تنسیخ اور تجدید کر کے انہیں استعمال میں لاتے ہیں

۱۔ طریقہ بلا واسطہ (تلقین طبعی) یعنی تعلیم بطریق گفتگو۔ یہ طریقہ ڈپٹی نذیر احمد صاحب مصنف (توبۃ النصوح و مراۃ العروس) کے خیال میں ایک عمدہ ذریعۂ تعلیم ہے۔ آپ فرماتے ہیں :-

زبان دانی کی استعداد بے شک کتابوں کے ذریعہ سے حاصل ہوتی ہے۔ مگر اہل زبان سے گفتگو کرنا بھی ایک عمدہ ذریعہ ہے"

عربی میں اس طریقہ کو تلقین طبعی کا نام دیتے ہیں۔ اگر ہم وسطانی (مڈل) جماعتوں کے پہلے درجے میں بچوں کو اس طریق پر تعلیم دیں تو لڑکے چھوٹے چھوٹے فقرے نہایت خوبی کے ساتھ بولنے لگیں گے زمانہ حال کے ماہرین تعلیم نے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ کسی اجنبی زبان کے سکھانے کا سب سے آسان۔ سب سے زیادہ دلچسپ اور سب سے عمدہ طریقہ تلقین طبعی ہے ....

زبان آموزی جیسا خشک مضمون اس کے ذریعے نہایت دلچسپ بن جاتا ہے۔ طلبہ اس سے بے ساختہ دلچسپی کا اظہار کرتے ہیں۔ صوبہ سرحد میں ۱۹۲۲ء میں تلقین طبعی کے اصول پر عربی زبان دانی کا سلسلہ الصحیفۃ الاولی۔ الثانیۃ والثالثۃ کے نام سے وسطانی جماعتوں کے تعلیمات سرحد کی طرف سے منظور کر کے رائج کیا گیا۔ یہ نہایت مستحسن اور قابل تقلید اقدام ہے۔

۲۔ تدریس بطریق ترجمہ یعنی عربی سے اردو اور اردو سے عربی بنانا۔ یہ پرانا طریقہ چلا آرہا ہے اگرچہ یہ طریق فرسودہ اور پامال ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ مگر اس کے بغیر چارہ بھی تو نہیں۔ اس سلسلہ میں شمس العلماء مولوی نذیر احمد صاحب کی رائے جو موعظۂ حسنہ میں آپ نے ظاہر کی ہے قابل غور ہے۔

۳۔ تلقین بطریق تعریف۔ یعنی ہر ہر لفظ کا مادہ۔ ماخذ۔ صیغہ۔ باب۔ روزمرہ۔ اور محاورہ کے

اعتبار سے اس لفظ یا مرکب کا مطلب اور مفہوم معلوم کرنا یہ طریقہ ثانوی اور اعلیٰ جماعتوں میں مفید رہتا ہے۔

۴۔ تلقین بہ تبدیلی مفردات و مرکبات در جملہ۔ اس سے مراد یہ ہے کہ جملے میں سے بعض الفاظ کو گھٹا بڑھا کر یا ان کی جگہ دوسرے الفاظ لاکر طلباء کے ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ اور بول چال میں ترقی پیدا کرنا مثلاً   اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ

میں ایمان لایا اللہ پر اور اس کے رسول (پر)

میں اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لایا۔ پھر طلبہ سے اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ کے معنی نکلوائے۔ بچے اگر ذہین ہیں اور قوت حافظہ رکھتے ہیں یا نہیں پائی تو وہ فوراً اس کا ترجمہ یوں کریں گے میں اللہ پر ایمان لایا۔ اب آپ اٰمَنْتُ بِرَسُوْلِہٖ کے معنی پوچھئے تو طلبہ اس کے معنی "میں اس کے رسول پر ایمان لایا" کریں گے۔ اگر وہ اس کا ترجمہ میں ایمان لایا نکالیں تو درست ہے۔ اس طرح ہر روز پڑھاتے وقت ایک آدھ فقرہ ایسا لیں اور اس کی مختلف صورتیں بدل بدل کر معانی نکلوائیں اس طرح کبھی عربی سے اردو اور کبھی اردو سے عربی میں ترجمہ کرائیں۔ اس طرح کی مشق سے آپ طلبہ میں اردو سے عربی میں ترجمہ کرنے کی استعداد پیدا کریں گے۔

سبق کے پانچ حصے

۱۔ تیاری یا تعارف۔ بچوں کو سبق کے لئے تیار کرنا۔ تیاری کا منشا یہ ہے کہ استاد جب بچوں کو پڑھانے جائے تو پہلے ان کو آمادہ کرے مثلاً مرکب توصیفی پڑھانا ہے تو اپنے کوٹ یا کتابوں کے رنگوں کے متعلق سوال کرے۔ پھر پوچھے یہ رنگ کس میں پائے جا رہے ہیں؟ بچے کہیں گے۔ کوٹ، شیروانی، کتاب یا بلیک بورڈ وغیرہ میں۔ تو پھر بتائے جس میں یہ رنگ پائے جاتے ہیں۔ انہیں گرامر میں موصوف اور یہ رنگ، عیب یا خوبی جو پائے جائیں اسے صفت کہتے ہیں۔ بہر حال ان کے تصورات کو تازہ کیا جائے کہ وہ سمجھنے لگیں کہ خوبی ہے اور فلاں ذات میں یہ خوبی پائی جاتی ہے۔ اس کے بعد ان کے ذہنی تصورات کو دیکھتے ہوئے اپنے مقصد (سبق) کا اعلان کیا جائے۔

اسی کا نام املاآن سبق ہے۔ باتیں کر کے وقت ضائع کرنا اور بعد میں کتاب لے کر پڑھا دینا
بچوں کی قوتِ تخیلہ کو دبا دینے کے مترادف ہے۔ بہر صورت نرمی سے باتیں کر کے ان کی توجہ اپنی
رف منعطف کرے تاکہ وہ مانوس ہو جائیں۔ پھر سبق شروع کیا جائے۔
۔ نفسِ سبق یعنی سبق بذاتِ خود کیا ہے۔ عربی اسباق عام طور پر چار طرح کے ہوا کرتے ہیں۔ نثر
نظم۔ قواعد (گرامر) انشا۔ چونکہ عربی کا ذریعہ تعلیم اردو ہے۔ لہذا پہلے اردو میں کہانی بتا دی جائے
ور اس قصہ کے پڑھانے کا جو اخلاقی مقصد ہو وہ ذہن نشین کرا دیا جائے۔ پھر استاد سبق کا
یک ایک جز ملے کر خود پڑھے۔ بعد میں ہوشیار لڑکا پھر متوسط ازاں بعد کمزور طالب علم کو موقع
یا جائے۔ اس کا نام نمونہ کی قرات ہے۔ ہمارے پڑھنے سے بچے سمجھ جائیں گے کہ کون سا لفظ مشکل
ہے جو الفاظ مشکل ہوں ان کو دو چار مرتبہ کہلایا جائے۔

تشریح تنبیہ:۔ نئے الفاظ بنانے اور نکالنے کا طریقہ (استخراج الفاظ) سب سے اچھا
ریقہ یہ ہے کہ ایک مادہ کے مشتقات وغیرہ جو بچوں کے ذہن میں ہوں۔ مختلف سوالات کے ذریعہ
ن کا استخراج کرایا جائے۔ ہم مادہ کو سمجھانے کے لئے ایک مثال دیتے ہیں۔ تختہ سیاہ پر معلوم
عالِم ۔ عَالَم ۔ مُتَعَلِّم ۔ عُلَمَاء ۔ مُعَلِّم ۔ عَالِمَةٌ وغیرہ الفاظ کو لکھ کر
ہم پوچھیں گے کہ ان الفاظ میں سے وہ حرف نکالو جو ہر ایک لفظ میں پائے جاتے ہیں تو دماغ پر
را زور ڈالنے کے بعد ذہین طالب علم فوراً جواب دیں گے ع ۔ ل ۔ م جن کا مجموعہ علم ہے۔ یہی
ن الفاظ کا مادہ یا جڑ ہے۔ اس سے ہم مختلف الفاظ نکال سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہم نصر مادہ
ہ ناصِر ۔ منصور ۔ ناصِرۃ ۔ انتصار ۔ منتصر ۔ ناصرین ۔ نَصَرْتُ ۔ نَصَرَتْ
غیرہ الفاظ نکال سکتے ہیں۔ بچوں کو اس کی مزید مشق اور تمرین کرائی جائے۔ اس طرح عربی الفاظ کے
دے بتا کر طلبہ کو مشتقات کی طرف توجہ دلائی جائے۔
نظم کے متعلق یہ سمجھانا کہ یہ نثر سے مختلف ہے۔ گا کر پڑھی جا سکتی ہے۔ اس میں قافیہ ہوتا ہے
جیسے اردو میں رات ۔ بات ۔ ذات ۔ پات اور گھات وغیرہ۔ اشعار ذیل میں ......

مُذَكَّرَاتِيْ تُنْسِبُهُمْ لِلاعْمَالِيْ وَ اَوْقَاتِيْ
اَكْتُبُ فِيْ صَحَائِفِهَا مَوَاعِيْدِيْ وَحَاجَاتِيْ

وَ اَوْقَاتِيْ - وَحَاجَاتِيْ اور ی ردیفِ نظم ہے۔

۴۔ الفاظ کے ساتھ ان کا ترجمہ - ان کا استعمال اس طریقہ سے کرایا جائے کہ لڑکا مستعد رہ کر جواب دینے کے قابل بن سکے۔

اوقات کو اس طرح ترتیب دو کہ مندرجہ بالا ہر چہار امور کا خیال رہ جائے۔ قرات کے سلسلے میں یہ خاص طور پر ذہن نشین رہے کہ بچوں کے سامنے نمونہ کے طور پر خود پڑھ کر دکھایا جائے۔ ذاں بعد ہشیار طلبہ کو موقع دیا جائے۔ پھر متوسط طالب علم پڑھیں اور اس کے بعد کم زور لڑکوں کی باری آئے گی۔ اس دوران میں استاد کو نہایت کڑی نگرانی کرنی ہو گی۔ کیوں کہ بچے فطرتاً نہایت چلبلے واقع ہوئے ہیں۔ بالخصوص کم زور خوشہ چیں جنھیں تعلیم سے اتنی دل چسپی نہیں ہوتی وہ اس اثنا میں توجہ دینے والے طالب علموں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ شروع کر دیتے ہیں۔ یا بعض ذہین سبق کو غیر دل چسپ پاکر یا استاد کی غیر موثر شخصیت کے زیرِ اثر کوئی شرارت کر بیٹھتے ہیں جس سے ضبط پہ اثر پڑتا تو درکنار سارے شاگردوں کو سبق پڑھنے نہ دیں گے۔ اندریں حالت معلم کو طبیعت کو ضبط میں رکھ کر اس مخصوص بچے کی طرف سے اس کے دوسرے ساتھیوں کو ہٹا کر رکھنا چاہیئے۔ اس سلسلے میں استاد کا ایک جگہ پر نہ کھڑے رہنا اور کرسی ہی پر نہ بیٹھے رہنا۔ بلکہ چل پھر کر قرات اور تلاوت کرانا نیز بچوں سے بدل بدل کر پڑھانا ضبط قائم رکھنے میں سود مند ثابت ہوگا۔ اگر ضبط پھر بھی قائم نہ ہوتا دکھائی دے تو پھر کسی ــــــ حکمتِ عملی سے ان کا اس بات سے رُخ پھیرنا چاہیئے۔ یہاں پر آپ کی ضیافتِ طبع کے لئے عرض کیا جاتا ہے کسی دانا سے کسی نے پوچھا بہترین بادشاہ کونسا ہے، شاہ یونان یا شاہ ایران؟ دانا نے جواب دیا جو اپنی طبیعت غصے کی حالت میں ضبط میں رکھ سکے اور جذبات کی رَو میں بہ نہ جائے۔ نیز بدہیں صاحب علم نہر کے منہ میں آئی ہوئی چٹان کی مانند ہے جو نہ تو خود آبِ علم سے سیراب ہوتی ہے۔ نہ ہی سوکھی مرجھائی ہوئی کھیتیوں کی طرف پانی کو

پڑھنے دیتی ہے۔

آج کے بچوں میں عربی پڑھنے سے بے رغبتی کا اولین سبب ریڈنگ نہ کرسکنا۔ اور بعض ناتجربہ کار کرخت مزاج اساتذہ کا سخت رویہ۔ متبادل مضامین کی فہرست میں فنی تعلیم از قسم ڈرائنگ۔ ایم۔ ڈی اور زراعت کی شمولیت ہیں۔ بعض عربی کے بے قیاس استادوں کا سفید پوشی نہ اختیار کرتے سے طلبہ کی نظروں میں گرجانا حتیٰ کہ بعض حضرات پر شاگردوں کا نازیبا آوازے کسنا نیز۔ ایسی باتوں کا اساتذہ عربی کے منہ سے نکل جانا جن کو رفیقان کار نہ احساس کمتری میں مبتلا ہونے کے باعث برداشت نہ کرسکتے ہوں اور اندر ہی اندر اعصابی جنگ شروع ۔ ت کا چھڑ جانا۔ عربی جیسے ادب عالیہ سے نفرت کا موجب بن سکتے ہیں۔

ماہر ادیب استاد ایسی صورتوں میں کبھی میدان خالی نہیں چھوڑتا۔ عربی سے شاگردوں کو نفور کرنے کے لئے یار لوگوں نے جو یہ مشہور کر رکھا ہے کہ عربی بڑی مشکل زبان ہے۔ اس میں افعال کی گردان کے چودہ صیغے ہوتے ہیں اور قواعد کو رٹنا پڑتا ہے تو یہ متعصب بھائیوں کی خود پسندی کا ادنیٰ نمونہ ہے۔ آئندہ سطور میں قواعد عربی پڑھانے کا دلچسپ طریقہ لکھا جاتا ہے جس کو تجربے میں لاکر دیکھیں کامیابی ضرور ہوگی۔

فارسی اہل زبان نے خوب کہا ہے "یک من علم را دہ من عقل باید" یوں کہئے تربیت ایک ایسی چیز ہے کہ وہ پڑھے لکھے انسان کو چار چاند لگا دیتی ہے۔ علم کی تربیت عمل سے جس قدر ہوسکتی ہے وہ کسی دوسرے طریق سے ناممکن ہے۔ کسی دانا نے بے عمل عالم کی مثال اس اندھے کی دی ہے جس کے ہاتھ میں چراغ ہے خود تو اس کی روشنی سے فائدہ نہیں اٹھاتا لیکن خوش قسمت لوگ اُس کی ضیائے (علم) سے مستفید ہوتے ہیں۔

قواعد عربی کی تعلیم

اول تو عربی گرائمر پہلے سال تعلیم نہ کی جائے اور اگر اس کے بغیر گذارہ نہ ہوسکے تو صرف و نحو کی ضروری باتیں بھی اسباق میں ساتھ ساتھ بتانی شروع کردی جائیں۔ حتی الامکان لڑکوں کو صرف و نحو کی نہایت اہم باتیں تدریجی طور پر نہایت سلیس

سادہ اور عام فہم پیرائے میں ان کے ذہن نشین کریں۔ بتائے ہوئے قواعد کے اجرا پر زیادہ زور دیا جائے یا یوں کہیے کہ بطریق استقرا چلا جائے، جب تک پہلا قاعدہ بخوبی طالب علموں کے دماغوں میں نہ سما جائے دوسرے قاعدے کی تلقین نہ شروع کی جائے۔ صرف و نحو کی مروجہ اور منظور شدہ کتابوں میں سے نہایت ہی کم ایسی کتابیں ہیں جن کو معیاری کہا جا سکے۔ البتہ المدرس العربیۃ (جو ایک مصری پروفیسر کے زور قلم کا نتیجہ ہے) یا پھر قاضی میر احمد شاہ رضوانی کی قواعد عربی بردو حصص اسکول کے طلبہ کے نصاب کے عین مطابق عام فہم اردو میں لکھی گئی ہیں۔ اول الذکر کتاب میں انشا پردازی اردو سے عربی ترجمہ اور قواعد متذکرہ پر مفید مشقیں ساتھ لگا کر کتاب کو مفید تر بنا دیا گیا ہے۔ مصری مصنفین کی سادہ عربی میں النحو الواضح اور مبادی العربیۃ فی الصرف والنحو للمرشدین توفی نے بھی اسی قسم کی کوششیں ہیں۔ موخر الذکر میں قواعد سوال و جواب کے طور پر لکھی گئی ہے اور اس میں بعد میں پڑھے ہوئے قاعدوں کے متعلق مشقیں دی گئی ہیں۔

سبق یا قواعد پڑھنے کا مدعا یہ ہرگز نہیں کہ اسے نوک زبان ازبر کر لیا جائے۔ بلکہ لڑکے عبارت پڑھنے کی خوب مشق کر لیں اور انہیں الفاظ کا ذخیرہ بہم پہنچایا جائے جس سے ان کو عربی میں بات چیت کرنے کا ملکہ حاصل ہو۔ اس لئے زیادہ تر زور اس بات پر دینا چاہیئے کہ اپنے خیالات ظاہر کرنے کی لیاقت ان میں پیدا ہو۔ لڑکوں کو کثیر تعداد الفاظ بتا کر ان کے معنوں پر حاوی کرانے سے یہ بہتر اور اہم ہے کہ ان کو سنا کر الفاظ کا صحیح استعمال سکھایا جائے جس کی بدولت وہ خود (خواہ کتنے ہی چھوٹے پیمانے پر ہو) قادر الکلام ہو کر عربی میں اپنے خیالات ظاہر کر سکیں۔

سب سے پہلے لڑکوں کو صرف واحد متکلم اور واحد مخاطب کا فرق سمجھائیں (مذکر و مونث کے جھگڑے سے ابتدا میں احتراز کریں) جب یہ فرق ان پر واضح ہو جائے تو متکلم مع الغیر اور جمع مذکر مخاطب کے صیغے بھی انہیں سکھا دیں اور کالن صیغوں کا فرق مثالوں کے ذریعے سمجھائیں۔

اَنَا اَجْلِسُ عَلَى الْكُرْسِيِّ	اَنْتَ تَجْلِسُ عَلَى الْكُرْسِيِّ
میں میں بیٹھتا ہوں پر کرسی	تو تو بیٹھتا ہے پر کرسی
میں کرسی پر بیٹھتا ہوں	تو کرسی پر بیٹھتا ہے

نَحْنُ نَجْلِسُ عَلَی الْکُرْسِیِّ اَنْتُمْ تَجْلِسُوْنَ عَلَی الْکُرْسِیِّ
ہم ہم بیٹھتے ہیں پر کرسی تم تم بیٹھتے ہو پر کرسی

ہم کرسی پر بیٹھتے ہیں تم کرسی پر بیٹھتے ہو

یہاں یہ خوب واضح کر دیا جائے کہ اَنَا میں کے معنی دیتا ہے اور ضمیر واحد متکلم ہے۔ اَنْتَ ضمیر واحد مذکر مخاطب ہے اور اس کے معنی تُو ہے۔ اَجْلِسُ فعل مضارع معروف کا صیغہ واحد متکلم اور تَجْلِسُ صیغہ واحد مذکر مخاطب ہے۔ علیٰ ہذا القیاس نَجْلِسُ۔ اَجْلِسُ۔ تَجْلِسُوْنَ اور نَجْلِسُ کے معنے ذہن نشین کرا دیئے جائیں۔ جب آپ کے شاگرد چار صیغوں کے عادی ہو جائیں تو تدریج ان کے ذہن کو غائب کے صیغوں کی طرف منتقل کریں۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ تثنیہ اور جمع کا فرق مذکر اور مونث میں تمیز بتا کر گردان مکمل کرائی جائے۔ کچھ دیر اس کی مشق کرائیں۔ بعد میں ماضی اور مضارع کے واحد متکلم کے مقابلے میں ماضی کا واحد متکلم کا صیغہ اور واحد مذکر مخاطب کے صیغے کے مقابلے میں ماضی کا واحد مذکر مخاطب کا صیغہ اسی طرح مضارع کے ہر صیغے کے مقابلے میں ماضی کا وہی صیغہ نکالنے کی مشق کرا دی جائے۔

اَنَا اَشْهَدُ کے مقابلے میں اَنَا شَهِدْتُ	اَنْتَ تَشْهَدُ کے مقابلے میں اَنْتَ شَهِدْتَ	
میں گواہی دیتا ہوں ر میں نے گواہی دی	تو گواہی دیتا ہے ء تو نے گواہی دی	
نَحْنُ نَشْهَدُ ر نَحْنُ شَهِدْنَا	اَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ء اَنْتُمْ شَهِدْتُمْ	
ہم گواہی دیتے ہیں ر ہم نے گواہی دی	تم گواہی دیتے ہو ر تم نے گواہی دی	
یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ ر هُمْ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ	هُمَا یُؤْمِنَانِ بِاللّٰهِ ر هُمَا اٰمَنَا بِاللّٰهِ	
وہ قائم کرتے ہیں نماز ر انہوں نے نماز قائم کی	وہ دونوں ایمان لائے اللہ پر ر وہ دونوں اللہ پر ایمان لائے	

علیٰ ہذا القیاس مضارع کے تمام صیغوں کے مقابلے میں ماضی کے تمام صیغوں کے مقابلے میں ماضی کے تمام صیغوں کا بامعنی تصور دلا کر خوب مشق کرائی جائے۔

ابتدا میں اس پیچیدگی میں بھی لڑکوں کو نہ ڈالیں کہ مضارع حال اور مستقبل دونوں کے لئے استعمال

ہوتا ہے۔ اس بات کو ان کی آئندہ لیاقت پر چھوڑ دیں۔ زمان بعد امر و نہی۔ اسم فعل۔ اسم مفعول نفی وا
اور معروف و مجہول سے روشناس کرائیں ۔ صرف کی تعلیم کے پہلو بہ پہلو نحو کے ابتدائی ضروری مسائل سے
لڑکوں کو واقف کر دینا ضروری ہے ۔ مسائل نحو کے متعلق بھی وہی اصول پیش نظر رہے ۔ نحوی مسا
عنوانات ذیل کے ماتحت آسکتے ہیں ۔ اسم فعل ۔ حرف ۔ فعل ۔ فاعل ۔ مفعول ۔ جار ۔ مجرور متعلق فع
مبتدا ۔ خبر متعلق خبر ۔ ان چیزوں کی شناخت ۔ ان کے اعراب اور ترتیب فقط ۔

ہفتہ میں ایک بار عربی کی املا لکھنا بھی ضروری ہے ۔ جو عبارت لکھائی جائے ان اسبا
میں سے لی گئی ہو جو استاد نے طلبہ کو ہفتہ کے دن یا کسی تعطیل سے ایک دن پہلے یاد کر
کے لئے دی ہو ۔ چھٹی جماعت میں ابتدائی دو تین ماہ میں نقل نویسی کی تختی پر خوب مشق کرائی جائے ۔ جو
ہر روز پڑھایا جائے ۔ وہی گھر پر تختی پر لکھنے کے لئے دیا جائے ۔ چھٹی ساتویں بلکہ آٹھویں میں
ایسا کیا جائے ۔ یا سبق میں کوئی جملہ چن کر اصلاح خط کے لئے گھر کے لئے تختی پر مشق کرنے کے
دیا جائے ۔ ماہ ستمبر اکتوبر میں املا کا سلسلہ شروع کر دیا جائے ۔ ہفتہ عشرہ میں ایک بار املا ضرور لک
جائے ۔ اس طرح بچوں کا عربی خط بنتا جائے گا ۔ اور رسم الخط کی غلطیاں رفع ہوتی جائیں گی کیونکہ

گر تو میخواہی کہ باشی خوشنویس می نویس و می نویس و می نویس

یعنی بار بار لکھنا اور اس طرح مشق بہم پہنچانا انسان کو خوش نویس بنا دیتا ہے ۔

نیا سبق پڑھاتے وقت معلوم سے نامعلوم کی طرف چلا جائے ۔ یعنی معلوم الفاظ مفردات مرک
اور جملوں سے نامعلوم جملے نکلوائے جائیں یا یوں کہئے کہ معلوم ذخیرہ الفاظ کا وقتاً فوقتاً امتحا
لے لیا جایا کرے ۔ آموختہ کا اس طرح اعادہ ہو جائے ۔ بایں طور کہ نئے سبق میں جو پرانے الف
استعمال ہوں بچوں سے ان کے معنے پڑھاتے پڑھاتے پوچھے جائیں ۔ اس طرح سے بچے
آموختہ کو خوب یاد کیا کریں گے ۔ اور صرف مخصوص طلبہ سے ہی سوال نہ کئے جایا کریں ۔ بلکہ کبھی کس
کبھی کسی سے پوچھا کریں ۔ تاکہ آپ کے ہر ایک شاگرد کو یہی خیال رہے کہ آج شاید مجھ سے نہ پوچھ

استنبول

عزیز احمد

استنبول کا نام سن کر رنگا رنگ خیالات کا ہجوم ذہن میں امڈ آتا ہے۔ اس شہرہ آفاق شہر نے کئی نام بدلے ہیں۔ مدتوں تک یہ بازنطین کے نام سے پکارا جاتا رہا۔ پھر اس پر صلیبی پرچم لہرایا اور اسے بپتسمہ دے کر قسطنطنیہ کا نام دے دیا گیا۔ پہلے یہ رومی شہنشاہوں کا پایہ تخت ہوا کرتا تھا پھر ترک سلطانوں کا دارالخلافہ بن گیا۔ آج اس شاہی کروفر کے کچھ بکھرے ہوئے آثاروں کے سوا اور کچھ باقی نہیں۔ آج اس قدیم تاریخی شہر کا نام استنبول ہے اور یہ جمہوریہ ترکی کا ایک اہم شہر ہے

محل وقوع

استنبول کی غیر معمولی اہمیت اس کے محل وقوع کی رہین منت ہے۔ یہ پرانا شہر ایک تکونی جزیرہ نما پر واقع ہے جس کے مشرق میں بحیرۂ ماسورا ہے۔ شمال میں آبنائے باسفورس اور جنوب میں شاخ زریں کا پانی۔ شاخ زریں (گولڈن ہارن) کی زیادہ سے زیادہ چوڑائی ۰۰ ۷ گز ہے اور اس کی بدولت استنبول دنیا کی عمدہ ترین قدرتی بندرگاہوں میں سے ایک ہے۔ شاخ زریں کی وجہ تسمیہ کے متعلق ایک خیال یہ ہے کہ اس کی شکل ایک خمدار سینگ سے ملتی ہے، دوسرا خیال یہ ہے کہ اس میں مچھلیوں کی ہمیشہ بہتات رہی ہے اور اس قدرتی دولت کی فراوانی نے اسے سنہری کا نام دیا۔ آبنائے باسفورس یورپ اور ایشیا کو الگ کرتی ہے۔ یورپ سے آنے والوں کے لئے استنبول زمین کا آخری کنارا ہے جس سے آگے حیرت انگیز مشرق کی سرزمین ہے۔ اس محل وقوع نے استنبول کو ہمیشہ غیر معمولی تجارتی اور سیاسی اہمیت دی ہے۔ اگر ایک طرف یورپ اور ایشیا کے درمیان خشکی کا راستہ یہاں سے ہے گذرتا ہے تو دوسری طرف بحیرۂ روم اور بحیرۂ اسود کے درمیان سمندری راستہ بھی یہی ہے۔

استنبول دنیا کے قدیم ترین شہروں میں سے ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہاں سب سے پہلی بستی

مسیح علیہ السلام سے ۹۰۰ برس پہلے قائم ہوئی تھی۔ اور اس کا نام لائی گس رکھا گیا تھا۔ رو[illegible]
شہنشاہوں نے اسے پایۂ تخت بنایا تو شہر کی وسعت بہت بڑھ گئی اور اس کے گرد ایک مضبو[illegible]
فصیل کھینچی گئی جس کی لمبائی پندرہ میل تھی۔

استنبول کا پرانا شہر روم کی طرح سات پہاڑوں پر آباد ہے۔ ان میں سے چھ پہاڑیاں شاخ زر[illegible]
کے ساحل پر ہیں۔ پہلی پہاڑی پر ایا صوفیہ کی تاریخی مسجد واقع ہے۔ جو پہلے گرجا ہوا کرتی تھی اور اب عجا[illegible]
ہے۔ دوسری پہاڑی پر نور عثمانیہ مسجد ہے۔ تیسری پہاڑی پر استنبول یونیورسٹی کی عمارت اور عظیم ا[illegible]
سلیمانیہ مسجد ہے۔ چوتھی پہاڑی پر سلطان محمد فاتح کی تعمیر کردہ مسجد ہے۔ پانچویں پہاڑی پر سلطان[illegible]
کی مسجد ہے چھٹی پر ایڈریانوپل دروازہ اور کاریی مسجد ہے اور ساتویں پر کوکا مصطفیٰ پاشا کی م[illegible]

تاریخ

...... استنبول کی ابتدائی تاریخ ماضی کے دھندلکے میں چھپی ہے۔ اس کی تاریخ کا [illegible]
آغاز ۶۵۸ قبل مسیح سے ہوتا ہے، جب یونانیوں کے ایک گروہ نے یہاں آ کر نو آبادی قائم [illegible]
اس گروہ کا سردار بائی زاس نامی ایک شخص تھا۔ کہتے ہیں کہ ڈلفی کی غیبی آواز نے اسے کہا تھا [illegible]
نو آبادی کا نام اپنے نام پر رکھنا چنانچہ شہر کا نام بازنطین رکھا گیا۔ یہ نو آبادی رفتہ رفتہ ترقی کر[illegible]
گئی۔ آبادکاروں کا گزارہ زیادہ تر مچھلیاں پکڑنے پر تھا۔ بالخصوص اس مقام پر جہاں آبنائے باسفو[illegible]
اور شاخ زریں باہم ملتی ہیں۔

بازنطین کو بہت جلد بڑی سیاسی اہمیت حاصل ہو گئی۔ یونانی استعمار کے لئے یہ ایک اہم نقط[illegible]
بن گیا جس کی بدولت بحیرہ اسود اور اس کے اردگرد کے علاقوں پر قابو حاصل کیا جا سکتا تھا۔ [illegible]
یونانیوں میں استعماری لڑائیاں چھڑیں تو بازنطین نے ان میں نمایاں حصہ لیا۔ اس شہر کے باشند[illegible]
نے کبھی ایک دھڑے کا ساتھ دیا اور کبھی دوسرے کا۔ ان کی کوشش ہمیشہ یہ ہوتی تھی کہ ان[illegible]
اپنا مفاد محفوظ رہے۔ انہیں کافی عرصہ تک تھریس کے وحشی باشندوں کے ساتھ جنگ کرنا پ[illegible]
یونان کے بعد جب روما الکبریٰ کا ستارہ بلندی پر آیا تو بازنطین رومی سلطنت کا جزو بن گیا [illegible]

جب رومی سلطنت میں خانہ جنگی کے شعلے بھڑک اٹھے تو یہ شہر بھی ان کی لپیٹ میں آیا۔ بازنطین نے شہنشاہ سیویرس کی مخالفت کی تھی۔ اس نے شہر کو تین سال تک گھیرے میں لئے رکھا ۱۹۶ء میں شہر فتح ہوا۔ اسکی فصیل گرادی گئی۔ اور کئی دن تک قتل عام اور لوٹ مار جاری رہی۔ آخر شہنشاہ کا غصہ ٹھنڈا ہوا اور اس نے شہر کو دوبارہ بارونق بنانا شروع کیا۔

۳۳۰ء میں اس شہر پر قسطنطین اعظم کا قبضہ ہوگیا۔ وہ اس کے محل وقوع کی موزونیت اور اس کے امکانات سے اس قدر متاثر ہوا کہ اسے اپنی سلطنت کا پایہ تخت بنالیا۔ اسوقت شہر صرف پہلی پہاڑی اور اس کے نواح تک محدود تھا قسطنطین نے نئے دارالسلطنت کا نام جدید روما رکھا اور روما کے ساتھ شابہت کو مکمل کرنے کے لئے اسے سات پہاڑیوں پر آباد کیا۔ ایک سال سے کم عرصہ میں اس نے اس کے گرد فصیل کھڑی کردی۔ بعد میں یہ شہر قسطنطنیہ یعنی "قسطنطین آباد" کے نام سے مشہور ہوگیا۔ اور صدیوں تک اسی نام سے پکارا جاتا رہا۔ قسطنطین نے نہ صرف اس لئے شہر کو پایہ تخت بنایا تھا بلکہ وہ روما کی دولت اور اس کے امرا کو بھی اپنے ساتھ کھینچ لایا تھا۔ اس سے شہر کی آبادی بہت جلد ایک لاکھ کو جا پہنچی۔

۳۹۵ء میں سلطنت روما کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ اور قسطنطنیہ شرقی رومی سلطنت کا پایہ تخت قرار پایا۔ شہنشاہ قسطنطین کے زمانہ سے لے کر کئی سال بعد تک جب قسطنطنیہ وسیع سلطنت روما کا واحد مرکز تھا۔ موجودہ استنبول سے ایک دور دراز اور گمنام جزیرہ میں قائم شدہ نوآبادی پر بھی حکومت کی جاتی تھی یہ جزیرہ برطانیہ تھا۔

شرقی رومی سلطنت شان و شوکت اور خوشحالی کے دور میں سے گذر کر آخر زوال و ادبار کی گرفت میں آنے لگی ۵۳۲ء میں شہر کو اندرونی گردابوں نے تباہ کر دیا۔ بالآخر شہنشاہ جسٹی نی ان نے امن و امان قائم کیا۔ اسی زمانہ میں ایا صوفیہ کی تعمیر ہوئی ۶۱۶ء ۶۲۶ء میں ایرانی فوجیں کئی مرتبہ شہر کے نواح تک پہنچ گئیں۔ اس زمانے میں جزیرہ عرب میں ایک نئی قوت پرورش پا رہی تھی۔ یہ اسلام تھا۔ ایرانیوں پر غلبہ پانے کے جلد ہی بعد رومیوں کو مسلمانوں سے سابقہ پڑا

سنہ ۶۷۲ء میں اسلام کے نامور فرزند حضرت ابو ایوب انصاری قسطنطنیہ کے محاصرہ میں شہر کی دیوار تلے شہید ہوئے۔ آخری عرب حملہ سنہ ۷۱۷ء میں ہوا۔ قسطنطنیہ کا محاصرہ سال بھر جاری رہا لیکن یہ شہر فتح نہ ہو سکا۔ ان پے در پے عرب حملوں کا ایک اثر یہ ہوا کہ اہل قسطنطنیہ نے شہر کو محفوظ رکھنے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دی اور بچاؤ کے انتظامات اس قدر مضبوط کر لئے کہ کوئی تین سو سال تک شہر پر آنچ نہ آنے پائی۔ لیکن اس تعمیر میں خرابی کی ایک صورت بھی مضمر تھی۔ قسطنطنیہ کی تجارت سے ہاتھ رنگنے کے لئے یورپ کے مختلف حصوں سے سوداگر یہاں کھچے آنے لگے اور شہر میں غیر ملکیوں کا اثر بڑھ گیا۔ اہل جنوا نے اپنی الگ نوآبادی قائم کر رکھی تھی اور اہل پالتسا نے الگ۔ ان دونوں میں تجارتی رقابت یہاں تک بڑھی کہ کھلم کھلا جنگ تک نوبت جا پہنچی۔

تیرھویں صدی عیسوی کے آغاز میں قسطنطنیہ صلیبی سورماؤں کے ہاتھوں غارت ہوا۔ سنہ ۱۲۰۴ء میں انہوں نے کئی ماہ کے محاصرہ کے بعد شہر پر قبضہ جما لیا۔ شہنشاہ اور ملکہ نے بھاگ کر جان بچائی۔ ان کے خزانے لوٹ لئے گئے اور شہر کا بڑا حصّہ آگ کی نذر ہوا۔ یہ آگ لگاتار آٹھ دن بھڑکتی رہی۔ گرجاؤں نے مدتوں سے جو زر و مال جمع کیا تھا سب چھین لیا گیا۔ لوگوں کی لاشیں گلیوں میں پڑی سڑ رہی تھیں۔ اس تباہ کاری اور لوٹ مار کا ذکر کرتے ہوئے ایک فرانسیسی مؤرخ نے لکھا تھا کہ جب سے دنیا وجود میں آئی ہے کسی شہر سے اس قدر مال غنیمت اکٹھا نہیں کیا گیا تھا۔ صلیبی سورماؤں کی جوع زر کا یہ حال تھا کہ قبریں کھود کھود کر مردوں کے تابوتوں میں سے بھی قیمتی چیزیں نکال لی گئیں۔ ان میں سے اکثر قبریں عیسائی ولیوں کی تھیں۔ لوٹ مار اور دہشت کا یہ دور پورے ساٹھ برس تک رہا۔ آخر سنہ ۱۲۶۱ء میں شہر کو اس بلائے بے درماں سے نجات ملی۔ لیکن اس عرصہ میں اس کی پرانی عظمت اور خوش حالی کا ایک کہانی بن چکی تھی۔ اس کے کوئی دو سو سال بعد تک بازنطینی سلطنت کا چراغ پھر ٹمٹماتا رہا۔

عثمانی سلطانوں کی نگاہیں بھی رہ رہ کر قسطنطنیہ کی طرف اٹھتی تھیں۔ اگر سنہ ۱۴۰۲ء میں امیر تیمور سلطان بایزید یلدرم کی کمر میں چھرا نہ گھونپ دیتا تو اغلب یہی تھا کہ یہ باہمت سلطان قسطنطنیہ کو فتح

کرلیتا۔ ۱۴۲۲ء میں سلطان مراد ثانی سے اس کا محاصرہ کیا لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ آخر اس باعزم ترک سلطان کا زمانہ بھی آگیا جس کے ہاتھ پر قسطنطنیہ کی فتح مقدر ہو چکی تھی۔ سلطان محمدؐ ثانی نے جو بعد میں محمدؐ فاتح کے نام سے مشہور رہوا۔ قسطنطنیہ پر حملہ کرنے کے لئے بڑی توجہ سے تیاری کی۔ سلطان بایزید اول نے باسفورس کے ایشیائی کنارے پر ایک قلعہ تیار کر رکھا تھا۔ سلطان فاتح نے باسفورس کے یورپی کنارے پر بھی ایک قلعہ بنوایا اور اس طرح قسطنطنیہ کو بحیرہ اسود سے کاٹ دیا۔ محاصرہ کے لئے خاص طور پر بڑی بڑی توپیں تیار کی گئیں۔ مارچ ۱۴۵۳ء کے آخر میں حملہ کر دیا گیا۔ اور ترک دستے شہر کے نواح میں پہنچ گئے۔ ۱۷ اپریل کو سلطان نے کوئی ڈیڑھ لاکھ فوج کے ساتھ ہلہ بولا۔ لیکن اہل شہر نے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ ۲۱ اور ۲۲ اپریل کی درمیانی رات کو سلطان نے وہ حیرت انگیز کارنامہ انجام دیا جو تاریخ میں یادگار بن گیا ہے۔ وہ راتوں رات اپنے بحری بیڑے کے بہتر جہاز باسفورس سے خشکی کے راستہ شاخ زریں میں لے آیا۔ عیسائیوں نے آہنی زنجیروں سے شاخ زریں کی جو ناکہ بندی کر رکھی تھی وہ اس حیرت انگیز کارنامے کی بدولت دھری کی دھری رہ گئی۔ یہ دیکھ کر اہل شہر کے حوصلوں کے اوس پڑ گئی۔ پھر بھی مقابلہ شدت سے جاری رہا۔ ادھر سلطان فاتح بھی آہنی عزم کئے ہوئے تھا۔ آخر ۲۹ مئی کو ایک عام حملہ اس زور کا ہوا کہ اس کے ریلے بچاؤ کرنے والوں کو تنکوں کی طرح بہالے گئے اور بازنطین کا قدیم شہر جو تاریخ کے بیسیوں اتار چڑھاؤ دیکھ چکا تھا۔ ترک فاتحوں کے ہاتھ آیا جو آج تک اس کے محافظ ہیں۔

قسطنطنیہ نے اس سے پہلے کئی فاتح دیکھے تھے۔ صلیبی فاتحین کے ہاتھوں اس کی جو گت بنی تھی اس کی یاد ابھی تازہ تھی۔ اہل شہر سہمے ہوئے تھے کہ نامعلوم مسلمانوں کے ہاتھوں ان پر کیسی تباہی آئیگی لیکن محمدؐ فاتح نے جس رواداری۔ فراخ دلی اور بردباری کا ثبوت دیا۔ اس کی مثال اسلامی تاریخ کے سوا کہیں ڈھونڈے نہ ملے گی۔ عیسائیوں کی عبادت گاہوں ان کے مذہب اور ان کے طرز زندگی کے ساتھ کسی قسم کا تعرض نہیں کیا گیا۔ ان کی جانیں اور جائدادیں ہر طرح محفوظ رہیں۔ فتح کے چوتھے دن شہر میں مکمل امن و سکون ہو گیا۔ لوگوں کی طمانیت اور دلجمعی کا یہ حال تھا کہ فتح کے صرف دو ہفتے بعد

۱۸ جون کو محمد فاتح صرف پندرہ سو سپاہیوں کا حفاظتی دستہ پیچھے چھوڑ کر خود اپنے پایۂ تخت
ٹ گیا۔ قرون وسطیٰ کی اس اسلامی رواداری کا مقابلہ جب عہد حاضر کے مہذب طور طریقوں
کیا جاتا ہے تو حیرت ہوتی ہے۔ زیادہ دیر کی بات نہیں کہ عثمانی سلطنت کے کئی حصے ترکوں
ہاتھوں سے نکل کر یورپی حکمرانوں کے ہاتھ میں چلے گئے تھے۔ آج ان یورپی ملکوں میں جاکر
ہو تو ترکی عہد یا اسلامی طریقۂ عبادت کی شاید ہی کوئی یادگار نظر آئے گی۔

ہلالی پرچم کے سایہ میں آکر قسطنطنیہ کا نام استنبول میں بدل گیا۔ دنیا کا یہ اہم شہر جو تجارتی
فوجی لحاظ سے یگانہ اہمیت رکھتا ہے۔ اب اسلامی تہذیب و ثقافت کا گہوارہ بن گیا۔ اسے
نی سلطنت کا پایۂ تخت بنا دیا گیا۔ اب اس کے اُفق پر ایک نیا حسن جلوہ گر ہونے لگا۔ مسلمان
وں اور صناعوں نے اپنا سارا کمال اس شہر کو عروس البلاد بنانے پر صرف کر دیا۔ جگہ جگہ بلند مینار ول
سر اٹھائے۔ مسجدیں۔ محل۔ باغ۔ فوارے۔ کتب خانے اور رنگارنگ عمارتیں تعمیر ہوئیں۔ استنبول
وسیع سلطنت کا اعصابی مرکز بن گیا۔ اور اس کا ہر اشارہ تین براعظموں میں حرکت پیدا کرنے لگا۔
ترقی اور پیش قدمی کا یہ دور سترھویں صدی تک جاری رہا۔ پھر یہ قوت محرکہ رک گئی اور بالآخر
ھویں صدی میں کمزوری کے آثار بالکل نمایاں ہو گئے۔ اس بات نے دشمنوں کو جو صدیوں سے
میں بیٹھے تھے سر اٹھانے کا موقع دیا۔ روس اور آسٹریا نے بات بات پر مشکلیں پیدا کیں لیکن
علیں بھی استنبول کو عثمانیوں سے نہ چھڑا سکیں۔ انیسویں صدی کے آغاز تک عثمانیوں کا قومی
اور ملک کی اندرونی زندگی دونوں درہم برہم ہو گئے۔ اصلاح حال کے لئے کئی دفعہ کوششیں
ں لیکن مغربی سازشوں نے انہیں ہر بار ناکام بنا دیا۔ بیسویں صدی کے آغاز میں عثمانی سلطنت
ے حصے مغربی طاقتوں نے چھین لئے۔ آخر پہلی جنگ عظیم میں شکست کھا جانے پر ترکی پر دشمنوں کا
بند ہو گیا۔ استنبول کے تاریخی شہر پر یورپی طاقتوں نے فوجی قبضہ جما لیا۔ ایسا معلوم ہوتا
ہلالی پرچم اس پر کوئی پانچ سو برس لہرانے کے بعد اکھاڑ پھینکا جائے گا۔ اور اس کے اُفق
مسلمانوں کی تعمیریں اس طرح غائب ہو جائیں گی جس طرح وہ بلقان کے شہروں سے غائب

ہو چکی ہیں لیکن قدرت کو ابھی یہ منظور نہ تھا۔ مغربی طاقتوں کی باہمی رقابت اور مصطفےٰ کمال کا تدبر ترکوں کے آڑے آیا اور استنبول جوں کا توں ترکوں کے ہاتھ میں رہا۔

استنبول ۱۴۵۳ء سے لے کر ۲۳ اپریل ۱۹۲۰ء تک عثمانی سلطنت کا صدر مقام رہا۔ آج یہ ترکی جمہوریہ کی ایک ولایت ہے۔ تاہم اس کی تاریخی اور قدرتی دولت نے اس کی اہمیت میں فرق نہیں آنے دیا۔ یہ اسی اہمیت کا صدقہ ہے کہ اس کی گہما گہمی میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ ۱۹۵۰ء کی مردم شماری کے مطابق اس کی آبادی دس لاکھ سے اوپر تھی۔

آب وہوا:۔ قدرتی مناظر کی خوبصورتی کے اعتبار سے قدرت نے استنبول کے معاملہ میں بڑی فیاضی سے کام لیا ہے۔ ایک تکونی جزیرہ نما کا تصور جس کے تین طرف سمندر کی لہریں پہاڑیوں کے پاؤں چوم رہی ہوں۔ بذات خود بڑا دل فریب ہے۔ اس پر استنبول کی آب وہوا نے سونے پر سہاگے کا کام کیا ہے۔ یہ شہر ۴۱ درجہ عرض بلد شمالی پر اس جگہ واقع ہے۔ جہاں ۱ سے ۲۸ درجہ مشرقی طول بلد کاٹتا ہے۔ اس محل وقوع نے اس کی آب وہوا کو بڑی خوشگواری اور تنوع بخشا ہے اس کی آب وہوا نہ صرف رومی آب وہوا کے عناصر رکھتی ہے۔ بلکہ وسطی یورپ اور بحیرۂ اسود کے خطوں کی آب وہوا کے عناصر بھی۔ موسم سرما میں یہاں شمال سے ہوائیں چلتی ہیں جو برف باری اور سردی کا موجب ہوتی ہیں۔ موسم بہار اور موسم خزاں میں ہوا جنوب سے چلتی ہے۔ اس کے ساتھ اکثر بارش آتی ہے۔ سالانہ بارش کی اوسط ۲۵ انچ ہے۔ زیادہ بارش سردی کے موسم میں ہوتی ہے استنبول میں سردی کا موسم مختصر ہوتا ہے۔ بہار بہت جلد آجاتی ہے۔ گرمیوں میں مطلع صاف رہتا ہے۔ لیکن شمال مشرقی ہواؤں کے طفیل گرمی زیادہ نہیں ہونے پاتی۔ استنبول کا بہترین موسم خزاں ہے جو لمبی بھی ہوتی ہے اور ہر لحاظ سے خوب صورت بھی۔ موسم کے متعلق استنبول میں عام مقولہ یہ ہے کہ یہاں نہ سردی کا موسم ہے نہ گرمی کا۔ بلکہ صرف شمالی اور جنوبی ہوائیں ہیں۔

غرض مجموعی طور پر یہ کہنا بالکل درست ہے کہ استنبول میں انتہائی سردی یا گرمی کا نام نہیں سردیوں میں جنوبی ہوائیں اکثر چلتی رہتی ہیں اور وہ سرما کی شدت کو گھٹا دیتی ہیں۔ گرمیوں میں شمالی

ہوائیں موسم کو اعتدال پر رکھتی ہیں۔ استنبول کی سیاحت سال کے ہر حصہ میں لطف کا باعث ہوتی ہے۔ سردیوں میں برف ضرور پڑتی ہے لیکن معمولی اور وہ زیادہ دیر تک نہیں رہتی۔ بہار کا موسم بہت مختصر ہوتا ہے لیکن اس کا حسن آنکھوں میں چکا چوند پیدا کرتا ہے۔ سر پر گہرے نیلے رنگ کا صاف آسمان۔ زمین پر زمردین سبزہ کا فرش۔ درختوں پر رنگا رنگ پھولوں کی بہار اور ان کی بھینی بھینی مہک۔ گرمی کا موسم بھی بڑے لطف کا زمانہ ہوتا ہے۔ گرمی کبھی بھی تکلیف دہ حد کو نہیں پہنچتی۔ پھر بحیرۂ اسود کو چومتی ہوئی جو شمالی ہوا چلتی رہتی ہے وہ باسفورس کے ساحل پر واقع سرسبز پہاڑیوں کو صحت افزا مقامات میں تبدیل کئے رکھتی ہے۔ خزاں کا موسم بھی اسی طرح خوش گوار رہتا ہے۔ بیرونی سیاحوں کے لئے گرما اور خزاں یقینی طور پر بہترین اوقات ہیں۔

شہر کے حصے:- شروع شروع میں استنبول کو روما کی طرح سات وارڈوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ لیکن شہر چودہ حصوں میں بٹ گیا۔ ان میں سے ایک قدیم حصہ گلاٹا ہے۔ اول اول اس کا نام سائیکی یعنی انجیر تھا کیوں کہ یہاں انجیر کے درختوں کی کثرت تھی۔ بازنطینی دور میں اس حصہ میں اہل جینوا، اہل پائسا، اور اہل وینس کی اکثریت ہوگئی۔ ان لوگوں کی تجارت اور دولت اس حد تک بڑھی کہ انہوں نے شہنشاہ سے خاص مراعات حاصل کرلیں۔ جب بازنطینی سلطنت میں کمزوری پیدا ہوئی تو گلاٹا کے لاطینی باشندوں نے مزید مراعات حاصل کرلیں۔ یہاں تک کہ یہ سلطنت کے اندر ایک اور چھوٹی سی سلطنت بن گئی۔ آخر ان لوگوں کے درمیان آپس میں ٹھن گئی اور اس جھگڑے کا خاتمہ فتح قسطنطنیہ کے ساتھ ہوا۔

بیوگلو شہر کا نسبتاً جدید حصہ ہے۔ چودھویں صدی میں یہ زمین باغوں اور انگور کی بیل سے ڈھکی تھی، جب استنبول پر ترکوں کا قبضہ ہوا تو گلاٹا کی فصیل کو گرا دیا گیا تاکہ شہر کی توسیع ہو سکے، چنانچہ جیسے آبادی نے بڑھتے بڑھتے بیوگلو کی پہاڑی کو ڈھانپ لیا۔ رفتہ رفتہ غیر ملکی سفارت خانے گلاٹا سے اٹھ کر بیوگلو میں آگئے۔

کادی کوئی شہر کا وہ حصہ ہے جو بازنطینی زمانہ سے بھی پیچھے جاتا ہے۔ کہتے ہیں یہ فونیقیوں کی نوآبادی تھی۔ جب یہ بازنطینیوں کے ہاتھ آیا تو شہنشاہ نے اس کی دیواریں گرا کر انہی پتھروں سے

بعض بنوایا۔ "اُسکودار" شہر کا ایک اور اہم حصہ ہے۔ تاریخی لحاظ سے اس کی اہمیت بھی بڑی ہے بہت پرانے زمانہ میں یہ بستی کالدیہ کے مقبوضات میں سے تھی۔ بعدازاں اس کا نام کرائسو پولس یعنی سنہری شہر پڑ گیا۔ اس کی شرح یہ تسلیم کی گئی ہے کہ سورج غروب ہونے کے وقت اگر باسفورس کے یورپی کنارے پر کھڑے ہو کر نگاہ دوڑائی جائے تو یہ تمام قطعہ سنہری جگمگاہٹ میں ڈوبا ہوا نظر آتا ہے سات سو سال قبل مسیح میں اسکودار پر ایرانیوں نے قبضہ کر لیا تھا۔ ۷۸۲ء میں خلیفہ ہارون الرشید نے اس بندرگاہ پر فتح کا جھنڈا گاڑا۔ مگر بعد میں یہ پھر بازنطینی ہاتھوں میں چلی گئی۔ عثمانی ترکوں نے اس بستی کو نئے سرے سے آباد کیا۔ یہاں تک کہ آبادی آس پاس کی پہاڑیوں سے جا ملی۔

باسفورس کی سیر:۔ استنبول کے قدرتی حسن میں سب سے خوبصورت زیور باسفورس ہے۔ اس کی مثال ایک ایسے بے نظیر ہیرے کی ہے جس کی طرف دنیا نے ہمیشہ للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھا ہے یوں تو دنیا میں کئی پہاڑوں، وادیوں، جھیلوں اور دریاؤں کے منظر خوب صورت ہیں لیکن باسفورس کا حسن ان سب میں اس وجہ سے نرالا ہے کہ اس کا ایک ایک چپہ اپنی جگہ لاجواب ہے۔ اس کے ہلکورے کھاتے ہوئے پانی پر سے کشتی میں بیٹھ کر گذرو تو بیسیوں دفعہ یوں گمان ہوتا ہے گویا پریوں کے دیس میں جا نکلے ہیں۔ جو آدمی ایک دفعہ اس سیر کی لذت سے آشنا ہو جاتا ہے۔ وہ نہ اس کے تذکروں سے اکتاتا ہے اور نہ بار بار اس مسرت بخش تجربہ کو دہرانے سے۔ باسفورس میں ایک چکر لگا لینا گویا نگارخانہ فطرت کی ایک جھلک دیکھ لینا ہے۔ اس کے دونوں کناروں پر جگہ جگہ شفاف شیریں پانی کے چشمے ہیں جو اس آبی شاہراہ کے حسن اور اس کی افادیت میں اور بھی اضافہ کرتے ہیں۔ پھر یہاں قسم قسم کی مچھلیوں کی جو بہتات ہے اس کا مقابلہ دنیا کا کوئی اور سمندر نہیں کر سکتا۔

باسفورس کے حسن کا تماشہ کرنے کے لئے تین راستے موجود ہیں۔ دو راستے تقسیم چوراہے سے نکلتے ہیں اور باسفورس کے ناکہ پر ختم ہوتے ہیں۔ لیکن ان سے زیادہ حسین راستہ بحری راستہ ہے گلاٹا کے پل سے دخانی جہاز چلتا ہے اور دونوں ساحلوں کے مختلف اسٹیشنوں پر رکتا جاتا ہے بعض دخانی کشتیاں ایچ پیچ کھاتی ہوئی دونوں ساحلوں کے بیچوں بیچ چلتی ہیں لیکن

باسفورس کی بے مثال خوب صورتی کو قریب سے دیکھنے کے لئے ضروری ہے کہ ایک ساحل کے ساتھ ساتھ چلا جائے اور واپسی پر دوسرے ساحل کے ساتھ ساتھ راستہ اختیار کیا جائے

گلاٹا کے پل سے یورپی ساحل کے ساتھ ساتھ چلیں تو پہلا اسٹیشن بیکتاس کا آتا ہے۔ یونہی ذرا آگے بڑھیں ساحل کے قریب جرگان محل کی خاک سیاہ عمارت نظر آتی ہے۔ یہ عمدہ محل سلطان عبدالعزیز نے ۱۸۷۴ء میں تعمیر کرایا تھا۔ ۱۹۰۹ء میں جب اصلاحات نافذ ہوئیں تو اسے محل سے پارلیمنٹ کی عمارت میں تبدیل کر دیا گیا۔ اس سے اگلے سال اسے آگ نے خاک سیاہ کر دیا۔ اب اس کے قریب جو وسیع باغ ہے وہ سیڈیم کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اس سے کچھ اور آگے تجارتی بحریہ کا مدرسہ ہے۔ جہاں بحری افسروں اور انجینروں کو تربیت دی جاتی ہے اس سے آگے ارنکائے ہائی اسکول ہے جو ۱۹۳۰ء میں قائم کیا گیا تھا۔ اس سے ذرا آگے کیاتس ہائی اسکول ہے جو استنبول کے بہترین مدرسوں میں شمار ہوتا ہے۔

اب ساحل پر اگلا اسٹیشن ارنکائے کا آتا ہے۔ یہاں سے مشہور مسجد والدہ صاف نظر آتی ہے یہ عالی شان مسجد جو اپنے نقش و نگار کے لئے بے مثال ہے ایک ترک سلطانہ کی بنوائی ہوئی ہے۔ یہاں سے آگے بڑھیں تو ساحل کے ساتھ ساتھ لکڑی کے بنے ہوئے بہت سے مکان نظر آتے ہیں۔ جو کبھی امراء نے چاندنی راتوں کا لطف اٹھانے کے لئے بنوائے تھے۔ مگر اب یہ عیش و نشاط کی محفلوں سے خالی ہیں اور زیادہ تر گودام استعمال ہو رہے ہیں۔ لیکن اس حالت میں بھی ان کے تعمیر کرنے والوں کی صناعی داد لئے بغیر نہیں رہتی۔

اگلا اسٹیشن کروسیم کا ہے۔ اس اسٹیشن تک ساحل کے ساتھ ساتھ کوئلے اور پٹرول کے ذخیرے بنائے گئے ہیں۔ چوتھا اسٹیشن ارناؤکوئی کا ہے۔ اس جگہ باسفورس کا پانی سب سے زیادہ تیزی کے ساتھ بہتا ہے۔ اس مقام پر گرم سے گرم موسم میں بھی خنک نسیم چلتی محسوس ہوتی ہے اوپر پہاڑی کی چوٹی پر امریکن زنانہ کالج ہے۔

پانچواں اسٹیشن بابک کا ہے۔ اس جگہ سابق خدیو مصر عباس حلمی کی والدہ کا بنوایا ہوا خوبصورت

محل ہے۔ آج کل یہ محل مصری سفارت خانے کا گرمائی مستقر ہے۔ مصر کے امراء اور اعلیٰ افسران تک گرمیاں گذارنے یہاں آجاتے ہیں۔ اسٹیشن کے پاس ہی ۱۷۳۵ء کی تعمیر شدہ ایک خوبصورت مسجد ہے۔ پاس ہی میونسپل باغات ہیں جہاں گرمیوں کے موسم میں لوگوں کا جمگھٹا لگا رہتا ہے۔ ساحل کے ساتھ ساتھ گرمائی تفریح گاہوں کی قطار چلی گئی ہے۔ جبکہ سرسبز پہاڑ کی بلندی پر امریکن رابرٹ کالج کی عمارت ہے۔ اس کے ساتھ ملا ہوا ایک وسیع قبرستان ہے جس میں وہ مجاہد دفن ہیں جو سلطان محمد فاتح کے جھنڈے تلے بری اور بحری لڑائیوں میں شہید ہوئے تھے۔

آگے بڑھتے ہوئے ہم رومیلی حصار کے اسٹیشن پر پہنچتے ہیں۔ یہ وہ مشہور تاریخی قلعہ ہے۔ جو سلطان محمد فاتح نے قسطنطنیہ پر حملہ سے پہلے باسفورس کے یورپی ساحل پر تعمیر کرایا تھا۔ اس قلعہ سے ذرا آگے باسفورس کا تنگ ترین حصہ آتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سے ۵۰۰ قبل مسیح میں ایرانی شہنشاہ دارا سات لاکھ کی فوج کے ساتھ ایک عارضی پل پر سے باسفورس کے پار اترا تھا۔ باسفورس کے تنگ ترین نقطہ پر دونوں ساحلوں پر کھڑے دو قلعے عجب منظر پیش کرتے ہیں۔ رومیلی حصار کے جنوبی دروازے پر سنگ مرمر کا جو کتبہ نصب ہے اس پر یہ الفاظ عربی رسم الخط میں کندہ ہیں "سلطان اعظم بادشاہ باہمت محمد بن مراد خاں خلد اللہ ملکہٗ نے رکنوز پادشاہین وزیر اعظم عبداللہ کو حکم دیا کہ اس بلند اور ناقابل تسخیر قلعہ کو تعمیر کرے یہ ماہ رجب ۸۵۶ھ میں مکمل ہوا۔"

رومیلی حصار سے آگے باسفورس کا رومانی حسن اور بھی بڑھ جاتا ہے۔ ساحل کے ساتھ ساتھ گرمائی تفریح گاہوں، ریستورانوں اور باغوں کی مسلسل قطار چلی جاتی ہے۔ ان دل فریب منظروں میں واقع چھوٹے چھوٹے اسٹیشنوں میں سے گذرتے ہوئے ہم بیوک دیر کے بڑے اسٹیشن پر پہنچتے ہیں۔ اس جگہ پانی کی گہرائی زیادہ ہے۔ اس لئے بڑے بڑے جہاز ٹھہر سکتے ہیں۔ یہ اسٹیشن گرمیوں کی پسندیدہ تفریح گاہ ہے۔ اس لئے اس کے نواح میں نفیس رہائش گاہوں، سیر گاہوں اور ریستورانوں کی بھرمار ہے۔ یہاں سے بلغراد کے مشہور جنگل کو راستے جاتے ہیں۔

چودھواں اسٹیشن سری یر کا ہے جس کے نواح میں چیل کے درختوں کی بہتات ہے۔ اس سے

یب ہی وادیٔ گلاب واقع ہے۔ جہاں نہایت شیریں پانی کے چشمے ابلتے ہیں۔ گرمیوں کے موسم میں ستنبول کے لوگ گروہ در گروہ ان چشموں پر آتے ہیں۔ اور سارا دن پر فضا نواح میں گذار کر شام کو پس چلے جاتے ہیں۔

آخری اسٹیشن ینی اہالی کا ہے۔ یہاں ساحل سے عمودی پہاڑیاں اوپر کو اٹھتی ہیں جن پر ماہی گیروں بستی قائم کر رکھی ہے۔ اس سے ذرا آگے باسفورس کا آخری کنارہ ہے۔ یہاں ایک بازنطینی قلعہ کے نڈر کھڑے ہیں۔ یہ قلعہ باسفورس کی حفاظت کے لئے بنایا گیا تھا۔ ا ابا سفورس کے آخری رے پر یورپی اور ایشیائی ساحلوں پر روشنی کے دو مینار سر اٹھائے کھڑے ہیں۔ یہ تنگ آبنائے ں داخل ہونے والے جہازوں کو راستہ دکھاتے ہیں۔ میناروں سے آگے بحیرۂ اسود کا گہرا نیلا نی ہر دم تھپیڑے کھاتا ہوا دکھائی دیتا ہے ؎

تعلیمی دنیا پر ایک نظر

مذہبی مدرسوں کی اہمیت

حال ہی میں برطانوی ناول نویس مسٹر ایولن واگ نے ہیں مونٹ گرجا کے مدرسے میں انعام تقسیم کرتے وقت کہا۔ اس وقت میری سب سے زیادہ ہمدردی والدین کے ساتھ ہے، جو لوگ اپنے بچوں کو حکومت کی گود میں تربیت دلانا چاہتے ہیں، ان کے لئے یہ گود اس قدر فراخ اور نرم و نازک ہے کہ ماں باپ کے لئے اپنے بچے کو مذہبی تعلیم دلانے کا فیصلہ کرنا بہت بڑی بات ہے۔ انہوں نے کہا مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی ہے کہ انعام میں کتابیں دی گئی ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ بعض مدرسے محض اس وجہ سے کہ ان کے بچوں کو کتابیں پڑھنے میں دقت پیش آتی ہے۔ انہیں تمغے اور سرخی انعام میں دیتے ہیں۔ انہوں نے مزید کہا کہ بچوں کے لئے یہ بہت بڑی بات ہے کہ وہ ایسے لوگوں کے درمیان پل کر جوان ہوں جو یہ سمجھتے ہوں کہ سکول کی کامیابی کا انحصار محض اسی بات پر نہیں کہ اس کے فارغ التحصیل لوگوں کے نام جنم دن کے اعزازات کی فہرست میں ہوں۔ گرجا کے مدرسے کو دوسرے مدرسوں پر بڑی فوقیت یہ ہے کہ اس کی زندگی کو بہت زیادہ ثبات حاصل ہے۔ اسکی دوسری بڑی خوبی سادہ زندگی بسر کرنے کی وہ قسم ہے جو پادری لوگ اٹھاتے ہیں دوسرے مدرسوں کی یہ حالت ہے کہ استاد طلبہ کو یہ تلقین کرتے ہیں کہ مدرسہ کی بھلائی سے بڑھ کر اور کوئی چیز نہیں اور خود صدر معلمی کی ہر ذاتی آرام کے لئے درخواستیں بھیجتے رہتے ہیں۔ گرجا کے مدرسے میں یہ بات نہیں ہوتی۔

برطانوی طلبہ کا مطالبہ

انگلستان کی نیشنل یونین آف سٹوڈنٹس نے وزیر تعلیم کو ایک یادداشت ٹریننگ کالجوں کے طلبہ کی طرف سے بھیجی ہے۔ اس میں درخواست کی گئی ہے کہ گریجویٹ سے کم درجے کے استادوں

تعلیم کو بہتر بنانے کی طرف فوری توجہ دی جائے۔ یونین نے کہا ہے کہ جب تک وزیر تعلیم استادوں کی تربیت کی ذمہ داری خود اپنے اوپر نہ لیں گے اس وقت تک پیشۂ معلمی اور ملک کی عام تعلیم کے معیار افسوسناک طور پر خراب ہوتے جائیں گے۔

سکاٹ لینڈ کی تعلیمی انسٹی ٹیوٹ

اس سال سکاٹ لینڈ کی تعلیمی انسٹی ٹیوٹ کا جو سالانہ عام جلسہ ایڈنبرا میں ہوا۔ اس میں تقریر کرتے ہوئے اس کے صدر نے کہا۔ ثانوی اور ابتدائی تعلیم میں پورا انقلاب آ چکا ہے۔ اور لطف کی بات یہ ہے کہ کسی نے اس انقلاب کی طرف خاص توجہ نہیں دی۔ لیکن یہ افسوس کی بات ہے کہ نرسری مدرسہ کی ترقی رک گئی ہے۔ حالاں کہ ۱۹۳۸ء میں اس ترقی کے آثار بڑے روشن تھے۔ یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ آج ابتدائی مدرسوں کے نصاب پہلے کی نسبت بہت زیادہ معقول ہیں اور ابتدائی سے ثانوی مدرسہ میں منتقل ہونے کے انتظامات تسلی بخش ہیں۔ تاہم سست رفتار سے ترقی کرنے والے طالب علم اور ایسے طالب علم کے لئے جو ذہنی آزمائشوں میں بہت اچھا ثابت نہ ہو لیکن اس کے بعض رجحانات امید افزا ہوں ابھی زیادہ توجہ اور ہمدردی کی ضرورت ہے۔ تحقیق اور مطالعہ کے لئے یہ بڑا پر امید میدان ہے۔ بالخصوص جبکہ مدرسہ چھوڑنے کے سرٹیفکیٹ کے قواعد بدل چکے ہیں۔ مجھے سکاٹ لینڈ کے محکمۂ تعلیم سے اس بات میں اتفاق ہے کہ بچوں کی درجہ بندی میں ریاضی کی قابلیت اور جدید زبانوں کی تقریری مہارت کا خاص خیال رکھنا چاہیئے۔ نیز ثانوی مدرسہ کے نچلے درجوں میں سائنس کے نصاب میں علم الحیوانات بھی شامل ہونا چاہیئے۔

انسٹی ٹیوٹ کے سابق صدر نے اپنی تقریر میں کہا کہ کسی پیشہ کے لئے نئے آدمیوں کو کھینچنا ہمارا کام نہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ طلبہ کے سامنے واقعات کو کھول کر رکھ دیں اور انتخاب کا فیصلہ ان پر چھوڑ دیں۔ جہاں تک تنخواہ پنشن اور دوسری سہولتوں کا تعلق ہے۔ ہم دوسرے متوازی پیشوں سے بہت پیچھے ہیں۔

جلسے نے ایک قرارداد منظور کی جس میں پارلیمنٹ سے ایک ایسا قانون منظور کرنے

کہا گیا جس کی رو سے استاد اپنے پیشہ کے اندرونی معاملات کے اسی طرح مالک بن جائیں جس طرح اب ڈاکٹری اور وکالت کے پیشے اپنے اندرونی معاملات میں خود مختار ہیں۔ ایک اور قرارداد میں حکومت سے کہا گیا کہ ملازمت سے سبکدوش ہونے والے استادوں کی پنشن بڑھا دی جائے۔ اور اس کی ادائیگی ماہانہ ہوا کرے۔ ایک اور قرارداد میں کہا گیا کہ ۱۹۷۲ء کے بعد کسی غیر تربیت یافتہ استاد کو ملازمت میں نہ رکھا جائے اور قومی میزانیہ کا زیادہ حصہ تعلیم پر صرف کیا جائے۔

نوجوان اور امداد باہمی

انگلستان کے نوجوانوں میں امداد باہمی کی تحریک کا بڑا چرچا ہے۔ گذشتہ جون کے آغاز میں گلاسگو کے مقام پر اس تحریک کے چار سو نمائندوں کا ایک اجتماع ہوا۔ کانفرنس کے صدر اور سیکریٹری جنہوں نے اس کا سارا بندوبست کیا۔ دونوں کی عمریں ۱۲ سال سے کم تھیں۔ کانفرنس میں مختلف سوالوں پر گرما گرم بحثیں ہوئیں۔ چوں کہ ہر طرح کے سیاسی مسائل کو بحث سے خارج رکھا گیا تھا۔ اس لئے جذبہ اور سرگرمی اور بھی زیادہ تھے۔ کئی غیر ملکی نمائندوں نے بھی کانفرنس میں شرکت کی۔

ایک جج کی شہادت

ایک برطانوی جج کو حال ہی میں اپنے پرانے مدرسے میں انعام تقسیم کرنے کے لئے بلایا گیا۔ اس موقع پر اس نے کہا جب میں اس مدرسے کا طالب علم تھا ان دنوں کے صدر معلم کو "غلیظ آر نھر" کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ اس کی وجہ اس نے یہ بیان کی کہ ایک روز صدر معلم صاحب نے نزننگ میں آکر دسویں جماعت کو ورجیل کا ایک شعر سنایا اور اس کی معانی شرح بیان کی۔ ساتھ ہی یہ فرمایا کہ یہ شرح مجھے آج غسل کرتے وقت سوجھی تھی۔ گھنٹہ ختم ہونے پر طلبہ میں بحث چھڑ گئی۔ کہ آج صدر معلم صاحب کی رگ شعریت یکایک کیوں پھڑک اٹھی؟ سب نے اس بات پر اتفاق کیا کہ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ اپنی عالمیت کا مظاہرہ کرنا چاہتے تھے۔ بلکہ اصل سبب اپنی طہارت کا ڈھنڈورا پیٹنا تھا کیوں کہ صدر معلم صاحب کا نہانا ایک اہم اور خلاف معمول واقعہ تھا۔ اس دن سے

صدر معلم صاحب کو "علیظ آرتھر" کا خطاب مل گیا۔ اور بعد میں وہ اسی نام سے مشہور ہوئے۔
اس خبر پر تبصرہ کرتے ہوئے اخبار "ٹائمز" اپنے تعلیمی ضمیمہ میں لکھتا ہے۔ رگبی کے مشہور صدر معلم ڈاکٹر آرنلڈ کے زمانہ میں لڑکوں کے نام توڑ رکھے جانے لگے تھے لیکن استاد ابھی محفوظ تھے۔ اس سے جلد ہی بعد بے ادبی کا رجحان ترقی پانے لگا۔ آج یہ حالت ہے کہ کردار کی مضبوطی استاد کو اس حملے سے بچا نہیں سکتی۔ جدید ثانوی مدرسے کا استاد اگر پُرہیبت شخصیت رکھتا ہے تو اسے قصاب کا نام مل جاتا ہے اور صدر معلم جو بلند کردار اور متانت میں ڈاکٹر آرنلڈ کا نمونہ ہوں۔ انہیں ہر چھوٹا بڑا "میم" کے نام سے پکارتا ہے۔ اس بات پر تعجب کا اظہار کرتے ہوئے اخبار مذکور لکھتا ہے کہ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ آیا لڑکیاں بھی اپنی استانیوں سے یہی سلوک کرتی ہیں یا نسوانی ذہانت کے طور طریقے اپنے بھائیوں سے الگ ہیں۔ اس ضمن میں برطانوی لڑکوں کا رویہ برطانوی تاریخ تعلیم کا ایک عجوبہ ہے۔ ایک شخص یونی ورسٹی سے بڑے بڑے اعزازات سے لدا ہوا آتا ہے۔ لیکن جوں ہی وہ نیم وحشی لڑکوں کے سامنے آکر کھڑا ہوتا ہے اور تختۂ سیاہ پر کچھ لکھنے کو پیٹھ موڑتا ہے اسے کوئی نہ کوئی خطاب مل جاتا ہے۔ جو عمر بھر اس کے ساتھ چمٹا رہتا ہے۔

نئے ادیبوں کو مشورہ | انگریزی علم ادب کے عام سالانہ جلسہ کی صدارت کرتے ہوئے مسٹر چارلس مارگن نے کہا صرف چھوٹے درجہ کے آدمی جن کے اپنے ذہن میں کہنے کو کچھ نہ ہو۔ یہ دیدہ دلیری کر سکتے ہیں کہ لکھنے کا فن نہ سیکھیں" اس جملہ میں ان لوگوں کے لئے بھی پیشگی جواب موجود تھا جو یہ کہنے کہ خداداد قابلیت اور شوقیہ مشغلہ ہم معنی چیزیں ہیں یا یہ شکایت کرتے کہ تعلیم میں ادیب کے پیشہ ورانہ فن کی طرف ضرورت سے زیادہ توجہ دی گئی ہے۔
مسٹر مارگن نے دعویٰ کیا کہ فن تحریر کے ٹیکنیکل پہلو سیکھے جا سکتے ہیں۔ مصور اور ادیب میں ایک فرق یہ ہے کہ ثانی الذکر اپنی جوانی کے زمانہ میں کسی اکاڈیمی میں مخصوص تربیت حاصل نہیں کر... یونیورسٹی کا نصاب فن تحریر کی کوئی براہ راست تربیت نہیں دیتا۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ ادیب کی ابتدائی تربیت کا زمانہ کون سا ہے۔ اس نے کب آغاز کیا؟ وہ اپنی مشق کس طرح جاری رکھے؟ ...

نوجوان ضروری قابلیت کی سند کس طرح حاصل کرے؟ کیا ادیب کے لئے کوئی تربیتی تعلیم ہے یا؟ مسٹر مارگن نے کہا بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ادیب کے لئے کوئی تربیت موجود نہیں کیونکہ دوسرے فنوں میں کسی نہ کسی جسمانی عمل کو بار بار دہرانے کی ضرورت ہے۔ اس کے برعکس ادیب کی مشق کسی جسمانی عمل میں واضح طور پر جیتی نہیں رکھتی۔

یہ کہنا بڑا آسان ہے کہ ادیب کو قواعد زبان اور لغت کا مطالعہ شروع کرنا چاہئے۔ اگرچہ یہ چیزیں بڑی اہم ہیں۔ لیکن کان کی صحیح تربیت کے بغیر ان سے یا دوسرے عناصر سے کام نہیں لیا جا سکتا۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ اس کا کان ہمیشہ درست فیصلہ دے گا یا اس پر بھروسہ کر کے وہ قواعد زبان یا محاورہ سے آنکھیں بند کر سکتا ہے۔ لیکن یہ بات یقینی ہے کہ اگر اس کا کان درست کام نہیں کرتا تو باقی کوئی چیز اسے کام نہیں دے سکتی۔ دوسرے لوازمات میں تربیت اسی وقت کام دے گی جب کان کی تربیت بھی ہو گی۔ یعنی کان الفاظ کی موزونیت اور ان کی ہم آہنگ بندش کی پرکھ کرنا سیکھ جائے گا۔ مسٹر مارگن نے کہا انجیل کا مصدقہ ترجمہ اور عام عبادات کی کتاب ایک نوجوان ادیب کے لئے نمونہ کا کام دے سکتے ہیں۔ ان سے وہ کہانی کا آغاز۔ بیان کی پُر تاثیری اور موزوں خاتمہ کی تکنیک سیکھ سکتا ہے۔ اسے ادب کے ان رہنماؤں سے سبق سیکھنا چاہئے جن کی کامیابی کا راز گولڈ سمتھ کی طرح اظہار کی صفائی اور سطور کی موزونیت میں ہے۔ مسٹر مارگن نے کہا نوجوان ادیب کو خارجی بندشوں سے آزاد رہنے کی بجائے ان کے تابع رہنا سیکھنا چاہئے۔ ایک بڑے اخبار کی تنقید جیسی چیز اس کے لئے بہت کار آمد ثابت ہو سکتی ہے، ادبی تنقید کا خوف ادیب کو لاپرواہی سے بچائے رکھتا ہے۔

سرکاری جریدہ کے اعلانات

شعبۂ تعلیم ـــــــــــــ صیغہ مدارس

ای/۳۰۲۴۵ ۲۵ اگست ۵۳ء
م۔ محمد نوید میٹرک۔ ایس۔ وی (۶۰ - ۱۴۰) قائم مقام اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول پنڈی بھٹیاں کو تاریخ حاضری سے م۔ محمد منیر کی جگہ جو ۱۰ ستمبر کو سبکدوش ہونے والے ہیں اپنی تنخواہ پر قائم مقام اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول باغبان پورہ مقرر کیا گیا۔

ای/۲۸۹۴۶ ۲۰ اگست ۵۳ء
م۔ غلام نبی بٹ بی۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ پی۔ ای۔ ایس دوم (آزمائشی) صدر معلم گورنمنٹ نارمل اسکول مظفر گڑھ کو جو ۱۷ جولائی ۵۳ء کو غیر ملکی تعلیم سے واپس آئے ہیں ۲۶ جولائی ۵۳ء سے م۔ محمد شفیع کی جگہ جن کا تبادلہ گورنمنٹ نارمل اسکول مظفر گڑھ میں ہو چکا ہے صدر معلم گورنمنٹ ٹیکنیکل اسکول جوہر آباد مقرر کیا گیا۔

ای/۲۸۵۰۰ ۱۸ اگست ۵۳ء
م۔ مقصود الحق حنیف منشی فاضل او ٹی ایک۔ امیدوار کو تاریخ حاضری سے م۔ فضل کریم کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے (۶۰ - ۱۴۰) کے عام پیمانہ تنخواہ میں -/۶۰ روپے ماہوار پر قائم مقام معلم السنہ شرقیہ گورنمنٹ ہائی اسکول للّہ مقرر کیا گیا

ای/۲۸۲۹۸ ۱۸ اگست ۵۳ء
م۔ فضل احمد ایس وی (۶۰ - ۱۴۰) اردو مدرس گورنمنٹ نارمل اسکول لالہ موسیٰ کو تاریخ حاضری سے ایک موجودہ اسامی پر اور اپنی تنخواہ پر اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول پنڈی بھٹیاں مقرر کیا گیا۔

ای/۵۰/۹۴ ۱۰ اگست ۵۳ء
م۔ عبدالمجید بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (۱۲۰ - ۲۵۰) انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول گجرانوالہ کو تاریخ حاضری سے م۔ نثار احمد مرزا کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول اکال گڑھ مقرر کیا گیا۔

م۔ نثار احمد مرزا بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (۱۲۰ - ۲۵۰) انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول

اکال گڑھ کو تاریخ حاضری سے م۔عبدالمجید کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔انگریزی مدرس گورنمنٹ
ہائی اسکول کھرانوالہ مقرر کیا گیا۔

ای/۲۸۲۷ م۔انور سلطان (۶۰ — ۱۴۰) عارضی ڈرائنگ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول لیہ کو تاریخ حاضری
۱۷ راگست ۱۹۵۳ء سے م محمد حسین ڈرائنگ ماسٹر کی جگہ جو ۹ رجون ۱۹۵۳ء کو سبکدوش ہو چکے ہیں۔عارضی معلم
دست کاری گورنمنٹ ہائی اسکول ملتان مقرر کیا گیا۔

" م۔محمد ایوب انور میٹرک۔ڈی۔ایم۔ایک امیدوار کو تاریخ حاضری سے م۔انور سلطان کی
جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے (۶۰ — ۱۴۰) کے عام پیمانہ تنخواہ میں/۶۰ روپے ماہوار یہ عارضی
ڈرائنگ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول لیہ مقرر کیا گیا۔

ای/۲۸۱۸۶ م تجلیل الحسن ایم۔اے۔بی۔ٹی (۲۰۰ — ۳۵۵) صدر معلم گورنمنٹ ہائی اسکول کرونڈ یکا کو
۱۷راگست ۱۹۵۳ء یکم جنوری ۱۹۵۳ء سے ش۔لال دین سیٹھی کی جگہ جو ۲۰ رنومبر ۱۹۵۲ء کو وفات پا گئے تھے۔
پی۔ای۔ایس درجہ دوم (۲۵۰ — ۷۵۰) میں ترقی دی گئی (آزمائشی)

" م۔الطاف علی خاں بی۔ٹی۔ (۲۰۰ — ۳۵۵) صدر معلم گورنمنٹ ہائی اسکول چیالیہ کو ۱ رجون ۱۹۵۳ء
سے پی۔ای۔ایس درجہ دوم (۲۵۰ — ۷۵۰) میں ترقی دی گئی (آزمائشی)

" م۔محمد اسحاق ایم۔اے (۲۵۰ — ۳۵۵) صدر معلم گورنمنٹ ہائی اسکول ظفروال کو ۳ راپریل ۱۹۵۳ء
سے پی۔ای۔ایس درجہ دوم (۲۵۰ — ۷۵۰) میں ترقی دی گئی (آزمائشی)

" م۔عبدالحمید ایم۔اے۔او۔ایل (۲۵۰ — ۳۵۵) صدر معلم گورنمنٹ نارمل اسکول گمکڑ کو
یکم اکتوبر ۱۹۵۳ء سے پی۔ای۔ایس۔درجہ دوم (۲۵۰ — ۷۵۰) میں ترقی دی گئی (آزمائشی)

" س۔علی۔اکبر شاہ (۲۵۰ — ۳۵۵) صدر معلم گورنمنٹ ہائی اسکول شور کوٹ کو ۱۰ اکتوبر ۱۹۵۳ء
سے پی۔ای۔ایس درجہ دوم (۲۵۰ — ۷۵۰) میں ترقی دی گئی (آزمائشی)

" م۔نیاز احمد طور بی۔اے (۲۵۰ — ۳۵۵) ڈپٹی انسپکٹر مدارس لاہور کو ۲ رنومبر ۱۹۵۳ء
سے پی۔ای۔ایس۔درجہ دوم (۲۵۰ — ۷۵۰) میں ترقی دی گئی (آزمائشی)

ای/۲۸۱۸۶ م۔رشید اللہ خان۔ایم۔ایس سی۔بی۔ٹی (۲۵۰ – ۳۵۵) صدر معلم گورنمنٹ ہائی اسکول کالا گنج
۱۶ راگست ۵۲ء یکم دسمبر ۵۲ء سے پی۔ای۔ایس درجہ دوم (۲۵۰ – ۷۵۰) میں ترقی دی گئی (آزمائشی)

" م۔سلطان علی۔بی۔ایس سی۔بی۔ٹی (۲۵۰ – ۳۵۵) صدر معلم گورنمنٹ ہائی اسکول چوڑانوالہ کو جو ۲۴ رمئی ۵۲ء سے سبکدوش ہو چکے ہیں ۱۹ رجنوری ۵۲ء سے پی۔ای۔ایس درجہ دوم (۲۵۰ – ۷۵۰) میں قائم مقام طور پر ترقی دی گئی۔

" م۔محمد مختار صادق۔بی۔ایس سی۔بی۔ٹی (۲۵۰ – ۳۵۵) صدر معلم گورنمنٹ ہائی اسکول گجرانوالہ کو ۱۹ رمارچ ۵۳ء سے پی۔ای۔ایس درجہ دوم میں (۲۵۰ – ۷۵۰) میں ترقی دی گئی (آزمائشی)

" م۔بشیر شاہ (۲۵۰ – ۳۵۵) صدر معلم گورنمنٹ ہائی اسکول راجن پور کو ۱۵ راپریل ۵۳ء سے پی۔ای۔ایس درجہ دوم (۲۵۰ – ۷۵۰) میں ترقی دی گئی۔(آزمائشی)

" م۔نثار محمد بخاری ایم۔اے۔بی۔ٹی (۲۵۰ – ۳۵۵) ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس گجرات کو ۴ رمئی ۵۳ء سے پی۔ای۔ایس درجہ دوم (۲۵۰ – ۷۵۰) میں ترقی دی گئی (آزمائشی)

" م۔غلام نبی بٹ۔بی۔اے۔بی۔ٹی ڈپلوما تعلیم (لندن) (۲۵۰ – ۳۵۵) صدر معلم گورنمنٹ نارمل اسکول لالہ موسیٰ کو یکم مئی ۵۳ء سے پی۔ای۔ایس درجہ دوم (۲۵۰ – ۷۵۰) میں ترقی دی گئی (آزمائشی)

۱/۲۷۷۸۱ م۔عبدالحکیم خان (۶۰ – ۱۴۰) معلم السنہ شرقیہ گورنمنٹ ہائی اسکول چونیاں کو جو اس وقت گورنمنٹ ہائی اسکول شرق پور میں ہیں یکم مارچ ۵۳ء سے (۶۰ – ۱۴۰) کے عام پیمانہ تنخواہ میں مستقل کیا جاتا ہے۔
لست ۵۳ء

" م۔محمد احمد خان (۶۰ – ۱۴۰) معلم السنہ شرقیہ گورنمنٹ ہائی اسکول ظفروال کو ۱۷ رنومبر ۵۱ء سے (۶۰ – ۱۴۰) کے عام پیمانہ تنخواہ میں مستقل کیا جاتا ہے۔

۱/۱۰۴۴۴۲ م۔عبدالعزیز ایک امیدوار کو م جلال الدین کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے تعلیمات کیا گیا

خاتمہ پر حاضری کی تاریخ سے (۷۰ ـــ ۱۴۰) کے نام پیمانہ تنخواہ میں -/۷۰ روپے ماہوار پر
عارضی ڈرائنگ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول کھاریاں مقرر کیا گیا۔

۲۳۲۵۹ مسٹر محمد رفیع ایم ایس سی۔ بی۔ ٹی۔ ایم۔ ایڈ۔ پی۔ ای۔ ایس (دوم) سینیئر ہاؤس ماسٹر پنجاب [illegible] کیڈٹ کالج حسن ابدال کو یکم اپریل ۶۸ء سے ایک عارضی منظور شدہ اسامی پر پی ای ایس درجہ اول (۳۵۰ ـــ ۱۲۰۰) میں ترقی دی گئی (قائم مقام)

〃 ڈاکٹر غلام حسین خاں نیازی۔ ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ پی۔ ای۔ ایس (دوم) آفیسر آن سپیشل ڈیوٹی دفتر ڈائرکٹر تعلیم کو یکم اپریل ۶۸ء سے پی۔ ای۔ ایس درجہ اول (۳۵۰ ـــ ۱۲۰۰) میں ترقی دی گئی (قائم مقام)

۲۳۰۷۳ مسٹر جی۔ ایم سیال۔ ایف۔ اے۔ پی۔ ٹی (۱۳۰ ـــ ۲۵۰) اے۔ ڈی۔ آئی برائے تربیت جسمانی ملتان کو تاریخ حاضری سے م سعید اللہ خاں کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ اپنی تنخواہ پر اے۔ ڈی۔ آئی برائے تربیت جسمانی لائل پور مقرر کیا گیا۔

〃 م سعید اللہ خاں میٹرک پی۔ ٹی (والٹین) (۱۳۰ ـــ ۲۵۰) قائم مقام اے۔ ڈی۔ آئی برائے تربیت جسمانی لائل پور کو مسٹر جی ایم سیال کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر اے۔ ڈی۔ آئی برائے تربیت جسمانی ملتان مقرر کیا گیا۔

۲۲۷۸۳ م یعقوب کریم مولوی فاضل۔ اورنٹل (۷۰ ـــ ۱۴۰) معلم السنہ شرقیہ گورنمنٹ ہائی اسکول تلہ گنگ کو بلائی ۶۸ء تاریخ حاضری سے م بدیع الحسن کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے بمعلم السنہ شرقیہ گورنمنٹ نارمل اسکول جھاوریاں صدر مقرر کیا گیا۔

۲۲۷۸۱ م جلال الدین (۷۰ ـــ ۱۴۰) ڈرائنگ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول کھاریاں کو تاریخ حاضری سے جولائی ۶۸ء م عبدالحمید کی جگہ جو ۴ جولائی ۶۸ء کو سبکدوش ہو گئے۔ ڈرائنگ ماسٹر گورنمنٹ نارمل اسکول گجرات مقرر کیا گیا۔

۲۲۲۰۰ مسٹر بشیر حسین ضیائی ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی پلاننگ افسر دفتر ڈائرکٹر تعلیم کو پی۔ ای۔ ایس درجہ دوم جولائی ۶۸ء سے پی۔ ای۔ ایس درجہ اول (۳۵۰ ـــ ۱۲۰۰) میں ترقی دے کر ۲ اپریل ۶۸ء

قبل دوپہر سے افسر تربیات دفتر ڈائرکٹر تعلیم مقرر کیا گیا۔

ای/۲۲۲۹۹ م۔ عبدالواحد رضوانی سردی فاضل، منشی فاضل، ادیب فاضل، (۷۰ — ۱۴۰) اردو مدرس
۲۶ جولائی ۱۹۵۵ء گورنمنٹ نارمل اسکول کمالیہ کو تاریخ حاضری سے م۔ عبدالمجید کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول کمالیہ مقرر کیا گیا۔

" م۔ عبدالمجید ایس۔ وی (۷۰ — ۱۴۰) اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول کمالیہ کو تاریخ حاضری سے م۔ محمد اکبر ولید کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ اپنی تنخواہ پر اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول پاکپٹن مقرر کیا گیا۔

" م۔ محمد اکبر ولید۔ ایس وی (۷۰ — ۱۴۰) اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول پاکپٹن کو تاریخ حاضری سے عبدالواحد رضوانی کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ اردو مدرس گورنمنٹ نارمل اسکول کمالیہ مقرر کیا گیا۔

صیغۂ نساء ـــــــــ شعبۂ مدارس

ڈبلیو/۳۰۱۴۱۰ مس زینب خیق محمد بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (۱۲۰ — ۲۵۰) صدر معلمہ گورنمنٹ زنانہ مڈل اسکول
۲۶ اگست ۱۹۵۵ء سکھر کو ۱۵ مئی ۱۹۵۵ء سے ۹ جون ۱۹۵۵ء تک ایک نئی منظور شدہ اسامی پر اور اپنی تنخواہ پر صدر معلمہ گورنمنٹ زنانہ ہائی اسکول سکھر مقرر کیا گیا۔

ڈبلیو/۳۰۰۱۸ مس شائستہ بیگم عبدالرحمان بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (۱۲۰ — ۲۵۰)، اے۔ ڈی۔ آئی مدارس
۳۳ اگست ۱۹۵۵ء ملتان کو ۱۱ اگست ۱۹۵۵ء سے ۴ ستمبر ۱۹۵۵ء تک مسز کے اختر ڈسٹرکٹ انسپکٹرس ملتان کی جگہ جن کو رخصت مل چکی ہے (۲۵۰ — ۳۵۵) کے پیمانہ تنخواہ میں -/۲۵۰ روپے ماہوار پر قائم مقام ڈسٹرکٹ انسپکٹرس مدارس ملتان مقرر کیا گیا۔

ڈبلیو/۳۰۰۲۰ مسز مصباح سلطانہ عبدالمجید۔ جے۔ اے۔ وی نائب معلمہ گورنمنٹ زنانہ ہائی اسکول چوبرجی
۲۳ اگست ۱۹۵۵ء لاہور کو ۲۲ مارچ ۱۹۵۵ء سے ساۃ تمشاد فاطمہ کی جگہ جنہوں نے ۱۳ ۔ ۱۹۵۵ء کو استعفیٰ دیدیا تھا (۵۰ — ۱۵۰) کے گریڈ میں ترقی دی جاتی ہے (آزمائشی)

ڈبلیو/۷۰۰۳ مسماۃ رشیدہ بیگم۔ جے۔ اے۔ وی۔ نائب معلمہ گورنمنٹ زنانہ ہائی اسکول پنڈی گھیب کو
۲۴ اگست ۱۹۵۸ء ایک موجودہ اسامی پر ۲۲ اپریل ۱۹۵۸ء سے ۷۵ ۔ ۔ ۱۵۰ کے گریڈ میں ترقی دی گئی

ڈبلیو/۳۳۰۳ مس امت الحفیظ جے۔ اے۔ وی (۶۰ ۔ ۱۴۰) قائم مقام اردو معلمہ گورنمنٹ زنانہ
۳۳ اگست ۱۹۵۸ء ہائی اسکول منڈی بہاء الدین کو تاریخ حاضری سے بمع اپنی آسامی قائم مقام اردو معلمہ گورنمنٹ
زنانہ ہائی اسکول پنڈ دادن خاں مقرر کیا گیا۔

〃 مسز زبیدہ علوی جے۔ اے۔ وی ایک امیدوار کو تاریخ حاضری سے ایک موجودہ آسامی پر
۷۵ ۔ ۱۵۰ کے پیمانہ تنخواہ میں ۔/۷۵ روپے ماہوار پر نائب معلمہ گورنمنٹ زنانہ ہائی اسکول
منڈی بہاء الدین مقرر کیا گیا۔

ڈبلیو/۲۸۴۷ مسز ای آئی ناظر۔ بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (۲۵۰ ۔ ۳۵۵) نائب معلمہ گورنمنٹ زنانہ ہائی اور
۱۸ اگست ۱۹۵۸ء نارمل اسکول راولپنڈی کو ۲۶ اپریل ۱۹۵۸ء ۲۵ مئی ۱۹۵۸ء تک مسز ایس۔ ایم اقبال
کی جگہ جن کو رخصت مل چکی ہے۔ صدر معلمہ گورنمنٹ زنانہ ہائی اور نارمل اسکول راولپنڈی
مقرر کیا گیا۔

ڈبلیو/۲۸۰۴۷ مس فہمیدہ بیگم ایم اے۔ بی۔ ٹی۔ ایک امیدوار کو مس مقبول حسین کی جگہ جو صدر معلمہ مقرر ہو چکی
۱۳ اگست ۱۹۵۸ء ہیں (۱۳۰ ۔ ۲۵۰) کے پیمانہ تنخواہ میں ۔/۱۷۰ روپے ماہوار پر قائم مقام اے۔ ڈی۔ آئی
مدارس راولپنڈی مقرر کیا گیا۔

۱۹۵۸ء

ڈبلیو/۴۸۸ ۳ مس محمودہ اختر ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی ایک امیدوار کو ایک نئی منظور شدہ آسامی پر ۱۹ جولائی
۱۱ اگست ۱۹۵۸ء قبل دوپہر سے (۱۳۰ ۔ ۲۵۰) کے پیمانہ تنخواہ میں ۔/۱۷۰ روپے ماہوار پر قائم مقام
اے۔ ڈی۔ آئی مدارس سیالکوٹ مقرر کیا گیا۔

ڈبلیو/۴۶۸۵ مس ثریا شفیع۔ بی۔ اے۔ بی۔ ٹی ایک امیدوار کو ۲ جولائی ۱۹۵۸ء قبل دوپہر سے ایک نئی
۷ اگست ۱۹۵۸ء منظور شدہ آسامی پر (۱۳۰ ۔ ۲۵۰) کے پیمانہ تنخواہ میں ۔/۱۳۰ روپے ماہوار تنخواہ پر قائم مقام
نائب معلمہ گورنمنٹ زنانہ ہائی اور نارمل اسکول جہلم مقرر کیا گیا ہے۔

ے شمارہ ے] لاهور [اکتوبر

اس شمارہ میں

تعلیمی ماہنامہ

آموزش

لاہور

اکتوبر سنہ ۱۹۵۴ء

جلد ۷
شمارہ ۷

سالانہ چندہ

پاکستان کے لئے ۶ روپے
غیر ممالک کے لئے ۸ روپے

قیمت فی پرچہ دس آنے

پبلشر

یونیورسٹی بک ایجنسی لاہور

نصاب کی تشکیل نو

ایم۔ اے۔ مخدومی

پنجاب ایجوکیشنل جرنل کے اس ماہ کے شمارے میں ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں نصاب سازی کے متعلق لیکچروں اور تحقیقاتی کام کا پروگرام درج ہے۔ جسے سنٹرل ٹریننگ کالج کے اساتذہ اور واشنگٹن سٹیٹ کالج (امریکہ) کے اساتذہ جو دو سال کے لئے پاکستان میں آئے ہیں مل کر عملی جامہ پہنائیں گے۔ اس پروگرام کے نگران ڈاکٹر اوسی شوئیر ناگ ہوں گے۔ جو نصاب سازی کے ایک مشہور ماہر ہیں۔ یہ قدم جو تعلیم کی تعمیر نو کے لئے اٹھایا جا رہا ہے ہم اس کا خیر مقدم کرتے ہیں۔

پرائمری اور مڈل جماعتوں کے نصابوں کو از سر نو مرتب کر کے محکمہ تعلیم نے تعلیمی ترقی کی حقیقی خدمت انجام دی ہے۔ ۱۹۴۹ء میں ایک جامع کمیٹی جو تعلیمی دلچسپی رکھنے والے تمام گروہوں کی نمائندہ تھی اس غرض سے مقرر کی گئی تھی کہ پرائمری اور مڈل جماعتوں کے نصابوں کی دوبارہ تشکیل کرے۔ ان نصابوں کو تین برس تک آزمایا گیا۔ پُرتمنا منصوبہ بندی کے باعث ان میں جو خامیاں رہ گئی تھیں ان کا غور سے مطالعہ کیا گیا۔ ۱۹۵۲ء میں ایک اور کمیٹی کا تقرر عمل میں آیا۔ تاکہ وہ ان نصابوں کی چھان بین ان سالوں میں حاصل شدہ تجربہ کی روشنی میں کرے۔ ترمیم شدہ نصابوں نے تعلیمی مضامین کو پاکستانی قوم کے فلسفہ حیات اور اس کی تعلیم

معاشرتی آرزوؤں کے ساتھ ہم آہنگ کرنے میں واضح کامیابی حاصل کی۔ تاہم یہ احساس ہر وقت
بود رہا کہ یہ کامیابی کسی سائنسی بنیاد پر استوار ہونی چاہیئے اور کوئی ایسا ادارہ موجود ہونا چاہیئے
ہمارے نصابوں کی تدریجی ترقی کا لگاتار مطالعہ کرتا رہے۔

سنٹرل ٹریننگ کالج میں کام کا جو نیا پروگرام تیار ہوا ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ نصاب کی
یل نو سے متعلق نئے منصوبوں کے لئے بنیاد قائم کی جائے۔ ان پروگراموں میں عام لیکچروں
سلسلے بھی شامل ہوں گے اور مدرسے کی مختلف منزلوں کے نصابوں کی تشکیل نو پر بحث و مباحثہ
ا۔ یہ کام پاکستانی ضروریات کو نگاہ میں رکھ کر کیا جائے گا۔ صوبے میں مروجہ نصابوں پر تنقید
ں اس غرض سے ہو گی کہ ان کی اصلاح کے لئے ٹھوس تجاویز پیش کی جائیں۔

ہمیں امید ہے کہ یہ کام نصابوں کی تشکیل نو اور تعلیمی منصوبہ بندی میں ایک قیمتی حصہ لے گا۔
ہر قسم کی ترمیم کے بعد بھی ہمارے نصاب مکمل ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔ ایک ترقی پسند نصاب ہمیشہ
بیل پذیر رہتا ہے وہ ہمیشہ ارتقا کے راستہ پر گامزن رہتا ہے۔ یہ امر افسوسناک ہے کہ ہمارے یہاں
ئی مستقل ادارہ موجود نہیں جو ہر وقت نصابوں کی چھان بین کرتا رہے۔ اس غرض کے لئے جب کبھی
ئی کمیٹی مقرر کی جاتی ہے تو اس کے اکثر اراکین ایسے لوگ ہوتے ہیں جو دوسرے فرائض میں ہمہ وقت
مروف رہتے ہیں وہ اس کام کے لئے بڑی مشکل سے وقت نکال سکتے ہیں۔

نصاب سازی ایک پیہم عمل ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ملکی تنقید اور غیر ملکوں کی نصابی
نیات پر متواتر نگاہ رکھی جائے۔ اس کے ساتھ ہی کچھ نہ کچھ تحقیق و تجربہ بھی جاری رہنا چاہیئے۔ تا کہ یہ
لوم ہوتا رہے کہ موجودہ حالات نے کون کون سی تبدیلیاں ضروری کر دی ہیں۔

جو کام پروفیسر شوئیرنگ کی نگرانی میں ہونے والا ہے۔ اس کی غایت یہ ہو گی کہ کم و بیش ایک
صحت مند نظریاتی بنیاد قائم ہو جائے۔ لیکن نصاب کی تشکیل نو کے پروگرام کے لئے ہمیں ایک ہمہ وقتی
ادارے کی ضرورت ہے جو ایک سینئر افسر اور مضامین کے ماہرین پر مشتمل ہو۔ ایک ترقی پسند تعلیمی نظام
ں نصاب کی تشکیل نو کا ادارہ قائم کئے بغیر نصاب سازی کا نام لینا ایک بڑی انوکھی بات ہو گی۔

استنبول میں دو دن

فضل احمد

اگست ۱۹۵۲ء میں دس پاکستانی اساتذہ کی ایک جماعت نفل برائٹ وظیفہ پر چھ ماہ کے لئے امریکہ روانہ ہوئی۔ ان میں سے میں بھی ایک تھا۔ ہم ۱۲ اگست کو علی الصباح کراچی سے ہوائی جہاز میں روانہ ہوئے اور عصر کے وقت بیروت جا پہنچے۔ بیروت سے اگلا مقام استنبول تھا اور یہ صرف کوئی دو اڑھائی گھنٹے کا راستہ تھا۔ بیروت سے جہاز اڑا تو دن غروب ہونے میں کوئی پون گھنٹہ باقی ہوگا۔ جہاز بحیرۂ روم اور جزیرہ قبرص پر سے اڑتا ہوا جنوب مغربی ترکیہ پر سے پرواز کرنے لگا۔ اتنے میں مغرب کا وقت ہو چکا تھا اور نیچے وادیوں میں جگہ جگہ ٹمٹماتی روشنی نظر آنے لگی تھی۔ ہرچند کہ ترکوں کے وطن عزیز کو آنکھ بھر کر دیکھنے کے لئے دل بے قرار تھا۔ لیکن رات کی سیاہی نے اس قدر جلد اس کے چہرے کو ڈھانپ لیا کہ یہ حسرت جوں کی توں باقی رہی۔ رات کے کوئی نو ساڑھے نو بجے جہاز استنبول کے ہوائی اڈہ پر جا اترا۔ ہم سب ہوائی بندر کی عمارت کے سامنے ادھر ادھر ٹہلنے لگے۔ ہر ایک کی خواہش تھی کہ کسی ترک سے ملاقات ہو تو اس سے کچھ بات چیت کی جائے۔ اتنے میں دو ادھیڑ عمر ترک جنہوں نے چھوٹی چھوٹی ڈاڑھیاں بھی رکھی تھیں ہمارے قریب آکھڑے ہوئے۔ ہمارے ساتھیوں میں سے ایک نے ڈاڑھی رکھ رکھی تھی اور یہی چیز ان دو بزرگوں کو اس طرف کھینچ لائی تھی۔ انہوں نے اپنی زبان میں کچھ پوچھا۔ ہم کچھ نہ سمجھے۔ ہم نے اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے "پاکستانی" کا لفظ کہا۔ اس پر ان دونوں کے چہرے خوشی سے تمتما اٹھے۔ وہ محبت کے ساتھ ہم تمام سے بغلگیر ہوئے۔ چند منٹوں بعد ان میں سے ایک گیا اور ایک سولہ سترہ سالہ نوجوان کو بلا لایا جو انگریزی جانتا تھا۔ اس کی زبانی معلوم ہوا کہ یہ دونوں ترک حج کے لئے جا رہے ہیں، یہ نوجوان جس نے اسی سال میٹرک پاس کیا تھا ہوائی اڈہ پر محکمہ ڈاک میں ملازم تھا۔ ہمیں استنبول میں صرف گھنٹہ بھر کے لئے رکنا تھا۔ یہ وقت انہی لوگوں کے ساتھ باتیں کرنے میں کٹ گیا۔ رخصت ہونے سے پہلے میں نے نوجوان کا پتہ نوٹ کیا۔ عزم یہ تھا کہ اب جاتی مرتبہ تو یہاں رکنا ممکن نہیں لیکن واپسی پر استنبول میں

ضرور رکوں گا۔

حسنِ اتفاق سے امریکہ میں استادوں کے جس بین الاقوامی گروہ میں مجھے رکھا گیا اس میں دو ترک بھی تھے۔ ان سے میل ملاقات کے باعث ترکیہ کے دیکھنے کا شوق اور بڑھا۔ ایک اور اتفاق حسنہ یہ ہوا کہ میں نے نومبر ۱۹۵۲ء میں انجمن والدین و اساتذہ کے بین الاقوامی اجلاس منعقدہ ایسٹ لانسنگ (مشگن) میں پاکستان کی طرف سے شرکت کی۔ یہ اجلاس پانچ دن تک جاری رہا۔ اس میں ترکیہ کے تعلیمی اتاچی مسٹر امین حکیم گل بھی شریک تھے۔ ان کے ساتھ تعارف ہو گیا۔ ترکیہ کے متعلق میرا شوق اور سرگرمی دیکھ کر انہوں نے پیش کش کی کہ واپسی سے کچھ پہلے اگر مجھے اطلاع کر دو تو میں ترکیہ میں تمہارے تعلیمی دورے کے لئے سہولتیں حاصل کر دوں گا۔ اصل منصوبہ کے ماتحت مجھے مارچ ۱۹۵۳ء کے دوسرے ہفتہ میں واپس آ جانا تھا۔ میں نے مسٹر امین کو استنبول پہنچنے کی متوقع تاریخ سے آگاہ کر دیا۔ کچھ دنوں بعد ان کا جواب موصول ہوا کہ تم دو ہفتہ کے لئے حکومت ترکیہ کے مہمان ہو گے۔ گورنر استنبول کو اطلاع دے دی گئی ہے وہ تمہارے تعلیمی دورہ کے لئے پروگرام تیار رکھیں گے۔

امریکہ میں چھ مہینے کا قیام ختم ہونے پر میں نے مزید چھ ماہ کے لئے ٹھہرنے کا فیصلہ کر لیا۔ لہذا مارچ میں ترکیہ کے تعلیمی دورے کا پروگرام از خود ختم ہو گیا۔ اب مجھے گیارہ مارچ کی بجائے آٹھ اگست ۱۹۵۳ء کو روانہ ہونا تھا۔ روانگی سے چند ہفتے پہلے میں نے مسٹر امین حکیم گل کو دوبارہ لکھا۔ ان کا جواب آیا کہ ان دنوں ترکیہ کے مدرسے اور کالج سب کے سب تعطیلات گرما کے لئے بند ہیں۔ اس لئے افسوس ہے کہ تعلیمی دورے کا کوئی پروگرام نہیں بنایا جا سکتا۔ البتہ انہوں نے ڈائرکٹر تعلیم استنبول کے نام ایک چٹھی لکھ بھیجی کہ وہ تمہیں ہر طرح کی رہنمائی بہم پہنچا دیں گے۔

میں آٹھ اگست کی شام کو نیویارک سے ہوائی جہاز میں بیٹھا۔ ۱۹ اگست کو حج تھا جس میں شرکت کے لئے مجھے کم از کم ۱۵ یا ۱۶ تاریخ تک جدہ پہنچنا تھا۔ میرے پاس صرف ایک ہفتہ تھا جس میں مجھے پیرس، استنبول اور بیروت میں ٹھہرنا تھا۔ اس طرح میں استنبول کے لئے صرف دو دن نکال سکا۔ یہ مہلت بہت مختصر تھی اگر تھوڑی سی اور فرصت نکل سکتی تو میں ترکیہ کے اندرونی حصہ میں بھی جاتا۔ لیکن آپ

مجبوراً اِس دو دِن کی مہلت کو ہی غنیمت سمجھا۔ اور ترکیہ ثقافتی، تجارتی اور صنعتی مرکز استنبول ہی کو دیکھنے پر اکتفا کرنا پڑا۔

استنبول میں ہوائی جہاز استنبول میں رات کے ساڑھے بارہ بجے پہنچا۔ میں نے پان امریکن ہوائی کمپنی کے دفتر کو پہلے سے لکھ رکھا تھا کہ رات کے قیام کے لئے کسی ہوٹل میں بندوبست کر رکھیں۔ یہاں آ کر معلوم ہوا کہ وہ ایسا نہیں کر سکے۔ ہوٹلوں میں سیاحوں کی بھرمار تھی اس لئے انتظام نہ ہو سکا تھا۔ میری طرح ایک امریکن کنبہ نے بھی اسی طرح کی درخواست کر رکھی تھی۔ ان کے لئے شہر کے اندرونی حصہ میں ایک نئے تعمیر شدہ ہوٹل میں رہائش کا بندوبست کیا گیا تھا۔ اتفاق سے ایک اور امریکی صاحب جن کے لئے اسی ہوٹل میں کمرہ روکا گیا تھا نہیں آئے تھے۔ لہٰذا مجھے اس امریکن کنبہ کے ساتھ اسی ہوٹل میں بھیج دیا گیا۔

ہوائی اڈہ سے ہماری جائے قیام کا فاصلہ پانچ چھ میل سے کم نہ تھا۔ آدھی رات کا سماں تھا اور چاروں طرف سناٹا چھا رہا تھا۔ میں کار کی کھڑکی میں سے لگاتار جھانکتا رہا کہ اس مقام کے طبعی خدوخال کا کچھ اندازہ ہو سکے جس کی ہر کنکری کے پیچھے تاریخ کی ایک داستان ہے۔ رات اندھیری تھی اور سڑکوں پر روشنی کے کھمبے اتنے دور فاصلہ پر تھے کہ کچھ اچھی طرح نظر نہ آ سکا۔ آخر ہم ہوٹل میں پہنچے۔ رات کا ڈیڑھ بجنے کو تھا۔ آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ میں اپنے کمرے میں گیا اور بہت جلد سو گیا۔

صبح ابھی سورج نکلنے میں آدھ پون گھنٹہ تھا کہ میں اُٹھ بیٹھا اور جلدی جلدی ضروریات سے فارغ ہو کر ناشتہ کیا اور باہر گھومنے کو نکل گیا۔ میں چاہتا تھا کہ اوّلین فرصت میں ڈائرکٹر تعلیم سے ملوں تاکہ مناسب وہ تمام دن میں استنبول کو زیادہ سے زیادہ دیکھ سکوں۔ ہوٹل سے باہر نکل میں سڑک پر ایک طرف کو چل دیا۔ دراصل یہ استنبول کا ایک بازار تھا جس کے دونوں طرف بالکل اسی طرح دوکانیں تھیں جس طرح اندرون شہر لاہور کے کسی بازار میں ہوں۔ دوکانوں کے اوپر رہائشی مکان تھے۔ البتہ جو چیز اس بازار کو لاہور کے بازاروں سے ممتاز کرتی تھی وہ اس کی گہری ڈھلوان تھی۔ میں مسلسل اس ڈھلان کے

اوپر چڑھ رہا تھا۔ اتنے میں بازار پیٹ کر دو سمتوں میں بٹ گیا۔ مجھے "جانولو"، میں جانا تھا۔ جہاں ڈائرکٹر تعلیم کا دفتر تھا لیکن مشکل یہ تھی کہ اس جگہ کا پتہ کس سے پوچھوں کچھ دیر چوراہے میں کھڑا سوچتا رہا آخر ایک نائی کی دوکان پر نگاہ پڑی جہاں لوگ حجامت بنوانے کے لئے جمع تھے۔ یہ سوچ کر کہ شاید ان میں سے کوئی انگریزی سمجھتا ہو اُدھر بڑھا اور ان سے جائے مطلوبہ کا پتہ پوچھا۔ کوئی جواب نہ ملا۔ ایک نے پوچھا کیا فرانسیسی سمجھتے ہو۔ میں نے کہا نہیں۔ صرف انگریزی جانتا ہوں۔ اس نے اشارہ سے کہا ٹھہرو میں کسی کو بلالاتا ہوں۔ کوئی پندرہ بیس منٹ کے توقف کے بعد ایک خوش پوش نوجوان آیا۔ میں نے اسے کاغذ پر لکھا ہوا پتہ بتایا۔ معلوم ہوا کہ دفتر تعلیم بالکل قریب اگلے موڑ پر واقع ہے۔

چند منٹ میں میں دفتر تعلیم کے سامنے جا پہنچا۔ دیکھا کہ دفتر ابھی بند ہے اور ڈائرکٹر صاحب کوئی ڈیڑھ گھنٹہ تک آئیں گے۔ اس وقت تک میں ادھر ادھر گھومنے کو چل دیا۔ ذرا آگے بڑھا تو دیکھا کہ دفتر تعلیم ایک بڑے وسیع احاطہ کا ایک گوشہ ہے۔ اس احاطہ کی بڑی عمارت گورنر استنبول کا دفتر ہے کسی زمانہ میں اس احاطہ کی عمارتیں باب عالی کے نام سے موسوم تھیں اور یہاں خلیفہ کے دفاتر ہوا کرتے تھے۔ دفتر تعلیم اور گورنر کے دفتر کے درمیان ایک نہایت خوبصورت چھوٹی سی مسجد تھی جس پر سلطان عبدالمجید کا نام کندہ تھا۔ اس کے دروازہ پر اس وقت قفل پڑا تھا۔

مسجد سُلطان احمد یہاں سے کچھ آگے بڑھا تو ایک بہت بڑی مسجد کے فلک بوس مینار دکھائی دیئے معلوم ہوا یہ سلطان احمد کی شہرۂ آفاق مسجد ہے۔ یہ مسجد سترھویں صدی عیسوی میں تعمیر ہوئی اور سات سال میں بن کر تیار ہوئی تھی۔ باہر سے دیکھو تو اس کا کوہ پیکر گنبد اور چھ نازک مینار مل کر ایک پُرہیبت حسن کا تاثر پیدا کرتے ہیں۔ گنبد کا قطر ۱۱ فٹ ہے گویا یہ ایا صوفیہ کے قطر سے بقدر ۹ فٹ زیادہ ہے۔ بڑے مرکزی گنبد کے چاروں طرف چھوٹے چھوٹے گنبد ہیں مسجد کا صحن مستطیل شکل کا ہے جس کی اطراف ۲۲۹ × ۲۱۱ فٹ ہیں۔ صحن میں سنگ مرمر کا فرش ہے اور اس کے عین وسط میں وضو کرنے کے لئے حوض اور فوارہ بنا ہے۔ حوض کے اوپر چھ نازک ستونوں پر ایک مرمریں چھتری کھڑی ہے۔

مسجد کا اندرونی حصّہ ایک وسیع ہال ہے جسے چار عفریت پیکر ستون سہارا دیئے ہوئے ہیں ان میں سے ہر ایک کا قطر کوئی دو گز کے لگ بھگ ہے۔ مسجد کی چھت میں کل ۲۶۰ دریچے ہیں۔ جن میں سے روشنی گذر کر دیواروں کی نیلگوں ٹائلوں پر بکھر کر ایک خوشگوار جگمگاہٹ پیدا کرتی ہے۔ اسی نیلگوں روشنی کے طفیل یہ مسجد عوام میں نیلی مسجد کے نام سے مشہور ہے۔ مسجد کے اندرونی نقش و نگار مسلمان صنّاعوں کی باریک کاری گری کا نہایت اعلیٰ نمونہ ہیں۔ مسجد اور اس کے نواح تنہائی اور بے کسی کا تصوّر پیدا کرتے تھے۔ ایک ادھیڑ عمر پیرزرگ اس کی نگہداشت کے لئے مقرر تھے۔ ان کے علاوہ مسجد میں ایک اور شخص بھی نظر پڑا۔ یہ ایک نوجوان تھا جو تلاوت قرآن میں مصروف تھا۔

یُں خیالات میں ڈوبا ہوا مسجد سے نکلا۔ اس کی پشت پر سمندر کی چمکیلی لہریں مصروف رقص تھیں۔ سامنے سڑک تھی اور دونوں پہلوؤں پر پرانی عمارتوں کے کھنڈر دور تک پھیلتے چلے گئے تھے۔ دائیں پہلو میں مسجد کی دیواروں کے بالکل زیر سایہ منڈی لگ رہی تھی۔ ترک کسان سبزیاں پھل اور اناج گدھوں پر لادے لا رہے تھے اور اس جگہ زمین پر ڈھیر لگاتے جاتے تھے۔ پیاز سبز مرچیں۔ بھنڈی۔ موٹے چاول۔ تربوز۔ مکئی وغیرہ پہلو بہ پہلو زمین پر پڑے تھے۔ گدھے ہانکنے والے کسانوں نے پتلونیں کس رکھی تھیں لیکن اکثر کا لباس میلا اور چیتھڑے چیتھڑے ہو رہا تھا۔ منڈی سے چند گز آگے پھوس کی چند جھونپڑیاں تھیں جن کے سامنے سڑے ہوئے سیاہ کیچڑ سے بھرپور ایک کچی غلیظ نالی تھی۔ ترکی کی مغربیت کے متعلق بہت کچھ سن رکھا تھا۔ اب مغرب میں پورا ایک سال گذارنے کے بعد یورپی ترکی کو دیکھا تو ایشیائی افلاس کے بدنما داغ اس کے چہرے پر بھی بالکل اسی طرح نظر آئے جس طرح کسی دوسرے ایشیائی شہر میں۔

ڈائرکٹر تعلیم سلطان احمد کی مسجد اور اس کے نواح میں گھوم کر میں دفتر تعلیم کو لوٹا۔ دیکھا کہ ڈائرکٹر صاحب تشریف فرما ہیں۔ ترک عربی الفاظ کو ادا کرتے وقت دال کو ت سے بدل دیتے ہیں۔ مثلاً احمد کو احمت کہیں گے، محمد کو ممت وغیرہ۔ یہ تصرف صرف تلفظ تک

4

محدود نہیں بلکہ املا میں بھی روا رکھا جاتا ہے۔ اس اصول کے ماتحت ڈائرکٹر صاحب کا نام محی الدین سے بگڑ کر محینتین بن گیا تھا۔ مسٹر محیتیں دوہرے جسم اور میانہ قد کے نہایت خلیق انسان ہیں۔ ان کی زبانی معلوم ہوا کہ سنہ ۱۹۵۰ء میں ترک اساتذہ اور طلبہ کا جو وفد پاکستان آیا تھا وہ اس میں شریک تھے۔ انہوں نے بتایا کہ تعلیم جسمانی کے ایک پاکستانی ماہر مسٹر بھٹی ترکیہ میں تعلیمی دورہ پر آئے ہوئے تھے اور گذشتہ روز ہی واپس گئے ہیں۔ مسٹر محیتین نے استنبول یونی ورسٹی کے ایک نوجوان طالب علم کو رہنمائی کے لئے میرے ساتھ کر دیا اور ہم دونوں ٹرام میں بیٹھ کر گھومنے کو چل دیئے۔ اس نوجوان کا نام چیتن تھا وہ یونی ورسٹی میں معاشیات کا طالب علم تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس کا دادا پاکستانی تھا۔ وہ چھوٹی عمر میں ترکی میں آیا۔ یہاں شادی کر لی اور اسی ملک میں آباد ہو گیا۔

استنبول یونی ورسٹی

سب سے پہلے ہم استنبول یونی ورسٹی میں گئے جو بایزید چوراہے کے بالکل سامنے واقع ہے۔ داخل ہونے کے لئے ایک عالی شان بلند محراب دار دروازہ ہے جس کی دونوں بغلوں میں دو چھوٹے دروازے ہیں۔ بڑی محراب پر سنہری عربی حروف میں لکھا ہے "دار الفنون عسکریہ" اس کے ساتھ ہی جلی سنہری حروف میں قرآن الحکیم کی یہ دو آیتیں لکھی ہیں "نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيبٌ ـــ يَنْصُرَكَ اللّٰهُ نَصْرًا عَزِيزًا"۔ میں ان عبارتوں کو پڑھنے کے لئے رک گیا۔ مسٹر چیتن نے حیرانی سے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "کیا آپ یہ مشکل رسم الخط پڑھ لیتے ہیں"۔ میں نے کہا "کیوں نہیں یہ قرآن کا رسم الخط ہے اور ہر مسلمان کو اسے پڑھنا سیکھنا چاہیئے۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ اس رسم الخط سے بے خبری کے باعث ترکی کی موجودہ پود اپنے بیش قیمت ثقافتی ورثہ سے بے خبر ہو کر رہ گئی ہے"۔ مسٹر چیتن نے جواب دیا "آپ ٹھیک کہتے ہیں لیکن حالات نے ہمیں مجبور کر دیا تھا کہ تھوڑے عرصہ کے لئے اس ثقافتی ورثہ سے بے خبری اختیار کر لیں۔ اب ہم اس سے دوبارہ آگاہی حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگے ہیں۔ مدرسوں میں عربی رسم الخط کے سکھانے کی اجازت ہو چکی ہے"۔

دروازے سے آگے ایک وسیع باغ ہے جس میں ایک عمارت کھڑی ہے۔ یہ عمارت عثمانی دور میں

وزارت جنگ کا دفتر تھی۔ استنبول یونی ورسٹی جس وسیع رقبہ کو گھیرے ہوئے ہے وہ شہر کی تیسری پہاڑی پر واقع ہے۔ سلطان محمد فاتح نے یہاں اپنے لئے ایک چوبی محل بنوایا تھا۔ بعدازاں جب سلطان کا دوسرا محل بن گیا تو یہ عمارت دوسرے کاموں میں آنے لگی۔ زمانے کے ساتھ اس عمارت نے کئی شکلیں بدلیں۔ آخر ۱۸۶۰ء میں موجودہ عمارت تعمیر ہوئی۔ ۱۹۲۴ء میں جمہوری حکومت نے یہ عمارت یونی ورسٹی کے حوالے کر دی۔

استنبول یونی ورسٹی کا آغاز دراصل سلطان محمد فاتح کے عہد میں ہو گیا تھا۔ اس کے زمانے میں سولہ بڑے بڑے مدرسے قائم ہو گئے تھے جو مختلف مسجدوں کے ساتھ ملحق تھے ان میں طلبہ کی تعداد سینکڑوں کو پہنچتی تھی جن کو تعلیم دینے کے لئے اساتذہ۔ اتالیق اور پروفیسر مقرر تھے۔ اس تعلیمی نظام کی زیر نگرانی ایک ہسپتال بھی چلتا تھا جس کے معالج طب کے اساتذہ تھے، جب عثمانی سلطنت کا شیرازہ بکھرنے لگا تو یہ تعلیمی نظام بھی پژمردہ ہو کر ناکارہ بن گیا۔ تعمیر نو کی کوششوں میں نظام تعلیم کی تجدید بھی شامل تھی چنانچہ ۱۸۷۰ء میں استنبول یونی ورسٹی کو مغربی طرز پر منظم کیا گیا۔ اس کے بعد اس میں کئی تبدیلیاں آئیں یا آنکہ ۱۹۳۳ء میں اسے باقاعدہ طور پر ایک جدید یونی ورسٹی کے سانچہ میں ڈھالا گیا۔ آج استنبول یونی ورسٹی ترکیہ میں جدید علوم و فنون کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ اس کی عمارت میں حال ہی میں کافی توسیع ہوئی ہے۔ پھر بھی موجودہ عمارت بڑھتی ہوئی ضرورتوں کے لئے کافی نہیں۔ یونی ورسٹی احاطے کے جنوبی سرے پر ایک نیا بلاک زیر تعمیر تھا۔

یونی ورسٹی پارک میں ایک بلند مینار سر اٹھائے کھڑا ہے۔ اسے سلطان محمد ثانی نے ۱۸۲۸ء میں تعمیر کرایا تھا۔ اس کی بلندی ۲۸۰ فٹ ہے۔ اس کے اوپر سے شہر کا ہر حصہ دکھائی دیتا ہے۔ کہتے ہیں یہ اس لئے تعمیر کرایا گیا تھا کہ محافظ یہاں بیٹھ کر شہر کے مختلف حصوں میں لگنے والی آگ سے آگاہ ہو سکیں۔

مسجد سلیمانیہ استنبول یونی ورسٹی سے ہم مسجد سلیمانیہ میں گئے جو اسی پہاڑی پر یونی ورسٹی سے تھوڑی دور واقع ہے۔ ترکی اسلامی فن تعمیر کا یہ شاہکار اس زمانے کی پیداوار ہے جب عثمانی سلطنت دولت اور طاقت کے لحاظ سے اپنے انتہائی عروج پر تھی۔ سلطان سلیمان

کی بنائی ہوئی یہ مسجد اپنے دور کی عظمت اور فراوانی کی پوری آئینہ دار ہے۔ اس کے اندر قدم رکھتے ہی دیکھنے والے کو وسعت اور عظمت کا بے پناہ احساس ہونے لگتا ہے۔ اس کا مرکزی گنبد ۱۷۴ فٹ بلند ہے اور اس کا قطر ۸۵ فٹ ہے۔ روشنی کے لئے چھت میں ۱۳۸ دریچے ہیں۔ عمارت نے ۲۰۸ × ۲۱۸ فٹ جگہ گھیر رکھی ہے۔ مسجد کے سامنے حسب معمول بہت فراخ صحن ہے جس کے وسط میں وضو کرنے کے لئے حوض بنا ہوا ہے۔ سارا فرش سنگ مرمر کا ہے۔

مسجد کے پاس ہی سلیمان اعظم کا عالی شان مقبرہ ہے، جہاں وہ اور اس کی بیوی مدفون ہیں۔ اس سے ذرا آگے اسی بادشاہ کا تعمیر کردہ طبیہ مدرسہ ہے۔ جسے حال ہی میں اصلاح و مرمت کے بعد ایک عوامی مرکز صحت میں بدل دیا گیا ہے۔

مسجد بایزید اب ہم مسجد بایزید میں پہنچے جو اسی نام کے چوراہے میں واقع ہے۔ یہ مسجد جو ۱۵۰۶ء میں تعمیر ہوئی تھی استنبول کی قدیم ترین مساجد میں سے ہے۔ یہ وہ عالی شان عمارت ہے جس کی تعمیر میں بازنطینی طرز تعمیر کی جگہ ترکی اسلامی طرز تعمیر استعمال کیا گیا۔ اس کا مرکزی گنبد چار مضبوط ستونوں پر کھڑا ہے جنہوں نے چار محرابیں بنا رکھی ہیں۔ اندرونی نقش و نگار نہایت عمدہ ہیں۔

یہ پہلی مسجد تھی جس میں میں نے ایک لڑکے کو قرآن مجید حفظ کرتے دیکھا۔ کچھ آدمی ایک طرف بیٹھے تلاوت میں مصروف تھے۔ ایک گوشے میں چند معمر عورتیں ہاتھوں میں تسبیح پکڑے بیٹھی تھیں اور ذکر و اذکار میں لگی ہوئی تھیں۔ معلوم ہوا کہ یہ مسجد ایک مقبول زیارت گاہ ہے۔ صحن سے آگے کچھ لوگ عطر اور مذہبی کتابیں فروخت کرنے کو بیٹھے تھے۔ جوں ہی ہم مسجد سے باہر نکلے چند نوجوانوں کی ایک جماعت بھی مسجد سے باہر آئی۔ ان میں سے ایک نے بڑھ کر مجھ سے ترکی میں کچھ پوچھا۔ مسٹر چلیتن نے اسے بتایا کہ یہ پاکستانی ہے۔ انگریزی میں کچھ کہو تو جواب دے سکے گا۔ اس پر اس نے بڑی گرم جوشی سے معانقہ کیا۔ میں نے پوچھا کیا آپ فارسی جانتے ہیں۔ جواب ملا فارسی تو نہیں عربی میں بات کر سکتا ہوں چنانچہ ہم چند منٹ تک باتیں کرتے رہے۔ اس نوجوان ترک کا دل اسلامی جذبات سے بھرپور تھا

مسجد کے ساتھ ملحق ایک باغ ہے جس میں بانی مسجد سلطان بایزید کا مقبرہ ہے۔

بحیرۂ مارمورا

اتنے میں دوپہر کے کھانے کا وقت ہوگیا۔ مسٹر چیتن دو گھنٹہ کے لئے مجھ سے علیحدہ ہو گئے۔ میں کھانے سے فارغ ہو کر بازار میں ٹہلنے لگا۔ ایک فراخ گلی میں سے جو بازار سے دفعتہً نیچے اترتی تھی سمندر کی لہریں نظر پڑیں۔ یہ بحیرۂ مارمورا تھا۔ میں اس گلی میں ہو لیا گلیوں اور مکانوں کی حالت بالکل وہی تھی جو ایک ایشیائی شہر میں ہوا کرتی ہے۔ یہ گلی ایچ پیچ کھاتی ہوئی نیچے ہی نیچے اترتی گئی۔ یہاں تک کہ ریل کی پٹڑی آگئی۔ پٹڑی سے تھوڑی دور آگے سمندر کا ساحل تھا اگست کے مہینے کا آغاز تھا اور مطلع بالکل صاف پھر بھی گرمی کا مطلق احساس نہ ہوتا تھا۔ سمندر سے ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ ساحل پر کچھ لڑکے نہا رہے تھے۔ ناچتی ہوئی موجوں کے پار دور فاصلے میں سرسبز پہاڑیاں سر اٹھائے کھڑی تھیں۔ یہ مارمورا کا دوسرا کنارا تھا۔ میں ساحل کے ساتھ ساتھ کوئی ڈیڑھ دو میل تک چلتا گیا۔ دوپہر کے وقت بھی یہ منظر ایسا بھلا تھا کہ پیچھے قدم ہٹانے کو جی نہ چاہتا تھا آخر ساحل کے کنارے ایک ریلوے اسٹیشن آگیا۔ میں پل پر سے گذر کر پلیٹ فارم پر پہنچا۔ اتنے میں ایک گاڑی یہاں آکر رکی مسافروں کی چہل پہل ختم ہوئی تو میں بازار کے راستہ دفتر تعلیم میں پہنچا جہاں مسٹر چیتن میرے منتظر بیٹھے تھے۔

ایا صوفیہ

اب ہم ایا صوفیہ کی مشہور عالم تاریخی عمارت میں پہنچے۔ جس جگہ آج ایا صوفیہ ہے عیسائی عہد سے پہلے یہاں تین مندر ہوا کرتے تھے۔ قسطنطین اعظم کے زمانہ میں یہاں دو گرجے بنے جو بعد میں ملا کر ایک گرجا بنا دیا گیا۔ زمانے کے انقلاب نے اس گرجا کو تین دفعہ تعمیر کرایا۔ آخر اس کی چوتھی تعمیر شہنشاہ جسٹینین نے کرائی جو آج تک باقی ہے۔ شہنشاہ نے اس عمارت کی پائداری اور خوبصورتی بڑھانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ صوبائی حکمرانوں کے نام فرمان پہنچے کہ بہترین عمارتی سامان جس جگہ سے ہاتھ لگے اکٹھا کر کے بھیجو۔ چنانچہ قدیم یونانی اور رومی عمارتوں کے ستون اس کی تعمیر میں صرف ہوئے۔ یہ عمارت ۵۳۲ء میں شروع ہو کر پانچ برس میں پوری ہوئی۔ اس کا کل رقبہ ۲ ۷ ۸ مربع گز گھیرے ہوئے ہے اور اس کا مرکزی گنبد فرش سے ۱۰۸ فٹ اونچا ہے۔

یہ عمارت ۱۰۸ ستونوں پر کھڑی ہے جس میں سے ۴۰ نچلی منزل پر ہیں اور ۶۸ اوپر کی منزل پر جو عورتوں کے لئے مخصوص تھی۔

۱۴۵۳ء میں جب قسطنطنیہ پر ترکوں کا قبضہ ہوا تو ایا صوفیہ کو مسجد میں بدل دیا گیا۔ بعد میں اس کے چاروں کونوں پر چار مینار تعمیر ہوئے۔ عمارت کو زلزلوں سے بچانے کے لئے اس کی بیرونی دیواروں کے ساتھ مضبوط پشتے تیار ہوئے۔ ترک سلطانوں نے عمارت میں اور اضافے بھی کئے صحن میں خوبصورت حوض بنوایا۔ اس کے ساتھ ہی ایک یتیم خانہ اور کچھ اور عمارتیں بنوائیں۔ ایا صوفیہ سے ملحق عمارتوں میں بہت سے عثمانی فرماں رواؤں کے مدفن ہیں۔

ایا صوفیہ نے ایک مندر سے گرجا کی شکل اختیار کی پھر یہ مسجد بنی ۱۹۳۵ء میں جمہوریہ ترکیہ نے اسے تاریخ تہذیب کی خدمت میں ایک عجائب خانہ کے طور پر پیش کیا۔ اس وقت سے ایا صوفیہ ایک عجائب گھر ہے جس کی بوقلموں تاریخ کو دیکھنے کے لئے سیاحوں کا تانتا بندھا رہتا ہے اس کی دیواروں پر حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تصویریں اب تک موجود ہیں۔ مرکزی گنبد کے وسط میں آیات قرآنی لکھی گئی ہیں۔ اور اسی طرح محراب پر مرکزی ہال کی دیواروں پر صرف لکڑی کے بڑے بڑے گول تختوں پر اسمائے الٰہی اور دوسرے کلمات درج ہیں۔ محراب کے ٹھیک اوپر حضرت مریمؑ بچہ گود میں لئے کھڑی ہیں۔ اس کی توجیہہ خواہ کچھ بھی ہو لیکن اسلامی رواداری کی یہ ایک عجیب مثال ہے۔ استنبول کی بعض دوسری مسجدوں میں بھی جو پہلے گرجے تھے یہی بات نظر آتی ہے۔ سلطان عبدالمجیدؒ (۱۸۳۹ء ۔ ۱۸۶۱ء) ایا صوفیہ کی ان تصویروں پر پلستر کروا دیا تھا لیکن جمہوری دور میں یہ پلستر اتروا دیا گیا۔

ایا صوفیہ سے واپسی پر راستہ میں ایک زیر زمین حوض دیکھا جس کی شکل ایک باؤلی کی تھی۔ اس میں پانی بارہ میل کے فاصلے سے بلغراد کے جنگل سے آتا ہے۔ کہتے ہیں یہ حوض شہنشاہ جسٹی نی ان نے بنوایا تھا

بلدیہ اسکول | عصر کے وقت ہم واپس دفتر تعلیم میں آئے۔ چند استانیاں مشر مخفیین کے زیر میں

ی ان سے باتیں کر رہی تھیں۔ مسٹر محیتین نے کہا میں نے انتظام کیا ہے کہ آج رات آپ ملدیز ہ
بورڈنگ ہاؤس میں ٹھہریں۔ مدرسہ بند ہے لیکن صدر معلم اور چند اور لوگ وہاں ہوں گے۔ میرا
یور آپ کو وہاں چھوڑ آئے گا۔

سورج ڈوبنے میں ابھی کچھ وقت باقی تھا۔ شام کے کھانے سے فارغ ہو کر ہم شاخ زریں
ساحل کے ساتھ ساتھ کار میں سوار ہو کر ملدیز اسکول کو چلے۔ شاخ زریں کا رومانی حسن پوری
فی کے ساتھ نکھرا ہوا تھا۔ یہ سڑک حد درجہ دل فریب مناظر کو پیچھے چھوڑتی اور سلطان حمید الدین
ل کے سامنے سے گذرتی ہوئی آخر ہمیں نہایت پر سکون ماحول میں مدرسہ کے دروازہ پر لے گئی
صدر معلم کے ساتھ اندر چلا گیا۔ وہ انگریزی نہیں جانتے تھے تاہم بڑے تپاک سے پیش نے
ہوہ پیش کیا اور اشاروں سے کچھ باتیں سمجھاتے رہے۔ اتنے میں سلطان عبدالحمید کی مسجد سے
لکل سامنے تھی اذان کی آواز آئی اور میں نماز مغرب کے لئے چلا گیا۔ یہ ایک چھوٹی سی نئی
م کی خوبصورت مسجد ہے۔ امام صاحب نے نہایت اچھے عربی لہجہ میں نماز پڑھائی۔ کوئی
چار درجن آدمی شریک نماز تھے۔ ان میں سے اکثر نوجوان فوجی سپاہی تھے جو کہیں قریب
یمپ لگائے ہوئے تھے۔ نماز پڑھ کر باہر نکلا تو بلند و بالا سرو کے درختوں کے پیچھے سے ذوالحج کا
نظر آیا۔ اب میں باسفورس کے ساحل کی طرف چل دیا اور کوئی دو گھنٹے تک اس کے یورپی
ے کی سیر کر کے واپس لوٹا۔

یلدیز اسکول میں واپسی پر جزیرہ قبرص کے ایک نوجوان ترک استاد اور استانی
لاقات ہوئی۔ یہ لوگ اپنے مدرسہ کے ترک بچوں کے ساتھ ترکی کی سیاحت کے لئے آئے ہوئے
۔ یہ بچے بھی اسی اسکول میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ ان دنوں ان کے ہاں تعطیلات تھیں
کی کے مدرسے بھی بند تھے۔ یہ لوگ انگریزی کے مدرس تھے۔ چونکہ قبرص انگریزوں کے ماتحت
س لئے انگریزی زبان کی تعلیم لازمی ہے۔ ہم دیر تک باتیں کرتے رہے۔ انہوں نے بتایا
رص میں اکثریت یونانیوں کی ہے۔ ترک کل آبادی کا کوئی ایک تہائی ہیں۔

رات کو کافی خنکی ہوگئی۔ میں دروازہ بند کرکے ایک موٹا کمبل اوڑھ کر سو گیا۔ صبح سورج نکلنے سے پہلے ضروریات سے فارغ ہو کر میں پہاڑی کی چوٹی کی طرف سیر کو نکل گیا۔ سڑک کے دونوں طرف قریب لوگوں کی جھونپڑیاں تھیں جو ہمارے ہاں کے کچے مکانوں سے زیادہ مختلف نہ تھیں۔ نہ ہر صحن میں انجیر کے گہرے سبز پتے سائبان بنائے نظر آتے تھے۔ یوں ہی بڑھتا ہوا میں بحریہ کالج کے دروازہ تک جا پہنچا۔ واپسی پر سپاہیوں کی ایک ٹولی سے مڈبھیڑ ہوئی۔ یہ لوگ پہاڑی چوٹی پر کیمپ لگائے ہوئے تھے۔ ان میں سے کوئی بھی انگریزی نہیں جانتا تھا۔ البتہ ایک نے کہا "میں عربی جانتا ہوں"۔ اس کے ساتھ تھوڑی سی بات چیت کرنے کے بعد میں آگے چل دیا۔ اور مدرسہ کے قریب اس مسجد کے سامنے رکا جہاں رات نماز ادا کی تھی۔ مسجد کے باغ میں ایک مینار پر ایک گھڑی نصب تھی جس کے نیچے سلطان عبدالمجید خان کی شان میں فارسی قصیدہ کندہ تھا۔ مسجد کے اندر ایک کتبہ میں مسجد کی تاریخ تعمیر یوں درج تھی۔ قال اللہ تعالٰی فی کتابہ المجید ــ <u>انہ حمید مجید</u>۔ نشان کردہ الفاظ کے اعداد سے سن ۱۳۰۵ ہجری نکالا گیا تھا۔

کوئی آٹھ بجے کے قریب مسٹر چیتین آگئے اور کچھ دیر مجھے مدرسہ کی عمارت دکھاتے رہے۔ یہ مدرسہ خاص طور پر معذور بچوں کے لیے مخصوص ہے اور اپنے ساز و سامان اور سہولتوں کے اعتبار سے اعلیٰ معیاروں کا مقابلہ کرتا ہے۔ تھوڑی دیر میں ہم دفتر تعلیم میں آپہنچے اور یہاں سے مسٹر چیتین مجھے بعض تعلیمی ادارے دکھانے لے چلے۔

اتاترک کمال ابتدائی مدرسہ

سب سے پہلے ہم مشہور اتاترک کمال ابتدائی مدرسہ میں گئے۔ یہ مدرسہ عمارت اور ساز و سامان کے لحاظ سے جدید ترین امریکی مدرسوں کا ہم پلہ لگتا تھا۔ یہ بیس سال کی کوشش کے بعد مکمل ہوا ہے۔ یہ نہ صرف اعلیٰ درجہ کا ابتدائی مدرسہ ہے بلکہ تعلیم بالغاں کا مرکز بھی۔ اس وقت مدرسہ بند تھا۔ لیکن رات کو بالغ جماعتیں باقاعدہ جاری تھیں۔ بحری افسروں کے تربیتی کالج کے بالکل اوپر پہاڑی کی چوٹی پر واقع ہے اور یہاں سے باسفورس

اپنی پوری رنگینی کے ساتھ پھیلی ہوئی نظر آتی ہے۔ مدرسہ میں طلبا کی کل تعداد ۲۰۰ بتائی گئی۔ تدریس کے لیے سمعی اور بصری امدادوں کو نہایت محنت سے تیار کیا گیا ہے۔ لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کی دلچسپیوں کا سامان موجود ہے۔ اس مدرسہ کو دیکھنے کے لیے کافی لوگ آتے رہتے ہیں۔ اسوقت بھی کوئی آدھی درجن ایسے لوگ موجود تھے۔ مدرسے کو دیکھ چکے تو رہنما ہمیں اس کے ہال میں لے گئے جہاں بچوں کو فلمیں دکھانے کا انتظام ہے۔ ہال میں بچوں کے قد کی کرسیاں دھری تھیں۔ نمونۃً ایک فلم ہمیں بھی دکھائی گئی جس میں بروصہ اور ترکی کے چند دوسرے اہم شہروں کی صنعتی اور زرعی زندگی پیش کی گئی تھی۔ فلم بلا شبہ تعلیمی افادیت سے لبریز تھی۔

استادوں کی تربیت گاہ۔ جاپا ترکیہ میں ثانوی استادوں کی تربیت کے لیے صرف دو کالج ہیں جن میں سے ایک استنبول کا ٹریننگ کالج جاپا ہے جو اسوقت بند تھا۔ لیکن اس کے پرنسپل ڈاکٹر کمال موجود تھے۔ وہ انگریزی نہیں جانتے تھے۔ اس لیے کالج دکھانے اور مختلف باتوں کی تشریح کرنے کا کام سائنس کے ایک پروفیسر کے سپرد ہوا۔

کالج کی عمارت کوئی پچاس برس پہلے عثمانی دور میں تعمیر ہوئی تھی۔ لیکن یہ عمارت موجودہ ضروریات کے لیے بالکل کافی ہے۔ سائنس کا کمرہ ہر طرح کے ضروری سازوسامان سے لیس تھا۔ جاپا ٹریننگ کالج میں ابتدائی مدرسوں کے لیے بھی استاد تیار کیے جاتے ہیں۔ یہ لوگ آٹھویں جماعت پاس کر کے آتے ہیں اور تین سال تک تربیت حاصل کرتے ہیں۔ ثانوی مدرس بننے کے لیے لیسے یعنی بارہ سالہ ہائی اسکول کا امتحان پاس کر کے دو سال تک تربیت لینی پڑتی ہے۔ ابتدائی مدرسوں کے استاد اگر ثانوی استاد بننا چاہیں تو انہیں مزید تین سال تک تربیت لینی پڑتی ہے۔ یونی ورسٹی میں بھی علم التعلّم کا نصاب موجود ہے۔ جو طلبہ یہ نصاب لیتے ہیں انہیں ساتھ ساتھ عملی تدریس کی مشق کرنا پڑتی ہے۔ ملک میں استادوں کی جو کمی موجود ہے اسے پورا کرنے کے لیے بارہ سالہ ہائی اسکول سے فارغ شدہ نوجوانوں کو دو ماہ کی ہنگامی تربیت دے کر مدرس بنا دیا جاتا ہے۔ لیکن ایسے استاد اسوقت تک باقاعدہ استاد تعینات نہیں کیے جاتے جب تک وہ تین سال تک لگاتار تسلی بخش کام نہ دکھائیں۔

عمارت میں گھومتے گھومتے ہم اس کی تحت زمین منزل میں جا پہنچے۔ یہاں اب کالج کا کتب خانہ ہے لیکن اس کی منقش دیواریں اور محراب کسی اور چیز کی غمازی کر رہی تھیں، دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ پہلے یہ کالج کی مسجد تھی اب کتب خانہ میں تبدیل کر دی گئی ہے۔

چھت والا بازار

ٹریننگ کالج سے فارغ ہو کر ہم اسلامی آرٹ کے عجائب گھر میں گئے جس کے چار وسیع کمروں میں اسلامی اور ترکی فن کے پرانے شاہکاروں کو قرینے سے رکھا گیا ہے۔ ایک کمرے میں عربی، فارسی اور ترکی خوشنویسی کے نمونے ہیں۔ دو کمروں میں اعلیٰ قسم کے ترکی قالین اور غالیچے ہیں اور چوتھے میں متفرق نوادرات۔

یہاں سے ہم استنبول کے پُر ہجوم کاروباری حصہ میں جا نکلے جہاں چھوٹے چھوٹے کارخانوں اور دستکاریوں کی بھرمار تھی۔ اس سے ذرا آگے بڑھے تو مشہور چھت والے بازار میں پہنچ گئے۔ یہ بازار کیا ہے بذات خود ایک مستقل بستی ہے جس کی شاخیں چاروں طرف دور دور تک نکل گئی ہیں۔ جگہ جگہ چھوٹے بڑے چوراہے اور تنگ گلیاں ہیں لیکن سب پر چھت موجود ہے۔ اس کے مختلف حصوں میں مختلف سامان کی دوکانیں ہیں لیکن یہ زیادہ تر کپڑے کی منڈی ہے۔ چھوٹی چھوٹی دکانوں پر رنگا رنگ تھانوں کے ڈھیر لگے تھے کپڑا زیادہ تر ترکیہ کے اپنے کارخانوں کا بنا ہوا تھا۔ چھوٹے دکان دار جگہ جگہ آوازیں لگاتے سنائی دیتے تھے۔ کپڑے کی یہ چھت والی منڈی اوّل اوّل سلطان محمد فاتح کے عہد میں بنی تھی۔ اس وقت سے لے کر اب تک یہ کئی دفعہ آگ اور زلزلوں کی نذر ہوئی۔ لیکن ہر دفعہ پھر تعمیر ہوتی رہی۔ استنبول کے سوا غالباً دنیا کے کسی اور شہر میں اس قسم کی منڈی... چھت کے نیچے دکھائی نہیں دے گی۔ جدید تجارتی مرکزوں کے کھل جانے سے اب اس منڈی کی اہمیت اور رونق گھٹتی جا رہی ہے۔

ٹاپکاپی محل

اب ہم ان وسیع شاہی محلوں اور عمارتوں کو دیکھنے گئے جو ایا صوفیہ سے لے کر شاخ زرّیں کے ناکہ تک ایک بڑے تکونی رقبہ میں پھیلی ہوئی ہیں اور جہاں سلطان محمد فاتح کے وقت سے لے کر سلطان عبدالمجید کے زمانہ تک تمام ترکی کے شاہی خاندان اقامت گزیں رہے

سب سے پہلے سلطان فاتح نے یہاں محل بنوایا تھا۔ اس کے بعد ہر سلطان کسی نہ کسی عمارت کا اضافہ کرتا رہا۔ تا آنکہ یہ محلوں مسجدوں اور شاہی عمارتوں کی ایک لمبی زنجیر بن گئی۔ آج یہ تمام شاہی عمارتیں اور ان کے صدیوں کے جمع شدہ نفائس و نوادر قومی عجائب خانہ ہیں اور ان کے وسیع باغات عوامی تفریح گاہوں میں تبدیل ہو چکے ہیں۔

ایا صوفیہ کی طرف سے جنوبی سمت سے داخل ہوں تو پہلے عظیم الشان باب ہمایوں آتا ہے پہلے وقتوں میں شاہی سواری یہاں سے گذرا کرتی تھی۔ اس کے پاس ہی سلطان احمد ثالث کا بنا کردہ خوب صورت فوارہ ہے ذرا اور آگے بڑھیں تو دائیں ہاتھ ایک چشمہ ہے جس کا پانی ایک ٹوٹی میں سے بہتا ہے۔ اس مقام کے ساتھ عثمانی تاریخ کی بہت سی بھیانک یادیں وابستہ ہیں کیوں کہ یہی وہ جگہ ہے جہاں جلاد مجرموں کا سر قلم کیا کرتا تھا اور اس چشمہ پر اپنے خون آلود ہاتھوں اور تلوار کو صاف کیا کرتا تھا۔ اس لئے اس چشمہ کا نام جلادی چشمہ پڑ گیا ہے۔

اور آگے بڑھیں تو دوسرا دروازہ آتا ہے جس کا نام باب السلام ہے۔ یہاں پر بیرونی احاطہ ختم ہو جاتا ہے۔ اور اس سے آگے محل کی اصلی حد شروع ہوتی ہے۔ باب السلام نہایت عالی شان محراب دار دروازہ ہے جس کے میناروں کے نیچے بڑے بڑے کمرے ہیں۔ یہاں ان امرا کو قید کیا جاتا تھا جو سلطان کی نظروں سے گر جاتے تھے۔ بادشاہ کے سوا کوئی شخص باب السلام میں سے گھوڑے پر سوار ہو کر نہیں گذر سکتا تھا۔ باب السلام سے آگے ایک وسیع مربع صحن ہے جس کے چاروں طرف سنگ مرمر کے ستونوں پر خوبصورت برآمدے کھڑے ہیں۔ دائیں ہاتھ کے برآمدوں میں سے گزر کر آگے شاہی باورچی خانے آتے ہیں۔ ان کے دس گنبد سمندر میں دور سے دکھائی دیتے ہیں۔ آج کل یہاں شاہی جواہرات اور قیمتی اشیا کی نمائش کی گئی ہے محل کے دوسرے حصوں میں شاہی محل کے چینی کے برتنوں۔ چاندی کے برتنوں اور کھانے پینے کے دوسرے چھوٹے بڑے برتنوں کی مکمل نمائش ہے۔ چینی کے برتنوں کا مجموعہ چھ ہزار اشیاء پر مشتمل ہے، دنیا میں اور کسی جگہ چینی کے برتنوں کا اتنا بڑا مجموعہ موجود نہیں۔

باب السلام سے بائیں ہاتھ مڑیں تو آگے شاہی دیوان آتے ہیں۔ جہاں بادشاہ امرا کے ساتھ بیٹھ کر سلطنت کے اہم امور طے کرتا تھا۔ انیسویں صدی کے وسط تک سلطنت کی قسمت کے سب فیصلے اسی جگہ ہوتے رہے۔ غیر ملکی سفیر یہیں بادشاہ کی خدمت میں پیش ہوتے .... دیوان کی عمارت بہت کشادہ اور خوشنما ہے۔ لیکن حق یہ ہے کہ شاہ جہاں کے دیوان عام اور دیوان خاص کے مقابلہ میں وہ سادہ معلوم ہوتا ہے۔

دیوان سے آگے ۱۳۹ فٹ اونچا گھنٹہ گھر ہے۔ اس کے پاس ہی ایک بڑے ہال میں اسلحہ کی نمائش کی گئی ہے۔ باب السلام کے بالکل بالمقابل ایک تیسرا دروازہ ہے جو باب السعادۃ کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں سے گذر کر ہم محل کے اندرونی حصہ میں داخل ہوتے ہیں۔ اس کے سامنے سب سے پہلے جس کمرہ پر نگاہ پڑتی ہے وہ شاہی تخت کا کمرہ ہے جو ترکی فن تعمیر کا عمدہ نمونہ ہے۔ یہاں عثمانی سلطان اور وزرائے عظم مرافعے سنا کرتے تھے اور غیر ملکی سفیروں کو سرکاری طور پر شرف باریابی بخشا کرتے تھے۔ اس سے بائیں طرف ملحق ایک اور کمرہ ہے جہاں غیر ملکی کپڑوں اور گھڑیوں کا مجموعہ نمائش کے لئے موجود ہے۔ اس سے ذرا آگے سلطان احمد ثالث کا کتب خانہ ہے جس میں یونانی اور عربی زبان کے نادر قلمی نسخے ہیں۔ یہ نسخے عالموں کے استفادہ کے لئے موجود ہیں صحن کی دائیں جانب سلطانی خدمت گاروں کے رہائشی کمرے ہیں۔ ایک کمرے میں عربی اور ترکی کتابوں کی نمائش کی گئی ہے۔ اس کے پہلو میں سلیم ثانی کا تعمیر کردہ حمام ہے۔

حمام سے ملحق ایک اور وسیع عمارت ہے جو سلطان فاتح نے تعمیر کرائی تھی۔ اس میں بہت سے بیش بہا نوادرات کی نمائش کی گئی ہے۔ ان میں سلطان احمد اول اور مراد رابع کے تخت بھی ہیں وہ مال غنیمت بھی ہے جو سلطان سلیم اعظم نے ایران کے شاہ اسماعیل سے لیا تھا۔ اس مال غنیمت میں شاہ اسماعیل کا بیش قیمت سنہری تخت ہے جس میں قیمتی جواہرات جڑے ہیں۔ ان کے علاوہ مختلف سلطانوں کے لباس الگ الگ اویزاں ہیں۔ اور طرح طرح کی قیمتی اشیا جو سلطانوں نے صدیوں میں ذاتی استعمال کے لئے جمع کی تھیں نمائش کے لئے موجود ہیں۔ اس سے آگے ایک کمرے میں ترکی کشیدہ کاری

نمونے ہیں اور دوسرے کمرے میں مختلف مصوروں کی بنائی ہوئی تصویروں کی نمائش ہے۔
اس چاردیواری سے آگے ایک تنگ راستہ میں سے گذر کر ایک اور احاطہ آتا ہے جس میں پہلی عمارت پوشاک محل ہے جہاں سلطان کپڑے پہنا کرتے تھے۔ اس کے قریب ہی سلطان محمد ثانی کی تعمیر کردہ خوبصورت مسجد ہے۔ پوشاک محل کی دوسری طرف باغ لالہ ہے جہاں لالہ کے پھول بوئے جاتے تھے۔ باغ لالہ کے دائیں جانب شاہی طبیب کا کمرہ ہے۔ جہاں سلطان کے لئے دوائیں تیار ہوتی تھیں اس سے ذرا آگے سنت کا کمرہ ہے جہاں شہزادوں کے ختنے کیے جاتے تھے۔ اور آگے بڑھیں تو ایک بڑا خوشنما محل آتا ہے جو بغداد کوشک کے نام سے مشہور ہے۔ یہ محل سلطان مراد رابع نے ۱۶۳۹ء میں فتح بغداد کی یادگار میں بنوایا تھا۔ اس سے آگے ایک اور کوشک ہے۔ جہاں مقدس تبرکات محفوظ ہیں ان میں سے ایک سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم کا جبہ مبارک ہے۔ اس سے آگے ایک کمرے میں چودھویں صدی سے لے کر انیسویں صدی تک کے ترکی لباسوں کی نمائش کی گئی ہے۔
قریب ہی ایک بڑی مستطیل شکل کی عمارت ہے اور اصل یہ سلطان فاتح کی تعمیر کردہ مسجد ہے۔ محل کے رقبہ میں یہ سب سے بڑی مسجد تھی۔ رفتہ رفتہ یہ شکستہ ہوگئی۔ ۱۹۳۵ء میں اس کی مرمت کی گئی اور اسے ایک کتب خانہ میں تبدیل کر دیا گیا۔ کتب خانہ کے بالکل سامنے ایک اور چھوٹی سی عمارت ہے جو کبھی چڑیا گھر ہوا کرتا تھا۔ مسجد سے آگے بڑھتے ہوئے ہم ایک بھاری کانسی کے دروازہ پر آتے ہیں۔ یہ حرم کا بڑا دروازہ ہے۔
حرم کی عمارت محل کے جنوب مغربی گوشے میں ہے۔ ابتداً اسے سلطان فاتح نے تعمیر کرایا تھا لیکن وقت گذرنے کے ساتھ اس کی توسیع ہوتی گئی اور نئے اضافے پہلی عمارتوں سے ملحق رکھے گئے چوں کہ یہ عمارت ڈھلوان زمین پر بنی ہے۔ اس لئے بعض مکان ایک منزلہ ہیں اور بعض دو اور تین منزلہ حرم کی یہ وسیع اور شاندار عمارت جو صدیوں تک بیگمات اور بچوں کی آوازوں اور قہقہوں سے گونجتی رہی آج بالکل سونی پڑی ہے۔
حرم سے باہر نکل کر دوسرے صحن کی طرف آتے ہوئے ایک لمبا کمرہ آتا ہے جہاں سلیم سوم

زمانہ سے لے کر عبدالحمید کے عہد تک استعمال ہونے والی گاڑیوں اور سازوں کی نمائش کی گئی ہے۔

باہر کی طرف آتے وقت دائیں جانب ایک اور عمارت چینی محل کے نام سے موسوم ہے۔ اس میں سلطان فاتح کے ذاتی استعمال کی چیزوں کی نمائش کی گئی ہے۔ سلطان کا ایک قدِ آدم مجسمہ بھی موجود ہے جو سلطان کے اصل لباس میں ملبوس ہے۔

الوداع شاہی عجائب گھر سے نکلے تو عصر کا وقت ہو چکا تھا، مجھے اسی رات بیروت کے لئے جہاز پکڑنا تھا۔ چنانچہ مسٹر چیلین کو الوداع کہی اور ٹیکسی میں بیٹھ کر پان امریکن کے دفتر میں پہنچا جو استنبول کے جدید تجارتی حصہ میں واقع ہے۔ یہ حصہ اپنی بلند و بالا عمارتوں اور کشادہ سڑکوں اور چوراہوں کے لحاظ سے جدید مغربی شہروں کا مقابلہ کرتا ہے۔ غیر ملکی کاروبار زیادہ تر اسی حصہ میں ہے۔ رات کے دس بجے ہوائی جہاز استنبول سے روانہ ہوا۔ میرا ذہن تاریخ کے اس نگار خانہ کی عبرت خیز داستانوں سے بھرپور تھا اور اس کے نرم و نازک قدرتی حسن کی رنگین تصویریں رہ رہ کر آنکھوں کے سامنے پھرتی تھیں۔ زیادہ افسوس اس بات کا تھا کہ ابھی استنبول میں بہت کچھ دیکھنے کو باقی تھا لیکن ساتھ ہی اس خیال سے کچھ طمانیت ہوتی تھی کہ یہ دو دن کی مہلت بھی غنیمت تھی۔ کچھ نہ دیکھنے سے تھوڑا بہت حصہ دیکھ لینا ہی بڑی بات تھی ❊

فن تدریس

علی نذیر احمد

ہر شخص کچھ غیر معمولی طور پر کامیاب استادوں کے نام گنا سکے گا۔ اگر اسے ان لوگوں کی کامیابی کے راز پر انگلی رکھنے کو کہا جائے تو غالباً ان سب میں تمسکل ہی سے بہت سی چیزیں مشترک نظر آئیں گی۔ کسی میں کوئی خوبی نمایاں ہوگی اور کسی میں کوئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تدریس ایک فن ہے اور ہر فن کی طرح اس میں فن کار کی یگانہ تخلیقی صلاحیتوں کو بڑا دخل ہے۔

کیا تدریس ایک فن ہے؟

اس موضوع پر مزید بحث کرنے سے پہلے لفظ فن کا مفہوم صاف ہو جانا چاہیئے۔ اگر مختلف لغاتوں میں اس لفظ کے معانی ڈھونڈے جائیں تو ان میں کافی فرق نظر آئے گا۔ تاہم ان سب میں ایک بات مشترک دکھائی دے گی وہ یہ کہ فن کا تعلق کسی نہ کسی طرح ان سوچی سمجھی انسانی سرگرمیوں سے ہے جن کا مقصد بعض ایسے عوامل کا راستہ بدلنا یا راستہ بند کرنا ہو جو انسانی دخل اندازی کے بغیر مختلف سمت اختیار کرتے۔ مثلاً گانا ایک مشہور فن ہے اس فن کو سیکھنے کے لئے ضروری ہے کہ آلات صوت کو کافی مشق کے بعد ایک مخصوص سانچے میں ڈھالا جائے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے اور آلات صوت کو ان کی طبعی حالت پر چھوڑ دیا جائے تو ایسا شخص گویا نہ بن سکے گا۔ یہی حال دوسرے فنون کا ہے۔ خوش نویسی ایک فن ہے جس شخص نے قلم و قرطاس کو ایک مخصوص طریقے پر استعمال کرنے کی لمبی مشق نہ کی ہو وہ خوش نویس نہیں بن سکتا۔ ہاں یہ الگ بات ہے کہ ایک شخص معمولی سی رہنمائی اور مشق سے اس فن میں مہارت پیدا کر لیتا ہے اور دوسرے کو اس پر قابو پانے کے لئے لگاتار رہنمائی اور لمبی مشق کی ضرورت پڑتی ہے۔ پس فن کی نہائی ماہیت کا سب سے اہم جزو یہ ہے کہ انسان پوری سوجھ بوجھ کے ساتھ بعض واقعات کا رُخ جان بوجھ کر بدل دے۔ اس معنی میں تدریس یقیناً ایک فن ہے، دراصل یہ ایک وسیع تر فن یعنی تعلیم کی ایک

شاخ ہے۔ تعلیم کی بہترین تعریف غالباً یہ ہے کہ یہ ان مؤثرات وعوامل پر سوجھی بوجھی گرفت کا نام ہے جن کا مقصد انسانوں کی نشو ونما میں ترسیم کرنا ہو۔ جہاں کہیں اور جب کبھی انسانوں کے خیالات، جذبات اور افعال کو متاثر کرنے کی کوشش کی جارہی ہو وہاں یقیناً کسی نہ کسی قسم کی تعلیم جاری ہے۔

تعلیم کے مختلف ذرائع

تعلیم کے اس مفہوم کو پیش نظر رکھا جائے تو معاشرہ میں کئی ادارے اور جماعتیں اس کام میں مشغول نظر آئیں گے۔ مسجد کے منبر سے جو وعظ کیا جاتا ہے اس کا مقصد انسانوں کے خیالات۔ جذبات اور بالآخر ان کے افعال میں تبدیلی پیدا کرنا ہے۔ اخبارات اور رسالے اپنا پورا زور قلم اسی بات پر صرف کر دیتے ہیں۔ ریڈیو کی نشریات کی ساری غرض وغایت یہی ہوتی ہے سینما کا پردہ سیمیں بھی اسی مقصد کے لئے وقف ہے۔ اور تو اور ہر اشتہار دینے والا اور ہر وہ شخص جو اپنی اشیاء یا اپنی خدمات کے خریدار پیدا کرنا چاہتا ہے اپنا سارا زور طبع اس بات پر صرف کر دیتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح زیادہ سے زیادہ لوگوں کی پسند پر اثر انداز ہو سکے تعلیم کی جو تعریف اوپر دی گئی ہے اس کے مطابق یہ تمام لوگ تعلیم کے ہمہ گیر کام میں لگے ہیں بالکل ان ہی کی طرح مدرسہ بھی اپنی ہمت کے مطابق اس خدمت کو انجام دیتا ہے۔

مدرسے کی ذمہ داری

یہاں یہ بجا طور پر پوچھا جا سکتا ہے کہ جو کام اتنے ہاتھوں میں بٹا ہوا ہو اس کی ذمہ داری مدرسہ پر کس حد تک ڈالی جا سکتی ہے؟ زیادہ صاف لفظوں میں یہ سوال اٹھایا جا سکتا ہے کہ جب تعلیم کا کام بعض ایسے افراد اور جماعتوں کے ہاتھوں میں بھی ہے جن کے سامنے اپنے ذاتی نفع کے سوا اور کوئی اونچا مقصد نہیں تو مدرسہ اکیلا اونچے مقاصد کے لئے مؤثر کام کس طرح کر سکتا ہے؟ جہاں سینما۔ ریڈیو۔ فلمی رسالے۔ گھٹیا قسم کے افسانے ناول اور اشتہار بازوں کی ایک پوری فوج دن رات لوگوں کو گھٹیا قسم کی ترغیبیں دینے میں مصروف ہو وہاں مدرسہ بلند اقدار کے لئے کیا کر سکتا ہے؟ یہ بجا ہے کہ مدرسے کے علاوہ بعض اور ادارے مثلاً مسجد۔ مذہبی ادارے۔ سیاسی اور علمی انجمنیں اور اسی طرح کی بعض اور جماعتیں بھی مدرسے کی طرح پسندیدہ مقاصد کے لئے سرگرم عمل ہیں لیکن ان سب میں بھی پورا اشتراک عمل ممکن نہیں کم از کم

ان کے طریقہ ہائے کار میں بڑا فرق ہے۔

یہ تمام سوالات اپنی اپنی جگہ بالکل درست ہیں۔ مدرسہ تعلیم کے متعدد ذرائع میں سے صرف ایک ذریعہ ہے۔ عوامی ذہن میں اسے تعلیمی غرض کے ساتھ خاص طور پر اس لئے مخصوص کیا جاتا ہے کیونکہ نئی پود کی تعلیم کا کافی کام اس کے ذمہ سپرد کیا گیا ہے۔ لیکن تعلیم کے متذکرہ صدر دوسرے ذرائع کی تاثیر سے کسی کو انکار نہیں۔ ان میں سے بعض کی کشش کئی حالتوں میں مدرسے کی کوششوں پر پانی پھیر دیتی ہے تاہم اس قدر ضرور ہے کہ موجودہ دور میں کوئی مہذب ملک اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ کوئی فرد یا جماعت کھلم کھلا ناپسندیدہ اقدار کو اچھالے۔ مختلف تعلیمی قوتوں کے مقاصد اور طریقہ ہائے کار میں خواہ کتنا ہی فرق کیوں نہ ہو وہ سب کم از کم زبانی طور پر یہ دعویٰ ضرور کریں گی کہ وہ پسندیدہ اقدار کی اشاعت کر رہی ہیں۔ یہ پسندیدہ اقدار معاشرے کے فلسفہ حیات پر مشتمل ہوتی ہیں۔ اس فلسفہ کی حیثیت ثقافتی بنیاد کی ہوتی ہے اور ریاست کی تہذیبی قوت قوم کی طرف سے اس کی محافظ و نگران مقرر کی گئی ہوتی ہے۔ مغربی ممالک میں یہ بنیادی فلسفہ جمہوری اقدار کے نام سے موسوم ہے۔ تاہم یہ خیال نہ کر لینا چاہیئے کہ تمام مغربی ملکوں میں ایک ہی قسم کی جمہوری اقدار رائج ہیں۔ برطانوی جمہوریت اپنے خدوخال میں امریکی جمہوریت سے الگ ہے اور روسی جمہوریت بالکل ایک علیحدہ چھاپ کی جمہوریت ہے۔ ہم پاکستان میں اسلامی جمہوریت کو رواج دینے کے دعویدار ہیں۔ غرض تعلیم کی نہائی اغراض کا فیصلہ کسی قوم کی ثقافتی زندگی کی بنیادیں کرتی ہیں۔ مدرسہ ان ثقافتی بنیادوں کو قائم و برقرار رکھنے والے متعدد خادموں میں سے ایک خادم ہے اور بس۔ تاہم ان سب میں اس کا مقام ایک جداگانہ خصوصیت رکھتا ہے۔ وہ دوسروں کے لئے نمونہ اور مثال قائم کرتا ہے۔ دوسروں کو زود و دیر اس کے قدم کے ساتھ قدم ملانا پڑتا ہے۔ خود غرض و نفع پرست افراد اور جماعتیں وقتی طور پر اس کے مخالف سمت میں قدم اٹھا سکتی ہیں وہ اس کے خلاف مستقل محاذ قائم نہیں کر سکتیں۔ مدرسہ جو تعلیمی قدم اٹھاتا ہے وہ پورے خلوص اور علم الیقین کے ساتھ اٹھاتا ہے۔ دوسری قوتیں بر ملا اس کی مخالفت نہیں کر سکتیں۔ اور اگر مدرسہ رائے عامہ کی تربیت سے غافل رہے تو ان کی دور [illegible]

قاصمت بھی بہت دیر تک نہیں سکتی ۔

اس ضمن میں ایک مثال کا تذکرہ افادیت سے خالی نہ ہوگا۔ راقم کو ریاستہائے متحدہ کے مدرسوں اور کالجوں کو کچھ عرصہ تک دیکھنے کا موقع ملا۔ وہ ایک ماہ تک ایک یونی ورسٹی کے پروفیسر کے ساتھ رہا۔ یہ پروفیسر ہفتہ میں دو بار رات کے وقت کوئی پچیس تیس میل دور استادوں کی ایک جماعت کو پڑھانے جایا کرتے تھے۔ ان کے لیکچروں کا موضوع جدید سمعی بصری امدادیں تھا۔ راقم بھی ان کے ہمراہ ہوتا۔ اس نے دیکھا کہ تقریباً ہر تقریر کے موقع پر کسی نہ کسی تعلیمی مواد تیار کرنے والی کمپنی کا ایک نمائندہ موجود ہوتا تھا جس نے پہلے سے پروفیسر موصوف کے ساتھ بات چیت کر رکھی ہوتی تھی۔ سبق کے بعد وہ جماعت کو اپنی تعلیمی فلمیں، سلائڈیں یا فلمی پٹیاں دکھاتا۔ اس چیز کا سارا اہتمام کمپنی کے خرچ پر ہوتا۔ اس سارے خرچ اور کاوش سے کمپنی کا صرف یہ مقصد ہوتا کہ اس کے تیار کردہ تعلیمی مواد کی تشہیر استادوں کے درمیان ہو جائے۔ کمپنی کی اصل غایت نفع اندوزی کے سوا اور کیا ہو سکتی تھی، لیکن اس غایت کو حاصل کرنے کے لیے اسے حقیقی تعلیمی خدمت بھی انجام دینا پڑتی تھی۔ یہی حال امریکہ کے ناشران کتب کا ہے۔ انگریزی کی مدرسین کی قومی انجمن کا سالانہ اجتماع ہو رہا تھا۔ اس موقع پر ناشروں نے اپنی مطبوعات کی نمائش کا اہتمام کیا تھا لیکن اپنی کتابوں کی تشہیر کے ساتھ ان لوگوں نے چھوٹے چھوٹے کتابچے بھی شائع کرا رکھے تھے جو تدریس انگریزی کے مختلف پہلوؤں پر سائنسی روشنی ڈالتے تھے۔ یہ کتابچے مفت بانٹے جا رہے تھے۔ بعد ازاں استادوں کے چلنے اجتماع دیکھنے کا اتفاق ہوا ان سب میں ناشروں کی طرف سے اس قسم کی تعلیمی خدمت کی سعی دیکھنے میں آئی ۔

اس مثال سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اگر مدرسے تنظیم و تعاون سے اپنی آواز مؤثر بنا لیں تو وہ تعلیمی میدان میں ایسی رہ نمائی کر سکتے ہیں، جسے چار و ناچار سب کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ تعلیمی رہ نمائی مدرسے ہی کا امتیازی حق ہے، جسے کوئی دوسری قوت غصب نہیں کر سکتی۔ اس رہ نمائی کا بوجھ اعتماد اور ثابت قدمی کے ساتھ قبول کرنا مدرسے کی اہم ترین معاشرتی ذمہ داری ہے ۔

فن تدریس میں مہارت | جب تدریس ایک فن اور استاد ایک فن کار ٹھہرا تو اس سے یہ بھی لازماً

اس فن میں مہارت پیدا کرنے کے لئے استاد کو فنی طریقوں اور تکنیکوں میں دسترس حاصل کرنی چاہیئے
کار کے لئے فنی تربیت کا حاصل کرنا صریح طور پر ضروری نظر آئے گا۔ ممکن ہے یہاں بعض لوگوں کی
ہ بعض مشہور مستثنیات کی طرف اٹھ جائے۔ مثلاً مولانا روم نے اپنی فن کاری کے متعلق کہا ہے:۔

شعر میگویم بہ از قند و نبات ٭ من ندانم فاعلاتن فاعلات

لیکن اس شعر سے یہ مراد نہیں لی جاسکتی کہ مولانا روم عروض و قوانی سے بے خبر تھے۔ اس کا مطلب
رف اس قدر ہے کہ شعر کہتے وقت مولانا کی توجہ عروض و قوانی پر نہ ہوتی تھی بلکہ معانی و مطالب کے
مابین کی آمد کا یہ حال تھا کہ الفاظ خود بخود عروض و قوانی کے موزوں سانچوں میں ڈھلتے چلے جاتے تھے
میں اس بات کے لئے کبھی تردد نہ کرنا پڑتا تھا۔

بالکل یہی حال تدریس کے فن کا ہے بعض نامور استاد ایسے بھی دیکھنے میں آئیں گے جنہوں نے
ئی فنی تربیت حاصل نہیں کی تھی لیکن اس کے باوجود انہوں نے معلمی کے پیشے میں نام پیدا کیا اور
ی مثال سے کئی لوگوں کو راستہ دکھایا۔ لیکن ایسے لوگ نوادرات میں سے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں،
ن کے متعلق بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ وہ پیدائشی استاد تھے۔ یہ امتیاز ایک اوسط استاد کے حصّہ
ں نہیں آسکتا۔ لہٰذا جو نوجوان مرد یا عورت اس بات کا فیصلہ کرے کہ وہ معلمی کا پیشہ اختیار کرے گا
ں کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ پہلے فنی تربیت حاصل کرے۔ فنی تربیت حاصل نہ کرنے کی صورت میں
دو راستوں میں سے کوئی ایک راستہ اختیار کرسکتا ہے۔ پہلی صورت یہ ہے کہ وہ حافظہ پر زور ڈال کر
تدریسی طریقے یاد کرے جن سے اسے پڑھایا گیا تھا۔ اگر وہ ان طریقوں کو پورے طور پر ذہن میں
فوظ بھی کرسکے (جن کا بہت کم امکان ہے) تو بھی یہ طریقے جدید تحقیقاتی اور نفسیاتی دریافتوں کی
شنی میں اکثر غیر موزوں ہوں گے، دوسری صورت یہ ہے کہ وہ آزمائش و سہو کا راستہ اختیار کر
ٹھوکریں کھا کھا کر کارآمد طریقہ ہائے تدریس معلوم کرے لیکن اس طرح طلبہ کو جو نقصان اٹھانا
ے گا وہ ناقابل تلافی ہوگا۔ غرض یہ دونوں راستے پُرخطر ہیں۔ سلامتی کی راہ یہی ہے کہ فن کاری کا
ی کرنے سے پہلے فنی تربیت مکمل کرلی جائے۔

نفسیاتی فطرت کا علم | فنی تربیت میں نہ صرف طریقہ ہائے تدریس اور تعلیمی امداد وسیع واقفیت
شامل ہے۔ بلکہ بچوں کی نفسیات کا ضروری علم بھی۔ پچھلی نصف صدی میں بچوں کے متعلق ہمارے علم میں
جو اضافہ ہوا ہے اس نے تعلیمی فکر میں انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ پہلے یہ سمجھا جاتا تھا کہ بچے کی مثال ایک
خالی برتن کی ہے جس میں استاد رفتہ رفتہ علم و واقفیت بھرتا رہتا ہے۔ نفسیاتی حقائق نے اس خیال کو
مطلق غلط ثابت کر دکھایا ہے۔

حدیث میں آیا ہے "انما السعید من وُعظ بغیرہ۔ والشقیُّ فی بطنِ اُمہ"
یعنی نیک بخت وہ ہے جو دوسرے کو دیکھ کر نصیحت پکڑے اور بدبخت ماں کے پیٹ ہی سے بدبختی لیکر
پیدا ہوتا ہے۔ اب یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ماں کے پیٹ میں جب بچے کی عمر ابھی صرف چند سکنڈ ہوتی ہے
اور وہ ابھی خوردبینی قد سے آگے نہیں بڑھا ہوتا اسوقت بھی وہ باپ اور ماں دونوں کے پشت ہائے
پشت کے متوارث خواص کا حامل ہوتا ہے۔ بطن مادر کا ماحول ان متوارث رجحانات پر کس حد تک اثر انداز
ہوتا ہے اس بات کے متعلق ابھی کوئی قطعی شہادت ہاتھ نہیں لگ سکی۔ لیکن بچے کے دنیا میں قدم
رکھتے ہی ماحول اپنا کام شروع کر دیتا ہے۔ بچے کا ماحول ورثہ میں حاصل کردہ طبعی رجحانات کو ترقی دینے
یا مسدود کرنے کا سامان پیدا کرنے لگتا ہے۔

جو رجحانات بچے کو ورثہ میں ملتے ہیں اور جنہیں طبعی رجحانات کا نام دیا جاتا ہے وہ اسے ایک
خاص طریقے پر سوچنے، محسوس کرنے اور عمل کرنے پر ابھارتے ہیں۔ یہ رجحانات مختلف افراد میں مختلف
ہوں گے لیکن ہر فرد کے طبعی رجحانات کو حرکت میں لانے والی صرف ایک چیز ہے اور وہ ہے
عزم یقا۔ یہی وہ قوت متحرکہ ہے جو اول سے آخر تک تمام انسانی خیالات، احساسات اور افعال کو
جنم دیتی ہے۔ یہ قوت متحرکہ طبعی رجحانات کے نکاسوں میں بہتی ہے اور اسی عمل کے ضمن میں ان
نکاسوں کی کیفیت کو رفتہ رفتہ بدلتی رہتی ہے۔ استاد کے لئے یہ نکتہ بے حد اہم ہے اسے اچھی طرح
سمجھ لینا چاہیئے کہ طلبا کے کردار کو وہ اسی صورت میں متاثر کر سکے گا جب وہ خود سوچیں گے محسوس
کریں گے اور کام کریں گے تعلیمی مواد یا استاد کی تقریر اکیلی کچھ انجام نہیں دے سکتی۔ تدریس کو کامیاب

بنانے کے لئے طلبہ کا تعاون اور اشتراک عمل ضروری ہے۔ یہ اشتراک خواہ فکری سطح پر ہو خواہ جذباتی سطح پر اور خواہ عملی سطح پر۔

ان نفسیاتی حقائق کی روشنی میں استاد کو چاہیئے کہ طلبہ کی طبعی استعداد کے متعلق مندرجہ ذیل تین نکات کو ملحوظ خاطر رکھے۔

(۱)۔ بچے کو جو استعدادیں ورثہ میں ملتی ہیں وہ محض جسمانی ذہنی اور مزاجی نشو ونما کے رجحانات ہوتے ہیں۔

(۲) یہ استعدادیں فقط بعض کرداری رجحانوں پر مشتمل ہوتی ہیں ان میں سے بعض مخصوص نوعیت کی ہوتی ہیں اور بعض عام نوعیت کی لیکن ان میں سے کوئی بھی منجمد اور تنگ سانچے میں ڈھلی نہیں ہوتی، بلکہ نشو ونما کے دوران میں یہ سب حد درجہ قابل ترمیم ہوتی ہیں۔

(۳) عمر بڑھنے کے ساتھ ان استعدادوں میں سے بچہ کو ماحول پر زیادہ سے زیادہ قدرت پیدا کرتا جاتا ہے اور اس طرح خود اختیاری ترقی کرتی جاتی ہے

مدرس کا فن

مندرجہ بالا علمی اور نفسیاتی حقائق اس بات کے متعلق کچھ شبہ نہیں چھوڑتے کہ خیالات۔ جذبات اور عمل میں ترمیم کرنے کی ایک ہی راہ ہے اور وہ ہے سوچنا، محسوس کرنا اور عمل کرنا۔ استاد خواہ کچھ کہتا رہے وہ اپنی مدد کے لئے خواہ کسی قسم کا مواد اکٹھا کر لے۔ اگر طالب علم سوچنے، محسوس کرنے اور عمل کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے تو اس کی ساری محنت بیکار ہے سیکھنے کے یہ تین آلات (سوچنا، محسوس کرنا اور کام کرنا) اس لحاظ سے یگانہ ہیں کہ معروف عمل ہونے سے ان کی کیفیت اور کمیت بدلتی رہتی ہے۔ ان کی ترمیم۔ اصلاح اور نشو ونما کا اور کوئی طریقہ نہیں ایسا کیوں ہے؟ اس لئے کہ ہر بچہ زندگی اور قوت متحرکہ کا ایک سرچشمہ ہے۔ وہ اپنی نشو ونما اور بالیدگی کے مخصوص رجحانات اپنے خمیر میں لے کر پیدا ہوا ہے۔ ان رجحانات کی اصلاح و ترمیم ان کی مخصوص ماہیت کی مناسبت ہی سے عمل میں آسکے گی۔ استاد ان طبعی رجحانات کو نظر انداز کر کے کچھ نہیں کر سکتا۔ یہ حد بندی استاد کے کام کو دوسرے فن کاروں سے مختلف بنا دیتی ہے بعض لوگ

کو حسب منشا جدھر چاہے موڑ سکتا ہے۔ معمار پتھر اور چونے سے جس قسم کی عمارت چاہے بنا سکتا ہے
استاد اپنے شاگرد کو جو چاہے نہیں بنا سکتا۔ وہ اس کے طبعی رجحانات کے دائرہ کے اندر ہی رہ کر کچھ
سکتا ہے۔ یہ حد بندی استاد کو دوسرے فن کاروں کے مقابلہ میں قدرے بے بس بنا دیتی ہے۔ لیکن ہم
آگے چل کر دیکھیں گے کہ بعض اور باتیں اس بے بسی کی تلافی کرنے والی بھی ہیں۔

ایک اہم نکتہ ہم نے کہا ہے کہ مدرس کا تخلیقی فن طالب علموں کے طبعی رجحانات کے دائرہ کے اندر اندر رہ کر ہی بروئے کار آسکتا ہے۔ کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ تدریس ایک خاص
سے آگے کچھ نتائج پیدا نہیں کر سکتی؟ اس سلسلے میں فارسی کے یہ شعر خواہ مخواہ ذہن میں آتے ہیں۔

اگر بیضہ مرغ ظلمت سرشت ۔ نہی زیر طاؤس باغ بہشت
بہنگام آں بیضہ پروردنش ۔ ز انجیر جنت دہی ارزنش
دہی آبش از چشمہ سلسبیل ۔ بر آں بیضہ گردم دمد جبرائیل
شود عاقبت بچہ زاغ زاغ ۔ برد رنج بیہودہ طاؤس باغ

یہ درست ہے کہ ہر چیز اپنے فطری رجحانات کے رنگ ہی میں نشو و نما پاتی ہے۔ تھوہر کے پودے پر
محنت کی جائے وہ گلاب کے پھول پیدا نہیں کر سکتا۔ لیکن یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ تعلیم تھوہر کو
ب کے پودے میں تبدیل کرنے کا ہرگز دعویٰ نہیں کرتی وہ صرف اس قدر دعویٰ کرتی ہے کہ موزوں
یت اور دیکھ بھال سے تھوہر کے پودے کو زیادہ خوشنما اور تنومند بنایا جا سکتا ہے، وہ بچوں کی ان
ئی ہوئی فطری صلاحیتوں کو جگانا چاہتی ہے جو سازگار ماحول نہ ملنے کے باعث ہمیشہ سوئی پڑی
یں، وہ ان جوہروں کو پوری آب و تاب دینا چاہتی ہے جو بصورت دیگر ہمیشہ سوئے پڑے رہتے یا
ہ سے زیادہ محض ٹمٹما کر بس ہو جاتے۔ قدرت نے انسانی فطرت کو جن رنگا رنگ اور انمول صلاحیتوں
مالا مال کیا ہے ان کا صحیح اندازہ کرنا غالباً مشکل ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے۔

اپنی فطرت کا اگر حسن نمایاں ہو جائے
آدمی کثرت انوار سے حیراں ہو جائے

اس میں کلام نہیں کہ بچے کی فطری صلاحیتیں تعلیم و تدریس کے لئے ایک آخری حد مقرر کرتی ہیں لیکن عام حالتوں میں یہ آخری حد اس قدر دور ہوتی ہے کہ اکثر حالتوں میں تعلیم کا اسکو بچا نہ سکنا [illegible] غیر اغلب ہوتا ہے۔

استادوں کے معتقدات

ہم نے کہا ہے کہ استاد کو اپنے فن کے اصولوں اور اس کی تکنیکوں سے باخبر ہونا چاہئے۔ اسے بچے کی نفسیاتی زندگی سے واقف ہونا چاہئے۔ اول الذکر اس کے فنی اوزار ہیں اور ثانی الذکر اس کا خام مواد جسے اس کا تخلیقی فن ایک مطلوبہ شکل دے گا۔ یہ چیزیں اپنی جگہ بہت اہم ہیں لیکن ان سے زیادہ اہم ایک اور چیز ہے اور وہ ہے استاد کے اپنے معتقدات۔ اس کی اقدار، اس کا فلسفہ حیات۔ مغرب کی مصنوعی تہذیب نے اس قوت کو بہت دیر تک نظر انداز کئے رکھا۔ کچھ برس ہوئے علم التعلیم کے ایک مشہور مغربی پروفیسر نے اپنے طالب علموں سے کہا تھا کہ میں چاہتا ہوں کہ جو کچھ تم یہاں سیکھو اس کا تعلق عملی تدریس میں کام آئے۔ میں تمہیں کسی ایسی چیز میں الجھانا نہیں چاہتا جس کا تعلق محض نظریات سے ہو۔

مغربی دنیا اب اس غلطی سے خبردار ہو چکی ہے۔ سارا بھروسہ مادی اقدار ہی پر رکھنے سے اسے جو تلخ مایوسیاں ہوئی ہیں انہوں نے اسے چونکا دیا ہے اور اب شد و مد سے یہ کہا جانے لگا ہے کہ تعلیم کے لئے اقدار و معتقدات روح کا درجہ رکھتے ہیں۔ نہائی نصب العین اور مقصد طے کئے بغیر طریقہ تدریس اور تکنیکوں کی تکمیل اور ان میں مہارت کوئی پائدار نتائج پیدا نہیں کر سکتی۔ سائنس اور ٹکنالوجی کے لئے بے شک طریق کار اور تکنیک ہی سب کچھ ہیں لیکن تعلیم میں ان کا درجہ ثانوی ہے۔ تعلیم فوری نتائج کو سب کچھ سمجھ کر اپنی اصلی غایت کو پورا نہیں کر سکتی۔ قرآن حکیم نے یہ نکتہ صدیاں گذریں بڑے بلیغ پیرائے میں صاف کر دیا تھا۔ اس کے الفاظ ملاحظہ ہوں۔

> کیا تم نے اس شخص کی حالت پر بھی غور کیا ہے جس نے اپنی خواہشات کی پوجا شروع کر رکھی ہے؟ اللہ نے اسے باوجود اس کے علم کے گمراہ کر دیا ہے۔ اس کے کانوں اور دل پر مہر لگا دی ہے۔ اسکی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہے۔ اسے اللہ کے بعد کون راستہ دکھا سکتا ہے؟

کیا تم سمجھتے نہیں" (سورہ جاثیہ)

اس آیت کے معانی بالکل صاف ہیں۔ جو شخص علم کو محض اپنی خواہشات یعنی مادی ضروریات کے پورا کرنے کا ذریعہ بناتا ہے وہ اس علم کے ہوتے ہوئے بھی ابدی حقیقت کے چہرے کی جھلک نہیں دیکھ سکتا بے شک جو کوئی اللہ سے منہ پھیر لے اسے ابدی حقیقت کا راستہ کون دکھا سکتا ہے۔ یہ ایک سیدھی سادھی بات ہے۔ قرآن کو ان لوگوں کی بے بصیرتی پر حیرت ہوتی ہے جو اتنی سی بات بھی نہیں سمجھ سکتے لیکن دنیا میں بارہا ایسا ہوا ہے کہ قوموں اور ملکوں نے اس نکتہ کے سمجھنے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے اس کا تمسخر اڑایا اور کہا کہ جو علم اس زندگی میں کام نہیں دیتا وہ کسی کام کا نہیں۔ مغربی تہذیب نے اس تجربے کو بہت بڑے پیمانے پر آزمایا۔ اس طور پر اسے جو مادی ترقی نصیب ہوئی وہ تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے۔ لیکن آخر اس کی خوش فہمی کا بھی خاتمہ ہو گیا اور اسے یہ اقرار کرنا پڑا کہ ان مٹ روحانی اقدار کو منزل قرار دیئے بغیر متوازن زندگی کی تعمیر ممکن نہیں۔

اس احساس نے استاد کے لئے یہ ضروری قرار دیا ہے کہ وہ طریقہ ہائے تدریس اور فنی ٹکنیکول کے علاوہ اقدار اور معتقدات کا بھی حامل ہو۔ فنی مہارتیں اسے ایک اچھا کاریگر بنا سکتی ہیں لیکن اس کی شخصیت میں وہ مقناطیسی کشش پیدا نہیں کر سکتیں جو اپنے ماحول کو معجز نما طریق سے متاثر کر دیا کرتی ہے۔ علوم و فنون محض آلات کا درجہ رکھتے ہیں جو کسی بلند تر مقصد کے لئے استعمال ہونے چاہئیں وہ بلند تر مقصد روحانی اور اخلاقی اقدار ہیں جس استاد کی شخصیت ان اقدار کو منعکس نہیں کرتی وہ اپنے کام کے ایک اہم حصے کو ادھورا چھوڑتا ہے۔ استاد کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایک واضح فلسفہ حیات سے غیر متزلزل وفاداری رکھتا ہو۔ وہ خواہ ریاضی کا استاد ہو یا سائنس کا۔ اس فلسفہ کے بغیر نہ وہ سبق کے دوران میں مناسب نکات پر زور دے سکتا ہے اور نہ طالب علموں کے ساتھ موزوں قسم کے تعلقات پیدا کر سکتا ہے۔ مدرسہ بذات خود ایک چھوٹا سا معاشرہ ہے جس میں ہر فرد دوسرے افراد کے ساتھ گوناگوں مراسم قائم کرتا اور بڑھاتا ہے۔ استاد کو نہ صرف اپنے رفقائے کار کے ساتھ مراسم قائم کرنے ہوتے ہیں بلکہ صدر معلم عوام اور طلبہ کے ساتھ بھی۔ ان مراسم کی نوعیت ضرا میر

استاد کے فلسفۂ حیات پر موقوف ہوگی۔ مثلاً اگر وہ تحکم پسندی میں یقین رکھتا ہے تو یہ مراسم اور قسم کے ہوں گے اور اگر نوع انسانی کی مساوات داخوت کا قائل ہے تو یہ مراسم مختلف نوعیت کے ہوں گے۔ اگر اس کا اعتقاد یہ ہے کہ اس زندگی کے بعد کچھ نہیں تو دوسروں کے ساتھ اسکے تعلقات اور قسم کے ہوں گے۔ برعکس اگر اس کا یہ عقیدہ ہے کہ اسے بہت جلد ایک حاکم اعلیٰ کے سامنے پیش ہوکر اپنے چھوٹے سے چھوٹے عمل کا جواب دینا ہے تو اس صورت میں اس کے انسانی تعلقات بالکل مختلف سانچے میں ڈھلیں گے۔ غرض استاد کے معتقدات ہی وہ محاکن قوت ہیں جو اس کی شخصیت کا رُخ معین کرے گی۔ اگر یہ یہ نما قوت موجود نہیں تو اس کی مثال "کلمۃٍ خبیثۃٍ نِ جتثت من فوق الارض مالھا من قرار" کی ہوگی۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا استاد کو ملازم رکھنے والے لوگوں کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے اخلاقی اور مذہبی اعتقادات کو معلوم کرنے کے بعد اسے ملازم رکھیں؟ اوپر جو کچھ کہا گیا ہے اس کی روشنی میں یہ قدم ناگزیر نظر آتا ہے۔ کیا یہ بات مضحکہ خیز نہیں کہ ہم یہ معلوم کرنے کا تو بے حد اہتمام کریں کہ کاری گر کے پاس کون کون سے اوزار ہیں لیکن یہ جاننے کی تکلیف گوارا نہ کریں کہ ان اوزاروں سے وہ کون سا کام لینے والا ہے۔ مختلف علوم۔ طرح طرح کے فنون۔ واقفیتیں اور مہارتیں محض حصول مقصد کے ذرائع ہیں، بذات خود مقصود نہیں۔ زندگی کا مقصد ان کے سوا کچھ اور ہے۔ تعلیم کے لئے یہ نہائی مقصد بنیادی درجہ رکھتا ہے اور اسی مناسبت سے استاد کے عقاید تدریس پر بہت گہرا اثر ڈالتے ہیں لہٰذا استادوں کو تربیت دینے والے اداروں اور مدرسوں کو چاہئے کہ وہ استادوں کے اعتقادات کے بارے میں خاموشی کی پالیسی ترک کردیں۔ اس پالیسی نے پہلے ہی ہماری تعلیم کو بہت نقصان پہنچایا ہے اب جبکہ مغرب میں بھی اس چیز کے خلاف ردعمل ہورہا ہے۔ پاکستان کو چاہئے کہ اپنے مستقبل کے اساتذہ کو واضح روحانی اور اخلاقی اقدار کا حامل بنانے کا تسلی بخش اہتمام کرے۔ اس کے بغیر استاد کی شخصیت میں یک جہتی پیدا نہیں ہوسکتی اور اس کی تدریس تشکیل کردار کا ذریعہ نہیں بن سکتی۔

مغربی نقطہ نگاہ میں تبدیلی | اس سوال پر مغرب کے نقطہ نگاہ میں جو تبدیلی رونما ہوئی ہے اسکا

اندازہ ذیل کے اقتباسات سے ہوگا۔

"غالباً کسی کاری گر کے فلسفہ زندگی کا اتنا اثر اس کے کام پر نہیں پڑتا جس قدر استاد کے فلسفہ حیات کا۔ چوں کہ اس کے بغیر گذارہ نہیں اس لئے استاد کو چاہیئے کہ تا وسعت امکان ایک وافی فلسفہ حاصل کرے زندگی اور تعلیم کے فلسفہ کے بغیر چارہ نہیں، جو لوگ اس بات پر فخر کیا کرتے ہیں کہ وہ ہر قسم کے فلسفہ سے بے نیاز ہیں فی الحقیقت وہ بھی ایک فلسفہ رکھتے ہیں۔ لیکن یہ فلسفہ بالکل ناکافی ہوتا ہے"۔ (رسک)

"ہمارے خیال میں کسی استاد کے متعلق اہم ترین بات یہ ہے کہ وہ کس قسم کے فلسفہ تعلیم کا حامل ہے۔ استاد کے متعلق جو چیز سب سے زیادہ روشنی ڈال سکتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ اپنے تعلیمی تصورات کو نظام کائنات کے ساتھ کسی طور پر ہم آہنگ کرتا ہے۔ سچ یہ ہے کہ انسان کے بنیادی تصورات اس کے کردار پر اتنا گہرا اثر ڈالتے ہیں کہ اگر کوئی استاد قطعی اور واضح طور پر یہ بتا دے کہ اس کے نزدیک تعلیم کا کیا مفہوم ہے تو ہم یہ بتا دینے کا ذمہ لیتے ہیں کہ وہ کون سے طریقے اختیار کرے گا اور اس کا کام کس حد تک کامیاب رہے گا"

(پروفیسر مُور۔ ہارورڈ یونی ورسٹی)

"تدریس کے نازک مقامات پر استاد کا نظریہ حیات ایک فیصلہ کن قوت ثابت ہو سکتا ہے۔ معلم کے کام پر اس بات کا بہت گہرا اثر پڑتا ہے کہ آیا وہ زندگی کے خالص افادی پہلو ہی میں یقین رکھتا ہے یا اس میں اتنی نظریاتی بلندی ہے جو اخلاقی اور روحانی اقدار کو لافانی خیال کرتی ہو۔ اس چیز سے نہ صرف اس کی اپنی دلچسپیوں اور سرگرمیِ عمل میں فرق پڑے گا۔ بلکہ اس بات میں بھی کہ وہ تدریس کے ضمن میں کن باتوں پر خاص توجہ دیتا ہے"۔ (آئی۔ ای۔ ملر)

زیادہ دیر کی بات نہیں کہ مغرب نے اساتذہ کی تربیتی درس گاہوں کے نصابوں سے فلسفہ تعلیم اور تاریخ تعلیم جیسے مضامین کو محض اس لئے اڑا دیا تھا کہ ان نظری بحثوں سے کچھ عملی فائدہ نہیں ہے نصاب سازی کے مضمون میں بھی زیادہ زور نصاب کی سطحی اور میکانکی تفصیلوں ہی پر رہ گیا تھا اب یہ احساس بڑھ رہا ہے کہ معاشرے کی تعمیر نو کے لئے تعلیم کو نہ صرف ضروری تکنیکیں فراہم کرنی چاہئیں بلکہ اسے وہ منزل بھی واضح طور پر بتانی چاہیئے جس کی طرف قدم اٹھایا جائے۔ استاد کی نگاہ

زندگی کے وسیع تر اور عمیق تر مقصد پر ہونی چاہیئے۔ خواہ وہ تاریخ پڑھائے یا ریاضی۔ اس کی نگاہ تاریخ کے سنوں اور الجبرا کے کلیوں سے پرے زندگی اور معاشرے کی منزل مقصود پر بھی رہنی چاہیئے۔ تاکہ وہ اپنی تدریس اور ان نہائی قدروں کے درمیان رابطہ پیدا کر سکے، چوں کہ زندگی محض ظاہری لباس سے عبارت نہیں اس لئے استاد کا فرض ہے کہ نوخیز طلبہ میں فوری اور نہائی دونوں قسم کی قدروں کا احساس پیدا کرے۔ ایسی قدریں جن میں معاشرتی اور کائناتی دونوں حسن موجود ہوں جس استاد نے خود کبھی ان مسائل پر غور نہیں کیا وہ نوخیز طلبہ کا قابل اعتماد رہنما نہیں بن سکتا۔ استاد اپنے مضمون پر لاکھ حاوی ہو اور طریقہ ہائے تدریس میں خواہ کتنا ہی ماہر کیوں نہ ہو اگر اس نے ایک خاصے جامع اور معقول فلسفے کی روشنی میں زندگی کے ہمہ گیر مقصد کو یقین کے ساتھ نہیں سمجھا تو وہ ایک مکمل طور پر قابل استاد نہیں۔ ونعم ما قیل۔

قلندر جز دو حرف لا اللہ کچھ بھی نہیں رکھتا

فقیہہ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا

ہمارا ماضی وحال اسلامی دنیا نے تعلیم و تدریس کی جو شاندار روایات قائم کیں ان سے کون بے خبر ہے؟ لیکن تعلیم کی یہ فلک بوس عمارت تمام تر روحانی اور اخلاقی بنیادوں پر اٹھائی گئی تھی۔ "افحسبتم انما خلقناکم عبثاً و انکم علینا لا ترجعون" کے خدائی انتباہ نے اس تعلیم کو ہمیشہ بے راہ روی سے بچائے رکھا۔ یہ اسی بات کا صدقہ تھا کہ ہمارے نامور علما اور اساتذہ اخلاق و تقویٰ میں بھی غیر معمولی پایہ کے لوگ ہوا کرتے تھے۔ علم اور روحانی اقدار دو متبادل لفظ خیال کئے جانے لگے تھے۔ ہر چند کہ یہ استاد جدید تدریسی تکنیکوں اور طریقہ ہائے تدریس سے ایک حد تک بے خبر تھے لیکن زندگی کے مقصد کے بارے میں انہیں کوئی غلط فہمی نہ تھی۔ تخلیق کائنات اور انسانی زندگی کا منشا انھوں نے پوری سوجھ بوجھ کے ساتھ اچھی طرح سمجھ رکھا تھا۔ منزل کی یہ تعیین ان کی فنی کمیوں کی کافی سے زیادہ تلافی کر دیتی تھی۔ نتیجہ یہ تھا کہ ان کی مساعی کی پیداوار غیر معمولی طور پر تسلی بخش تھی جو لوگ ان سے تربیت حاصل کرتے تھے وہ عموماً ایک دوررس نگاہ اور ایک رخ شخصیت لے کر نکلتے تھے۔

مغرب کے سیاسی غلبہ کے ساتھ مغرب کا نظام تعلیم بھی آیا۔ اس نظام نے پہلی مرتبہ ہمیں سیکولر تعلیم سے
متعارف کرایا۔ تعلیم اور اخلاق کا صدیوں پرانا بندھن ٹوٹنے لگا۔ پھر بھی پرانی روایات کے مٹنے میں دیر لگی
کافی سال تک انگریزی مدرسوں کے استاد بھی پرانی وضعداری پر جمے رہے۔ لیکن ان روایات کو مٹانے والے
اثرات پوری شدت کے ساتھ مصروف کار تھے۔ رفتہ رفتہ خالص سیکولر چھاپ کے استاد پیدا ہونے لگے۔
ان کے زور پکڑتے ہی تعلیم کی بے مقصدی ایک ہمہ گیر شکایت بن گئی۔ پڑھے لکھے نوجوانوں کا اخلاقی
دیوالیہ پن ضرب المثل بننے لگا۔ لوگ حسرت کے ساتھ پہلے وقتوں کے مکتبوں اور ان میں پڑھانے والے
بزرگوں کو یاد کرنے لگے۔ ہر نسل نے محسوس کیا کہ اس کے بعد آنے والی نسل کو جو تعلیم ملی ہے وہ مقابلتاً
کم مؤثر ہے۔ اس افسوسناک صورت حال کی بہت سی توجیہیں کی گئیں بعض نے کہا کہ پرانی درسی کتابیں جن
اخلاقی سبقوں سے بھرپور تھیں وہ بلند تعلیمی معیاروں کے ضامن تھے۔ بعض نے کہا کہ پرانے طریقہ ہائے
تدریس زیادہ کارگر تھے۔ بعض نے یہ خیال ظاہر کیا کہ پرانے استادوں کی مار پیٹ تعلیم کو بلند سطح پر رکھنے کی موجب
تھی، جو شخص تعلیم کی فکری تاریخ سے واقف ہے وہ فوراً جان لے گا کہ ان میں سے کوئی سبب بھی پست تعلیمی
معیاروں کا موجب نہیں۔ اصل سبب جس کی جڑیں اب کافی گہری ہو چکی ہیں یہ ہے کہ ہمارے استاد عموماً
ایک واضح فلسفۂ حیات سے دن بدن کورے ہوتے جا رہے ہیں۔ سکول، کالج یا تربیتی درس گاہ میں
اس فلسفہ کی بہم رسانی کا کوئی خاص انتظام نہیں۔ اگر اتفاقاً کسی کے ہاتھ یہ دولت لگ گئی تو لگ گئی
ورنہ اکثریت زندگی کے مادی مقاصد کے سوا کسی اور شے سے واقف نہیں، جہاں استادوں کی ذہنی
پرواز کی آخری حد اتنی پست ہو وہاں شاگردوں میں بلندی ڈھونڈنا خود فریبی کے سوا کچھ نہیں۔

بچوں کے لئے تفریحی تعلیم

اویس احمد

ٹکنالوجی کی ترقی نے تعلیم کو بہت سے نئے مؤثر وسائل عطا کئے ہیں جن سے جدید تعلیم نے کافی فائدہ اٹھایا ہے۔ طرح طرح کی تعلیمی فلموں اور فلمی ٹکڑوں کی افادیت کسی سے پوشیدہ نہیں۔ یہی حال ریڈیو کی نشریات کا ہے۔ تمام ترقی پسند ملکوں میں تعلیمی نشریات بچوں کی تعلیم و تربیت میں روز افزوں حصہ لے رہی ہیں۔ لیکن جہاں نئی سائنسی ایجادیں عموماً تعلیم کے کام کو زیادہ سہل بنا دیتی ہیں۔ وہاں بعض اوقات کم از کم وقتی طور پر کچھ الجھنیں بھی پیدا کر دیتی ہیں۔ اس وقت اس طرح کی دقت ٹیلی وژن نے پیدا کر رکھی ہے۔ سائنس کی یہ نئی ایجاد ریڈیو سے ایک قدم اور آگے بڑھی ہے۔ یہ نہ صرف بولنے یا گانے والے کی آواز نشر کرتی ہے۔ بلکہ اس کی شکل و صورت اور حرکات و سکنات بھی۔ اس نے گویا ریڈیو سیٹ کو پردۂ سیمیں میں تبدیل کر دیا ہے۔ ہمارے یہاں ابھی ٹیلی وژن موجود نہیں۔ لیکن جن ملکوں میں سائنس کی یہ نئی برکت عام ہو چکی ہے وہاں اس نے اساتذہ اور والدین کے لئے ایک حقیقی مسئلہ پیدا کر دیا ہے۔ بچوں کے لئے اس کی کشش بے پناہ ہے۔ وہ فارغ اوقات کا بڑا حصہ اس کی نذر کر دیتے ہیں اور اس میں ایسے کھوئے رہتے ہیں کہ دوسرے تعلیمی یا تفریحی مشغلوں کی طرف دھیان نہیں کرتے۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ میں ٹیلی وژن اساتذہ اور والدین کے لئے ایک مشکل سوال بن چکا ہے۔ وہاں ٹیلی وژن کے سیٹ عام گھروں میں ہیں۔ ٹیلی وژن اسٹیشن تمام تر پرائیویٹ کمپنیوں کے ہاتھوں میں ہیں جو نجی منفعت کی خاطر اپنے پروگراموں میں ایسے بھڑکیلے پن کا اہتمام کرتی ہیں جسے تعلیمی طور پر پسندیدہ نہیں کہا جا سکتا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ٹیلی وژن کوئی بری چیز ہے۔ یہ ایجاد ابھی اپنے بچپن میں ہے رفتہ رفتہ اس کے تعلیمی امکانات سے فائدہ اٹھایا جانے لگے گا۔ لیکن سردست یہ امریکی تعلیم کے لئے باعث دردسر بنی ہوئی ہے۔

مبادل تفریحی پروگرام اس یقین نے کہ تفریح صرف محو تماشہ ہونے کا نام نہیں بلکہ یہ اس سے زیادہ تخلیقی مشاہدات سے عبارت ہے۔ امریکی ماہرین تعلیم کو اس پر آمادہ کیا ہے کہ ابتدائی مدرسہ کی منزل ہی سے زندگی بخش تفریحی پروگراموں کو رائج کیا جائے۔ ایسے پروگرام اب ملک بھر میں رائج ہیں۔ ان کا مقصد ایسے پسندیدہ تفریحی مشغلوں کے ساتھ پائدار دلبستگی پیدا کرنا ہے جو بچوں کے فارغ اوقات اور فالتو توانائی کو تخلیقی انداز میں جذب کریں۔

مختلف مدرسوں میں مختلف تفریحی پروگرام رائج ہیں۔ پروگرام کے اوقات میں والدین اور دوسرے لوگوں کو مدرسہ میں آنے اور بچوں کی تخلیقی دلچسپیوں کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرنے کی عام اجازت ہوتی ہے۔ بلکہ ان کی آمد کا خیر مقدم کیا جاتا ہے۔ جو لوگ ان پروگراموں کا مشاہدہ کرتے ہیں وہ ان کے رنگا رنگ تنوع اور جاذبیت سے بڑے متاثر جاتے ہیں۔

مثال کے طور پر یہاں ایک مدرسے کی تفریحی تعلیم کا ذکر کیا جاتا ہے۔ اس مدرسہ میں طرح طرح کے کلب قائم ہیں اور ہر طالب علم ان میں سے کسی نہ کسی کلب کا رکن ہے۔ سوموار کے دن بعد از دوپہر کلبوں کی سرگرمیاں عام پڑھائی کی جگہ لے لیتی ہیں۔ یہ تفریحی پروگرام اڑھائی بجے بعد دوپہر شروع ہوتا ہے اس وقت تک قبل از پرائمری جماعتیں ختم ہو جاتی ہیں اور ان جماعتوں کے استاد بھی تفریحی پروگرام میں ہاتھ بٹانے کے لئے فارغ ہو جاتے ہیں۔ اس طرح یہ ممکن ہو جاتا ہے کہ کسی کلب کے سرپرست کو بیس سے زیادہ طلبہ کی نگرانی نہ کرنی پڑے۔ یہ کلب جن سرگرمیوں میں حصہ لیتے ہیں ان میں سے چند یہ ہیں:۔
دست کاری۔ ٹکٹ جمع کرنا۔ تتلیوں کا تماشہ کرنا۔ عوامی ناچوں میں حصہ لینا۔ کارٹون بنانا۔ ہوائی جہازوں کے نمونے بنانا۔ کھانے پکانا اور سیر و سیاحت کے متعلق بحث و مباحثہ کرنا۔

ایک اور مدرسے کے تفریحی پروگرام میں یہ بھی شامل ہے کہ طلبہ بچوں کے عجائب گھر میں جائیں جہاں طرح طرح کے زندہ جانوروں کا کافی بڑا مجموعہ موجود ہے۔ نیز اس مدرسے کے بچے شہر کی آرٹ گیلری میں بھی جاتے ہیں، جہاں بچوں کے لئے خاص سبقوں کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ اس مدرسے کے سینکڑوں بچے تعطیلات گرما میں موسیقی کی جماعتوں میں شامل ہوتے ہیں اور یہ تربیت انہیں بالآخر بچوں کے

بینڈ کا رکن بنا دیتی ہے۔ اس کے علاوہ بچوں کو مطالعہ قدرت اور سیر و سیاحت سے متعلق کئی فلمیں دکھائی جاتی ہیں۔ انگریزی زبان کے مدرس تفریحی مطالعہ کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ تعطیلات گرما میں سفری کتب خانے چلائے جاتے ہیں۔ مدرسے کے ساتھ جو ورکشاپیں ملحق ہیں وہ اس قسم کی عملی مہارتوں کی تربیت دیتی ہیں جو فارغ اوقات میں کارآمد ثابت ہوں۔

ایک اور مدرسے میں بچوں کو خاکے، تصویریں اور پس منظر تیار کرنے کی تربیت دی جاتی ہے۔ وہ ٹکٹوں۔ طرح طرح کی چٹانوں۔ پھولوں اور پتوں کے مجموعے فراہم کرتے ہیں۔ تیتا۔ سینا اور رنگنا سیکھتے ہیں۔ لکڑی کے نمونے بناتے ہیں۔ اور تمثیل کاری کی مشق کرتے ہیں۔ یہ مدرسہ اس نظریے کا حامل ہے کہ انسانی زندگی کے آٹھ بنیادی مقاصد میں سے تفریحی مشاغل بھی ایک ہیں۔

لونگ بیچ کے مدرسوں میں تفریحی مشاغل پر اس قدر زور دیا جاتا ہے کہ انہیں معاشرتی علوم کے مطالعہ میں نظر انداز نہیں کیا گیا۔ مثلاً اس مضمون کے مطالعہ میں بچے اوزاروں سے لکڑی کاٹ کر سرخ ہندیوں کی بستیوں کے نمونے اور پرانی وضع کی گاڑیوں اور قلعوں کے نمونے تیار کرتے ہیں جب وہ چین کا حال پڑھتے ہیں تو مٹی کے برتن بنانے اور ان پر روغن کرنے کا تھوڑا بہت عملی کام سیکھتے ہیں اور جب سوئٹزرلینڈ کے متعلق پڑھتے ہیں تو اس ملک کے خوبصورت پہاڑوں اور جھیلوں کے نمونے تیار کرتے ہیں۔ اس مدرسے اور معاشرے کے درمیان اس حد تک تعاون موجود ہے کہ بچے تفریحی مشاغل کے ضمن میں جو مہارتیں سیکھتے ہیں وہ مابعد کے سالوں میں بھی بروئے کار آتی رہتی ہیں۔

ایک اور مدرسہ باہر جنگل میں ایک بڑا باورچی خانہ تیار کر رہا ہے۔ تاکہ لڑکے اور لڑکیاں جب باہر تفریح کے لئے جائیں تو یہ ان کے کام آئے۔ باورچی خانہ کی تعمیر خود طالب علم کر رہے ہیں اور ماہر انہیں صرف مشورہ دینے پر اکتفا کرتے ہیں۔ یہی حال گرد و نواح کے تفریحی میدانوں کا ہے جو تیار ہو رہے ہیں، اس تعمیر پر جو لاگت آ رہی ہے وہ ان چندوں سے پوری ہو رہی ہے جو فارغ التحصیل طلبہ یا دوسرے لوگوں سے جمع کئے گئے ہیں۔ یہ تفریحی میدان مختلف قسم کی کھیلوں اور گھوڑ

بھی گنجائش پیدا کریں گے۔ ایک اور تربیتی مدرسہ میں یہ دستور ہے کہ معاشرتی علوم کے
بابعض غیر ملکوں کا مطالعہ ہو ان کے تفریحی مشغلوں کو بھی زندہ شکل دی جائے ۔ مثلاً جب میکسیکو
پڑھا جاتا ہے تو طلبہ قدیم میکسیکو تہذیب کے لباس تیار کرتے ہیں ، اس عہد کے عوامی ناچ
سیکھتے ہیں اور اس طور پر اس مٹی ہوئی تہذیب کی ایک جیتی جاگتی جھلک پیدا کر دیتے ہیں۔
ایک اور مدرسے کے تفریحی پروگرام میں موسیقی کے سازوں اور ان کے استعمال کا لمبا چوڑا نصاب
ہے۔ اس مدرسے میں ابتدائی سائنس کا مطالعہ قدرتی سائنس کے ایک عجائب گھر میں کیا جاتا ہے
سے کا ایک ہمہ وقت ملازم اس عجائب گھر میں رہتا ہے۔ جانوروں پرندوں ، درختوں اور پودوں
مطالعہ کے لئے بچوں کو اس عجائب گھر میں بھیج دیا جاتا ہے جہاں وہ قدرتی ماحول میں ان چیزوں کا
مطالعہ کرتے ہیں۔

یہاں یہ خیال نہ کرنا چاہیئے کہ جن مدرسوں میں اس قسم کے تفریحی پروگرام رائج ہیں انہیں غیر معمولی
سہولتیں حاصل ہیں یا ان کے ہاں اساتذہ کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ہونٹ ورتن اسکول کیلئے نوریتیا
مڈل اسکول ہے جس کی آٹھ جماعتوں کو صرف چار استاد پڑھاتے ہیں۔ اس مدرسہ میں پچھلے
سالوں سے راہ نمائی کی تربیت کا پروگرام زیر عمل ہے۔ ساتویں اور آٹھویں جماعتوں کے طلبہ
خدمات رضاکارانہ طور پر پیش کرتے ہیں۔ ان کے ذمہ یہ کام ہے کہ دوپہر کے وقت جب تفریح کا
آئے تو اس وقت تمام بچوں کے لئے تفریحی پروگرام پیش کریں۔ اس ذمہ داری میں ان دونوں
جماعتوں کا ہر طالب علم حصہ لیتا ہے۔

تفریحی پروگراموں کی تیاری استادوں کے مشورہ اور ان کی راہ نمائی میں ہوتی ہے۔ استاد پہلے
سے مقررہ اوقات پر ان متعلم راہ نماؤں کے ساتھ مل کر بیٹھتے ہیں اور مختلف سرگرمیوں کے منصوبے تیار
کرکے انہیں ان کی تربیت دیتے ہیں۔ عموماً یوں کیا جاتا ہے کہ ایک لڑکے اور ایک لڑکی کو ہفتہ بھر
کے لئے پہلی سے چوتھی جماعت کی راہ نمائی سونپ دی جاتی ہے۔ ہفتہ ختم ہونے پر متعلم راہ نماؤں کا
جلسہ ہوتا ہے جس میں ان دونوں کی کارکردگی پر تحریری تنقید کی جاتی ہے۔ یہ تنقید عموماً خاصی پختگی کا

۔ لئے ہوتی ہے ۔

پاس ہی ایک اور چھوٹی سی آبادی میں مدرسہ نے ایک نہایت مفید اور دلچسپ پروگرام جاری کیا ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ محدود ذرائع کے ساتھ کیا کچھ کیا جا سکتا ہے۔ اس مدرسے کنڈرگارٹن سے لے کر آٹھویں جماعت تک کل ۲۰۰ طالب علم ہیں۔ ہر ہفتہ کے دن جب مدرسہ میں (تعطی)ل ہوتی ہے طرح طرح کی کھیلوں کے مقابلے ہوتے ہیں جو ساڑھے نو بجے صبح سے ساڑھے چار بجے (سہ پہر) دوپہر تک جاری رہتے ہیں۔ صدر معلم خود ہمیشہ ان کھیلوں میں حصہ لیتے ہیں اور اپنی مدد کے لئے (دو طر)ف ایک اور استاد کو بلاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ بچے چھٹی کی دلچسپیوں کو چھوڑ کر ان کھیلوں (می)ں آ شریک ہوتے ہیں۔ کل ۲۰۰ طلبہ میں سے عموماً ۱۲۰ حاضر ہوتے ہیں۔ واضح رہے کہ یہ حاضری (با)لکل رضاکارانہ ہے کیونکہ ریاستہائے متحدہ میں ہفتہ اور اتوار دونوں دن مدرسوں کے لئے چھٹی (کے)، دن ہیں۔ بچے اپنا دوپہر کا کھانا ساتھ لاتے ہیں، دوپہر کو مدرسے کے دارالطعام میں سب اکٹھے (بیٹ)ھ کر کھانا کھاتے ہیں۔ اس کے بعد انہیں فلمیں دکھائی جاتی ہیں۔ اب اس پروگرام میں یہ اضافہ (ہو)ا ہے کہ لڑکیاں اپنی ماؤں کی تواضع چائے سے کرتی ہیں اور بچوں اور والدین کے مخلوط گروہوں (کے) لئے تفریحی سامان مہیا کیا گیا ہے۔ بستی میں مدرسے کا یہ پروگرام بے حد مقبول ہوا ہے ۔

معذور بچوں کا کیمپ ساحل سمندر پر سینٹا کروز کے پہاڑوں میں جسمانی طور پر معذور بچوں کے لئے گرمائی کیمپ قائم کیا گیا تھا۔ بہت سے مدرسوں نے اپنے (ج)سمانی طور پر معذور بچوں کو یہاں ہوائی جہازوں کے ذریعہ بھیجا۔ ان بچوں کو ایک محدود قسم کی جسمانی (ت)ربیت اور قدرتی سائنس کی تعلیم دی گئی۔ یہ نصاب دو ہفتے کا تھا۔ لیکن اس نصاب کی بڑی خوبی یہ تھی کہ یہ رنگا رنگ تفریحی مشاغل کا ایک جزو تھا۔

ایک ابتدائی مدرسے کا کارنامہ جو لوگ شانرٹ ابتدائی مدرسہ کو دیکھنے جاتے ہیں۔ انہیں یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ مدرسے کے وسائل میں ایک سوئمنگ تالاب بھی شامل ہے۔ ایک چھوٹی سی بستی میں ایک ابتدائی مدرسے کے لئے یہ ایک بہت بڑی

ہے۔ کنڈرگارٹن سے لے کر آٹھویں جماعت تک ہر بچے کو سال میں سات مہینوں تک تیرنے کی
تعلیم دی جاتی ہے۔ بڑی جماعتوں کے لڑکے اور لڑکیاں چھوٹے بچوں کو تیرنا سیکھنے میں مدد دیتے
ہیں۔ ہر بچے کو تیرنا سیکھنا پڑتا ہے۔ ہاں اگر کوئی طبی طور پر معذور ہو تو الگ بات ہے۔ تیراکی کے علاوہ
کھیلوں میں مہارت پیدا کی جاتی ہے۔ یہاں بھی بڑی جماعتوں کے طلبہ چھوٹی جماعتوں کی رہنمائی کرتے
ہیں۔ دوپہر کے وقفہ میں کوئی ۸۵ فی صد طلبہ ان تفریحی پروگراموں میں مشغول نظر آتے ہیں جو تفریحی مہارتیں
ان میں پیدا کی جاتی ہیں وہ مابعد کی زندگی میں مستقل کام دینے والی ہیں۔

ریڈلینڈز کے شہر میں ایک تفریحی منصوبہ پر دیر سے سوچ بچار ہو رہا تھا۔ اس پر اس سال عمل شروع
کیا ہے۔ منصوبہ یہ ہے کہ بچوں اور بالغوں کے اشتراک عمل سے کھیلوں اور تفریحی مشاغل کی سہولتوں کو
وسیع کیا جائے۔ طالب علموں کے کلب اس پروگرام میں زیادہ توجہ کھیل کے میدانوں۔ مدرسے کی ستھرائی
حفاظت۔ ٹورنامنٹوں۔ کھیلوں کی نگرانی اور اس طرح کی دوسری باتوں کی طرف دیتے ہیں۔ اس طرح
اس کو منصوبہ بندی اور رہنمائی کی جو تربیت ملتی ہے، اس پر اب زیادہ زور دیا جانے لگا ہے۔

دیکھنے والے کو بڑی حیرت اس وقت ہوتی ہے جب وہ سیراز کے الگ تھلگ چھوٹے چھوٹے پہاڑی
مدرسوں کو دیکھتا ہے۔ یہ مدرسے جن رنگارنگ تفریحی مشاغل کا اہتمام کرتے ہیں وہ تنوع اور دلچسپی
کے اعتبار سے بہترین تفریحی مشاغل کہے جا سکتے ہیں۔ ان میں لڑکے اور لڑکیاں مل جل کر حصہ لیتے ہیں
ان مشاغل کی بدولت طلبہ کے درمیان بہت عمدہ مراسم قائم رہتے ہیں۔

سیراز سے آگے ایک اور پہاڑی علاقہ ہے جہاں آبادی اور بھی چھدری ہے۔ یہاں کے مدرسوں میں جو
تفریحی پروگرام رائج ہیں انہیں دیکھ کر یہ اندازہ ہونے لگتا ہے کہ ناموافق حالات میں بھی اساتذہ اور
طلبہ کے سرگرم تعاون سے کیا کچھ ہو سکتا ہے۔ اساتذہ اور طلبہ مل کر کھیلوں میں حصہ لیتے ہیں اور کھیلوں
کے مقابلے اکثر ہوتے رہتے ہیں۔

پاساڈینا کے مدرسوں میں یہ دستور ہے کہ کھیلوں کے نگران کھیل کے میدانوں میں جا کر بچوں کو
نئی جسمانی مہارتیں سکھاتے ہیں اور آنے والے جسمانی مقابلوں کے متعلق دلچسپی پیدا کرتے ہیں۔ اس

شہر کے مدرسوں میں یہ انتظام بھی موجود ہے۔ لڑکوں اور لڑکیوں کو ایسی ہر قسم کی مہارتیں سکھا
جو انہیں زندگی میں کام دیں گی۔ اس کے علاوہ مدرسوں میں ناچ موسیقی اور اداکاری کے کلب
موجود ہیں۔

خاتمہ کلام اور جن رنگا رنگ تفریحی مشاغل کا ذکر ہوا ہے ان کی غایت فقط یہ ہے کہ طلبہ میں
استعداد پیدا کر دی جائے جو انہیں اس قابل بنا دے کہ اپنے فارغ اوقات کو
اور تخلیقی طور پر پُر کر سکیں۔ آج تعلیم کے سامنے یہ ایک مشکل سوال ہے۔ ہر معاشرہ میں مدرسے اپنے معاشر
ماحول کے مطابق اس سوال کا حل تلاش کر رہے ہیں۔ ہمارے مدرسوں میں تمام امریکی تفریحی مشا
حسب حال نہیں ہو سکتے۔ ہم ان میں سے بعض کو رائج کر سکتے ہیں لیکن ہمیں بیشتر تفریحی مش
اپنے مخصوص معاشرتی ماحول کی مناسبت سے وضع کرنے ہوں گے لیکن ان مشاغل کی ضر
کے متعلق بالکل کوئی کلام نہیں۔ ایک ایسے معاشرے میں جہاں بیکاری ایک کہنہ مرض کی صو
اختیار کر چکی ہو یہ بات اور بھی ضروری ہے کہ اس کے مستقبل کے شہری اپنے فالتو اوقات کو
طریقہ پر گذارنا سیکھیں۔

جدید تعلیم کو یہ نکتہ کبھی نہ بھولنا چاہیئے کہ صحت مند تفریحی مشاغل تسلی بخش انسانی تعلقا
بنیاد ہیں۔ ان کی عدم موجودگی کلیت: تنگ نظری اور یاس کا ماحول پیدا کیا کرتی ہے۔ وہ پُرامید
تعمیر و تخلیق کی سب سے بڑی ضامن ہوا کرتی ہے۔ اس کے پیدا کرنے میں پسندیدہ تفریحی مشاغل کا
ہے۔ چند برس ہوئے ہمارے صوبہ کا امن و امان مذہبی تنگ نظری کے باعث تہ و بالا ہوا
دنوں ایک نوجوان پاکستانی سے امریکہ میں بات چیت کرنے کا اتفاق ہوا۔ بڑے درد بھرے لہ
بولے میں نے تہیہ کر لیا ہے کہ وطن میں واپسی پر نوجوانوں میں صحت مند تفریحی مشاغل کی تحر
جب تک ہماری نوعمر پود صحت مند تفریحی مشاغل سے لطف اٹھانا نہیں سیکھتی اس وقت تک
افسوس ناک واقعات کا سدِ باب مشکل ہے۔ بے شک اس نظریہ میں بہت بڑی سچائی ہے۔
تعلیم کو کوشش کرنی چاہیئے کہ تفریحی مشاغل کے تعمیری امکانات سے فائدہ اٹھائیے۔

بالغ عورتوں کی تعلیم

مسز اختر ممتاز

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ تعلیم انسانی فہم وذکا کو جلا دے کر اسے زندگی میں بلند نصب العین حاصل کرنے کے قابل بناتی ہے، انسان تعلیم یافتہ ہو کر نہ صرف اپنی زندگی کو کامیاب بنانے اور بہتر طور پر گذارنے کا اہل ہو جاتا ہے بلکہ اس کی تعلیم اس کی سوسائٹی یعنی اس کے گھر اس کے محلہ اس کی بستی اس کے ملک اور اس کی قوم کو فائدہ پہنچاتی ہے۔ سوسائٹی کو ایک زندہ جسم انسانی سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ ایک جاہل انسان کو اسی جسم کا ایک عضو ناکارہ سمجھئے جو اپنی جہالت کی بدولت پے در پے غلطیوں کا شکار ہو کر ناکامی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے اور سوسائٹی پر بوجھ ہے۔ بخلاف اس کے ایک تعلیم یافتہ انسان اس سوسائٹی کی روح رواں ہے وہ سوسائٹی کا قوی دماغ ہے جو سوجھ بوجھ اور ... بلند خیالات کا حامل ہے، وہ محض اپنی خاطر نہیں جینا اسے اپنی سوسائٹی کے دیگر افراد کی خوشنودی بھی مطلوب ہے، چناں چہ وہ سوسائٹی کے مقاصد و اغراض کو اپنے مقاصد و اغراض پر مقدم سمجھ کر فراخدلی کا ثبوت دیتا ہے اور سوسائٹی کے فوائد کو اپنے فوائد سمجھ کر ہمیشہ نئی تجویزوں پر عمل کر کے سوسائٹی کی ترقی کی راہیں اختیار کرتا ہے۔ ہماری ترقی و بقا کے لئے ضروری ہے کہ ہماری سوسائٹی کا ہر فرد تعلیم یافتہ ہو۔

تعلیم کو عام کرنے کی خاطر ہماری حکومت کی طرف سے اسکول اور کالج کھلے ہیں جن میں ہماری کثیر آبادی کا محض ایک قلیل حصہ یعنی صرف کچھ بچے اور لڑکے تعلیم پا رہے ہیں اور بہت ایسے ہیں جو بوجوہ اسکول اور کالج جانے کے قابل نہیں۔

۱۔ وہ جن کی عمر زیادہ ہے۔ وہ ان اسکولوں میں جہاں بچے پڑھتے ہیں پڑھنا پسند نہیں کرتے۔

۲۔ وہ جو مالی مجبوریوں کی وجہ سے باقاعدگی سے اسکول نہیں جا سکتے اور تعلیم کی موجودہ سہولتوں سے استفادہ حاصل نہیں کر سکتے۔

عورتیں جو گھر ملو فرائض میں اس قدر مصروف رہتی ہیں کہ باقاعدہ تعلیم پانے کے لئے ان کے پاس زیادہ وقت نہیں۔

ہمارے ان بالغ افراد میں سے کچھ ایسے ضرور ہیں جنہوں نے ابتدائی عمر میں پڑھنا شروع کیا پر شدہ بدہ حاصل کر لی لیکن پھر کام کاج میں لگ گئے اور یوں سلسلہ خواندگی ایسا منقطع ہوا ف شناسی تک بھول گئے اور کئی ایسے ہیں جو بالکل ان پڑھ اور جاہل ہیں۔ اس طبقہ میں اکثریت نسواں کی ہے اور اس وقت ان ہی بالغ افراد کی تعلیم کی ضرورت ہمارے پیش نظر ہے۔

عورت کے ذمے دنیا کی اہم ترین ذمہ داری یعنی بچے کی پرورش اور تربیت ہے۔ ہمارے آج کے بچے ے بڑے ہوں گے۔ یہ کمزور ناتواں معصوم ہی ہماری قوم کے معمار ہیں۔ ان کی بہتر تربیت ان کو بہتر ں بنا سکتی ہے۔ اور بُری تربیت ان کو سوسائٹی کا نکما فرد بنانے کی اہل بھی ہو سکتی ہے۔ بچوں کی ربیت گاہ ماں کی گود ہے۔ تعلیم یافتہ ماں ہمیشہ بلند خیال روشن دماغ اور اعلیٰ کردار کی مالک ہوگی پنے بچے میں وہی بلند خیالی اور روشن دماغی پیدا کر سکتی ہے۔ حفظان صحت کا علم بچے کی پرورش کے ۔ ماں کے لئے بڑا مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ بچے کی جسمانی صفائی اس کی اچھی صحت بنانے اور ذہنی وت کو اجاگر کرنے کی محرک ہوتی ہے۔ ہمارے ملک میں جہاں افلاس سے بڑھ کر جہالت کا دور دورہ ۔ اکثر مائیں بچوں کی جسمانی صفائی کا مطلق خیال نہیں کرتیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بعض بچے ایام طفلی ں اس دنیا سے کنارہ کر جاتے ہیں۔ بعض اوقات کمزور اور دائم المریض رہ کر ذہنی بیماریوں میں گھر جاتے ہیں یہ سب محض اس لئے کہ ہماری مائیں ان پڑھ ہیں۔ حفظان صحت کے اصول جاننے والی ہر عورت اپنے تندرست رکھ سکتی ہے۔ جو بچہ جسمانی طور سے تندرست و توانا ہوگا وہ ایک تندرست و توانا دماغ کا مالک ہوگا۔ ایسے بچے پختہ ارادے پاکیزہ خیالات اور بلند کردار رکھتے ہیں اور سوسائٹی و ملک کے بہترین نابت ہوتے ہیں۔

ان حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے ہیں اور ہماری حکومت کو بالغ عورتوں کی تعلیم کی طرف خصوصاً دینی چاہیئے۔ تعلیم سے محض پڑھ لینے کے قابل ہو جانا مقصود نہیں۔ اس لئے کہ کئی لوگ پڑھ لکھ سکتے

ہیں اور اس کے باوجود جاہل رہتے ہیں اور وہ اس طرح کہ وہ پڑھنے سے فائدہ نہیں اٹھاتے۔ جب اسکول میں رہتے درسی کتب پڑھتے رہتے اور جب اسکول چھٹا تو پڑھائی وڑھائی سب بالائے طاق اپنے کام میں اس درجہ منہمک ہوئے کہ پہلا پڑھا ہوا بھی دماغ سے اتر گیا۔ پڑھنا ہمارے لئے علم کرنے کی پہلی سیڑھی ہے اور یہی وہ راستہ ہے جس پر گامزن ہو کر ہم تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اس سیڑھی پر رکھ لینے کو یہ سمجھ لینا کہ ہم نے منزل پا لی نہایت مضحکہ خیز خیال ہے۔ ہاں البتہ اگر ہم مسلسل پڑھتے اور یوں زینہ بہ زینہ علم حاصل کرنے میں ترقی کرتے گئے تو پھر منزل کو پا لینا دور نہیں۔ پڑھنا تو تعلیم حاصل کرنے کے ذرائع میں سے ایک ذریعہ ہے اور یہ وہ واحد ذریعہ ہے جو ہماری حکومت نے ہم پہنچایا ہے اور جس سے ہمارے طبقہ نسواں میں سے محض چند بچیاں صحیح طور پر مستفید ہو سکتی ہیں۔

حکومت کی طرف سے تعلیم کی خاطر اسکول کھولے گئے ہیں لیکن اکثریت ایسی عورتوں کی ہے جو اسکا نہیں پڑھ سکتیں۔ عمر کا تقاضا، گھر کے فرائض اور وقت کی کمی ان کو اجازت نہیں دیتی کہ وہ باقاعدہ حاضر ہو سکیں اور تعلیم حاصل کر سکیں۔ ایسی بالغ عورتوں کی تعلیم کے لئے ہمیں ایسے اداروں کی ضرورت جن میں موجودہ اسکولوں کی سی پابندیاں نہ ہوں۔ گو یہ ادارے بھی اسکولوں کی طرح مستقل ہو بالکل اسی طرح جس طرح کہ بچوں کی تعلیم کے لئے اسکول اور کالج ہیں۔ بالغ عورتوں کی تعلیم کے مرکز ہوں جن میں صرف بالغ عورتوں کی تعلیم کو پیش نظر رکھا جائے اور جن کے اوقات و نصاب با تعلیمی ضرورت و دلچسپی کو مد نظر رکھ کر مرتب کئے جائیں۔

سب سے پہلے تو ہمارے سامنے یہ مسئلہ ہے کہ ایسے مرکز کہاں ہوں۔ سردست لڑکیوں کے ا میں ہی ایسے تعلیمی مرکز قائم کئے جا سکتے ہیں۔ اسکولوں میں مرکز قائم کرنے میں چند فوائد ہیں۔ سب سے تو یہ ہے کہ اخراجات کم اٹھیں گے۔ تعلیمی مرکز میں کئی ایسی اشیا کی ضرورت ہو گی جن سے تعلیم د مدد ہو۔ شلاً نقشے۔ چارٹ۔ بورڈ وغیرہ اور ایسا سامان اسکولوں میں موجود ہوتا ہے۔ دو مرکز قائم ہونے کی صورت میں بلڈنگ کا کرایہ۔ نگراں کے اخراجات وغیرہ مزید خرچ کا باعث جن کے ہم ملک کے موجودہ مالی حالات کے تحت متحمل نہیں ہو سکتے۔

اسکولوں میں مرکز قائم ہونے سے ہمارا دوسرا مسئلہ بھی بخوبی حل ہو جائے گا اور وہ یہ ہے کہ مرکز کے لئے ہمیں اساتذہ کی ضرورت ہوگی اور شروع میں اسکول کی معلمات ہی کی خدمات حاصل کی جاسکتی ہیں. کئی معلمات اسکول کے بورڈنگ ہاؤس میں رہتی ہیں. ان کے لئے اس مرکز میں حاضر ہونا آسان ہوگا اور ان کی خدمات کے صلہ میں حکومت کو ان کی تنخواہ میں مزید اضافہ کرنا ہوگا کئی ضرورت مند بہنیں بخوشی کام کرنے کو تیار ہوں گی اور بہت ممکن ہے کہ کئی استاد بہنیں خدمت خلق کے جذبہ کے تحت بلا معاوضہ بھی اس مرکز میں کام کرنے پر آمادہ ہو جائیں. مرکز کی معلمات بھی اسکولوں کی معلمات کی طرح مستقل ہوں گی. مرکز کے قائم ہو جانے کے بعد شروع میں کچھ مدت تک تو ایک معلمہ سے ہی کام چل جائے گا۔

اس مرکز میں خواتین کے جمع ہونے کا ایسا وقت رکھا جائے جب وہ زیادہ سے زیادہ گھر کے کام سے فارغ ہوں اور پھر یہ بھی دیکھا جائے کہ وہ اوقات ایسے ہوں کہ اسکولوں میں بچیوں کی تعلیم میں حارج نہ ہوں. گھریلو عورتیں عموماً دوپہر کے کھانے کے بعد فارغ ہو جاتی ہیں. چنانچہ گرمیوں میں دو گھنٹے. دو بجے بعد از دوپہر سے چار بجے بعد از دوپہر مناسب رہے گا. موسم سرما میں یہی وقت بچیوں کی تعلیم کا ہوتا ہے لیکن یہ امر مجبوری آغاز میں ہمیں زیادہ مشکلات کا سامنا کرنا ہوگا. اور اسکول میں ایک کمرہ اور ایک معلمہ کو دو گھنٹے کے لئے اس مرکز کے لئے وقف کرنا پڑے گا۔ اس سے لڑکیوں کا زیادہ ہرج نہ ہوگا. عموماً اسکول میں آخری گھنٹے دستکاری کے لئے رکھے جاتے ہیں. کیوں کہ بچیاں اس وقت تک تھک جاتی ہیں اور دماغی کام چستی و مستعدی سے نہیں کر سکتیں، دستکاری کے لئے دو جماعتیں ایک استانی کی نگرانی میں بھی کام کرتی رہیں گی اور یوں دوسری معلمہ فارغ ہو کر مرکز میں کام کر سکتی ہے۔

دو گھنٹے کی تعلیم بالغ عورتوں کے لئے مناسب رہے گی. ان کا نصاب ایسا ہوگا جس کے لئے دو گھنٹے کافی رہیں گے. لیکن یہ ضروری ہے کہ مرکز بلا ناغہ اور باقاعدہ دو گھنٹے کھلا رہے اور خواتین بلا ناغہ حاضر ہوں۔

مرکز کا نصاب عورتوں کی احتیاج اور دلچسپی کو مدنظر رکھ کر مرتب کیا جائے ۔ مذہبی تعلیم ہر فرد کے لئے ضروری ہے ، اس میں شک نہیں کہ قرآن مجید بہتوں نے پڑھا ہو گا ، لیکن اس کے معنی تفسیر و مسائل سے اکثر بہنیں قطعی ناواقف ہوتی ہیں ، دوسرے عورتیں فطرتاً مذہب کی طرف زیادہ مائل ہوتی ہیں ، وہ شوق سے مذہبی تعلیم حاصل کرنے کے لئے مرکز کی طرف کھنچی چلی آئیں گی ۔ بڑی عمر کی عورتوں کو پڑھنے کی طرف راغب کرنا ایک کٹھن کام ہے ۔ لیکن مذہب کے نام پر عورتیں جوق درجوق چلی آئیں گی ۔ قرآن کریم کی تفسیر و مسائل سننے کا شوق ان کو مرکز کی جانب راغب کرنے کا محرک ہو گا ۔ اس لئے دینی تعلیم یعنی قرآن پاک پڑھنا اور اس کے معنی بخوبی سمجھنا سکھایا جائے ۔

اس کے علاوہ چھوٹی موٹی گھریلو دستکاریاں سکھانا بھی خالی از دلچسپی نہ ہو گا ، ویسے تو ہر عورت ضرورت کے ماتحت سینا پرونا اور سویٹرز وغیرہ بننا جانتی ہے ۔ لیکن جدید وضع قطع کے کپڑوں کی تراش اور نئی نئی بنایاں سیکھنا ان کے لئے مفید ثابت ہو گا ۔ ان کے علاوہ کئی اور ایسی دستکاریاں ہیں جن کا سیکھ لینا زیادہ وقت طلب نہیں اور جن کے سیکھنے سے بہنوں کو مالی فائدہ بھی پہنچ سکتا ہے ، اُجرت پر سینا اور سویٹرز بننا تو عام ہے ۔ اسی طرح ٹوپیاں سینا ۔ ٹوکریاں بنانا ۔ گتے و رنگین کاغذ سے کھلونے بنانا ، چیتھڑوں سے گڑیاں سینا ۔ شیشے و پیپرماشی کے ڈبے اور دوسری چیزیں بنانا ۔ پراندے بنانا وغیرہ کئی دستکاریاں ہیں جن سے غریب خواتین فائدہ اٹھا سکتی ہیں ۔ اپنی فرصت کے لمحات میں وہ ایسی اشیا بنا کر ان کو فروخت کر کے اپنی آمدنی میں اضافہ کر سکتی ہیں ۔

بچوں کی پرورش اور بچوں کی نفسیات کا علم بھی خواتین کو دلایا جانا از حد ضروری ہے ۔ بچے کی پیدائش سے لے کر اسکول جانے تک کے زمانہ میں ماں ہی بچے کی تمام تر توجہات کا مرکز ہوتی ہے ۔ اس کی خوشی اور آرام ماں سے متعلق ہوتے ہیں ۔ شروع میں بچہ محض رو کر یا ہنس کر اپنی ناراضگی اور خوشی کا اظہار کرتا ہے ۔ فطرتاً بچہ بلاوجہ ہرگز نہیں روتا ۔ کسی چیز کی خواہش بھوک یا تکلیف اس کے رونے کے اسباب ہوتے ہیں ۔ جاہل ماں اکثر اوقات بلا سوچے سمجھے اس کے رونے کی وجہ کو بھوک سمجھ کر دودھ دیتی ہے ۔ بچہ اگر بھوک سے رویا ہے تو چپ ہو جائے گا ۔ اگر کسی اور وجہ سے رویا ہے تو بھی وقتی طور سے

چپ ہو جائے گا لیکن کچھ ہی دیر کے بعد پھر اپنی تکلیف یا خواہش دوہرائے گا۔ بلکہ اب اس کے رونے کی وجہ ناراضگی بھی ہوگی۔ ماں پھر اسے دودھ دے کر چپ کرانا چاہتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچہ جھنجلا جھنجلا کر روتا ہے اور یوں چڑچڑا اور ضدی ہو جاتا ہے۔ اس ذہنی تکلیف کے علاوہ اکثر بچوں کو ماں کی ناسمجھی کی وجہ سے جسمانی تکالیف سے بھی بار بار دوچار ہونا پڑتا ہے۔

شیرخوارگی کا عالم گذار کر بھی جب تک بچہ اسکول جانے کے قابل نہیں ہو جاتا وہ ماں کو ہی اپنا رفیق، دوست اور ہمدرد و غمخوار سمجھتا ہے اور ماں کو خوش دیکھ کر خوش ہوتا ہے، اس وقت ماں کی محبت و شفقت بچے کی آئندہ زندگی کو کامیاب بنانے میں بہت مددگار ہوتی ہے لیکن عموماً یہ دیکھا گیا ہے کہ کثرت اولاد کی وجہ سے کچھ مجبوراً اور پھر عادتاً مائیں خود بھی چڑچڑی ہو جاتی ہیں اور ہر وقت بلاوجہ بچے کو دھمکاتی اور مارتی رہتی ہیں۔ یا پھر اسے ان دیکھے ہوّوں سے ڈرا کر خاموش کرا دیتی ہیں، دوسرے بچوں کے سامنے اپنے بچوں کو ڈانٹ ڈپٹ کرتے ہوئے انہیں ذرا احساس نہیں ہوتا کہ وہ بچے کے جذبۂ خودداری کو ٹھیس لگا کر چکنا چور کر رہی ہیں۔ اور اس میں ان کے اس سخت رویہ کی وجہ سے انکے اپنے خلاف انتقام کا جذبہ پرورش پانے لگ جاتا ہے جو بڑے ہونے پر نہ جانے کون سی راہ اختیار کرے جاہل ماں بلاوجہ ناراض بھی ہوتی رہتی ہے اور پھر بعض اوقات بے جا لاڈ پیار بھی کرتی ہے جس سے بچہ ایک کشمکش میں پڑ جاتا ہے اور حیران ہے کہ ماں کو اس کا کون سا کام خوش کر سکتا ہے، چنانچہ اس میں ذہنی پیچیدگیاں بڑھتی رہتی ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچہ الجھنوں میں گرفتار ہو کر زندگی کے ایسے دوراہے پر آ کھڑا ہوتا ہے جہاں اس کے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوتا ہے کہ کون سی راہ اختیار کرے غرضیکہ یوں اس کی زندگی ایک مسلسل تذبذب میں گذر جاتی ہے تعلیمی نفسیات سے بہرور ماں بچہ کی معمولی سے معمولی حرکات کو سمجھ کر اس کی خواہش، شوق، تکلیف و ناراضگی کو جان کر مناسب عمل کرتی ہے ہر ایک عورت کے لئے بچوں کی نفسیات سے واقف ہونا ضروری ہے۔ نفسیات کا مضمون بڑا دلچسپ ہوتا ہے اور چوں کہ دلچسپی کے علاوہ کارآمد ہوتا ہے عورتیں شوق سے حصہ لیں گی۔

حفظانِ صحت کا علم بھی عورتوں کے لئے اتنا ہی ضروری ہے۔ جتنا کہ نفسیات کا علم۔ شبہ ہو اگر یہ

مقولہ ہے کہ ایک تندرست و توانا جسم ایک تندرست و توانا دماغ کا حامل ہوتا ہے: بچہ کی اور اپنی صحت اور تندرستی کو برقرار رکھنے کے لیئے ہر ماں کو اور ہر عورت کو حفظان صحت کے علم سے واقف ہونا چاہیئے۔ بچوں کی چھوٹی چھوٹی تکالیف کو مائیں نظر انداز کر دیتی ہیں جو درست نہیں۔ اس لئے کہ بعد میں یہی معمولی تکالیف بڑھ کر خطرناک صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ جاہل ماں اکثر ناسمجھی سے اپنا مرض بچے کو دے دیتی ہے۔ اس لئے ہمارے ملک میں موروثی امراض کی کثرت ہے۔ بچا ہوا کھانا اور خصوصاً بچا ہوا پانی نہایت مضر ہوتا ہے۔ جاہل مائیں بلا تکلف اپنا جھوٹا پانی بچے کو پینے کے لئے دے دیتی ہیں۔ ہمارے گھر ایک عورت کپڑے دھونے آیا کرتی تھی۔ ایک روز اپنے ساتھ اپنے بچے کو بھی لائی۔ اس روز اس کو زکام کی شکایت تھی۔ دوپہر کو کھانا کھا کر پانی پیا اور وہی بچا ہوا پانی بچہ کے مانگنے پر اس کو دے دیا۔ مجھے معلوم ہوا تو میں نے اس کو منع کیا کہ جھوٹا پانی بچے کو مت پلایا کرو۔ اس کا جواب اتنا سادہ تھا کہ سن کر افسوس بھی ہوا اور ہنسی بھی آئی۔ بولی۔ بی بی خدا نہ کرے ہم کوئی ہندو تھوڑی ہیں جو چھوت کریں۔ میں نے اسے سمجھایا کہ جھوٹے پانی میں اور تو کوئی چھوت نہیں ہاں اس سے بیماری کی چھوت ضرور ہوتی ہے اور اب جو تم نے بچے کو اپنا جھوٹا پانی پینے کو دیا ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہارے بچے کو بھی زکام ہو جائے گا، مختصر یہ کہ گلے دانت۔ پیٹ، جگر اور پھیپھڑوں وغیرہ کے امراض بہت جلد ماں سے بچے کو منتقل ہو جاتے ہیں اور مناسب احتیاط سے روک تھام ہو جاتی ہے۔ گھر اور کھانے کی صفائی، مچھر اور مکھی سے بچاؤ وغیرہ کی ضرورت کو سمجھنے کے لیئے اور امراض اور ان کے معمولی علاج کی واقفیت کے لیئے عورتوں کو حفظان صحت کا علم ضرور ہونا چاہیئے۔

بعض اوقات عام معلومات سے واقفیت دلانے کے لیئے لکچر ہونے چاہئیں جن میں دوسرے ملکوں کے باشندوں خصوصاً عورتوں کے متعلق بتایا جائے کہ کس طرح اور کون کون ملک کی خواتین تعلیم و ترقی میں پیش پیش ہیں۔ کون سے ملک تہذیب یافتہ ہیں اور کن وجوہات سے وغیرہ دوسروں کی ترقی و تمدن کو دیکھ کر انسان خود بھی انہی مدارج پر پہنچنے کی سعی کرتا ہے اور عورتوں میں تو تقلید کا مادہ بدرجہ اتم موجود ہے۔ اگر اپنی ذہنی ترقی اور قوم کی ترقی کے لیئے دوسرے ممالک کی اچھی عادات و صفات کی تقلید

کریں بھی تو کچھ بُرا نہیں ۔

شروع شروع میں تعلیم کا طریقہ محض لکچر ہی ہوگا۔ کیوں کہ اکثر خواتین ناخواندہ ہوں گی، ہاں لکچر کو سمجھانے کے لیے امدادی اشیا مثلاً تصاویر، چارٹ اور ماڈل سے مدد لی جائے تو سمجھنا آسان ہو جائے گا ساتھ ہی ساتھ ان پڑھ خواتین کو پڑھنا اور لکھنا شروع کر دیا جائے۔ بالغ عورتوں کی سمجھ بچوں سے زیادہ ہوتی ہے اور وہ جلد پڑھنا سیکھ جاتی ہیں۔ اس لیے ان کو پڑھانے کا طریقہ بھی بچوں کو پڑھانے کے طریقہ سے مختلف ہوگا۔ حروف شناسی کے لیے عام قاعدوں کی بجائے بالغوں کو پڑھنا سکھانے والے خاص چارٹ دیئے جائیں۔ خواندہ خواتین کے لیے ایک لائبریری بھی ضرور ہو جس میں کتابیں عام معلومات کے متعلق ہوں۔ زبان آسان ہو تاکہ سمجھنے میں دقت نہ ہو۔ لیکن بچوں کی لائبریری کی مانند ان میں جن و پری اور کتے بلی کی کہانیاں نہ ہوں، بلکہ عام معلومات اور مفید باتوں کو دلچسپ پیرائے میں بیان کیا گیا ہو۔ تاکہ ان کو پڑھ کر اور زیادہ مطالعہ کا شوق بڑھے۔ خواندہ خواتین کو دلچسپ معلومات پڑھتے دیکھ کر اور سن کر ناخواندہ خواتین بھی جلد از جلد پڑھنے کی کوشش کریں گی۔

اگر ہو سکے تو فلم پروجیکٹر کے ذریعے کبھی کبھار تعلیمی شو بھی دکھایا جائے۔ اس قسم کے ادارے اگر ہمارے ملک میں قائم ہو جائیں تو بالغ عورتوں کی تعلیم عام ہو جائے اور جلد ہی اکثریت تعلیم یافتہ ہو جائے۔ مستقل اداروں کے قیام کے بغیر تعلیم کا عام ہونا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے جس طرح ہماری حکومت بچوں کی تعلیم کو بھی اپنی ذمہ داری سمجھ کر زیادہ اسکول کھول رہی ہے۔ اسی طرح عوام کی تعلیم کو بھی اپنی ذمہ داری سمجھ کر بالغوں کی تعلیم کے خاص مرکز کھولنے کی جلد از جلد کوشش کرنی چاہیئے۔ صاحب اقتدار اور صاحب حیثیت مخیر حضرات بھی اس جد و جہد میں دل کھول کر حصہ لیں۔ لیکن حکومت کی امداد بہر صورت ناگزیر ہے۔

تعلیمی دُنیا پر ایک نظر

عالمی اعداد و شمار کے چند دلچسپ پہلو

یونیسکو نے حال ہی میں جو اعداد و شمار شائع کئے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ دنیا کی آبادی کا ۴۵ اور ۵۰ فی صد کے درمیان حصہ جس کے افراد دس یا دس سال سے زیادہ عمر کے ہیں بالکل ناخواندہ ہے۔ افریقہ میں اَن پڑھ لوگوں کا تناسب سب سے زیادہ یعنی ۷۵ سے ۸۰ فی صد ہے۔ اس کے بعد (روس کو الگ کر کے) ایشیا کا نمبر ہے جس کا تناسب ۶۵ سے ۷۵ فی صد ہے جنوبی امریکہ میں ۴۰ سے ۵۰ فی صد۔ شمالی امریکہ میں ۴۰ فی صد اوشانہ میں ۱۰ سے ۱۵ فی صد اور (روس کو الگ کر کے) یورپ میں ۵ سے ۱۰ فی صد ہے یہ معلومات "عالمی اعداد و شمار" میں درج ہیں جس کا نیا ایڈیشن ترمیم و توسیع کے بعد شائع ہوا ہے۔

اس کتابچے میں ہر ملک کے بچوں کی کل آبادی درج کرنے کے ساتھ ساتھ بتایا گیا ہے کہ وہاں ابتدائی اور ثانوی مدارس میں کتنے بچے داخل ہیں۔ اس کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ریاست ہائے متحدہ میں سب سے زیادہ یعنی ۳۴ ہزار ۴ سو ۶۲ غیر ملکی طلبا اعلیٰ تعلیم پا رہے تھے لیکن اعلیٰ تعلیم پانے والے طلبا کی کل تعداد میں غیر ملکی طلبا کے تناسب کا جہاں تک تعلق ہے سوئٹزرلینڈ اول نمبر پر تھا جہاں ایسے طلبا کی تعداد ۴ ہزار ۷۵ تھی۔

۱۹۵۲ء میں پہلی بار جو کتابیں شائع ہوئی ہیں ان کے اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ برطانیہ میں سب سے زیادہ یعنی ۱۳ ہزار ایک سو ۵۰ نئی کتابیں شائع ہوئیں۔ اس کے بعد مغربی جرمنی میں ۱۰ ہزار ۵ سو ۴۶، فرانس میں ۱۰ ہزار ۴ سو ۱۰۔ جاپان میں ۹ ہزار ۶ سو ۶۳ اور ریاست ہائے متحدہ میں ۹ ہزار ۳ سو ۹۹ چھپیں۔

اس کتابچے کے مطابق ۱۹۵۳ء میں ریڈیو سٹوں کی تعداد جو ساری دنیا میں استعمال ہو رہے تھے ۲۲ کروڑ یعنی ۹۵ فی ہزار تھی۔ ان میں سے نصف ریاستہائے متحدہ میں تھے۔ وہاں موٹر گاڑیوں میں لگے ہوئے ریڈیو سٹوں کی تعداد ۲ کروڑ ۵۰ لاکھ یعنی دنیا کے کل سٹوں کا تقریباً ۱۰ فی صد تھی۔

ریاستہائے متحدہ میں ٹیلی وژن کے سیٹ بھی سب سے زیادہ استعمال ہوتے ہیں۔ جولائی ۱۹۵۳ء میں ان کی تعداد ۲ کروڑ ۱۵ لاکھ تھی اور ان میں ۴ فی صدی سال کے حساب سے اضافہ ہو رہا تھا ستمبر ۱۹۵۲ میں ۲۰ ملکوں سے ٹیلی وژن کا پروگرام باقاعدہ نشر ہو رہا تھا۔

یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ۱۹۵۲ء میں ہانگ کانگ نے ۲ سو ۹ ۵ طویل فلم بنا کر دنیا میں تیسرا نمبر حاصل کیا۔ جاپان میں ۲ سو ۱۷ اور ریاست ہائے متحدہ میں ۳ سو فلم اس سال بنے تھے۔ بھارت میں ۲ سو ۳۳ اور اٹلی میں ایک سو ۴۸ تیار ہوئے تھے۔

لیکن برطانیہ میں سینما دیکھنے والوں کی تعداد بلحاظ آبادی سب سے زیادہ تھی گویا ۱۹۵۳ء میں ہر شخص نے تقریباً ۲۶ بار فلم دیکھے۔ برطانیہ میں روزانہ اخبارات کی اشاعت بھی سب سے زیادہ تھی۔ فی ہزار باشندوں کے لحاظ سے پڑھنے والوں کا تناسب یہ تھا۔ برطانیہ میں ۶ سو ۱۵ سویڈن میں ۴ سو ۹ - جاپان اور ریاستہائے متحدہ میں بالکل برابر یعنی ۳ سو ۵۳، گویا ان دونوں کا دسواں نمبر تھا۔ اس کے برعکس ۱۹۵۱ء میں اخباری کاغذ کا خرچ فی کس ریکے زیادہ ریاست ہائے متحدہ میں ہوا یعنی ۱، ۳۵ کیلو۔ کنیڈا میں ۳، ۲۳ کیلو اور سویڈن میں ۷، ۱۸ کیلو تھا۔

تعلیم اور دستکاریوں کا مشترکہ پروگرام

اس سال فلسطین کے تقریباً ۲ ہزار عرب مہاجر بچوں کے لئے جن کی ابتدائی تعلیم حال ہی میں ختم ہوئی ہے۔ مدرسوں کا نصاب مختلف ہو جائے گا۔ مشرق وسطیٰ کے ثانوی مدرسوں میں تعلیم پانے والے طلبا کے برعکس، وہ اپنا آدھا وقت مدرسے کی جماعتوں میں اور آدھا وقت کارخانوں میں صرف کیا کریں گے۔

یونیسکو اور انروا کے باہمی تعاون سے غزہ میں یہ نیا تعلیمی پروگرام اس سال ستمبر سے شروع ہوگا جس میں اسکول کی نصابی تعلیم اور دستکاریوں کے ضمن میں عملی تربیت کو مشترک کر دیا جائے گا۔ انروا کے شعبۂ تعلیم کے افسر اعلیٰ مسٹر رابرٹ ویسٹ واٹر نے ایک بیان میں کہا۔ ہمیں امید ہے کہ یہ پروگرام جو فی الحال غزہ میں شروع کیا جا رہا ہے مشرق وسطیٰ میں عرب مہاجرین فلسطین کے مفاد کے لئے دوسرے مقامات پر بھی عمل میں لایا جائے گا۔ انروا کا شعبۂ تعلیم اس وقت لبنان۔ شام۔ اردن اور غزہ میں

فلسطین کے ایک لاکھ ۶۰ ہزار سے زیادہ عرب مہاجر طلبا کے لئے ابتدائی ثانوی اور کالج کی تعلیم کا انتظام کر رہا ہے۔

اس پروگرام کو چلانے کے لئے فلسطین کے ۷۰ مہاجر اساتذہ نے جنہیں دستکاریوں کا کچھ تجربہ حاصل تھا چھ ہفتے میں ایک خاص تربیتی نصاب ختم کیا ہے یعنی انہوں نے دو کنیڈی اور دو برطانوی ماہرین کی نگرانی میں لکڑی کا، لوہے کی چادروں کا اور لوہے کا کام سیکھا ہے انروا نے ان ماہرین کی خدمات خاص اسی مقصد سے حاصل کی تھیں۔ اسی دوران میں ۲۰ ایسے یونٹ غزہ میں تعمیر کرنے شروع کر دیئے گئے تھے جن میں سے ہر ایک میں ایک کلاس روم اور دو کارخانے ہیں یہ عنقریب مکمل ہو جائیں گے۔

چھ ہفتے کے نصاب کے دوران میں تربیت پانے والے طلبا نے غزہ میں دستکاریوں کی ایک نمائش بھی کی۔ اس نمائش کا معائنہ کرتے ہوئے یونیسکو کے تعلیمی مشیر مسٹر احمد توقان نے ایک بیان میں کہا۔ اس قسم کے نصاب میں حصہ لینے سے بہت سے عرب نوجوانوں کی مخفی صلاحیتیں منکشف ہو جائیں گی اور انہیں مزید تربیت پانے کا موقع مل سکیگا۔ اس طرح عرب ملکوں میں لامحالہ دستکاریوں اور گھریلو صنعتوں کا معیار بلند ہو جائے گا۔

اساتذہ کی مزید تربیت

اقوام متحدہ کے تعلیمی سائنسی اور ثقافتی ادارے (یونیسکو) اور مہاجرین فلسطین سے متعلق اقوام متحدہ کے بحالیات امور کے ادارے (انروا) نے ملک مشرق وسطیٰ میں جو مدارس مہاجرین کے لئے قائم کر رکھے ہیں۔ ان کے اساتذہ خود طالب علم بن کر ایک مدرسے میں داخل ہوئے ہیں تاکہ وہ معمولی دستکاریاں مثلاً جلد سازی۔ نجاری اور ظروف سازی سیکھیں، اور فارغ التحصیل ہو کر اپنے طلبا کو یہ کام سکھائیں معلوم ہوا ہے کہ لبنان۔ شام۔ اردن اور غزہ میں قائم شدہ مدرسوں کے تقریباً ایک ہزار اساتذہ موسم گرما کی تعطیلات اس طرح گذاریں گے۔ اس تربیتی نظام میں اقوام متحدہ کے دونوں مذکورہ بالا اداروں کے علاوہ عرب حکومتیں بھی تعاون کر رہی ہیں۔

شام میں معاشرتی علوم کی کانفرنس:- یونیسکو کے زیر اہتمام شام کے صدر مقام دمشق میں ایک طبقاتی

کانفرنس منعقد ہوئی۔ جس میں مشرقی بحیرۂ روم کے علاقے اور مشرق وسطیٰ میں معاشرتی علوم کی تعلیم کو فروغ دینے کے موضوع پر غور کیا گیا۔ اس علاقے کے سات ملکوں یعنی مصر، یونان، ایران، عراق، لبنان، شام اور ترکی نے جن کے طریقۂ تعلیم ملتے جلتے ہیں۔ اس کانفرنس میں حصہ لیا۔ لیبیا، اردن اور سعودی عرب میں معاشرتی علوم کی تعلیم یونی ورسٹی کے معیار تک نہیں پہنچی ہے۔ اس لئے اس کے مبصرین نے کانفرنس میں حصہ لیا۔ دراصل یونیسکو نے اس سال معاشرتی علوم کی تعلیم کو فروغ دینے کے موضوع پر دنیا کے تین مختلف حصوں میں تین کانفرنسیں منعقد کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا، دمشق کی کانفرنس اسی سلسلے کی آخری کڑی ہے۔ پہلی کانفرنس جنوبی ایشیا کے لئے اور دوسری جنوبی امریکہ کے لئے مخصوص تھی، دمشق کی کانفرنس کے لئے حکومت شام نے ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچائی ہیں۔

فلموں سے متعلق ایک معاہدے کا نفاذ

یونیسکو کے ایما سے ایک بین الاقوامی معاہدہ پچھلے مہینے نافذ ہوا ہے جس کی رو سے تعلیمی فلموں، فلمی پٹیوں، آواز کے ریکارڈوں اور نشر و اشاعت کے دوسرے سامان پر سے بحری محصول اور تجارتی پابندیاں دور ہو جائیں گی۔ دس ملک اس معاہدے پر عمل کر رہے ہیں جن کے نام یہ ہیں۔

پاکستان، کمبودیا، کنیڈا، ہائیٹی، عراق، ناروے، فلپین، ناروے اور شام اور یوگوسلاویہ۔ گیارھویں ملک یعنی یونان نے بھی اس معاہدے کو قبول کرنے کے لئے دستاویزات اقوام متحدہ کو بھیج دی ہیں۔ وہ ۷ اکتوبر سے اس پر عمل شروع کرے گا۔

اس معاہدے کے ماتحت مستثنیٰ ہونے والی چیزوں پر نہ تو کسٹم کا محصول عائد ہوگا۔ نہ مقدار کی پابندی لگائی جائے گی اور نہ درآمد کرنے کے لئے لائسنس لینا ضروری ہوگا۔ اس کا اطلاق فلموں، فلمی پٹیوں، مائکروفلموں، آواز کے ریکارڈوں، شیشے کے سلائڈوں، دیوار پر لگانے والے نقشوں، چارٹوں اور پوسٹروں پر ہوگا۔

اس معاہدے سے پوری طرح فائدہ اٹھانے کے لئے ضروری ہوگا کہ سامان برآمد کرنے والے ملک ان چیزوں کی بابت تصدیق کریں کہ وہ تعلیمی، سائنسی یا ثقافتی مقاصد کے لئے ہیں۔ درآمد کرنے والے ملک کو یہ تصدیق نامہ قبول کر لینا ہوگا۔ درآمد اور برآمد کرنے والوں کے فائدے کے لئے یونیسکو ایسے تمام تصدیق شدہ

علموں کی فہرست شائع کرے گا۔

دس اور ملکوں نے بھی معاہدے پر دستخط کردیئے ہیں۔ مگر ابھی تک انہوں نے تصدیق نہیں کی ہے ان کے نام یہ ہیں۔

افغانستان۔ برازیل۔ ڈنمارک۔ ڈومینکن ری پبلک۔ ایکوئےڈور۔ ایران۔ لبنان۔ نیدرلینڈز۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ اور یوراگوئے۔ ریاستہائے متحدہ نے رسمی منظوری کے لئے اس معاہدے کو سینیٹ کے سامنے پیش کردیا ہے۔ یونیسکو کا ایک اور معاہدہ جس کی رو سے کتابیں۔ اخبارات۔ فنی سامان۔ سائنسی آلات اور دوسری تعلیمی چیزیں درآمدی محصول سے مستثنےٰ ہوگئی ہیں۔ ۹ ملکوں میں نافذ ہے اور اس پر عمل ہورہا ہے یہ دونوں معاہدے ادارے کے اس نصب العین کا ایک جزو ہیں کہ خیالات صوری اور معنوی اعتبار سے ساری دنیا میں فروغ پائیں۔

ٹیلی وژن اور "روشن خیال طبقہ"

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ٹیلی وژن روشن خیال طبقے میں ابھی مقبول نہیں ہوا ہے۔ حال ہی میں ٹیلی وژن سے متعلق ایک بین الاقوامی مطالعی نصاب لندن میں شروع ہوا تھا ٹیلی وژن کے ماہرین کو سب سے بڑی شکایت یہ تھی کہ بہت سی روشن خیال ہستیاں ٹیلی وژن سے بالکل الگ تھلگ رہتی ہیں۔ ان میں سے بعض نے یہاں تک کہا کہ انہیں اپنی لیاقت پر گھمنڈ ہے۔ تاہم سب اس بات پر متفق تھے کہ اگر ٹیلی وژن کے پروگراموں کو بہتر بنانا مقصود ہو تو ٹیلی وژن نشر کرنے والوں اور اس روشن خیال طبقے کے درمیان یکجہتی اور تعاون ہونا چاہئے۔ یہ اپنی قسم کا پہلا مطالعی نصاب تھا جسے اقوام متحدہ کے تعلیمی۔ سائنسی اور ثقافتی ادارے یونیسکو اور بی بی سی نے مل کر شروع کیا تھا۔ تین ہفتے تک ٹیلی وژن کے ۲۳ ماہرین نشریات جو بارہ ملکوں سے آئے تھے۔ بی بی سی لندن کے اسٹوڈیو میں مل کر کام کرتے رہے انہوں نے تعلیمی اور ثقافتی پروگراموں سے متعلق مسائل پر تبادلہ خیالات کیا۔

لندن میں ان روشن خیال لوگوں کی بے تعلقی کو دور کرنے کے طریقوں پر بھی غور کیا گیا۔ خاص طور پر جاپان۔ کینیڈا اور جرمنی کے ماہرین نے اپنے اپنے ملک کی چند مثالیں دے کر اس پہلو پر روشنی ڈالی۔ مثلاً

یہ کہ وہاں ایسی جماعتیں قائم ہیں جو کسی خاص مسئلے کی چھان بین کرنے کے لیے نشر کرنے والوں اور روشن خیال طبقے کے افراد کو ایک جگہ جمع کر سکتی ہیں۔

یونیسکو کے ماہر ٹیلی وژن مسٹر کیسیر نے ٹیلی وژن نشر کرنے والوں کی دقتوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ انہیں نہ صرف اپنے ناظرین کو سمجھانا اور نئی معلومات سے آگاہ کرنا پڑتا ہے۔ بلکہ ان کے ذوق اور دلچسپی کا بھی خیال رکھنا ہوتا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ ٹیلی وژن کا پروگرام کتابوں اور تقریروں سے زیادہ آسان انداز میں اور بہت ہی موثر انداز میں ہونا چاہیے۔ اس لئے عام دلچسپی کے مزاحیہ پروگرام کی بہ نسبت تعلیمی یا ثقافتی پروگرام زیادہ دشوار ہوتے ہیں۔

مطالعی مذاکرات میں شرکت کرنے والے ماہرین کے جوش و خروش کی تعریف کرتے ہوئے مسٹر کیسیر نے کہا یہ دیکھ کر خوشی ہوئی تھی کہ یہ ماہرین کس قدر ذوق و شوق کے ساتھ اپنے تجربات کو پیش کرتے ہوئے اس میں مزید اضافے کے لئے تبادلۂ خیالات کر رہے ہیں۔ امید ہے کہ اپنے اپنے ملکوں کو واپس جانے کے بعد یہ ماہرین آپس میں مراسلات کے ذریعہ تعلق قائم رکھیں گے اور جو نئی بات معلوم ہو گی اسے دوسروں تک پہنچاتے رہیں گے۔ یہ طریقۂ تعاون ان سب کے لئے مفید ہو گا اور ان کے ذریعہ عوام کو فائدہ پہنچے گا۔

لندن میں تین ہفتے کے دوران قیام میں ٹیلی وژن کے ۳۲ ماہرین نے اپنے مشترکہ مسائل کا تجزیہ کیا۔ ایک دوسرے کے پروگرام کو جانچا اور آئندہ پروگرام بنانے کے امکانات پر غور کیا۔ بارہ ملکوں کے یہ ماہرین تقریباً ۲ کروڑ انسانوں کے لئے ٹیلی وژن پروگرام مرتب کرتے ہیں۔

ان ماہرین میں جاپان، ریاست ہائے متحدہ اور اس جیسے دور دراز ملکوں کے نمائندے بھی شامل تھے۔ باقی نمائندے ان ملکوں سے آئے تھے: بلجیم۔ فرانس۔ جرمنی۔ اٹلی۔ مراقش۔ نیدرلینڈ۔ سوئٹزرلینڈ اور برطانیہ

لیکچرار کو نکل جانے کا حکم

برمنگھم یونیورسٹی میں ایک امریکی پروفیسر ڈاکٹر جوزف کورٹ علم الابدان پڑھاتے تھے۔ انہیں حال ہی میں حکم ملا کہ جزائر برطانیہ سے نکل جائیں۔ اس حکم کے خلاف برطانیہ کی کئی سیاسی، شہری اور مزدور انجمنوں نے آواز اٹھائی ہے۔ برمنگھم ٹریڈ کونسل کے سکرٹری مسٹر ہیری بیکر نے کہا کہ یہ مختلف

ہاتھوں پر زور ڈال کر وزیر داخلہ سے کہیں گے کہ اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کریں اور مسٹر کورٹ کو انگلینڈ میں
رہنے کی اجازت دیدیں۔ انہوں نے کہا کہ میکارتھی کے پنجہ کو اس قدر نہ بڑھنے دینا چاہیئے کہ وہ اس
ملک میں بھی گرفت کر سکے۔ جب مشرقی یورپ کے لوگ ہماری پناہ میں آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ ظلم کا
شکار ہو رہے ہیں تو ہم انہیں خوش آمدید کہتے ہیں۔ مغرب سے آنے والے لوگوں کے ساتھ بھی ایسا
ہی برتاؤ ہونا چاہیئے۔ برمنگھم یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور پرنسپل نے کہا ہمیں اس معاملہ سے کچھ
سروکار نہیں۔ یہ ڈاکٹر کورٹ اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا باہمی معاملہ ہے۔ جہاں تک یونیورسٹی میں
ان کے بحیثیت استاد کام کرنے کا تعلق ہے ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں۔

ڈاکٹر کورٹ جن کی عمر اس وقت ۴۲ سال ہے ۱۹۵۱ء میں اپنی بیوی سمیت انگلستان میں آئے
تھے۔ ان کی بیوی کی عمر ۲۸ سال ہے اور وہ برمنگھم کے "ملکہ الزبتھ ہسپتال" میں ڈاکٹر ہیں۔ ڈاکٹر
کورٹ نے اس بات سے انکار کیا ہے کہ انہوں نے فوجی خدمت سے بچنے کے لئے اپنا ملک چھوڑا تھا
انہوں نے کہا ۱۹۴۸ء میں مجھے جسمانی طور پر ناقابل قرار دیا گیا تھا۔ انہوں نے مزید کہا جب میں طب کا
طالب علم تھا ان دنوں میں امریکن کمیونسٹ پارٹی کا رکن تھا لیکن طالب علمی کے زمانہ کے ساتھ ہی
یہ سیاسی سرگرمی ختم ہو گئی۔ اب میری خواہش یہ ہے کہ چپکے سے انگلستان میں زندگی گذاروں
اور اپنا سائنسی کام جاری رکھوں۔ اگر مجھے امریکہ لوٹنے پر مجبور کیا گیا تو میں نہ صرف بیکار ہو جاؤں گا بلکہ
شہریت کے حقوق سے ہاتھ دھو بیٹھوں گا اور پانچ سے دس سال تک قید بھگتوں گا۔

پچھلے دسمبر میں برمنگھم کی سی۔ آئی۔ ڈی نے ڈاکٹر کورٹ کو امریکی سفارت خانے کا ایک پیغام پڑھ کر
سنایا تھا جس میں ان پر چار الزام لگائے گئے تھے۔ آخری الزام یہ تھا کہ انہوں نے فوجی خدمت سے
بچنے کے لئے ریاست ہائے متحدہ کو چھوڑا۔ پیغام میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ اس آخری الزام کی بنا پر ان کے امریکی شہریت
کے حقوق ختم کر دیئے جائیں گے۔ مئی ۱۹۵۲ء میں وزارت امور داخلہ (انگلستان) نے انہیں اطلاع دی کہ اگر
ان کی شہریت باقی نہ رہی تو وہ ان کا پرمٹ منسوخ کر دے گی۔ جن لوگوں نے وزارت داخلہ کے پاس سفارش کی ان کو جواب
ملا کہ ڈاکٹر کورٹ کو قیام جاری رکھنے کی اجازت دینا ایک خطرناک بات ہو گا۔

ریٹائرڈ انسپکٹر مدارس

انگلستان میں شہنشاہ معظم کے انسپکٹر مدارس کے ریٹائر ہونے کی عمر ۶۰ سال ہے، اس عمر میں آ مجبوراً ملازمت سے الگ ہونا پڑتا ہے۔ پارلیمنٹ میں ایک رکن نے وزیر تعلیم سے پوچھا کہ ساٹھ سال عمر میں انسپکٹر کے لئے جبری سبکدوشی ضروری کیوں قرار دی گئی ہے جس پر جواب ملا کہ اس عمر کو پہنچتے پہنچتے وہ کام کو خوبی سے کرنے کے اہل نہیں رہتے۔ اس پر ایک ریٹائر شدہ انسپکٹر کو بہت غصہ آیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ وزیر تعلیم کا جواب انسپکٹروں کی بہت بڑی اہانت ہے۔ مجھے سبکدوشی سے ذرا پہلے اپنے افسر کی طرف سے ایک چھٹی ملی تھی جس میں میری قابلیت اور کارکردگی کو بڑا سراہا گیا تھا۔ دوسرے انسپکٹروں کو بھی عموماً اسی طرح سبکدوشی سے پہلے چھٹیاں موصول ہوتی ہیں۔ اگر ہم لوگ اس عمر تک نااہل ہو جاتے ہیں تو پھر قابلیت اور حسن کارکردگی کی یہ ستائش کیوں؟ بات اصل میں یہ ہے کہ سبکدوشی اس لئے عمل میں آتی ہے کہ نوجوانوں کے لئے مواقع پیدا ہوں وزیر کو یہ حقیقت صاف صاف بیان کر دینی چاہئے تھی۔

اجتماعی زندگی اور دست کاریاں

حکومت جاپان کے تعاون اور یونیسکو کے اہتمام سے ایک طبقاتی کانفرنس ٹوکیو میں ۲۸ اگست سے شروع ہوئی ہے جو ۵ ستمبر تک جاری رہے گی اس کانفرنس میں مشرق بعید کے آٹھ ملکوں کے فن کار اور ماہرین تعلیمات حصہ لے رہے ہیں، وہ تبادلۂ خیالات کے ذریعہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ فنون لطیفہ او دست کاریوں کو عوامی تعلیم اور اجتماعی زندگی میں کیا اہمیت حاصل ہے، اس قسم کی پہلی کانفرنس ۱۹۵۱ء میں انگلستان کے شہر برسٹل میں منعقد ہوئی تھی، اس وقت سانچے کے فنون سکھانے کے عام مسائل اور تعلیم میں ان کے مقام پر غور و خوض کیا گیا تھا۔

ٹوکیو والے اجلاس میں خاص طور پر ایسے روایتی فنون اور دست کاریوں کے متعلق مسائل پر تبادلۂ خیا کیا جائے گا جو اب بھی ایشیا میں رائج ہیں۔ مثلاً چرخہ کاتنا۔ زردوزی کرنا۔ لکڑی اور چمڑے کے کام۔ ظروف سازی۔ سادہ کاری اور بت تراشی وغیرہ۔ اجلاس میں شریک ہونے والے ماہرین اس پہلو پر غور کریں گے

مختلف قسم کی ثقافتوں اور روائتی صلاحیتوں کے خلط ملط ہونے سے ایک دوسرے پر کیا اثر پڑتا ہے :
• وہ یہ بھی معلوم کریں گے کہ مختلف قسم کے تعلیمی اداروں میں فنون لطیفہ اور دست کاریوں کی تربیت کے اصول اور عملی طریقوں کی نوعیت کیا ہے۔ نیز پتہ لگائیں گے کہ تجارتی اور صنعتی طریقوں کے ترقی کر جانے سے روائتی فنون اور دست کاریوں پر کیا اور کس حد تک اثر پڑا ہے۔

وہ فنون لطیفہ اور دست کاریوں کی تربیت دینے ان کو رائج کرنے اور مقبول بنانے کے لئے کوئی ایسی صورت معلوم کریں گے جس کو ترقی دینے سے ہر ملک کی ثقافتی زندگی اور بین الاقوامی مفاہمت کو فائدہ پہنچے، وہ ایسی تجاویز منظور کریں گے جو قومی اور بین الاقوامی اداروں اور سرکاری ارباب حل و عقد کو بھیجی جاسکیں۔ تاکہ عوامی تعلیم اور اجتماعی زندگی میں ان تجاویز پر عمل کرتے ہوئے فائدہ اٹھایا جاسکے۔

ان آٹھ ملکوں کے نمائندے اس اجلاس میں شریک ہوئے ہیں۔ پاکستان۔ بھارت۔ جاپان کمبوڈیا۔ سیلون۔ چین (فارموسا) فلپین اور تھائی لینڈ۔ ان کے علاوہ فرانس۔ برطانیہ۔ ریاستہائے متحدہ بین الاقوامی لیبر آرگنائیزیشن اور انجمن ہائے اقوام متحدہ کے بین الاقوامی وفاق نے اپنے مبصرین بھیجے ہیں۔ یہ اجلاس ایم دیوی پرشاد رائے چودھری کی زیر ہدایت ہو رہا ہے جو مدراس آرٹس اینڈ کرافٹس اسکول کے پرنسپل ہیں۔

سرکاری جریدہ کے اعلانات

صیغہ رجال ــــــــــ شعبہ مدارس

ای/۱۰۸۷۵ ۸ اکتوبر ۵۲ء م۔ عبدالمجید خان ایس وی (۶۰ - ۱۴۰) اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول چونیاں کو تاریخ حاضری سے م۔ نظام الدین کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول قصور مقرر کیا گیا۔

〃 م۔ نظام الدین ادیب عالم۔ ایس وی منشی فاضل۔ بی اے۔ بی ٹی (۶۰ - ۱۴۰) اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول قصور کو م۔ عبدالمجید خان کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ تاریخ حاضری سے اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول چونیاں مقرر کیا گیا۔

ای/۲۱۸۸۸ ۱ ستمبر ۵۲ء م۔ ولی محمد ذکی۔ ایم۔ ایس سی (زراعت) درجہ اول (۲۵۰ - ۳۵۵) معاون انسپکٹر مدارس برائے سائنس قسمت راولپنڈی (آزمائشی) کو تاریخ حاضری سے م۔ اکرام الحق کی جگہ جنہیں رخصت دی جا چکی ہے۔ نائب انسپکٹر مدارس برائے سائنس قسمت لاہور مقرر کیا گیا۔

ی/۲۱۶۹۹ ۷ ستمبر ۵۲ء م۔ صالح محمد ایس۔ وی (۶۰ - ۱۴۰) لیکن اسو تنت (۱۵۰ - ۲۵۰) میں اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول جہلم کو تاریخ حاضری سے م۔ محمد حسین کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر اردو مدرس گورنمنٹ نارمل اسکول گکھڑ مقرر کیا گیا۔

〃 م۔ محمد حسین ایس۔ وی (۱۵۰ - ۲۵۰) اردو مدرس گورنمنٹ نارمل اسکول گکھڑ کو تاریخ حاضری سے م۔ محمد انور کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول پنڈی بھٹیاں مقرر کیا گیا۔

ی/۲۱۵۹۱ ۲ ستمبر ۵۲ء م۔ ثنائی محمد بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (۱۳۰ - ۲۵۰) اے۔ ڈی۔ آئی مدارس جھنگ کو م۔ خوشی محمد کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر اے۔ ڈی۔ آئی مدارس لائل پور مقرر کیا گیا۔

ای/۳۱۵۹۱ م۔خوشی محمد۔ایم۔اے بی۔ٹی (۱۳۰ ــ ۲۵۰) اے۔ڈی۔آئی مدارس لائل پور کو م۔علی محمد
۴ ستمبر ۱۹۵۳ء کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر اے۔ڈی۔آئی۔مدارس
مدارس جھنگ مقرر کیا گیا۔

ای/۳۱۵۲۱ م۔محمد ابراہیم ایف۔اے۔ایچ۔پی۔ایس۔وی (۶۰ ــ ۱۴۰) اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول
۴ ستمبر ۱۹۵۳ء اکال گڑھ کو م۔نذر محمد کی جگہ جو ۱۲ اگست کو سبکدوش ہو گئے تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر
اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول سرگودھا مقرر کیا گیا۔

〃 م۔سردار علی شمیم۔ایچ۔یو۔ایس۔وی (۶۰ ــ ۱۴۰) اردو مدرس گورنمنٹ نارمل اسکول گکھڑ
کو م۔ابراہیم کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر اردو مدرس
گورنمنٹ ہائی اسکول اکال گڑھ مقرر کیا گیا۔

ای/۱۲۲۶۷ ح۔سبط احمد ڈرائنگ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول پنڈی گھیپ کو م۔محمد شفیع کی جگہ جن کا تبادلہ
۳ ستمبر ۱۹۵۳ء ہو چکا ہے۔تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر ڈرائنگ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول سرگودھا
مقرر کیا گیا۔

〃 م۔محمد شفیع ڈرائنگ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول سرگودھا کو م۔سبط احمد کی جگہ جن کا تبادلہ
ہو چکا ہے۔تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر ڈرائنگ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول پنڈی گھیپ
مقرر کیا گیا۔

ای/۳۱۳۲۸ م۔عبداللطیف خاکی بی۔اے۔ایس۔ڈی۔پی۔ای (والٹن) (۶۰ ــ ۱۴۰) ورزش ماسٹر
۳ ستمبر ۱۹۵۳ء گورنمنٹ ہائی اسکول میانوالی کو مسٹر بی۔ایم۔گل کی جگہ جنہیں تدریسی کام کے لئے واپس
بلا لیا گیا ہے۔تاریخ حاضری سے (۱۳۰ ــ ۲۵۰) کے عام پیمانہ تنخواہ میں ۱۳۰/- روپے
ماہوار پر قائم مقام اے۔ڈی۔آئی برائے تربیت جسمانی گجرات مقرر کیا گیا۔

ای/۳۱۰۸۲ م۔فیض الحسن ایم۔اے۔ایس۔اے۔وی (۱۳۰ ــ ۲۵۰) انگریزی مدرس گورنمنٹ نارمل اسکول
یکم ستمبر ۱۹۵۳ء قصور کو ایک نئی منظور شدہ اسامی پر ۲۴ اپریل ۱۹۵۳ء قبل دوپہر سے اپنی تنخواہ پر انگ

مدرس گورنمنٹ ٹیکنیکل ہائی اسکول جوہر آباد مقرر کیا گیا ۔

۳۱-۸۲/ا م-عبدالمجید ایس-وی (۶۰ - ۱۴۰) زراعت ماسٹر گورنمنٹ نارمل اسکول شاہ پور کو ایک نئی تمبر ۵۵ء منظور شدہ آسامی پر ۱۹ اپریل قبل دوپہر سے اپنی تنخواہ پر اردو مدرس گورنمنٹ ٹیکنیکل ہائی اسکول جوہر آباد مقرر کیا گیا۔

" م-خان شاہ (۶۰ - ۱۴۰) ورزش ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول پھالیہ کو ایک نئی منظور شدہ آسامی پر ۷ مارچ ۵۵ء قبل دوپہر سے اپنی تنخواہ پر ڈرائنگ ماسٹر گورنمنٹ ٹیکنیکل ہائی اسکول جوہر آباد مقرر کیا گیا ۔

۳۰۵۲۴/ا م-ولایت خاں ۔ایس-وی ۔ایک امیدوار کو ایک نئی آسامی پر تاریخ حاضری سے (۶۰ - ۱۴۰) اگست ۵۵ء کے عام پیمانہ تنخواہ میں -/۶۰ روپے ماہوار پر قائم مقام اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول پسرور مقرر کیا گیا۔

" م-محمد شریف ۔ایس-وی ۔ایک امیدوار کو ایک نئی آسامی پر تاریخ حاضری سے (۶۰ - ۱۴۰) کے عام پیمانہ تنخواہ میں -/۶۰ روپے ماہوار پر قائم مقام اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول پنڈی گھیب مقرر کیا گیا ۔

صیغہ نسار ــــــــــ شعبہ مدارس

۳۱۹۳۱/د مس طوبیٰ حسن ۔جے-ڈی-پی-ای معلمہ تربیت جسمانی گورنمنٹ زنانہ ہائی اور نارمل اسکول ۵۵ء مظفرگڑھ کا آزمائشی عرصہ ۳۱ مارچ ۵۶ء تک بڑھا دیا گیا ہے کیونکہ ۵۲-۱۹۵۳ء میں ان کا کام اور رویہ نا تسلی بخش رہا ہے

" استانی مرتضیٰ بیگم ایس-وی (۶۰ - ۱۴۰) اردو معلمہ گورنمنٹ زنانہ ہائی اسکول سرگودھا کو ایک نئی منظور شدہ آسامی پر یکم اپریل ۵۵ء سے (۶۰ - ۱۴۰) کے عام پیمانہ تنخواہ سے (۱۵۰-۲۵۰) کے پیمانہ تنخواہ میں ترقی دی جاتی ہے (مستقل)

۳۱۶۳۱/د ۵۵ء مس صفیہ بیگم بی-اے (ریاضی نصاب ک-ب- درجہ دوم) ایک امیدوار کو ایک نئی آسامی

۵ جولائی قبل دوپہر سے ۱۳۰ – ۲۵۰ کے عام پیمانہ تنخواہ میں -/۱۳۰ روپے ماہوار پر قائم مقام اے۔ ڈی۔ آئی مدارس ڈیرہ غازی خان مقرر کیا گیا۔

ڈبلیو/۳۴۰۵۴ مس سرفراز غوری۔ بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (۱۳۰ – ۲۵۰) معاون معلمہ گورنمنٹ زنانہ ہائی اسکول مری کو ۱۷ اگست ۱۹۴۸ء مسز ق۔ ملک کی جگہ جن کو رخصت مل چکی ہے ۱۹ جولائی ۱۹۴۸ء سے ۳۱ اگست ۱۹۴۸ء تک اپنی تنخواہ پر قائم مقام صدر معلمہ گورنمنٹ زنانہ ہائی اسکول مری مقرر کیا گیا۔

ڈبلیو/۳۰۵۷۷ استانی لاہرہ ایس۔ وی (۶۰ – ۱۴۰) اردو معلمہ گورنمنٹ زنانہ نارمل اسکول لیہ کو مسز کشور ۹ جولائی ۱۹۴۸ء علاء الحق کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر اردو معلمہ گورنمنٹ زنانہ ہائی اسکول قصور مقرر کیا گیا۔

" مسز کشور علاء الحق ایف۔ اے۔ جے۔ اے۔ وی (۶۰ – ۱۴۰) قائم مقام اردو معلمہ گورنمنٹ زنانہ ہائی اسکول قصور کو استانی حمیدہ بیگم کی جگہ جو وفات پا چکی ہیں تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر قائم مقام اردو معلمہ لیڈی میکلیگن زنانہ ہائی اسکول لاہور مقرر کیا گیا۔

ڈبلیو/۲۹۳۴۴ مس زکیہ علاؤالدین جے اے وی (۷۵ – ۱۵۰) معاون معلمہ گورنمنٹ زنانہ ہائی اسکول ۷ جولائی ۱۹۴۸ء ٹوبہ ٹیک سنگھ کو ایک موجودہ آسامی پر تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر معاون معلمہ زنانہ ہائی اور نارمل اسکول جھنگ مقرر کیا گیا۔

" مس غلام فاطمہ جے۔ اے۔ وی (۷۵ – ۱۵۰) معاون معلمہ گورنمنٹ زنانہ ہائی اسکول۔ چوبرجی باغ لاہور کو جن کا تبادلہ جھنگ میں ہو چکا تھا مس زکیہ علاؤالدین کی جگہ جن تبادلہ ہو چکا ہے۔ تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر معاون معلمہ گورنمنٹ زنانہ ہائی اسکول ٹوبہ ٹیک سنگھ مقرر کیا گیا۔

۰ ۷ شماره ۸] لاهور [نومبر

اس شمارہ میں

ادارہ تحریر { پروفیسرسراج الدین / قاضی محمد اسلم / ایم - اے - مخدومی

معاونین { عبدالغفور چودھر / فضل احمد

تعلیمی ماہ نامہ

آموزش
لاہور

نومبر ۱۹۵۴ء

جلد ۷

شمارہ ۸

سالانہ چندہ

پاکستان کے لیے ۶ روپے

غیر ممالک کے لیے ۸ روپے

قیمت فی پرچہ دس آنے

پبلشرز

یونی ورسٹی بک ایجنسی، لاہور

ایچ۔ ڈی خالد پرنٹر پبلشر نے دین محمدی پریس لاہور میں طبع کرا کے،
یونیورسٹی بک ایجنسی ۲ کچہری روڈ لاہور سے شائع کیا

اداریہ

ایم۔ اے مخدومی

قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم میں دلچسپی بڑھتی جا رہی ہے۔ پنجاب اسمبلی نے اپنے پچھلے اجلاس میں ثانوی تعلیم کے متعلق جو قانون منظور کیا ہے وہ اس کے ایجنڈے پر سب سے اہم مد تھی۔ اس مسئلہ پر لوگوں کے مختلف طبقوں نے بڑی دلچسپی کا اظہار کیا۔ ایک آزاد جمہوری معاشرے میں ہونا بھی یوں ہی چاہیے۔ تعلیم کے ساتھ عوامی زندگی کا گہرا مفاد وابستہ ہے۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ تعلیمی پالیسی مرتب کرنے میں لوگوں کو موثر آواز حاصل ہو۔ اصلاحی پروگرام کی کامیابی ہی اس بات پر موقوف ہے کہ عوام جیسے کچھ بھی ہوں انہیں قبول کیا جائے، نہ کہ ان میں وہ اوصاف فرض کر لیے جائیں جو ہم ان میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ تعلیم ایک ہمہ گیر معاشرتی مسئلہ ہے۔ اسے تمام معاشرتی قوتوں کو پیش نگاہ رکھنا چاہیے۔

تعلیمی معاملات میں رائے عامہ کی یہ اہمیت بجا ہے لیکن اسے موثر بنانے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی تنظیم و ترکیب ماہرانہ رہنمائی میں تشکیل پذیر ہو۔ جدید معاشرتی زندگی کی شاخ در شاخ گتھیاں اور اس کی گہرائی اس قدر وسیع ہے کہ اس کے مسائل ایک عام آدمی کو عموماً چکرا دیتے ہیں۔ ان کو سمجھنے اور ان پر رائے ظاہر کرنے کے لیے وہ ایسے ماہروں کی دستگیری کا محتاج ہے جو صحیح واقعات و حالات اس کے سامنے رکھیں۔ تعلیمی امور میں یہ رہنمائی کرنا ماہرین تعلیم کا کام ہے۔ یہ ماہرین اپنے مخصوص علم اور تجربہ کی بنا پر تعلیمی مسائل کو زیادہ گہری نگاہ سے دیکھ سکتے ہیں، ان کا فرض ہے کہ ان مسائل پر بے لاگ سائنسی

اور اپنی تحقیق کے نتائج سے لوگوں کو آگاہ کریں۔ واقعات وحقائق کی یہ جستجو لگاتار جاری رہنی چاہیے۔
تعلیمی تحقیق ہی وہ راستہ ہے جس پر چل کر ہم اپنے نظام تعلیم میں ہم آہنگی مضبوطی اور سادگی پیدا کر سکتے
یہی وہ طریق ہے جو اصلاحی کام کے لئے باشعور عوامی تائید حاصل کر سکتا ہے، اسی وسیلے سے یہ ممکن ہو سکتا
طلبہ کو معاشرتی نفسیاتی اور معاشی ماحول سے ہم آہنگ کرنے کا کٹھن کام سہل ہو جائے۔ اس کی
سے ہمیں فکر وعمل کے پسندیدہ نمونے ہاتھ لگ سکتے ہیں۔ اس وقت ہم دوررس تبدیلیوں کا آغاز کرنے
ہیں، اس لئے تعلیمی تحقیق کی ضرورت اور بھی شدید ہے۔ تعلیم کا جامد تصور تحقیق وجستجو کو نظر انداز کر سکتا
اس کا متحرک تصور ایسا نہیں کر سکتا، تحقیق وتجسس ہی وہ آب حیات ہے جو کسی نظام تعلیم کو صحت مند
توانا رکھ سکتا ہے۔ یہ کام ہمارے ماہرین تعلیم کی قوت عمل کو ایک کھلی ہوئی دعوت ہے۔ ہمیں یقین ہے،
یہ دعوت بہ طریق احسن قبول کی جائے گی ؎

(انگریزی سے ترجمہ)

نیو ایجوکیشن فیلوشپ

انیس الدین انصاری

تعلیمی مسائل مسلسل تحقیق طلب ہیں۔ فلسفۂ تعلیم۔ طریقہ ہائے تعلیم۔ نظامِ تعلیم اصلاحی مدارج سے گذر رہے ہیں۔ ان کی اصلاح و ترقی برابر ہوتی رہنا چاہیے۔ ان مسائل تعلیمی پر غور و فکر، رہبران انسانیت کا اہم فرض ہے۔ تعلیم ایک تحرکی کیفیت رکھتی ہے، وہ جامد اور غیر متغیر حالت میں کبھی نہیں رہ سکتی۔ تعلیم کی تاریخ ثابت کرتی ہے کہ تعلیم برابر ارتقائی دور سے گذر رہی ہے اور تعلیمی ترقی کے مسائل پر تنقیدی نظر ڈالنے کے لیے معلمانِ تعلیم کے لئے تبادلۂ خیال نہایت ضروری ہے۔

سنہ ۱۹۲۱ء میں ملک فرانس کے مقام کیلے (CALAIS) پر ایک بین الاقوامی کانفرنس ہوئی جس میں ماہرین تعلیم نے ایک جماعت کی بنیاد ڈالی جس کا مقصد تعلیمی مسائل پر تبادلۂ خیال کرنا اور تعلیم کے جدید نظریات کو دنیا کے سامنے پیش کرنا قرار دیا گیا۔ کانفرنس اس نتیجہ پر پہنچی کہ سنہ ۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم اول کے جاری ہونے سے جو عالمگیر تباہی اور بربادی رونما ہوئی وہ عام انسانیت کے لیے مہلک ترین صورت حال ثابت ہوئی ہے۔ لہٰذا دنیا کے ہر ملک میں تعلیمی نظام کو اس طرح تبدیل کیا جائے کہ انسان اس ہولناک مصیبت سے نجات پا سکے اور دنیا کو سکون اور راحت مسرت اور شادمانی کی جنت بنایا جائے۔ ان شریفانہ جذبات اور بلند مقاصد کے ساتھ اس جماعت کی تشکیل عمل پذیر ہوئی اس جماعت کا نام "نیو ایجوکیشن فیلوشپ" رکھا گیا۔ اور یہ طے کیا گیا کہ ہر ملک میں اس کی ایک شاخ قائم کی جائے۔ تقریباً تینتیس سال سے یہ جماعت قائم ہے اور دنیا کے تیئس مختلف ملکوں میں اس کی شاخیں قائم ہو گئی ہیں۔ بین الاقوامی حیثیت کی تعلیمی جماعت غالباً اس کے علاوہ کوئی دوسری اتنی نمائندہ نہیں ہے، حسب ذیل ملکوں میں اس کی شاخیں ہیں۔

(۱) آسٹریلیا (۲) بلجیم (۳) ڈنمارک (۴) مصر

(۵) انگلستان (۶) فرانس (۷) ہالینڈ (۸) ہندوستان
(۹) اٹلی (۱۰) نیوزی لینڈ (۱۱) شمالی آئرلینڈ (۱۲) ناروے
(۱۳) پاکستان (۱۴) اسپین (۱۵) اسکاٹ لینڈ (۱۶) جنوبی افریقہ
(۱۷) کولمبیا (۱۸) ایکوئیڈر (۱۹) جنوبی روڈیشیا (۲۰) سوئڈن
(۲۱) سوئٹزرلینڈ (۲۲) ریاست ہائے متحدہ امریکہ (۲۳) مغربی جرمنی

ان جماعت کا مرکزی دفتر لندن میں ہے۔

نیو ایجوکیشن فیلوشپ کے مقاصد میں یہ اہم مقصد ہے کہ تعلیم کو بچوں کے لیے خوشگوار بنایا جائے ان کی تخلیقی قوتوں کو بیدار کیا جائے ان میں جو فطری صلاحیتیں ہیں ان کی مکمل نشوونما کا انتظام کیا جائے۔ ہر بچہ کی مخصوص صلاحیتوں کا اندازہ کیا جائے اور اس کی انفرادی شخصیت قائم کی جائے۔ ان نظریوں کے پیش نظر جو درس گاہیں قائم ہوئی ہیں ان میں سے حسب ذیل چار اقسام کی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

(۱) تخلیقی درس گاہیں۔

(۲) عملی درس گاہیں۔

(۳) مشاہدہ اطفال کی درس گاہیں۔

(۴) آزاد درس گاہیں۔

تخلیقی درس گاہیں تخلیقی درس گاہوں میں بچوں کے تخلیقی رجحانات کے اظہار کے مواقع کا زیادہ سے زیادہ انتظام ہوتا ہے۔ ہر بچہ میں دو رجحانات ہوتے ہیں۔ تقلیدی و تخلیقی۔ قدیم طریقۂ تعلیم میں صرف تقلیدی قوتوں کے اظہار کا خیال رکھا جاتا تھا۔ تخلیقی قوتیں عموماً مردہ ہو جاتے تھے تخلیقی قوتوں کے اظہار کے لیے کوئی خاص کوشش نہیں کی جاتی تھی۔ یہ یقین کیا جاتا تھا کہ ایجادی قوتیں مخصوص انسانوں میں ہوتی ہیں، ہر بچہ میں ایجادی قوت نہیں ہو سکتی۔ لیکن یہ خیال غلط ہے۔ قدرت نے ہر بچہ کے اندر ایجادی قوتوں کو پیدا کیا ہے۔ ہر بچہ

ایجادی واختراعی خصوصیات کا اظہار کرتا رہتا ہے۔ غلط تعلیم بچہ کی اس فطری قوت کے اظہار کو روکتی ہے۔ صحیح تعلیم میں بچہ کی ایجادی قوت کے مواقع بہم پہونچائے جاتے ہیں؛ بچہ کی ایجادی قوت یا تخلیقی قوت کا مظاہرہ فنون لطیفہ کی تعلیم میں بہت اچھی طرح ہو سکتا ہے۔ نقاشی مصوری یا دیگر دست کاریوں میں بچہ کی تخلیقی قوتوں کا اظہار ہوتا ہے؛ بچہ کی تخلیقی قوتوں کے اظہار سے بچہ کی شخصیت کی نشوونما ہوتی ہے؛ جن درس گاہوں میں تعلیم کے اس پہلو کو اہمیت دی جاتی ہے ان کو عام طور پر "تخلیقی درس گاہیں" کہا جانے لگا ہے یہ درس گاہیں یقیناً صحیح تعلیم کی طرف اپنا رخ رکھتی ہیں۔

عملی درس گاہیں یہ درس گاہیں اس امر پر زور دیتی ہیں کہ بچے درس گاہوں میں زیادہ وقت دست کاری میں صرف کریں تعلیم کو صرف لکھنے اور پڑھنے تک محدود نہ رکھا جائے۔ بلکہ طلبا دست کاری کے ذریعہ مختلف علوم وفنون سے واقف ہو کر مفید شہری اور اچھے انسان بنیں۔ کمرۂ جماعت میں میز اور کرسی پر بیٹھ کر سبق اس طرح حاصل نہ کریں کہ یا تو استاد کی گفتگو سنتے رہیں۔ یا تختہ سیاہ پر لکھی ہوئی چیز پڑھتے یا لکھتے رہیں۔ یا استاد کی ہدایت کے مطابق لکھنے پڑھنے میں مصروف رہیں۔ بلکہ قومی زبان یا غیر زبان کو ڈرامائی عمل کے ذریعہ سیکھا جائے۔ ریاضی میں عملی طور پر پیمائش کرکے یا مثالی دوکانوں میں عملی طور پر خرید وفروخت کرکے یا جغرافیہ میں عملی طور پر ماڈل بنا کر یا سائنس میں عملی تجربات کرکے یا مختلف علوم کو عملی دست کاری کے ذریعہ حاصل کیا جائے۔ مدرسوں میں لکھنے پڑھنے کے مقابلہ میں ایسی فضا پیدا کی جائے جو عموماً کارخانوں میں کام میں مصروف رہنے کی ہوتی ہے اور طلبہ دست کاری اور عملی کام میں زیادہ وقت مصروف رہیں۔ ایسی درس گاہوں کو عام طور پر "عملی درس گاہیں" کہا جاتا ہے۔ یہ بچوں کی فطرت کے خلاف ہے کہ وہ صبح سے شام تک لکھنے اور پڑھنے میں مصروف رہیں؛ بچے اپنے ہاتھ سے کام کرنے میں فرحت محسوس کرتے ہیں۔ لیکن یہ مقصد نہیں ہے کہ وہ لکھنا پڑھنا ترک کردیں۔ بلکہ لکھنے پڑھنے اور عملی کام میں گہرا ربط ہو۔ مثلاً تاریخ میں قطب الدین ایبک سے لے کر عالمگیر کے زمانہ کے فن تعمیر کا حال پڑھتے ہیں تو ان عمارتوں کے نمونے پلائی وڈ یا چکنی مٹی سے بنائیں۔ یا سائنس میں کھلی کی گھنٹی کے متعلق پڑھا ہیں تو اس کا نمونہ

میں جغرافیہ میں کشمیر کا حال پڑھ رہے ہوں تو اس کے ریلیف نقشہ کو چکنی مٹی سے ایک لکڑی یا ٹین کے تختہ پر بنایا جائے۔ یہ طریقۂ تعلیم نفسیاتی لحاظ سے بھی مفید ہے اور اس دور میں جب کہ دنیا نے صنعت و حرفت میں غیر معمولی ترقی کی ہے، دست کاری نہ جاننے والے انسانوں کی قدر نہیں ہے اور ہمارے ملک کو محض ادیب، فلاسفر یا مقررین کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ سائنسی آلات مشینوں کو استعمال کرنے والے دست کاروں کی ضرورت ہے اور یہ طریقۂ تعلیم ہمارے تعلیمی نظام کی خصوصیت ہونا چاہیے۔

مشاہدۂ اطفال کی درس گاہیں

مروجہ تعلیمی نظام میں عام طور پر جماعتوں کو پڑھایا جاتا ہے ہر بچہ کی انفرادی خصوصیات کا مشاہدہ کرکے اس کی شخصیت کو ملیار کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی۔ جدید نظریہ کے مطابق ایک درس گاہ میں ایک بچہ کو مرکز مان کر تعلیمی کوششیں جاری رہیں۔ مدرس کو ہر بچہ کی ذہانت اس کے فطری رجحانات اس کی فطری صلاحیتیں معلوم کرنی چاہئیں اس کے رجحانات اور میلانات کے مطابق اس کی شخصیت کی نشو و نما کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔ بچہ کی سیرت کی تعمیر میں اس کی پسند اور ناپسند باتوں کو معلوم کرکے اس کے دل کی گہرائی میں سچائی، نیکی اور حسن عمل کو پیوست کرنا ہے۔ اس کے علاوہ ایک درس گاہ میں ایسی فضا قائم کی جائے جس میں بچہ کے نقطۂ نظر سے انتظامات کیے جائیں۔ مثلاً اس کا اندازہ کیا جائے کہ بچے کیا کیا باتیں پسند کرتے ہیں اور کیا ناپسند اور ان کے مذاق کے مطابق مدرسہ کے انتظامات کیے جائیں۔ طریقۂ تعلیم میں بھی بچوں کی مسرت و شادمانی کا لحاظ رکھا جائے۔ بچوں کے جذبات کی تربیت اس انداز سے کی جائے کہ بچے جذباتی انداز میں اچھی باتوں کو پسند کریں اور برائی سے دلی نفرت پیدا ہو۔ امتحان کے کمرہ میں بچے اس وجہ سے نقل نہ کریں کہ استاد کا ڈر ہو بلکہ اس وجہ سے نقل نہ کریں کہ وہ دل سے نقل کرنے کو ذلیل ذریعۂ منفعت سمجھتے ہوں۔ بالا درس گاہوں میں طلبہ کی شخصیت کی نشو و نما کا خیال مضامین پڑھانے کے مقابلہ میں زیادہ رکھا جاتا ہے۔ مضامین پڑھانے سے یا تو معلومات میں اضافہ ہوتا ہے یا کسی فن کو سیکھا جاتا ہے۔ لیکن صحیح تعلیم حصول علم یا حصول فن نہیں ہے بلکہ بچہ کے اندر ایسا مذاق پیدا کیا جائے کہ وہ دلی جذبات سے مناسب مصروفیتوں کی طرف متوجہ ہو۔ ہر بچہ میں فطری صلاحیتیں مختلف ہوتی ہیں ان صلاحیتوں

اندازہ کیا جائے اور اس کی انفرادی خصوصیات کو اس پر الزام کے ساتھ منسوب نہ کیا جائے۔ بلکہ اس کی انفرادی خصوصیات کی بنیاد پر اس کی شخصیت کو تعمیر کیا جائے۔

آزاد درس گاہیں ایسی درس گاہیں جن میں یہ فضا پیدا کی جائے کہ بچے اپنے مشترکہ مفاد کے لئے قواعد خود ہی مرتب کریں۔ ان قواعد کی پابندی خود ہی کریں۔ خلاف ورزی کرنے والوں کے لیے بچوں کی جماعت ہی سزا تجویز کرے، اور بڑی حد تک ضبط مدرسہ کی ذمہ داری بجائے پرنسپل۔ ہیڈ ماسٹر یا استادوں کے خود بچوں پر عائد کی جائے۔ اس قسم کے مدرسوں میں بچوں میں احساس فرض پیدا ہو جاتا ہے۔ قواعد کی پابندی کسی بیرونی خوف کی وجہ سے نہیں کی جاتی بلکہ ہر بچہ ان قواعد کی ضرورت کو پورے طور پر سمجھتا ہے اور ان کی پابندی اپنے ذاتی مفاد اور جماعتی مفاد کے لیے ضروری قرار دیتا ہے۔ ایسی درس گاہوں کو "آزاد درس گاہیں" اس لیے کہا جاتا ہے کہ بچے جو کام کرتے ہیں اپنی مرضی سے کرتے ہیں اور اس کام کی خوبی اور ضرورت کو خوب سمجھتے ہیں۔ ایسے ضبط والے مدرسہ کو آزاد ضبط کہا جاتا ہے اور جو ضبط محض بڑوں کے خوف کی وجہ سے ہو اس کو جابرانہ ضبط کہنا چاہیئے۔

نیو ایجوکیشن فیلوشپ نے متذکرہ بالا درس گاہوں کی کامیابی کے لیے مسلسل تبلیغی جدوجہد کی فیلوشپ کی مساعی زیادہ تر اشاعتِ خیالات تک محدود رہی ہیں۔ لیکن فیلوشپ ان اصحاب کی جماعت رہی ہے جو تعلیم کی شریفانہ خدمات انجام دینا اپنا مقصدِ زندگی قرار دیتے ہیں۔

نیو ایجوکیشن فیلوشپ کے کارکنان اس عقیدہ کو بھی بنیادی اہمیت دیتے ہیں کہ مذہب کو تعلیم کا اہم جزو قرار دیا جائے۔ لیکن ان کا خیال ہے کہ مذہب کا تصور چند رسمی پابندیوں تک محدود نہ رہے۔ بلکہ کائنات کے خالق کا وسیع تصور پیدا کیا جائے اور روحانیت کی پاکیزہ زندگی کا مقدس مفہوم واضح کیا جائے جو دنیا کے لیے کامل سکون اور دائمی راحت کا سبب ثابت ہو۔ بین الاقوامی محبت و اخوت۔ امن عامہ اور تکمیل انسانیت کے لیے مسلسل جدوجہد کرنا نیو ایجوکیشن فیلوشپ کے اہم مقاصد ہیں، دنیا کے لیے تعلیم کی اصلاح کی ضرورت مسلمہ ہے۔ دنیا کے تمام ملکوں میں، تعلیم

صحیح بنیادوں پر قائم ہو جائے تو بین الاقوامی مشکلات کا انسداد ہو سکتا ہے۔

نیو ایجوکیشن فیلو شپ اپنے ممبران کو متوجہ کرتی ہے کہ تعلیمی مسائل پر غور و فکر مسلسل کرتے رہنا چاہیے اور اپنے ملک کے تعلیمی نظام کی اصلاح کی جائے۔ ممکن ہے کہ اپنے ملک کی تعلیمی اصلاح دوسرے ملکوں کے لئے بھی اصلاح کا سبب ثابت ہو اور اس طرح ایک مصلح تعلیم دنیا کی تمام آبادی کی خدمت کرنے کا موقع حاصل کر سکتا ہے۔

نیو ایجوکیشن فیلو شپ مختلف ملکوں کی تعلیمی جد و جہد کو ہر ماہ ایک رسالہ میں شائع کرتی ہے اس طرح ممبران کو غیر ملکوں کے تعلیمی خیالات سے واقفیت کا موقع ملتا ہے۔

ذوق جمالیات کی تربیت

فضل احمد

تعلیم صرف طرح طرح کی واقفیت اور بنیادی مہارتیں سکھانے پر بس نہیں کرتی بلکہ وہ پسندیدہ قسم کے ذوق پیدا کرنے کا اہتمام بھی اپنے ذمہ لیتی ہے، اس موضوع پر قلم اٹھانے سے پہلے مناسب ہوگا کہ ذوق کا مفہوم صاف کر دیا جائے۔ ذوق جمالیات یا جمالیاتی لذت اندوزی سے کیا مراد ہے؟ کیا اس قسم کا استحسان سکھایا جاسکتا ہے؟ ان سوالوں کا جواب دور رس نفسیاتی مباحث کا آغاز کر سکتے ہیں جن کی اس مختصر مضمون میں گنجائش نہیں۔ یہاں ان پر صرف ایک محدود دائرہ کے اندر نگاہ ڈالی جائے گی۔

ذوق جمالیات کیا ہے؟

ذوق جمالیات یا استحسان علم و مشاہدہ کا ایک مخصوص طریق ہے جو بعض باتوں میں ذہنی اور افادی ادراک سے بہت مختلف ہے۔ یہ اختلاف ان جذبات کی بنا پر پیدا ہوتا ہے جو صاحب ذوق شاہد پر طاری ہوتے ہیں۔ ذہنی اور افادی ادراک میں جذبات کی یہ حرارت ناپید ہوتی ہے۔ یہ نکتہ ایک مثال سے واضح ہو جائے گا۔ فرض کیجیے کہ ایک بندوق کا مشاہدہ کیا جا رہا ہے۔ خالی ذہنی ادراک کی صورت میں اس پر ایک بے رنگ تنقیدی نگاہ ڈالی جائے گی۔ یہ بندوق کہاں کی بنی ہوئی ہے؟ یہ کس قسم کی ہے؟ یہ کیسے لوہے کی بنی ہے؟ اس کے مختلف اجزا باہم کس طرح یک جا کیے گئے ہیں؟ یہ کس اصول پر کام کرتی ہے؟ غرض خالص ذہنی ادراک میں توجہ ایسی باتوں پر لگی رہتی ہے جن کا تعلق ہماری ذات کی بجائے صرف شہود کے ساتھ ہو اس مثال میں ہماری دلچسپی اس خاص بندوق کے ساتھ نہیں بلکہ ہم اسے ایک خاص قسم کے ہتھیار کا نمونہ خیال کرتے ہوئے اس کے متعلق طرح طرح کی باتیں معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ ہمیں اس خاص بندوق کی افادیت سے کوئی بحث نہیں۔

افادی ادراک میں توجہ کا مرکز مشہود نہیں ہوتا بلکہ وہ عملی کام جو اس سے لیے جا سکتے ہیں اور کی

مثال میں۔ یہاں ہماری توجہ بندوق کی ساخت یا اس کے کسی اور پہلو پر نہیں ہوگی۔ بلکہ ان فوائد پر جو ہم ان سے حاصل کر سکتے ہیں۔ یہاں علمی افادیت کا پہلو اس قدر غالب ہوتا ہے کہ خود شہود کی طرف معمولی توجہ کی جاتی ہے۔

مشاہدہ کی تیسری صورت یہ ہے کہ ایک مشّاق بندوقچی بہت سی بندوقوں میں سے ایک خاص بندوق کو چھانٹ لیتا ہے، وہ اسے ہاتھ میں تولتا اور اس کے توازن کا جائزہ لیتا ہے۔ اس کا جچا تلا تناسب۔ اس کی عام خوبی اور اس کا موزوں وزن یک دم بندوقچی کے دل میں مسرت کا ایک جذبہ پیدا کرتا ہے، وہ اس کے اجزا پر الگ الگ نگاہ نہیں ڈالتا، وہ اس کے اصول کار کی طرف توجہ نہیں دیتا۔ وہ اسے چلا کر دیکھنے کا بھی انتظار نہیں کرتا، بلکہ دفعتہً چلّا اٹھتا ہے "واہ - واہ ... کاریگر نے کیا خوب بندوق بنائی ہے"! وہ اس کے توازن اور تناسب سے اس قدر سوہا جاتا ہے کہ پہلی فرصت میں اسے چلا کر دیکھنا چاہتا ہے، وہ اس وقت کا انتظار نہیں کر سکتا جب اس کے چلانے کی حقیقی ضرورت پیش آئے، وہ دوسروں کو بھی یہ نفیس ہتھیار دکھاتا ہے اور اس بات کا متمنی رہتا ہے کہ دوسرے بھی اسے سراہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ جس نگاہ استحسان سے وہ بندوق کو دیکھتا ہے اسی سے دوسرے بھی اسے دیکھیں۔

جمالیاتی لطف اندوزی اس مثال سے واضح ہوگیا ہوگا کہ جمالیاتی لطف اندوزی ایک ایسی وجدانی کیفیت کا نام ہے جو ذہنی اور افادی ادراک سے بہت آگے نکل جاتی ہے، بقول غالب ؎

ہے پرے سرحد ادراک سے اپنا مسجود
قبلہ کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں۔

استحسان محویت اور استغراق کے عالم کا نام ہے۔ شاہد اپنے آپ کو شہود میں کھو دیتا ہے۔ اس طرح کھوئے جانے سے اسے ایک ایسی پُرکیف مسرت کا احساس ہوتا ہے جو اس کی روح کو بلندی اور سرور بخشتی ہے۔ یہ لطف اندوزی بدنی لذات سے مختلف ہے۔ بدنی لذات کا وجود جمالیاتی لطف اندوزی کے بغیر بھی ممکن ہے۔ مثلاً ایک پیٹو کو ذائقہ دار رنگ کھانوں سے جو لذت حاصل ہوتی ہے وہ خالص بدنی

لذت ہے۔ اس میں کسی قسم کے لطیف عناصر کو دخل نہیں۔ بقول غالب ؎

بے دلی ہائے تماشہ کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق
بے کسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں

جمالیاتی لطف اندوزی کے لئے ضروری ہے کہ بدنی لذت کے ہمراہ بعض ذہنی اجزا بھی موجود ہوں۔ مثلاً کھانے کے ضمن میں محض پیٹ بھرنے یا زبان کے چٹخارے پر ہی بس نہ ہو جائے بلکہ یہ بھی دیکھا جائے کہ اس کے رنگ و بو میں لطافت موجود ہے یا نہیں۔ اسے صاف ستھرے برتنوں میں پاکیزہ دسترخوان پر چنا گیا ہے یا نہیں۔ کھانے کا کمرہ صاف ستھرا ہے یا نہیں، غرض جمالیاتی لطف اندوزی میں تناسب توازن اور نظم و ترتیب کے ذہنی ادراک کا ہونا ضروری ہے، جہاں یہ اجزا موجود نہ ہوں وہاں وہی چیز استحسان کی بجائے تنفر پیدا کرنے کا سبب ہو سکتی ہے۔ اس کی وضاحت ایک مثال سے ہو جائے گی۔ ایک بے حد نفیس مزاج بزرگ کھانے پر مدعو تھے۔ کھانا دسترخوان پر چنا گیا تو سالن کے چند چھینٹے سفید دسترخوان پر پڑ گئے، یہ امر ان کے لطیف ذہنی ادراک پر اتنا گراں گزرا کہ جب تک دسترخوان بدلا نہیں گیا اس وقت تک وہ کھانے کا ایک لقمہ نہ اٹھا سکے۔

سرور کونین صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا ادراک اس قدر حساس تھا کہ پیراہن مبارک پر چھوٹے چھوٹے دھبے بھی طبیعت مبارک کو مکدر کر دیتا۔ لباس سادہ اور موٹا ہوتا لیکن حد سے زیادہ صاف ستھرا۔ اسی بنا پر آں حضرتؐ کو سفید لباس زیادہ مرغوب تھا۔ ایک مرتبہ کسی نے ایک دھاری دار کپڑا تحفہ کے طور پر دیا۔ آں حضرتؐ نے زیب تن فرمایا اور نماز کے لیے کھڑے ہو گئے، جب فارغ ہوئے تو یہ کپڑا اتار پھینکا اور فرمایا اس کی رنگین لکیروں نے میری یکسوئی میں فرق ڈالا۔

استحسان کے لئے ذہنی ادراک گو لازمی ہے لیکن یہ محض پس منظر کا کام کرتا ہے۔ استحسان کے وقت نگاہ مشہود کے مجموعی حسن پر ہوتی ہے۔ اس کے اجزا کو ایک ایک کر کے جانچا تولا نہیں جاتا اگر ایسا کیا جائے تو استحسان کا سارا کیف و سرور خاک میں مل جائے۔ اس نکتہ کی وضاحت ایک مثال سے ہو جائے گی۔ فرض کیجئے مندرجہ ذیل اشعار زیر بحث ہیں:۔

دریا کی روانی

اچھلتا ہوا اور ابلتا ہوا — اکڑتا ہوا اور مچلتا ہوا
یہ بنتا ہوا اور وہ تنتا ہوا — ٹپکتا ہوا اور چھنتا ہوا
روانی میں اک شور کرتا ہوا — رکاوٹ میں اک زور کرتا ہوا
ادھر پھولتا اور پچکتا ادھر — رخ اس سمت کرتا۔ کھسکتا ہوا
پہاڑوں پہ سر کو ٹپکتا ہوا — چٹانوں پہ دامن جھٹکتا ہوا
وہ پہلوئے ساحل دباتا ہوا — یہ سبزہ پہ چادر بچھاتا ہوا
بھٹکتا ہوا۔ غل مچاتا ہوا — وہ جل تھل کا عالم رچاتا ہوا
ادھر جھومتا اور شکتا ہوا — ادھر گھومتا اور شکتا ہوا
بپھرتا ہوا۔ جوش کھاتا ہوا — بگڑ کر وہ کف منہ میں لاتا ہوا
ادھر گونجتا۔ گنگناتا ہوا — ادھر خود بخود بھنبھناتا ہوا
تڑپتا ہوا۔ جگمگاتا ہوا — شعاعوں کا جوبن دکھاتا ہوا

یوں ہی الغرض ہے یہ پانی رواں
بس اب دیکھ لیں شاعر نکتہ داں

اکبر الہ آبادی کے ان اشعار پر کئی طرح سے نگاہ ڈالی جا سکتی ہے۔ انہیں قواعد زبان سکھانے کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً ان کی تحلیل صرفی اور ترکیب نحوی کی جا سکتی ہے۔ ان کی مدد سے زبان کے مختلف قاعدے اور ترکیبیں سکھائی جا سکتی ہیں۔ اس کے علاوہ انہیں عروض و قوافی کی مشق کا ذریعہ بنایا جا سکتا ہے۔ اور شاعرانہ فن کے مختلف ذرائع کی شرح ان میں تلاش کی جا سکتی ہے۔ یا ان تمام علمی باریکیوں کو چھوڑ چھاڑ ان اشعار کا زبانی یاد کرنا ہر طالب علم کے لئے ضروری قرار دیا جا سکتا ہے۔ ان کا زبانی امتحان میں کامیابی کی شرط قرار دی جا سکتی ہے۔ لیکن ان تمام صورتوں میں نگاہ الفاظ کے ظواہر پر اٹک کر رہ جائے گی۔ وہ ان کی موزوں لفظی تصویروں اور میٹھے ترنم کو نہ پا سکے گی۔

استحسان میں الفاظ کا ادراک ایک ضروری شرط ہے۔ الفاظ کے معانی جانے بغیر ان کی تحسین کا ذکر کرنا بے معنی ہے۔ استحسان کا عمل شروع میں اس وقت ہوگا جب لغات کی دشواریاں ختم ہو جائیں لیکن جب یہ عمل شروع ہو جائے پھر کوئی اور اثرات اس میں خلل انداز نہ ہونے چاہئیں۔ اس وقت تماشائی پورے طور پر لفظی تصویروں کے لطیف حسن اور ان کے متوازن ترنم میں کھویا ہوگا۔ اسے اور کسی چیز کو ایک آنکھ دیکھنے کی فرصت نہ ہوگی۔

استحسان کا آغاز بے شک کثیف بدنی لذت سے ہوتا ہے۔ بچپن میں ہم صرف بدنی لذات ہی سے متاثر ہوتے ہیں جوں جوں پختگی بڑھتی ہے، ان لذات کی کثافت گھٹنے لگتی ہے، اب ان میں تناسب اور توازن کا حسن ڈھونڈا جانے لگتا ہے۔ تاآں کہ یہ چیز بذات خود مقصود ہو جاتی ہے۔ نظم و ضبط اور توازن و تناسب کا شیدائی بن جانا استحسان کی استعداد پیدا کرتا ہے۔ یہ استعداد اخذ کی جاتی ہے مشاہدے اور جذبات کے درمیان مضبوط رشتے قائم کرنے سے وجود میں آتی ہے۔

جمالیاتی لذت اندوزی کی تدریس

استحسان کی ماہیت اور اس کے اجزائے ترکیبی معلوم ہو جانے کے بعد اب اس بات پر غور کیا جا سکتا ہے کہ اس کی تدریس کس طرح ہونی چاہئے اور آیا یہ ممکن بھی ہے کہ استحسان کی استعداد پیدا کی جا سکے۔ تدریس پر بحث کرنے سے پہلے دوسرے سوال کا جواب طے کر لینا چاہئے۔ یہ دیکھا جا چکا ہے کہ بدنی لذات اور ادراک استحسان کی سمت میں دو ابتدائی قدم ہیں۔ اگر کسی شخص میں ان دونوں میں سے کسی ایک کی استعداد ناپید ہے تو اسے استحسان نہیں سکھایا جا سکتا۔ مثلاً جو شخص آنکھیں نہیں رکھتا اسے فن مصوری سے لطف اندوزی کے قابل نہیں بنایا جا سکتا۔ اسی طرح جو شخص اس قدر ضعیف العقل ہے کہ وہ توازن اور تناسب کا ادراک نہیں کر سکتا اس میں جمالیاتی لطف اندوزی کی صلاحیت پیدا نہیں کی جا سکتی۔ پس جب ہم استحسان کی تدریس کا ذکر کرتے ہیں تو یہ بات پہلے سے فرض کر لیتے ہیں کہ بدنی لذت اندوزی اور ذہنی ادراک کی صلاحیتیں موجود ہیں۔

اس ضمن میں دوسرا قابل ذکر نکتہ یہ ہے کہ استحسان انفرادی جذبات کا معاملہ ہے، چونکہ جذبات

جذبات بالکل ایک سے نہیں ہو سکتے، اس لئے ایک ہی چیز اور ایک ہی مشاہدہ سے مختلف لوگ مختلف قسم کا جمالیاتی سرور حاصل کریں گے، لہذا استاد کو یہ توقع نہ رکھنی چاہیئے کہ کسی ایک فنی شاہکار سے سب طالب علم ایک ہی ساتھ متاثر ہوں گے یا ان کی اثر پذیری کی کیفیت اور کمیت یکساں ہو گی۔

طریق تدریس استحسان کا سبق چار اقدام میں بٹنا چاہیئے (۱) تیاری (۲) استحضا، (۳) رہنمائی (۴) تخلیقی مشق ۔ ذیل میں ان چہارگانہ اقدام پر مختصر روشنی ڈالی جاتی ہے ۔

(۱) **تیاری** :- تمہید یا تیاری ہر سبق کا لازمی جزو ہوا کرتا ہے ۔لیکن استحسان کے سبق میں اس کی اہمیت غیر معمولی ہے کیوں کہ یہاں اس کا مقصد یہ ہے کہ آنے والے مشاہدہ کے لئے ضروری ذہنی پس منظر اور جذباتی استعداد پیدا ہو جائے تاکہ طلبہ استحضار کے وقت بلاواسطہ محو تماشا بن سکیں چنانچہ یہاں تیاری پر زیادہ وقت اور زیادہ توجہ صرف ہو گی ۔

تیاری کی طرف پہلا قدم یہ ہو گا کہ ان موثرات اور دلچسپیوں کا راستہ بند کر دیا جائے جو آنے والے مشاہدہ کی راہ میں روڑے ثابت ہو سکیں ۔ اگلا کام یہ ہو گا کہ اس مشاہدہ کے لئے شوق انتظار پیدا کیا جائے اس کی صورت یہ ہے کہ اس کی طرف کوئی معنی خیز اشارہ کر دیا جائے یا کسی سابقہ سبق کے ساتھ اس کا تعلق قائم کر دیا جائے ۔

تیاری میں اگلا قدم موزوں ذہنی پس منظر کا پیدا کرنا ہے ۔مثلاً اگر ہم اکبر الہ آبادی کی وہ نظم پیش کرنا چاہتے ہیں جو پیچھے دی جا چکی ہے تو اس کے متعلق ہر قسم کی ضروری واقفیت بہم پہونچانی ہو گی۔ مشکل الفاظ و محاورات کے معانی بھی اسی واقفیت میں شامل ہیں، استحضار کے وقت استحسان کی محویت میں لفظی بحثوں سے خلل نہیں ڈالا جائے گا ۔ یہ کام تیاری کے مرحلہ پر کرنے کا ہے ۔ یہاں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ نظم کے استحسان کے لئے صرف لغوی معانی کافی نہیں ۔شاعر کی فن کاری محض الفاظ کی موزونیت تک محدود نہیں رہتی ۔بلکہ اس کا تخلیقی فن اس سے بہت آگے جاتا ہے، وہ لفظوں کی مدد سے ذہنی تصویر یں کھینچتا چلا جاتا ہے ،اس کا ہر لفظ ایک مخصوص ذہنی تصور پیدا کرنے کے لئے چنا گیا ہوتا ہے ۔ یہ تمام تصویریں باہم مل کر وہ پُر کیف ذہنی منظر پیدا کرتی ہیں جو شاہد پر محویت کی کیفیت طاری کر دیتا ہے ۔

تیاری کے وقت استاد کو چاہیئے کہ لغات کے معانی کے علاوہ ہر لفظ کی مخصوص ذہنی تصویر کی وضاحت بھی کرے

تیاری میں آخری قابل توجہ بات یہ ہے کہ مشاہدہ سے پہلے موزوں جذباتی استعداد پیدا کر دی جائے تاکہ طلبہ اس جذباتی کیفیت کے لئے مستعد ہو جائیں جو دوران مشاہدہ طاری ہونے والی ہے۔ اگر مشاہدہ اندوہناک جذبات سے بھرپور ہے تو استاد اسی قسم کا جذباتی ماحول پیدا کرے گا اور اگر وہ سرور بخش جذبات سے لبریز ہے تو اس کے حسب حال جذباتی ماحول کا اہتمام ہوگا۔ کمرہ جماعت اور اس کے اردگرد کا ماحول بہر حال پیش آنے والے مشاہدہ سے ہم آہنگ ہونا چاہیئے۔ اگر بلا کی گرمی پڑ رہی ہے اور گرمی کی شدت سے روح پگھلی جا رہی ہے تو لطیف اور سرور بخش جذباتی ماحول کا پیدا کرنا قریب قریب محال ہے۔ اس سے یہ نکتہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ تدریس استحسان کے لیے ذاتی تیاری کرنے کے لیے بعض اوقات کافی وقت چاہیے۔ اس قسم کے سبق مقررہ نظم اوقات کی حدبندیوں کو برداشت نہیں کر سکتے۔ مثلاً یہ نہیں ہو سکتا کہ ہر ہفتہ میں استحسان کا ایک سبق ہو جایا کرے۔ حالات اور ماحول سازگار ہوں تو شاید ہفتے میں ایسے ایک سے زیادہ اسباق بھی ہو جائیں اور اگر ایسا نہ ہو تو شاید کئی ہفتوں میں ایک سبق بھی نہ ہو سکے۔

(۲) **استحضار**۔ سبق کے اس مرحلہ پر مشاہدہ کرنے والوں پر محویت اور استغراق کی کیفیت طاری ہونی چاہیئے۔ اگر تیاری کے قدم میں اس چیز کے لیئے اچھی طرح راستہ صاف کر دیا گیا ہے تو اب استاد کو اطمینان رکھنا چاہیئے کہ مشہود کا حسن خود بخود اپنی تاثیر پیدا کر لے گا۔ اس کا پیش کر دینا ہی اس بات کی ضمانت ہوگا کہ مشاہدہ کرنے والے اس کے تناسب و توازن کی لطافت سے اس طرح سرشار ہو جائیں کہ ان کی ساری توجہ اسی ایک نقطہ پر مرکوز ہو جائے۔ اس غرض کے لیئے ضروری ہوگا کہ مشہود کافی عرصہ تک شاہدہ کے لیے پیش رہے۔ تاکہ اس کے حسن پر مختلف زاویہ ہائے نگاہ سے نظر ڈالی جا سکے۔ مشاہدہ کے عمل میں کسی قسم کی رکاوٹ پیدا نہ ہونی چاہیئے۔ تدریس کا پورا پیریڈ مشاہدہ پر صرف کرنے ہی سے یہ غایت حاصل ہوگی۔ تیاری کے مرحلے پہلے طے کر لینے چاہئیں۔

بعض استاد نظم اور نثر کے اسباق میں کچھ تمیز نہیں کرتے وہ نظم پڑھاتے وقت بھی الفاظ و معانی کی تشریح کا اسی طرح اہتمام کرتے ہیں جس طرح نثر پڑھاتے وقت۔ زباندانی کے اسباق میں

[محا]ورات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا لیکن نظم کی بڑی غایت زبان سکھانا نہیں بلکہ جذبات کی تربیت ہے ہر ایک نظم مخصوص قسم کے جذبات جگانے کے لئے لکھی جاتی ہے۔ اس کے الفاظ کا مدھم یا تند و تیز ترنم اور اس کی ذہنی تصویریں اسی مقصد کے لئے تیار کی گئی ہوتی ہیں۔ اگر نظم کا ماحصل بھی مخصوص ذخیرہ الفاظ میں اضافہ کرنا سمجھ لیا جائے تو یہ غایت نثر کے سبق سے زیادہ آسانی کے ساتھ پوری ہو سکتی ہے۔ لہٰذا نظم کی پہلی غایت نگاہ استحسان پیدا کرنا ہے۔ نظم فن کار کا ایک نازک شاہ کار ہے جو جمالیاتی لطف اندوزی کے لیے تیار کیا گیا ہے۔ استاد اسے مزے لے لے کر پڑھ کر سنائے گا۔ اگر وہ گانا جانتا ہے تو اسے گا کر بھی سنا سکتا ہے۔ اگر اس نظم کا کوئی ریکارڈ موجود ہے تو وہ بجایا جا سکتا ہے۔ پھر طلبہ میں سے زیادہ مستعد لڑکے اسے پڑھ کر سنائیں گے۔ طلبہ انفرادی طور پر اسے بار بار پڑھیں گے اور لطف اٹھائیں گے الفاظ و محاورات کی تشریح و وضاحت کے جھگڑوں کو اس لطف اندوزی میں خلل ڈالنے کی اجازت نہیں ہو گی۔ یہ کام تیاری کے ضمن میں کسی پچھلے پیریڈ میں کر لیا گیا ہو گا۔ لیکن نظم پڑھانے کا یہ طریق ہر نظم پر لاگو نہیں ہو سکتا اس طریق پر وہی نظم پڑھائی جا سکے گی جو حقیقی طور پر تخلیقی فن کا ایک اچھا نمونہ ہو۔

(۳) رہ نمائی :۔ استحضار نے اگر اپنا کام پورا کر دیا ہے تو اس کے ختم ہوتے ہی مشاہدہ کرنے والے غیر رسمی طریق پر اپنے اپنے تاثرات کا اظہار کرنے لگیں گے۔ استاد صرف اس اظہار رائے کی موزوں رہ نمائی کرے گا۔ ہر طالب علم آزادانہ ماحول میں مشہود کے ان پہلوؤں کا ذکر کرے گا جن سے وہ بہت زیادہ متاثر ہوا ہے۔ اگر جماعت مشاہدہ کے بعض حصوں میں غیر معمولی دل چسپی کا اظہار کرے تو اسے دوبارہ پیش کیا جا سکتا ہے۔ لیکن استاد کو یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ اس قسم کا استحسانی نقد و تبصرہ ہمیشہ رضا کارانہ طور پر ہی ہو سکتا ہے۔ اسے بہ جبر طلبہ پر ٹھونسا نہیں جا سکتا۔ جو طالب علم مشہود سے غیر معمولی طور پر متاثر ہوئے ہیں وہ عموماً اپنے تاثرات بیان کرنے کے لئے بے تاب ہوں گے۔ ہاں کچھ ایسے طلبہ بھی ہوں گے جو متاثر تو ہوئے ہیں لیکن شرمیلے پن یا قوت اظہار کی کمی کے باعث دل کی بات کہنے سے جھجکتے ہیں۔ ایسے طلبہ کی دست گیری کرنا استاد کا کام ہے۔

استحضار کے بعد فنی قسم کا نقد و تبصرہ بھی ہو سکتا ہے۔ مثلاً نظم کے استحسان کے بعد ان شاعرانہ

خصوصیات پر بحث ہوسکتی ہے جن کے طفیل شاعر نے اپنا مقصد حاصل کیا ہے۔ لیکن یہ کام سیانے طالب کے کرنے کا ہے۔ چھوٹی جماعتوں میں ایسی کوشش کرنا بے سود ہے۔ فنی بحث کا انحصار کلی طور پر طلبہ کی ان کی استعداد اور دلچسپیوں پر ہونا چاہیئے۔ ابتدائی مرحلوں پر صرف ایسی فنی چیزوں کی طرف توجہ دلائی جاسکتی ہے جن کا علم استحسان کی تاثیر بڑھانے کا موجب ہو سکے۔

(۴) **تخلیقی مشق:** ۔ زیادہ ہونہار لڑکے اکثر یہ پسند کریں گے کہ خود انہیں بھی شاہدہ کردہ نمونے کی تقلید میں تخلیقی کوشش کرنے کا موقع ملے۔ وہ استاد کی رہ نمائی اور مشورہ سے ایسی کوشش کو جاری رکھیں گے۔ اگر استاد مناسب حوصلہ افزائی اور رہ نمائی سے کام لے تو اکثر بچے فن کاری میں حیرت انگیز دلچسپی اور صلاحیت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ یہ کام دراصل فن میں مہارت حاصل کرنے کا ہے اور اسے مہارتی سبقوں کے اصولوں کے تابع رکھنا چاہیئے۔

استاد کی اہمیت

تدریس کے ہر عمل میں استاد کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ لیکن تدریس استحسان میں اس کی اہمیت اور بھی زیادہ ہے۔ اگر استاد خود جمالیاتی لذت اندوزی سے کورا ہے تو وہ کبھی نگاہ استحسان پیدا نہیں کر سکتا، ذوق و وجدان کی نوعیت بڑی حد تک متعدی امراض کی سی ہے۔ ان کا تعلق الفاظ و کلام سے نہیں جذبات و احساسات کے ساتھ ہے۔ اگر کسی چیز کا شاہدہ استاد کے دل میں جذباتی گرمی پیدا کر دیتا ہے تو یہ گرمی خود بخود منعکس ہو کر دوسروں کو بھی متاثر کرے گی لیکن جہاں یہ گرمی ناپید ہو وہاں اثر پذیری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، دوسروں کو دیدہ ور بنانے والے کے لیے ضروری ہے کہ خود بھی دیدہ ور ہو ۔

بچوں کی تربیت اور والدین کی ذمہ داری

پروفیسر شبیر احمد قاری

بچوں کی تربیت اور سماج میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ یہ مسئلہ کہ تعلیم نے پہلے جنم لیا یا سماج نے۔ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کا آج تک فیصلہ نہ ہو سکا۔ یہ بات اپنی جگہ کافی وزن رکھتی ہے کہ ایک اچھا تعلیمی نظام ایسے ہی سماج میں جنم پا سکتا ہے جو ہر اعتبار سے ترقی پا چکا ہو۔ مگر یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ سماجی ترقی کی تمام تحریکیں کوئی نہ کوئی تعلیمی بنیاد رکھتی ہیں۔ بہرحال اس قدر واضح ہے کہ بہتر طریقہ تعلیم ایک اعلیٰ سماج پیدا کر سکتا ہے۔

پاکستان ایک نوزائیدہ ملک ہے اور جن مقاصد کے حصول کی خاطر اسے معرض وجود میں لایا گیا وہ سب کے پیش نظر ہیں۔ ہماری قدیم تہذیب اور تمدن کیا تھے؟ ہم نے مہذب دنیا کی تعمیر میں کیا حصہ لیا؟ کس طرح تہذیب کو آگے بڑھایا اور کیوں سب سے پیچھے رہ گئے؟ یہ سوالات تفصیل طلب ہیں مجھے اس وقت صرف یہی کہنا ہے کہ ہم وہ نہیں رہے جو ہمیں ہونا چاہیے تھا اور پاکستان کے قیام کا مقصد اولین اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم اپنی کھوئی ہوئی تہذیب و شائستگی کو پھر حاصل کریں۔ ہم اپنی منزل سے بہت دور رہ گئے ہیں۔ وہ لوگ جن کی جمعیت کو آج قوم کہا جاتا ہے پاکستان کے خواب کی تعبیر نہیں ہیں بلکہ وہ نسل جو موجودہ قوم کی جگہ لے گی ہماری امیدوں کا مرکز ہے۔ ہماری موجودہ نسل اپنا وقت پورا کر چکی اور نئی نسل اس کی جگہ لینے والی ہے۔ ہم نے جس ماحول میں پرورش پائی اس میں ہم وہی بن سکتے تھے جو ہم آج ہیں۔ مگر ہم یہ نہیں چاہتے کہ ہماری نئی نسل ہماری طرح ہو۔ تعمیر قومی کی منزل کٹھن ہے اور اس کے لیے بہترین زاد سفر بچوں کی صحیح تربیت ہے۔ اس کام کے لیے ہمیں پہلے اپنی تربیت کرنی ہوگی کہ وہ عادات جو ہم میں پختہ ہو چکی ہیں ہماری آئندہ نسل کو ورثے میں نہ مل سکیں ہمیں اپنے بچوں کی تربیت کے لیے ایک صحت مند ماحول پیدا کرنا ہوگا تاکہ وہ ہمارا نہیں بلکہ ہماری آرزوؤں کا جواب ہوں۔

یوں تو انسان آغوشِ مادر سے لے کر آغوشِ لحد تک کچھ نہ کچھ سیکھتا ہی رہتا ہے۔ مگر اس کی زندگی کا ابتدائی حصّہ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ اہم ہوتا ہے۔ ان چند سالوں میں ہی انسان کی سیرت کا سنگِ بنیاد رکھا جاتا ہے۔ اس ابتدائی دور میں پہلے والدین اور پھر استاد پر بچہ کی تربیت کی ذمہ داری ہوتی ہے بلکہ یوں کہنا زیادہ درست ہوگا کہ پہلے والدین تنہا اور اس کے بعد استاد کی شرکت میں بارِ تربیت اٹھاتے ہیں۔ ہمارے ابتدائی مدارس میں جس طرح تعلیم ہوتی ہے اور اساتذہ میں جس قدر خامیاں موجود ہیں اس کے لیے ایک الگ مضمون درکار ہے۔ ہمیں اس وقت صرف "آغوشِ مادر" سے بحث ہے۔ ماں باپ کی تربیت بچہ کی سیرت پر اس وقت اثر انداز ہوتی ہے جب اس کے دل و دماغ کا آئینہ ہر نقش سے مبرا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس عہد کے نقوش سب سے زیادہ واضح اور دیرپا ہوتے ہیں۔ دنیا کی تاریخ میں لاتعداد مثالیں ان لوگوں کی موجود ہیں جن کی سیرت کا سنگِ بنیاد والدین نے اس طرح رکھا کہ اس کی بدولت وہ ایک عظیم الشان شخصیت کا محل تعمیر کر سکے۔

روزمرہ زندگی میں ہم دیکھتے ہیں کہ والدین کی شخصیت قدم قدم پر بچوں کی سیرت میں جلوہ گر نظر آتی ہے۔ خدا ترس اور نیک والدین کے بچے عموماً نیک اور خدا ترس ہوتے ہیں۔ بعض خصائل بعض قوموں اور نسلوں کے لیے مخصوص ہوتی ہیں۔ ہمارے ملک میں شرافت خاندانی کو اسی لیے اہمیت حاصل تھی کہ شرفا کے بچے ایک اعلیٰ اور صحت مند ماحول میں پرورش پاتے تھے، اس لیے ان سے عوام کی نسبت زیادہ ارفع و اعلیٰ کردار کی توقع کی جاتی تھی۔ آج کل بھی عام طور پر دیکھنے میں آتا ہے کہ خاندانی اور شریف النسل لوگوں کے بچوں میں عموماً اپنے خاندانی اوصاف موجود ہوتے ہیں۔ بچوں کی تربیت کے سلسلہ میں گھر اور ہمسایہ ماحول کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ میں ایک ایسے شخص کو جانتا ہوں جو ایک گاؤں میں پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم قصبہ میں پائی۔ بچپن میں وہ آئے دن زمین وغیرہ کے جھگڑے اور معمولی معمولی باتوں پر نااتفاقیاں اور تلخ رنجیاں دیکھتا تھا۔ اس کی ثانوی تعلیم نسبتاً ایک بڑے اسکول میں ہوئی اور کالج کی تعلیم ہندوستان کے ایک بہترین ادارے میں ہوئی اور پھر اس نے ولایت سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ محنت شاقہ اور بُری عادتوں سے پرہیز اس کی بہترین خوبیاں تھیں۔ اب وہ ایک افسرِ اعلیٰ تھا۔ اپنی محنت اور فرض شناسی کے جوہر رکھنے کے باوجود وہ اپنے ماتحتوں میں

محبوب نہ بن سکا۔ اس کی غیر محبوبیت کی وجہ ماتحتوں کی سہل انگاری نہیں تھی، بلکہ اس کا ذرا ذرا سی باتوں پر ادنیٰ ترین ملازم سے الجھ پڑتا تھا۔ یہ نتیجہ ہے ادنیٰ دیہاتی ماحول میں ابتدائی تربیت پانے کا جہاں ایک ہی خاندان کے لوگ معمولی معمولی باتوں پر لڑتے جھگڑتے رہتے تھے اور جس کا اثر اعلیٰ تعلیم اور بلند عہدہ جیسی چیزیں بھی دور نہ کر سکیں۔

اس تفصیل کا اجمال یہ ہے کہ گھر کا ماحول اور والدین کی شخصیت اور تربیت بچے کی سیرت کا سنگِ بنیاد ہیں۔ والدین کو بچے کی نفسیات سے اس قدر ضرور واقف ہونا چاہیئے جو بچے کی سیرت کی تشکیل کے لئے ضروری ہے۔ اگر والدین بچے کی سیرت کا سنگِ بنیاد درست نہ رکھ سکے تو نتیجہ اس کے علاوہ کچھ نہ ہوگا کہ تاثریا می رود دیوار کج"۔ استاد کی تربیت ثانوی چیز ہے۔ اگر ابتدا ہی غلط طریقہ سے ہوئی ہے تو اچھے استاد کو بھی بے پناہ دقتوں کا سامنا ہوتا ہے، یوں بھی گھریلو تربیت کا اثر زائل کرنا مشکل کام ہے خصوصاً ہمارے ملک میں بچے اپنے وقت کا زیادہ تر حصہ والدین ہی کے ساتھ گذارتے ہیں، اس لئے نتیجہ یہی ہوگا کہ ایک طرف استاد سودائے خام میں مبتلا رہے گا اور دوسری طرف والدین ان خامیوں کو پختہ تر کرتے رہیں گے۔

بچے کی پرورش کے سلسلہ میں والدین کو انتہائی احتیاط اور تحمل سے کام لینا چاہیئے، بچہ کی عمر کے پہلے دو سال ماہرِ نفسیات کے لئے بڑی اہمیت رکھتے ہیں تجسس کا مادہ بچے کی سیرت میں قدرت کی طرف سے اسی لئے ودیعت ہوا ہے کہ وہ علم حاصل کرنے میں اس کا معاون ثابت ہو، بچہ دنیا میں آنکھیں کھولتے ہی ہر چیز کو حیرت اور اشتیاق سے دیکھتا ہے۔ ہر چیز کے متعلق اس کے دل میں طرح طرح کے سوالات پیدا ہوتے ہیں معمولی سے معمولی چیز اس کے لیے دلچسپی کا سامان ہوتی ہے۔ پہلے اور دوسرے سال کی درمیانی عمر میں بچہ اپنے اندر بڑوں کی خصوصیات پیدا کرنا شروع کرتا ہے۔ وہ چلنا اور بولنا سیکھتا ہے۔ اور ہر کام میں بڑوں کی نقل کی کوشش کرتا ہے یہ وقت اس کی سیرت کی تعمیر کے سلسلہ میں بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے سمجھدار والدین اسی وقت سے بچے کو اچھی عادات کی طرف مائل اور بری عادات سے متنفر کر سکتے ہیں۔ اگر وہ اس میں کامیاب ہو جائیں تو آئندہ کے مراحل ان کے لیے بہت آسان ہو جاتے ہیں۔ مگر ہمارے یہاں سب سے بڑی بدقسمتی یہی ہے کہ لوگ اس عمر میں بچوں کی تربیت کی طرف قطعاً توجہ نہیں دیتے

بلکہ اس عمر میں بے جا پیار کر کے ان کی عادات خراب کر دی جاتی ہیں۔ جب بچہ قدرے بڑا ہوتا ہے تو والدین
اسے تہذیب سکھانے اور تعلیم دینے کی طرف توجہ دیتے ہیں اور اپنی ناسمجھی کے باعث بچے کو اپنے معیار پر
جانچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ بچے کی فطری صلاحیتوں اور اس کی نفسیات سے کوئی تعلق نہیں رکھتے
ان کے ذہن میں پہلے سے ایک خاکہ موجود ہوتا ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ بچے کے اطوار و عادات خاکے کے
عین مطابق ہوں۔ بچہ اپنی فطری ناواقفیت کی بنا پر جب ان کے معیار سے گرتا نظر آتا ہے تو وہ بجائے
اس سے ہمدردی سے پیش آنے کے ناراض ہوتے ہیں اور سزا دینا چاہتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے
اس عمل سے بچے کے لیے سیکھنے کا کام ناگوار اور اس کی سیکھنے کی فطری صلاحیت کو بے کار کر دیتے ہیں۔

بچے کی سیرت کی تشکیل کے لیے پہلے سے ذہن میں ایک پروگرام ہونا کوئی بری بات نہیں (اگرچہ
سمجھدار والدین بچے کی فطری صلاحیتوں کا جائزہ لے کر اس کے نشو و نما کا پروگرام بناتے ہیں) تاہم اس
پروگرام پر جس طرح عمل کیا جاتا ہے وہ سراسر غلط اور غیر فطری طریقہ ہے۔ ننھے بچے کی مثال ایک نوزائیدہ
پودے کی سی ہے جس طرح ایک اچھا باغبان اگرچہ ہر پودے کو ایک خاص انداز کا درخت بنانا چاہتا
ہے۔ مگر اس کے ساتھ زبردستی کرنے کے بجائے اس کی نزاکت کو پوری طرح مدِ نظر رکھتے ہوئے اس کی
پرورش کے لیے ایک تدریجی پروگرام بناتا ہے۔ عین اسی طرح والدین کو بھی بچے کی نفسیات کو
پوری طرح مدِ نظر رکھتے ہوئے ان کی تربیت کرنی چاہیئے۔ انہیں بچے کی فطرت کا پورا خیال رکھتے ہوئے کبھی
نرمی کبھی سختی اور کبھی کھیل کود کی باتوں میں اس کو اپنی پسندیدہ باتیں اور مذہبی نکات سکھانے چاہئیں۔

بچے کی زندگی کسی ضبط کے ماتحت ضرور ہونی چاہیئے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اس پر بے جا جبر کیا جائے
اس نظم و ضبط کے لئے محبت اور پیار سزا کی نسبت زیادہ مفید ثابت ہوں گے۔ محبت اور پیار بھی اگر حد سے
بڑھ جائیں تو یقیناً مضر اثرات پیدا ہوتے ہیں۔ ناجائز روک ٹوک اور بے جا پیار دونوں برے اثرات کے
حامل ہوتے ہیں۔ والدین کو ان دونوں چیزوں میں توازن رکھنا چاہیئے۔ لاڈلے بچے عموماً ضدی اور
بد دماغ ہوتے ہیں۔ خود اعتمادی کا مادہ ان میں بہت کم ہوتا ہے۔ زمانہ کے سرد و گرم سہنے کی ان میں طاقت
نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ والدین ان کی جائز و ناجائز باتوں میں تمیز نہیں کرتے وہ محبت کے

بچپن میں ان کی ہر آرزو پوری کرتے رہتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کچھ عرصہ بعد یہ عادات بچے میں پختہ ہو جاتی ہیں اور پھر اگر اس کی بات نہ مانی جائے تو وہ ضد کرنے لگتا ہے۔ اسی طرح والدین انتہائی محبت کی وجہ سے بچے کی ہر اس کام میں مدد کرنا چاہتے ہیں جس کے کرنے میں وہ لطف حاصل کرتا ہے۔ مثلاً وہ کوئی زیادہ وزن اٹھانا چاہتا ہے والدین خود اٹھا دیتے ہیں یا وہ سیڑھیاں چڑھنا چاہتا ہے والدین گود میں اٹھا کر اسے اوپر پہونچا دیتے ہیں۔ اسی طرح کھیل کود سیر و تفریح ہر معاملہ میں اس کی مدد کرتے ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچے کا وہ قدرتی شوق (ہر کام خود کرنے کا) ختم ہو جاتا ہے، اس میں نہ تو عملی صلاحیت رہتی ہے اور نہ خود اعتمادی۔ پھر وہ ہر کام میں دوسروں کی مدد اور سہارے کا خواہاں ہوتا ہے۔ بڑے ہو کر اس میں خطرات مول لینے اور کسی معاملہ میں پہل کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی، خود اعتمادی کی کمی کی وجہ سے وہ ہمیشہ ناکامیوں سے دوچار ہوتا رہتا ہے۔ لہٰذا والدین کو اس کا پورا خیال رکھنا چاہیئے کہ ان کی روک ٹوک اور بے جا مدد بچے کی فطرت کے بہترین جوہر کو نہ فنا کردے۔ انہیں بچے کو آزاد چھوڑ دینا چاہئے جہاں بچے کو روکنے یا اس کی مدد کرنے کی ضرورت پڑے اس طرح مدد کریں کہ بچے کی خودداری اور انانیت کو ٹھیس نہ لگے۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا ہے تجسس کا مادہ بچوں میں فطری ہوتا ہے۔ وہ جوں ہی بولنا سیکھتے ہیں چیزوں کے متعلق طرح طرح کے سوالات کرتے ہیں۔ بچوں کو کچھ سکھانے کا یہ بہترین وقت ہوتا ہے۔ والدین کو بچے کے ہر سوال کا جواب پوری احتیاط اور ہمدردی سے دینا چاہیے۔ اور اس طرح پیش آنا چاہیے کہ ان میں نئی باتیں معلوم کرنے کا شوق ترقی کرے۔ کبھی کبھی خود بھی ان سے کوئی بات اس طرح دریافت کی جائے گویا خود علم حاصل کرنا مقصود ہے۔ اس طرح بچوں میں خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے اور یہ احساس کہ "ہم بھی کچھ جانتے ہیں"۔ ان میں ذہانت اور نئی باتیں معلوم کرنے کے ذوق کا اضافہ کرتا ہے۔

مندرجہ بالا سطور اگرچہ اس موضوع پر بہت ہی ناکافی ہیں۔ ایک ایسے موضوع کے متعلق کچھ لکھنا جس پر ہر زبان میں بہت زیادہ اور بہت عمدہ لکھا گیا ہے۔ بظاہر خورشید کو آئینہ دکھانے کے مترادف ہے۔ تاہم اتنا ضرور ہے کہ اس مضمون سے والدین اور اساتذہ کو بچوں کی نفسیات کے متعلق معلومات

حاصل کرنے کی تحریک ہوگی اور وہ خود کو اس قابل بنانے کی کوششیں کریں گے کہ بچوں کے مسائل اور ان کی نفسیات سے واقف ہو جائیں۔ اگر اس مضمون سے واقعی یہی اثر ہوا تو یہ ملک اور قوم کے لیے بے حد مفید ہوگا اور میں یہ سمجھوں گا کہ میرا مقصد حاصل ہو گیا۔ ٹریننگ کالج کے طلبہ جو آگے چل کر استاد اور والدین بننے والے ہیں، انہیں نفسیات کی تعلیم پر خاص طور پر زور دینا چاہیے۔ کیوں کہ تعمیر قومی کے سلسلہ میں ان کی ذمہ داری عوام سے زیادہ ہے۔

آخر میں ایک بات اور کہنا چاہتا ہوں کہ سزا کا مسئلہ اس قدر سیدھا نہیں ہے جتنا ٹریننگ کالج کی کتابوں میں۔ یعنی "سزا دینی ہی نہیں چاہیئے"۔ اسلام دین فطرت ہے اور اس میں سزا اور جزا کا قانون موجود ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان فطری طور پر سزا کے خوف کے بغیر بری باتوں سے باز نہیں رہ سکتا اور اچھے کام کو کرنا نہیں چاہتا جس میں اسے محنت کرنا پڑے۔ اس نکتے کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے حسب ضرورت اس پر عمل کرنا چاہیئے۔ اس سلسلہ میں اگر اعتدال اور توازن قائم رکھا گیا تو بچوں کی تعلیم و تربیت میں یقیناً مفید ثابت ہوگا۔ ⁂

سوڈان میں

نئی تعلیم اور نیا معاشرہ

محمد عبدالعزیز

افریقہ کے نوآبادیاتی علاقوں میں سوڈان بہت جلد برطانیہ کی سامراجی گرفت سے نکل کر ایک آزاد حیثیت حاصل کر لے گا، ایک ایسی آزاد حیثیت جس میں اسے اپنی ملی ضروریات اور فکری تعمیر کا پورا پورا موقع ملے گا۔ اس وقت یہاں انجمن اقوام متحدہ کی نگرانی میں ایک عبوری حکومت مستقبل کے سوڈان کی ہیئت ترکیبی کا ڈھانچہ تیار کر رہی ہے جو یقیناً سوڈانیوں کے سیاسی، سماجی، معاشی اور اقتصادی تقاضوں کا حامل ہوگا اور اس نئے ماحول میں سوڈانیوں کو اپنے معیار اور اپنی قدروں کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھالنے کا موقع ملے گا۔

۱۸۹۸ء میں مہدی السوڈانی نے بغاوت کی لیکن مصری اور برطانوی فوجوں نے سوڈان پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ اس وقت سے سوڈان میں مصر و برطانیہ کی مشترکہ حکومت قائم ہے لیکن یہاں کے انتظامی اور تعلیمی امور میں مصری حکومت صاحب اختیار نہ تھی، اور فی الواقع آج اس عبوری دور میں بھی ——— برطانیہ ہی اندرونی نظم و نسق کا ذمہ دار ہے۔ ان دنوں سوڈان کی آبادی ایک کروڑ کے لگ بھگ ہے اور اس کا رقبہ دس لاکھ مربع میل سے کچھ اوپر یعنی ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا ایک تہائی۔ لیکن اس کا بیشتر حصہ خشک اور صحرائی ہے۔ صرف نیل ابیض کا نواحی علاقہ قابل کاشت اور زرخیز ہے اور اسی علاقے میں کپاس اور دوسری اجناس پیدا کی جاتی ہیں۔

مہدی السوڈانی کی بغاوت اور اندرونی شورشوں کی وجہ سے برطانوی انتظامی کل کو سوڈان کے داخلی خدوخال کے بدلنے کا کم موقع ملا۔ اس پر مستزاد مواصلات کے مسدود وسائل، تجارتی تعطل اور معاشی بحران۔ اس لیے یہاں کی قبائلی زندگی پر تجدد کی پرچھائیں نہ پڑ سکی۔ شہروں میں البتہ مغربی تہذیب و تمدن کے کچھ کچھ آثار نظر آتے ہیں۔ لیکن یہاں شہروں کی تعداد ہی کتنی ہے۔ گنتی کے چند شہر ہیں جن میں خرطوم

کے علاوہ کسی شہر کی آبادی چالیس ہزار سے زیادہ نہیں ہے۔ ان حالات میں سوڈان کا تعلیمی اور معاشرتی لحاظ سے ترقی کرنا مشکل ہی نہیں، کم وبیش ناممکن تھا لیکن اس ناسازگار ماحول میں بھی اس پس ماندہ اور غیر ترقی یافتہ ملک نے جو کچھ حاصل کیا ہے وہ کسی طرح کم وقیع نہیں ہے۔

تعلیمی پس منظر سنہ ۱۹۳۰ء میں ابتدائی تعلیم کا انحصار پرانے مکتبوں پر تھا، جہاں بچوں کو حروف شناسی اور قرأت کا درس دیا جاتا تھا۔ لیکن ان مکتبوں میں فکر وعمل کا فقدان تھا۔ یہاں بچوں میں عملی سرگرمی پیدا نہیں کی جاسکتی تھی جو انہیں ان کی ذمہ داریوں کا احساس دلاکر ایک باوقار زندگی بسر کرنے کا خوگر بنا سکے۔ ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کا حال کچھ اس سے زیادہ بہتر نہ تھا کیوں کہ اس کا مقصد انہیں محض معمولی سرکاری ملازمتوں کے لیے تیار کرنا تھا اور یہ کوئی عظیم مقصد نہ تھا جو سوڈانی معاشرے میں زندگی کی ایک نئی طرح ڈال سکتا۔

لیکن بعض اوقات انتشار میں بھی تعمیر کا کوئی نہ کوئی پہلو نکل آتا ہے۔ سنہ ۱۹۳۱ء کے اقتصادی بحران میں گارڈن میموریل کالج کے ثانوی مدرسے میں طلبہ نے مقاطعہ کیا، دراصل یہ مقاطعہ تنخواہوں کی نئی شرح میں تخفیف کے خلاف ایک زبردست احتجاج تھا۔ مقاطعے کے اختتام پر گورنر جنرل نے تعلیمی اصلاح کے لیے ایک کمیشن مقرر کیا جس کا مقصد فی الواقع مقاطعے کے اسباب کا جائزہ لینا نہیں بلکہ طلبہ کی بڑھتی ہوئی تعداد کا تجزیہ کرنا تھا۔ یہ طلبہ ان اداروں میں تعلیم پاکر جب اس فضا سے باہر آتے ہیں تو ان کی نگاہیں صرف سرکاری ملازمتوں ہی پر اٹھتی ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے لیے زندگی کی تمام تر راہیں مسدود ہوتی ہیں اس لیے کمیشن کا مقصد تو اس بڑھتی ہوئی تعداد کو روکنا تھا تعلیمی سہولتیں بہم پہونچانا نہ تھا۔ ہمارے ملک میں بھی کم وبیش حالات یہی تھے یعنی انگریزوں نے جو نظام تعلیم اس ملک میں قائم کیا اس کا سب سے اہم مقصد کلرکوں اور سرکاری جواخواہوں کی ایک فوج تیار کرنا تھا جو اپنے مفلوج اور معطل ذہنوں سے قوم کی سماجی زندگی کو برباد کرنے میں اپنے فرنگی آقاؤں سے بھی آگے آگے تھی۔ یہ حالات ہمارے ملک میں آج بھی کم وبیش ویسے ہی ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ "سفیدان فرنگی" کی بجائے ہم نے اسی آب وگل سے چند "خواجگانِ دیگر" پیدا کرلیے ہیں۔ لیکن سب سے تعجب خیز بات یہ ہے کہ سوڈانی کمیشن نے اقتصادی بحران کے باوجود چند تعمیری سفارشات پیش کیں

جو مندرج ذیل ہیں ۔

(۱) ایک نئے تربیتی ادارے کے قیام کی جملہ تجویزوں کو تسلیم کر لیا گیا ۔

(۲) ابتدائی مدارس کے مدرسین کی تربیت میں ضروری اصلاح اور ان کی ملازمتوں کو دوسرے سرکاری ملازموں کے مساوی لانے کا اصول بھی مان لیا گیا ۔

(۳) ہر ضلعے میں ایک تعلیمی افسر مقرر کیا جانا بھی طے پایا ۔

ان سفارشات کے پیش نظر حکومت نے خرطوم کے تربیتی مدرسہ کو شہر کی فضا سے دور دیہاتی ماحول میں قائم کرنے کا فیصلہ کیا اور وی ۔ ایل ۔ گرفتھس کو اس کا پرنسپل مقرر کیا ۔ گرفتھس نے اپنے دو انگریز اور چند سوڈانی ہم کاروں کے ساتھ خس و خاشاک سے ایک بہت بڑے کام کا آغاز کیا ۔ سوڈان میں تعلیمی سہولتیں ناپید تھیں اور اس ماحول میں کسی علمی مقصد کو سامنے رکھ کر کام کرنا مشکل تھا اور بالخصوص ان حالات میں کہ شہر کی آسانیوں کو چھوڑ کر گاؤں کی سخت کوشیوں کو اپنی زندگی کا ایک جزو بنانا پڑے تعلیم یافتہ لوگوں کے لیے یہ مسئلہ بظاہر بہت اہم تھا لیکن خلوص اور لذت کار، انسان کو بڑے سے بڑا کام کرنے پر آمادہ کر دیتا ہے سوڈان میں بھی یہی ہوا ۔ خرطوم کے جنوب میں کوئی ۲۰۰ میل کے فاصلے پر بخت الرضا ایک منڈی ہے ۔ یہ مقام اس تربیتی مدرسہ کے قیام کے لیے سب سے موزوں سمجھا گیا ۔

بخت الرضا کا تربیتی ادارہ

سنہ ۳۴-۱۹۳۳ء میں نیل ابیض کے کنارے کچھ عمارتیں تعمیر ہوئیں ۔ ان عمارتوں میں فن تعمیر کی مینا کاریاں تو نہ تھیں لیکن اپنی ضرورت کے مطابق جدید سہولتیں ضرور موجود تھیں ۔ درس و تدریس کے کمرے ، طلبہ اور اساتذہ کی رہائش گاہیں اگرچہ کچی تھیں مگر صاف ستھری اور باسلیقہ تھیں ، اور اس لق و دق میدان میں جہاں درخت اور سبزے کی کمی تھی ، درخت لگائے گئے ۔

اس ادارے میں سب سے زیادہ اس بات کی کوشش کی گئی کہ تعلیم یافتہ سوڈانیوں کو اپنی زندگی سے ناآشنا اور دور نہ رکھا جائے بلکہ ان کے دل میں اس کا احترام پیدا کیا جائے تاکہ ان میں اصلاح کا ایک شدید جذبہ پیدا ہو جائے اور وہ گاؤں کی ترقی کو اپنی ترقی اور گاؤں کے باشندوں

اپنی اصلاح سمجھنے لگیں۔

گاؤں کی زندگی شہروں کی نسبت زیادہ سخت ہوتی ہے۔ اگر اس سخت ماحول اور اس مشکل زد
تعلیم یافتہ طبقہ روشناس نہ ہو تو وہ اپنی آرام دہ رہائش گاہوں میں بیٹھ کر دوسروں کی تکلیفوں اور
دکھ درد کو کیوں کر محسوس کر سکتا ہے۔ اس لیے اس تربیتی ادارے میں دیہاتی زندگی کے ان پہلو
پہلوؤں کو تربیت کا ایک لازمی جزو بنا دیا گیا، اس سے آرام طلب اور کم کوش تعلیم یافتہ افراد میں بھی
ان تکلیفوں کا احساس ہی پیدا نہیں ہو جائے گا۔ وہ اس کی کسک بھی محسوس کریں گے۔ اس سے ا
تکلیف بھی ہو گی اور وہ اس ماحول کو بہتر بنانے کی ان تھک کوشش کریں گے۔

سوڈان کے اس تربیتی ادارے میں یہ تجربہ کامیاب رہا، اور چند نوجوان تربیت یافتہ جب ا
ادارے سے صالح جذبات لے کر نکلتے ہیں تو ان میں کام کرنے کی صلاحیت بھی ہوتی ہے اور صحرا کو
بنانے کا عزم بھی۔

نیا تجربہ

اس بنیادی اصول کے پیش نظر بخت الرضا میں تیرہ سے اٹھارہ برس کی عمر کے طالب علم
ذہنی اور اخلاقی تربیت کے لیے کچھ اصول وضع کیے گئے جو اپنی نوعیت اور اپنی علاقائی
کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں لیکن نظم و ضبط کا قیام اور شہریت کی تربیت تو ہر متعلم کے
لازمی ہوتی ہے۔

نظم و ضبط

نظم و ضبط کا تصور سوڈان میں بھی کچھ ہمارے تصور نظم و ضبط سے بالاتر نہیں۔ مدرسوں میں
جسمانی سزا تعلیم کا ایک جزو سمجھی جاتی تھی اور ممکن ہے ایک ایسے معاشرے میں جہاں ا
جمہوری قدریں ہمہ گیر نہ ہوں یا لوگوں میں وہ ذہنی بلندی پیدا نہ ہو سکی ہو جو ایک جمہوری نظام کا خا
ہوتا ہے تو زجر و توبیخ اور مار پیٹ کی نوبت بھی آجاتی ہو لیکن اسے تعلیم و تربیت کا ایک ضروری جزو سمجھنا
اس دور میں تعلیمی ترقی کا منہ چڑھانا اور ایک ایسی روایاتی فضا میں زندگی بسر کرنا ہے جہاں تجدد کی جھلک ا
نہ ہو۔ ایک وقت تھا کہ یہاں بھی مدرسین طلبہ کو منکسر مزاج، خاموش، مطیع و فرماں بردار دیکھنے کے آرزو
تھے اور طلبہ کا سوال پوچھ لینا گستاخی کے مترادف سمجھا جاتا تھا لیکن حق یہ ہے کہ مدرس کا ایک اہم

سے بچوں کے سامنے جانا اور بچوں کا دم بخود ہو کر وقت کی رفتار کو دیکھنا تعلیم نہیں ہے۔ بچوں کا گلا گھونٹنا
اس سے تو ان کی ذاتی صلاحیتیں دب کر رہ جاتی ہیں۔ اچھے نظم و ضبط کا انحصار اچھے نصاب اور بچوں کو
ں کے صحیح مقاصد سے روشناس کرنے میں، طریق تدریس کے موزوں اور مناسب ہونے کے ساتھ ساتھ
ں کی شخصیت اور طلبہ سے اس کے تعلقات پر مبنی ہوتا ہے ــــ اور کسی حد تک مصنوعی انعام و سزا پر بھی۔

جب بحث الرضامیں یہ تجربہ شروع کیا گیا تو حالات ناسازگار تھے۔ نہ تو ماحول ہی اتنا جمہوری تھا کہ
لبہ اس تلخ گھونٹ کو امرت سمجھ کر پی لیتے اور نہ کوئی اچھا نصاب ہی تھا کہ اس کی مدد سے بچوں کی دلچسپی کو
ائم رکھا جاتا۔ اس لیے امتحانات کے نتائج اور جسمانی سزا ہی تعلیم کا سب سے بڑا معیار تصور کیے جاتے تھے
بلکہ نئے تعلیمی رجحانات کے ساتھ اب ان اداروں میں بھی طلبہ خاموش و ساکت سننے والے نہیں، خود
متحرک اور فعال ہیں، اور اب ان میں زیادہ سے زیادہ خود اعتمادی پیدا کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

گرنعتس نے اپنے اس نئے تجربے میں مقامی اختلافات کی بھی پرواہ نہ کی، وہ خود لکھتا ہے کہ:
مجھے سر پرسی نن سے اس سلسلے میں پورا پورا اتفاق ہے کہ مدرس طلبہ کا بڑا بھائی ہو، روائتی آمر نہ ہو جیسے ان سے
براہِ راست کوئی تعلق نہ ہو۔" اس نے نصاب کو درست کیا امتحانات ختم کر دیے اور سوداتیوں ہی کو
ہاؤس ماسٹر مقرر کیا اور ایک مجموعۂ قوانین مرتب کیا جس میں مدرسے کے نظم و ضبط کے سلسلے میں چند اہم
دفعات درج کر دی گئیں۔ اس ضابطۂ قانون کی رو سے طلبہ کے روزمرہ کردار میں کوئی پہلو ناخوش گوار ہو
یا سے از روئے نظم و ضبط صحیح نہ سمجھا گیا تو اس کے خلاف ایک سیاہ نشان لگا دیا جاتا اور جب ان سیاہ نشانوں
کی تعداد مقررہ حدود سے متجاوز کر جاتی تو اسے یا تو "ہاؤس" سے نکال دیا جاتا ہے یا اسے جسمانی یا اسی قسم کی
کوئی اور سزا دی جاتی ہے۔ ایک غلطی کے ارتکاب کے بعد اسے بار بار دہرانا، آئے دن جھگڑے کرتے رہنا،
چوری کرنا۔ یہ اور اسی نوعیت کے دوسرے جرائم ماحول سے عدم مطابقت اور بچے کی کم فہمی سمجھی جاتی ہے۔

لیکن کسی مدرسے کا نظم و ضبط کسی مجموعۂ قوانین کے بل بوتے پر قائم نہیں رہ سکتا۔ خواہ یہ قوانین کتنے ہی اچھے
اور کتنے ہی عمدہ کیوں نہ ہوں شکایات پیدا ہی ہوتی رہتی ہیں۔ طلبہ کو یہ احساس نہیں ہوتا کہ انہیں کس قدر
آگے بڑھنا ہے۔ اور مدرس کو یہ علم نہیں ہوتا کہ انہیں طلبہ کو کہاں اور کس مقام پر رکھنا چاہیئے۔ اس سلسلے میں

یک اہم بات تو یہ ہے کہ مدرس اپنے شاگردوں کا دوست ضرور ہو۔ لیکن جماعت میں اس کی قائدانہ حیثیت قائم رہے اور یہ اسی وقت ممکن ہے کہ جب مدرس کی شخصیت میں جاذبیت ہو وہ ان سے ذہنی اعتبار سے بلند ہو اور بچوں کی رہنمائی کرنے کا اہل بھی ہو۔

آج سے تیس برس پہلے تو سوڈانی مدرسوں میں کسی کو اس کا احساس بھی نہ تھا۔ مگر اب رفتہ رفتہ مدرسین میں اپنے وقار کے قیام کے لیے تحصیل علم اور حصول معلومات کا جذبہ بڑھتا جا رہا ہے۔

اس سلسلے میں دوسری اہم بات پیش بینی ہے۔ نظم و ضبط قائم رکھنے میں واقعات اور حالات کا جائزہ اور بچوں کے معمولات کا مشاہدہ ضروری ہوتا ہے۔ اس سے ان کے بہت سے مسائل حل ہو جاتے ہیں مدرس کی حیثیت ایک پولیس کی ہوتی ہے جو مجرم کی نقل و حرکت کا جائزہ لیتا رہتا ہے۔ اور بخت الرضا میں مدرس کو اپنے نئے ماحول میں زیادہ فہم و تدبر، سوجھ بوجھ، پیار اور سوجھ بوجھ سے کام لینا پڑتا ہے۔ اسے یہ بھی دیکھنا پڑتا ہے کہ وہ بچوں سے کس حد تک بے تکلف ہوا اور ان کے افعال و کردار، ان کی بول چال، اور ان کی چال ڈھال۔ غرض ان کی زندگی کے ایک ایک پہلو کو اس طرح دیکھتا رہے کہ جہاں ان سے لغزش ہو وہ ان کی رہنمائی کرے محبت اور مروت سے۔ اخلاص اور پیار سے۔

ذہنیت کی تربیت تعلیمی معلم کا سب سے بڑا کام اور اہم فرض مدرسوں میں ان تعلیمی محرکات کی دریافت ہے جو مدرسے کی فضا میں زندگی، توانائی، عزم و حوصلہ اور لذت کا رس پیدا کر سکیں۔ صرف طلبہ ہی میں نہیں مدرسوں میں بھی چھوٹے چھوٹے بچے مدرسے کے مختلف مشاغل میں کھیلنے کی فطری خواہشات کی بنا پر دلچسپی لیتے ہوں لیکن نوجوان طلبہ کے لیے مدرسہ اور اس کے ماحول میں دلچسپی پیدا کرنے کے لیے کچھ اور اسباب کی ضرورت ہوتی ہے۔

بخت الرضا کی تعلیمی تجربہ گاہ میں بچوں کے مشاغل اور ان کی دلچسپیوں کو قائم رکھنے کے لیے مختلف طریقے اختیار کیے گئے۔ مثلاً جغرافیہ کی تدریس کے سلسلے میں بچوں کے سامنے سوڈان کے مختلف علاقوں میں لوگوں کے رہن سہن اور ان کی بود و باش کا مکمل خاکہ کہانیوں کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے جس سے سوڈان کے دور دراز کے علاقوں میں بسنے والے خاندانوں میں باہمی روابط ہی نہیں بڑھتے بلکہ ہمدردی کی محبت اور

مں بھی پیدا ہو جاتا ہے۔

بچوں میں اپنی ذمہ داریوں کو سنبھالنے کے لیے اور نئے خیالات اور نئے رجحانات کو اپنانے کے لیے سی تحریکات کے ذریعے ان میں خود اعتمادی اور خودکاری کے ساتھ ساتھ ان میں فکری مساوات اور یہ داری کا احساس پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ سوڈان میں بالعموم مدرسین بچوں سے ایک یسے کردار کی توقع رکھتے ہیں جس میں وہ گم سم بیٹھے ہوں۔ ان میں زندگی نہ ہو اور وہ صرف مدرس کے حکام کی اطاعت گذاری کی ایک کل ہوں۔

اس طریق فکر اور اس نظریے کو بدلنا آسان نہ تھا۔ لیکن بوائے اسکاؤٹ تحریک، زرعی کلب، اسکول بجٹ، انجمن تاریخ و جغرافیہ اور اسی قسم کی دوسری انجمنوں اور سوسائٹیوں کی مدد سے طلبہ میں اسعان نظر پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ شہریت کی تربیت کا ان انجمنوں سے بہتر اور کیا وسیلہ ہو سکتا ہے ۱۹۳۷ء سے لے کر اس وقت تک تعلیم کو اس نہج پر چلانے کی پوری کوشش کی گئی ہے لیکن سوڈان جیسے غیر ترقی یافتہ ملک میں جہاں مواصلات کی آسانیاں بھی میسر نہیں یہ کام بہت ہی مشکل تھا۔ مگر بفضلہ تعالےٰ ان کارکنوں کو اس سلسلے میں بھی کامیابی حاصل ہوئی ہے۔

بخت الرضا میں اس وقت کئی خود مختار اور آزاد انجمنیں مصروف کار ہیں۔ ان سماجی اداروں کی تربیت اور ان کے نظام میں دو چیزوں کا بالخصوص خیال رکھا گیا ہے کہ یہ انجمنیں اپنے نظام کار اور اپنے کاروبار میں مصنوعی نہ ہوں بلکہ حقیقی ہوں، جاندار ہوں، دوسرے یہ کہ عبوری دور میں صرف ایک انجمن کا قیام اور وہ بھی ایک ایسی انجمن کا قیام جس کا حلقۂ کار بہت وسیع ہو، کچھ زیادہ موزوں نہیں سمجھا گیا، کیوں کہ ان حالات میں بعض اوقات اونچے اور ذہین طلبہ اپنے اختیارات کی حدود کو پھاند کر بہت آگے نکل جاتے ہیں اور یہ اقدام جمہوری اقدار حیات کے منافی ہیں۔ اس لیے بخت الرضا میں مختلف انجمنیں اپنی اپنی حدود میں کام کر رہی ہیں اور حق یہ ہے کہ ان انجمنوں نے ایک جمہوری فضا پیدا کرنے میں بڑی امداد کی ہے، چناں چہ ایک انجمن کی ہنگامہ آرا میٹنگ کے اختتام پر ایک مدرس نے کہا۔

"اس سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ جمہوریت اعلیٰ کردار کے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتی۔"

اور ذرعی کلب کے دو ممبروں کو جب خرطوم میں نئی حکومت کے قیام اور اس کے دستور اور طریق کار کی خبر ملی تو انہوں نے کہا۔

"اچھا تو وہ لوگ ہمارے ذرعی کلب کے مطابق اپنی حکومت چلانا چاہتے ہیں۔"

بقول گرفتھس یہ طلبہ اتنے کم عمر اور سادہ لوح تھے کہ ان میں طنز و تنقیص کا شائبہ بھی نہیں۔ انہوں نے تو صرف اپنے مافی الضمیر کو بیان کر دیا۔

۱۹۵۰ء میں سودان نے اپنی تعلیم کا انتظام خود اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ اس وقت ہر شخص کی نگاہیں اعلیٰ تعلیم کی اصلاح اور توسیع کی طرف اٹھتی تھیں اور محض اس خیال سے کہ یہ تعلیم ہمیں اقتصادی بحران سے نجات دلائے گی اور ہمیں آزادی سے قریب تر لائے گی ان خیالات اور محسوسات کے پیش نظر وہ ابتدائی تعلیم کی ماہیت کو سمجھنے سے قاصر رہے لیکن سودان کے چند حق آشنا ماہرین تعلیم کی نگاہیں اس سے ماورا بھی دیکھ سکتی تھیں۔ وہ مغربی طریق تعلیم سے قطعی مطمئن تو نہ تھے لیکن انہیں اس کی خوبیوں سے انکار بھی نہ تھا۔ اب تک سودانی حکومت ثانوی تعلیم کی توسیع سے عمداً احتراز کرتی رہی اور اسے کبھی مختلف محکموں کی مجموعی خالی آسامیوں سے آگے بڑھنے نہیں دیا۔ اس طرح سرکاری ملازمتوں کی ضروریات تعلیمی پالیسی پر اثر انداز ہوتی رہیں اور مدرسے اس مجلس میں داخل ہونے کے "ابواب" بن کر رہ گئے۔

تعلیم یافتہ طبقہ اس صدی کے آغاز میں مغربی طریق تعلیم اتنا معقول نہ تھا اور بالعموم سودانی والدین اپنے بچوں کو ان مدرسوں میں بھیجنا پسند نہیں کرتے تھے لیکن رفتہ رفتہ جب نئی تعلیم کے فوائد دیکھنے میں آئے تو لوگوں نے تعلیم کی طرف زیادہ توجہ دی اور مغربی مدرسوں میں طلبہ کی تعداد بڑھنے لگی بعض تعلیم یافتہ سودانیوں نے مغربی لباس بھی پہننا شروع کر دیا۔ لیکن یہ لباس اور بود و باند کے یہ طریق محض سرکاری کاروبار ہی تک محدود تھے، گھر آکر ان کا وہی اپنا لباس ہوتا اور وہی اپنے طور طریقے۔

چالیس سال کی اس مسلسل تعلیم اور انگریزی اقتدار کی مضبوط گرفت سے سودانی معاشرے میں تعلیم یافتہ سودانیوں میں ایک نیا طبقہ پیدا ہو گیا۔ اس طبقہ نے روایاتی سودانی سماج کے برعکس زندگی کو مغربی سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی۔ پرانے سماج کا چلن اور رہن سہن کا طریقہ بالکل ہی مختلف تھا

مغرب خاندانی زندگی سے دور انفرادی زندگی کا قائل۔ لیکن سوڈان کی خاندانی زندگی اور اس کے معاشرتی اور آب کا اس نئی زندگی سے براہ راست کوئی تعلق نہ تھا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ حکومت کا نظام کچھ ان خطوط پر قائم ہونے لگا جو قبائلی، خاندانی اور گروہی تقاضوں سے قطع نظر انفرادی حقوق و فرائض پر منتج تھا۔

رہائشی مدرسوں میں گھر سے دور رہنا، سرکاری ملازمتوں میں ایک مقام سے دوسرے مقام پر تبادلہ ہونا، مقابلے کے امتحانوں میں اپنی ذاتی قابلیت کے بل بوتے پر آگے بڑھنا یہ ایسے عوامل تھے جنہوں نے یہاں کے قبائلی معاشرے میں ایک نمایاں تغیر پیدا کر دیا۔

مابعد جنگ

زمانہ مابعد جنگ میں سوڈان میں ایک ذہنی انقلاب آیا۔ اب سوڈانی تعلیم یافتہ طبقے میں قیادت اور رہنمائی کے آثار پیدا ہونے لگے۔ انہیں اپنی ذات پر اعتماد ہے۔ انہیں اپنی صلاحیتوں کا احساس اور اپنی قیادت پر بھروسہ ہے۔ انہوں نے اپنے حالات کو سازگار بنانے کے لیے اور پرانے معاشرے میں بھی مطابقت پیدا کرنے کی جدوجہد کی ہے تاکہ سوڈانی معاشرے میں ایک ایسی ہم آہنگی اور مطابقت پیدا ہو جائے جو کسی قوم کی بقا اور اس کی فلاح و بہبود کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ لیکن جو چیز محکمہ تعلیم کے ارباب بست و کشاد کے لیے سب سے زیادہ پریشان کن ثابت ہوئی وہ طلبہ کے مطالعات اور معمولی معمولی باتوں میں سیاسی گروہوں کی حمایتیں ہیں۔ وہ اس سلسلے میں اپنے والدین کا بہت کم خیال رکھتے تھے۔

مغربی تعلیم نے جہاں ذہنوں کو روشن کیا اور طلبہ میں فکری عادات پیدا کیں وہاں اس کی ایک بنیادی خامی طلبہ کی دین سے بیگانگی ہے۔ اور اس کی وجہ محض یہ ہے کہ یورپ کی سماجی زندگی میں "خدا کو تخت و تاج سے محروم کر دیا گیا ہے"۔ سوڈان میں بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ دین سے کچھ بیگانہ ہوتا جاتا ہے مگر یہاں تو اس کے اثرات بہت ہی نمایاں ہیں۔ لیکن سوڈان میں ابھی لادینیت کے نقوش اتنے گہرے نہیں ہیں۔

ملک میں جمہوری نظام قائم ہو چکا ہے۔ اب انفرادی حیثیت سے اگر ایک ایک سوڈانی اشتراک و تعاون صبر و تحمل، دوسروں کا احترام اور کردار میں سلامت روی پیدا نہیں کرتا تو وہ یقیناً اس نظام کو چلانے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ لیکن اب یہاں زندگی کی حرارت اور گرمی انہیں کشاں کشاں منزل کی طرف

مدرسہ کا مقام | آج تعلیمی نقطۂ نگاہ سے سوڈان کے سامنے سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ ا حالات میں مدرسے قوم و ملّت کی کیا خدمات انجام دے سکتے ہیں کیوں کہ یہی مدرسے تو تعلیم یا سماج کے ابواب ہیں۔

یہ ضروری نہیں کہ وہ اقدار حیات جنہیں ایک بچہ مدرسے میں رہ کر اپنا تا ہے اور انہیں اپنا زندگی کا ایک جزو بنا تا ہے مدرسہ سے باہر ان میں اور اپنی سماجی زندگی میں مطابقت یا ہم آہنگی کرے۔ آگے چل کر وہ سماج کے باشعور اور بالغ اراکین کے اعمال و کردار کو اپنے لیے ایک نمونہ بنا کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھال لیتا ہے، دوسری اہم بات یہ ہے کہ تعلیمی توسیع کے ساتھ ساتھ ہوا ان مدرسوں میں کام کریں گے ان کے افکار و خیالات بھی معاشرے کی منہاج فکر کا پرتو ہوں گے۔ اس سے ماورا اور بڑھ کر کوئی بات نہیں کہہ سکتے۔ اس لیے آج سوڈان کو ایسے مہربان اور ہمہ تن اور حوصلے کارکنوں کی ضرورت ہے جو مصائب کو جھیلتے ہوئے آگے بڑھنا جانتے ہوں اور جو اپ ذاتی مفاد ملک و ملت کے مفاد پر قربان کرنے کا جذبہ رکھتے ہوں اور خدا کا شکر ہے کہ مختلف دشواریوں اور قباحتوں کے باوجود یہ لوگ آگے بڑھ رہے ہیں اور بقول گرفتھس

"اپنی فہم و فراست اور قائدین کی ساعی اور دلچسپی کی بدولت سوڈان مستقبل کا مقابلہ کر رہا ہے اور ہمت و امید کا دامن اب تک اپنے ہاتھ سے چھوٹنے نہیں دیا۔ ان کے دل میں ان سب کی محبت اور ان کی قدر و قیمت ہے جنہوں نے ان کے ساتھ کام کیا ہے — اللہ یکتب سلامتہم" +

از ماست کہ بر ماست

عزیز احمد

بہت سال نہیں گذرے استادوں کا ایک وفد صوبائی وزیرِ تعلیم سے ملا اور یہ شکایت کی کہ ہمارے معاشرے میں استاد کا مقام افسوسناک حد تک پست ہے، اسے بلند کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ وزیرِ موصوف نے جواب دیا کہ حکومت استاد کا مقام بلند کرنے کے لیے کوئی تعزیری قانون منظور نہیں کر سکتی۔ اپنے مقام کو بلند کرنا خود استادوں کا کام ہے، البتہ اس کام میں حکومت کی اخلاقی تائید استادوں کو ہمیشہ حاصل رہے گی۔

اس جواب میں جو طنز موجود ہے معلوم نہیں وفد کے فاضل اراکین اس سے کہاں تک متاثر ہوئے لیکن یہ حقیقت ناقابلِ انکار ہے کہ کسی پیشہ کو معاشرہ میں جو درجہ ملتا ہے اسے متعین کرنے میں ان روایات کو بڑا دخل ہے جو اہلِ پیشہ نے خود قائم کی ہوں۔ آج کل علم و سائنس کا زمانہ ہے اور مختلف تنظیمیں اپنی آواز موثر بنانے کے لیے اظہارِ خیال کے انوکھے ذرائع سے کام لیتی ہیں لیکن پروپیگنڈا کے اس زمانہ میں بھی باوقار پیشے روایات قائم کرنے اور انہیں برقرار رکھنے کے کام کو نظر انداز نہیں کرتے مثلاً ڈاکٹروں کو لیجیے۔ ان کی تنظیم اس بات کا صد درجہ خیال رکھتی ہے کہ کوئی فرد پیشہ کی مسلمہ روایات کے خلاف عمل نہ کرے اور جو ڈاکٹر اس قصور کا مجرم ثابت ہو اسے پیشے کی تنظیم سے خارج کر دیا جاتا ہے۔

فنی اور پیشہ ورانہ روایات کی یہ حفاظت کوئی نئی شے نہیں۔ پہلے وقتوں میں بھی یہ چیز مشرق اور مغرب دونوں میں رائج تھی۔ مختلف صنعتوں اور حرفتوں نے اپنے آپ کو برادریوں میں منظم کر رکھا تھا۔ ہر ایک کا اپنا اپنا پیشہ ورانہ اخلاقی معیار مقرر تھا جس کی پابندی ہر فرد پر لازم تھی۔ اس کی خلاف ورزی کی سزا برادری سے اخراج کی شکل میں ملتی تھی، یہ خوف افراد کو پیشہ ورانہ روایات کا پابند رکھتا تھا۔

جدید معلمی کی روایات ہمارے ملک کا جدید معلم انگریزی عہد کی پیداوار ہے۔ اس زمانہ سے پہلے معلمی کا پیشہ اپنی مخصوص روایات رکھتا تھا اور انہی روایات کی بدولت اسے معاشرہ میں ایک خاص مقام حاصل تھا۔ آج ہم کو اس بات کا رونا ہے کہ معلم کا پرانا مقام باقی نہیں رہا۔ لیکن کیا ہم نے کبھی یہ بھی سوچا ہے کہ ہمارے پیشے کی پرانی روایات کس حد تک باقی ہیں؟

پرانی روایات علم کو ایک انمول شے قرار دیتی تھیں، استاد تنخواہیں پاتے تھے۔ لیکن ان کی خدمات ہر کس و ناکس چند پیسوں میں خرید نہیں سکتا تھا، ان کی خاص توجہ حاصل کرنے کے لیے قوت خرید کی بجائے جوہر قابل کی ضرورت ہوا کرتی تھی۔ گو آج بھی ایسے استاد نایاب نہیں جو ہونہار شاگردوں کی طرف خاص توجہ دینے میں لذت محسوس کرتے ہیں۔ لیکن آج بہت بڑی اکثریت ایسے استادوں کی ہے جن کی نظر التفات حاصل کرنے کے لیے جیب میں پیسے ہونے چاہئیں۔ علم آج ایک بازاری متاع کا درجہ حاصل کر چکا ہے جس کی خرید و فروخت کے طور طریقے پوری طرح طے شدہ ہیں۔

معلمی میں کاروباری روایات قائم کرنے کی اولیت کا شرف ہمارے بڑے بڑے شہروں اور قصبوں میں کام کرنے والے استادوں کو حاصل ہے۔ کیونکہ مغربی اثرات انہی مرکزوں سے چھن چھن کر ملک کے طول و عرض میں سرایت کرتے رہے ہیں۔ آج اگر لاہور کے ثانوی مدرسوں کے طلبہ کے متعلق تحقیقاتی مطالعہ کیا جائے تو شاید یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ ان کی غالب اکثریت ٹیوشن کے سہارے جیتی نظر آئے گی۔ کئی مدرسوں نے اپنی چار دیواری ہی میں اس آب حیات کا بندوبست کر رکھا ہے۔ اُدھر چھٹی کی گھنٹی بجی اور اِدھر استاد صاحبان نجی معلمی کی دکانیں کھول کر بیٹھ گئے۔ اس قسم کی نجی معلمی کی تاثیر میں لوگوں کا اعتقاد یہاں تک بڑھ چکا ہے کہ کئی والدین لڑکے کو داخل کرانے سے پہلے اس بات کا اطمینان چاہتے ہیں کہ آیا مدرسہ میں ثالثو پڑھائی کا بندوبست بھی ہے یا نہیں؟ ثالثو پڑھائی سے ان کی مراد وہ بعد از مدرسہ جماعتیں ہیں جن کے لیے چند روپے فی طالب علم وصول کیے جاتے ہیں اور پاس ہونے کی گارنٹی مل جاتی ہے۔

نجی معلمی کی کشش کا یہ عالم ہے کہ کئی نوجوان اساتذہ شہری مدرسوں میں جمے رہنے کی خاطر

گورنمنٹ ملازمت پر لات مار دیتے ہیں۔ راقم کو ایک ایسے استاد صاحب کا علم ہے جنہیں لاہور سے باہر کسی گورنمنٹ کالج میں لیکچرار کا عہدہ مل سکتا تھا لیکن انہوں نے لاہور کی ٹیوشنوں کی خاطر اسکول کی مدرسی کو ترجیح دی۔

کوئی ذی ہوش آدمی استادوں سے یہ مطالبہ نہیں کرے گا کہ وہ اپنے مادی مفاد سے بے پروا ہو جائیں لیکن اس مفاد کی نگہبانی کے طریقے پسندیدہ بھی ہو سکتے ہیں اور ناپسندیدہ بھی۔ نجی معلمی نے استاد کی متاع کو ایک ادنیٰ بازاری جنس کا درجہ دے دیا ہے اور اس کی اپنی حیثیت ایک ایسے اجیر کی سی بن گئی ہے جسے بہت سستے داموں خریدا جا سکتا ہے۔ اس کے جواب میں شاید کہا جائے کہ استاد کو معاشی ضرورت نے یہ حیثیت قبول کرنے پر مجبور کیا ہے۔ یہاں اس بحث میں الجھنا مقصود نہیں کہ یہ دلیل کس حد تک وزنی ہے۔ بلکہ مقصود صرف یہ جتلانا ہے کہ معاشرے میں ہمیں جو مقام حاصل ہے اس کی ذمہ داری نہ حکومت پر ہے اور نہ غالباً کسی اور جماعت پر، بلکہ اس کی ذمہ داری ان روایات پر عائد ہوتی ہے جو ہم نے اپنے پیشہ سے وابستہ کر دی ہیں۔ یہ روایات ہر اس آدمی کا مقام متعین کرتی ہیں جو معلمی کے پیشہ میں قدم رکھتا ہے خواہ وہ ذاتی طور پر ان کا حامی ہو یا مخالف۔

معاشی توقعات طب اور وکالت کے پیشوں نے اپنے حسب حال کچھ روایات قائم کر رکھی ہیں۔ جن کو معاشرہ نے قبول کیا ہے۔ کسی ڈاکٹر سے چند منٹ مشورہ لینے کے لیے فیس ادا کرنا پڑتی ہے۔ لوگ یہ فیس ادا کرتے ہیں۔ اور اگر کوئی ڈاکٹر کسی وجہ سے کسی کو بلا فیس مشورہ دے دے تو یہ اس کا بڑا احسان گنا جاتا ہے۔ اسی طرح ایک وکیل قانونی مشورہ کے لئے معقول اجرت وصول کرتا ہے۔ ڈاکٹروں اور وکیلوں نے جماعتی طور پر اس بات پر اصرار کیا ہے کہ ان کے چند منٹ بھی قیمتی ہیں۔ معاشرہ نے ان کا یہ مطالبہ تسلیم کر لیا ہے۔ ہر شخص ڈاکٹر اور وکیل کے وقت کو بڑا قیمتی سمجھتا ہے۔ اسی مناسبت سے ان دونوں پیشوں کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

اس کے برعکس استاد کی حیثیت کیا ہے؟ اگر کسی استاد نے بڑا تیر مارا تو ٹیوشن کا معاوضہ پچاس ساٹھ روپے ماہوار مل گیا۔ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ وہ اس معاوضہ میں صرف ایک گھنٹہ روزانہ

پڑھاتا ہے تو بھی طالب علم کے گھر پہ روزانہ آنے جانے کے اوقات کو شمار کر کے یہ وقت عموماً دو گھنٹے روزانہ سے کم نہیں بنے گا۔ اس حساب سے معقول نجی معلمی کی اجرت ایک روپیہ فی گھنٹہ سے زیادہ نہ بنتی۔ واضح رہے کہ اجرت کی یہ شرح بہت کم خوش نصیبوں کے حصے میں آتی ہے، ورنہ اکثریت کو جن نرخوں پر خریدا جا سکتا ہے ان کا ذکر بھی پیشہ ورانہ وقار کی توہین ہے۔

معاشیات کا یہ ایک ابتدائی اصول ہے کہ ہر جنس کی قدر و قیمت اس بات پر موقوف ہے کہ منڈی کی دوسری اجناس کے مقابلہ میں ان کی قوت خرید کیا ہے؟ جنس منڈی میں بکے گی تو اس کی قیمت کا فیصلہ عالم گیر معاشی اصول ہی کریں گے۔ قیمت ایک اضافی چیز ہے، اسے مصنوعی سہاروں سے مستقل طور پر بڑھایا نہیں جا سکتا۔

بعض دل چسپ نتائج معاشی قوتوں نے معلمی کی جو قدر و قیمت طے کر رکھی ہے ان سے بعض اوقات بڑے دل چسپ نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ بعض اتناد ایسے بھی ہیں جو نجی معلمی کو ایک گھٹیا کام سمجھ کر اس سے نفرت کرتے ہیں، ان لوگوں کے لیے عجیب دقتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ دوست احباب بلکہ رشتہ دار تک جب دیکھتے ہیں کہ استاد صاحب کے پاس فالتو اوقات کی کمی نہیں تو ذکا رنگ کے مطالبے پیش ہونے لگتے ہیں، چوں کہ منڈی کے نرخوں کے مطابق ان اوقات کی چنداں قیمت نہیں اس لیے یہ مطالبے بڑی بے تکلفی سے پیش ہوتے ہیں بالکل اسی بے تکلفی سے جیسے کوئی عورت اپنی پڑوسن سے ذرا سا نمک مانگ لے۔ اب استاد صاحب حیران ہیں کہ کریں تو کیا کریں؛ اگر کورا جواب دیتے ہیں تو بالکل اسی بے مروتی کے مجرم ٹھہرتے ہیں جس طرح نمک کی ایک چٹکی سے انکار کرنے والی پڑوسن؛ اور اگر ان مطالبوں کے سامنے سر جھکا دیتے ہیں تو وہ بہت جلد اجرت لے کر پڑھانے والوں سے بھی زیادہ معروف نظر آنے لگتے ہیں، اگر وہ بہت فیاض طبع واقع ہوئے ہیں اور صدقۂ علم کو ثواب کا کام خیال کرتے ہیں تو یہ خوش فہمی صرف انہی تک محدود رہے گی، اس چشمۂ علم سے مفت سیراب ہونے والے اور ان کے لواحقین اپنے آپ کو مطلق زیر احسان نہیں سمجھیں گے۔

دوسرے پیشوں میں کسی فرد کو اس قسم کا مخمصہ پیش آئے تو پیشہ ورانہ تنظیم اس کی الجھنوں کا

ؤ کر دیتی ہے لیکن بیچارہ استاد اس امداد سے بالکل محروم ہے ، اس کے پیشے نے جو روایات پچھلی ایک صدی
میں تعمیر کی ہیں وہ یہ ہیں کہ مدرسے میں جوں توں کر کے چند گھنٹے کاٹ لو اور پھر ایک خوانچہ فروش کی طرح
آدھی رات تک گلی کوچوں میں آوازے لگا لگا کر علم فروخت کیا کرو ، اس درجے سے اگر ترقی کر لو تو پھر
ایک جگہ چھابڑی لگا کر بیٹھ جاؤ ۔ چٹ پٹے علمی مصالحوں کے گاہک خود بخود چھابڑی کے گرد جمع ہو جایا
کریں گے ، بس یہ معلمی کا معراج ہے ، اس سے آگے پیشہ ورانہ روایات کسی اور منزل کی خبر نہیں دیتیں ۔

ان حالات میں نجی معلمی سے بیزار استاد کرے تو کیا کرے ؟ اس کے سامنے صرف دو ہی راستے
کھلے ہیں ، یا تو اپنے پیشہ کی روایات کو پوری سرگرمی سے قبول کرے اور یا اس پیشہ کو چھوڑ دے
اگر وہ کوئی درمیانی راہ اختیار کرے گا تو اپنے معاشرتی تعلقات کو تلخ کرے گا ۔ نہ صرف ملنے والے
اسے بے مروت اور خشک مزاج خیال کرنے لگیں گے بلکہ مدرسہ میں بھی وہ ایک نااہل استاد سمجھا
جائے گا ۔ نوجوان استاد جو نئے ولولے اور بلند نئی عزائم کے ساتھ معلمی کے پیشہ میں قدم رکھتے ہیں بہت جلد
اپنے آپ کو اس تلخ حقیقت سے دوچار پاتے ہیں اور زود و بدیر انہیں اپنے پیشے کی "شاندار
روایات" کے سامنے سر جھکانا پڑتا ہے ۔

مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ

"مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ" یہ طنز ایک مشہور برطانوی مضمون نگار نے اپنے پُرگو دوستوں پر کسی تھی ۔ ہر وہ
پاکستانی استاد جو شہری یا قصباتی آبادی میں رہتا ہو اور ٹیوشن نہ کرنا چاہتا ہو بے ساختہ یہی جملہ
منہ سے نکالے گا ۔ زندگی میں اسے جن لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے ، مالک مکان سے لے کر دھوبی
اور بھنگی تک سب اس سے یہی درخواست کریں گے کہ ماسٹر جی ہمارے بچے کو روزانہ گھنٹہ آدھ گھنٹہ
دے دیا کرو ، آپ بڑے اچھے آدمی اور قابل استاد ہیں ۔ ماسٹر صاحب کے لیے نجات کی صرف ایک ہی راہ
ہے اور وہ یہ کہ اپنے آپ کو نجی معلمی میں اس حد تک معروف کر لیں کہ کسی کو ایک منٹ کے لئے فارغ
نظر نہ آئیں ۔

جو لوگ چند سال مدرسوں میں پڑھا کر پھر کوئی اور پیشہ اختیار کر لیتے ہیں "معلمی کی برکات" ان کا

پیچھا عمر بھر نہیں چھوڑتیں۔ وہ لاکھ کہیں کہ اب میرے مشاغل اور نوعیت کے ہیں۔ بڑے بڑے ثقہ بزرگ ڈاڑھی پر ہاتھ پھیر کر یہی فرمائیں گے کہ ماشاءاللہ آپ کی تدریسی مہارت ضرب المثل ہوا کرتی تھی۔ بس چند مہینے آپ کی توجہ سے فیض یاب ہو گیا تو اس کی سالوں کی کمزوریاں دور ہو جائیں گی۔ ایک اور بزرگ بڑی متانت سے فرماتے ہیں کہ آپ جانتے ہیں چند روپے ماہوار خرچ کر۔۔۔ استاد بآسانی حاصل کیا جا سکتا ہے لیکن لڑکی کا معاملہ ہے۔ آپ کے سوا بھلا اور کس سے کہیں۔ غرض یہ فرمائشیں ایسے ایسے لوگوں کی طرف سے موصول ہوتی ہیں جن کے متعلق اس قسم کا وہم و گمان بھی نہ ہو سکتا تھا اور یہ بزرگوار ایسی مجبوریاں اور لطیف حجتیں پیش کرتے ہیں کہ سابق استاد خونِ دل پی کر رہ جاتا ہے۔ اور تہ دل سے آرزو کرتا ہے کہ کاش میں نے عمر عزیز کے چند سال مدرسوں میں نہ گذارے ہوتے۔ کیوں کہ بقول ذوق ؎

کہ اس کھیت کی مٹی سے بھی کتا گھاس پیدا ہو

پس چہ باید کرد؟

یہ ہیں وہ "شاندار" پیشہ ورانہ روایات جن کے بل بوتے پر ہمارے استاد معاشرے کا شکوہ کرتے نہیں تھکتے کہ اس نے انہیں بہت پست مقام دے رکھا ہے۔ وہ اتنی شکایت کر کے بری الذمہ ہو جاتے ہیں اور یہ سوچنے کی تکلیف گوارا نہیں کرتے کہ معاشرہ میں کسی پیشہ ور جماعت کا مقام خود اس کی اپنی پیدا کردہ روایات کا رہینِ منت ہوتا ہے۔ جب ہم اپنے مقام کا موازنہ پہلے وقتوں یا دوسرے ملکوں کے استادوں سے کرتے ہیں تو ہم اس حقیقت کو بھول جاتے ہیں کہ ان حالتوں میں پیشہ ورانہ روایات یکسر مختلف ہیں۔ پہلے وقتوں میں تو حاضر کی نجی معلمی کا تصور سرے سے ناپیدا ور ناقابلِ برداشت تھا۔ آج بھی مغربی ملکوں میں ہمارے ملک کی ٹیوشن بازی کا نام و نشان تک نہیں۔ استاد آمدنی بڑھانے کے لیے طرح طرح کے اور کام کرتے ہیں لیکن ٹیوشن نہیں کرتے۔

من حیث الجماعت استادوں کی مالی زبوں حالی ناقابلِ انکار ہے۔ اسے دور کرنے کی کوشش جماعتی سطح پر ہونی چاہیے۔ تعلیم ہر دور میں ایک قیمتی چیز رہی ہے۔ جدید دور میں اس کی قدر و قیمت اور بھی بڑھ گئی ہے۔ کیوں کہ اب انسانی تہذیب اس قدر پیچیدہ ہو چکی ہے کہ تعلیم کے بغیر انسان اس کے گورکھ دھندے

میں بالکل کھویا رہتا ہے۔ سائنس اور ٹکنالوجی کی بے پناہ ترقی نے افہام و تفہیم کی ضرورت کو کئی گنا اشد بنا دیا ہے۔ معاشرتی زندگی کی ان کارفرمائیوں نے مدرسے اور استاد کو قائدانہ مقام پر لا کھڑا کیا ہے اس مقام کو سمجھنا اور اس کی ذمہ داریوں کو تمکنت اور اعتماد کے ساتھ پورا کرنا جدید استاد کا امتیازی حق ہے یہ حق اسے کوئی قانون ساز مجلس یا پولیس کی تہدیدی قوت عطا نہیں کر سکتی بلکہ اسے حاصل کرنا سراسر جامعتی تعلیم اور احساس فرض پر موقوف ہے۔ معاشرتی مسائل کے مطالعہ اور حل کا کام جامعتی سطح ہی پر کیا جا سکتا ہے۔ اس کے بغیر معلمی کا پیشہ قائدانہ روایات قائم نہیں کر سکتا، جب تک یہ روایات قائم نہ ہوں اس وقت تک معاشرہ میں استاد کا مقام بلند نہیں ہو سکتا۔ استاد جدید زندگی میں رہنمائی کا درجہ اسی وقت حاصل کرے گا جب وہ خود اپنے مسائل کو قائدانہ صلاحیت کے ساتھ حل کرنا سیکھ لے گا۔ تعلیم ایک ہمہ گیر معاشرتی مسئلہ ہے، جب تک اس کے مسائل استاد کی بجائے دوسرے لوگوں کے ہاتھوں حل ہوتے ہیں اور استاد ایک بے بس خوانچہ فروش کے درجے کے ساتھ چمٹا ہوا ہے اس وقت تک اس کے معاشرتی مقام میں بلندی کا آنا محال ہے۔ اس وقت پیشہ کی روایات یہ ہیں کہ سب سے کامیاب استاد وہ ہے جس کی نجی معلمی کی دکان خوب چمکے اور جسے دن رات ٹیوشنوں سے فرصت نہ ہو۔ اور جو استاد ان روایات سے دامن بچانا چاہے، اسے گوشۂ قبر سے پہلے کہیں امان نہ ملے۔ ان روایات کے ہوتے ہوئے استاد کے لئے معاشرہ کی تخلیقی رہنمائی سنبھالنا کیوں کر ممکن ہو سکتا ہے؟ پہلی قسم کا استاد دنیا و مافیہا سے بے خبر رہے گا اور دوسری قسم کا استاد لوگوں کے ساتھ میل ملاپ سے بھاگے گا۔ موجودہ حالات میں کوئی تیسری صورت ممکن نہیں۔ ان حالات میں معاشرہ کی رہنمائی تو بہت بڑی چیز ہے خود اپنا سر سلامت رکھنا ہی بڑی کامیابی ہے۔ استادوں کو چاہیے کہ معاشرہ کی سرد مہری کا گلہ کرتے وقت ان بنیادی حقائق پر بھی نگاہ رکھ لیا کریں۔

خوش فہمی کا خطرہ

ادریس احمد

تدریس کے لیے غالباً کوئی چیز اتنی خطرناک نہیں جتنی خوش فہمی۔ طلبہ کے علم و واقفیت کو اچھی طرح جانچے بغیر ان کے متعلق کوئی مفروضہ قائم کر لینا استاد کی ساری محنت کو ضائع کر سکتا ہے۔ ایک کامیاب استاد وہ ہے جو ہر وقت طلبہ کی نبض پر ہاتھ رکھے رہے اور ایک لحظہ کے لئے بھی ان کی ذہنی کیفیت سے غافل نہ ہو جو استاد یہ خیال کرتا ہے کہ اس کی تیاری، سرگرمی اور فصیح بیانی ہی تدریس کو کامیاب بنانے کے لیے کافی ہے وہ اس نفسیاتی حقیقت سے آنکھیں بند کرتا ہے کہ سیکھنے والوں کو ذہنی اور جذباتی طور پر اپنے ساتھ شامل کئے بغیر کوئی تدریسی کام ممکن نہیں۔ نو آموز اساتذہ پر تمتاتیز روی کے جوش میں عموماً اس اہم نکتہ کو جلد بھول جاتے ہیں۔ اس فروگذاشت سے جو تلخ مایوسی انجام کار مترتب ہوتی ہے، اس کی چند مثالیں درج ذیل ہیں۔

اردو گرامر کا ایک سبق

ایک متعلم استاد چھٹی جماعت کو اردو گرامر پڑھا رہے تھے۔ موضوع تھا اسم معرفہ کی اقسام۔ اس کی چاروں قسمیں تختۂ سیاہ پر لکھ دی گئیں، اور جماعت سے مشق کرائی جانے لگی۔ استاد صاحب اپنی دانست میں یوں بڑی کامیابی سے سبق پڑھائے جا رہے تھے کہ نگران نے جماعت کو یہ سوال پوچھ کر چکر میں ڈال دیا کہ اسم معرفہ کیا ہوتا ہے، جب تسلی بخش جواب نہ ملا تو طلبہ سے کہا گیا کہ اسم معرفہ کی کچھ مثالیں دو۔ صرف دو ایک نے چند مقامات کے نام لیے۔ اس سے یہ گمان گذرا کہ جن طلبہ کو اسم معرفہ کا تھوڑا بہت تصور بھی ہے وہ بھی شہروں کے علاوہ کسی اور چیز کو اسم معرفہ کی ذیل میں شمار نہیں کرتے۔ اب ان سے پوچھا گیا کہ کمرۂ جماعت میں موجود چیزوں یا اشخاص میں سے کوئی اسم معرفہ کی ذیل آتا ہو تو اس کا نام بتاؤ۔ اس پر کتاب۔ میز۔ دوات۔ سلیٹ وغیرہ اسمائے نکرہ کی گردان شروع ہو گئی۔ جب پوچھا گیا کہ اسم معرفہ اور نکرہ میں کیا فرق ہے؟ تو جواب ملا کہ اسم معرفہ

اسم ہے جو خاص طور پر بولا جائے اور اسم نکرہ وہ اسم ہے جو عام طور پر بولا جائے" گویا کسی اسم کا معرفہ یا نکرہ ہونا بولنے والے کے لہجہ پر موقوف تھا!

متعلم استاد جو اسم معرفہ کے تصور پر بلند و بالا عمارت کھڑی کرنے میں مصروف تھے حیران تھے کہ جس بنیاد پر اینٹیں چنی جا رہی تھیں وہ سرے ہی سے ناپید ہے، مجبوراً اب اس بنیاد کی طرف متوجہ ہوئے اور معرفہ کی اقسام کا قصہ سردست ختم کیا۔

تاریخ کا ایک سبق

ایک اور متعلم استاد افغانستان کی جنگوں کی تمہید باندھ رہے تھے۔ روس کی طرف سے حملے کے خطرے کا ذکر کرنے کے بعد انہوں نے سندھ، ایران اور افغانستان میں انگریزوں کی دلچسپی کا ذکر کیا۔ یہ موضوع ختم کرکے وہ آگے بڑھنے کو تھے کہ نگران نے جماعت سے سوال کیا کہ ان دنوں انگریزوں اور فرانسیسیوں کے باہمی تعلقات کیسے تھے؟ بڑی مشکل سے چند طالب علم ان کے کشیدہ تعلقات کا ذکر کر سکے، جب پوچھا گیا کہ یہ کشیدگی افغانستان اور ایران کی راہ سے ہندوستان کے لیے کیا خطرہ پیدا کر سکتی تھی تو کوئی تسلی بخش جواب نہ ملا۔ متعلم استاد اپنے خیال میں جس کام کو پورا کر چکے تھے وہ ابھی شروع کرنا باقی تھا۔

تاریخ کا ایک اور سبق

یہ سبق تاریخ سندھ محمد بن قاسم پر تھا، جب سبق ختم ہو گیا تو طلبہ سے پوچھا گیا کہ حجاج نے کس مقام سے فوج روانہ کی تھی۔ کوئی تسلی بخش جواب نہ ملا۔ پھر پوچھا گیا کہ یہ فوج کس راستہ کو طے کر کے سندھ میں پہنچی تھی؟ جواب ملا یہ فوج سمندر کے راستہ سے آئی تھی!

سائنس کا ایک سبق

متعلم استاد، کاربن ڈائی آکسائڈ کی تیاری پڑھا کر اس کے طبعی اور کیمیائی خواص پر بھی بحث کر چکے تھے۔ اب اس کے فوائد پر نگاہ ڈالنا باقی رہ گیا تھا۔ فوائد پوچھے گئے تو پہلا فائدہ یہ بتایا گیا کہ اگر یہ املیق گیس موجود نہ ہو تو تمام دنیا جل کر خاک سیاہ ہو جائے؛ کرید کر دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ طلبہ کے ذہن میں یہ بات ہے کہ جس طرح دفتروں میں مخروطی شکل کے آہنی برتن اس غرض سے کاربن ڈائی آکسائڈ سے بھرے رکھے جاتے ہیں کہ آگ لگ جانے کی

صورت میں آگ کو بجھا سکیں۔ اسی طرح ہوا میں اس گیس کی موجودگی آگ کو بھڑکنے سے بچاتی ہے۔

۵۔ آموز استاد کو انتباہ

ان مثالوں سے یہ بالکل واضح ہے کہ طلبہ کے متعلق بلا ثبوت کوئی مفروضہ قائم کر لینا حد درجہ غلط ہے۔ استاد کو قدم قدم پر یہ یقین کرتے رہنا چاہیے کہ اب تک جو راستہ طے ہو چکا ہے وہ حقیقی طور پر سب نے طے کر لیا ہے، اگر کسی وجہ سے استاد اور طلبہ کے درمیان فاصلہ پیدا ہو گیا ہے تو یہ فاصلہ اب ہر قدم پر بڑھنے لگے گا تا آن کہ یہ دونوں ایک دوسرے سے بہت دور کھڑے نظر آئیں گے۔

یہاں اس مجبوری کا ذکر بھی کر دینا چاہیے جو بہت سے استاد پیش کیا کرتے ہیں، وہ مجبوری یہ ہے کہ اگر پھونک پھونک کر قدم رکھا جائے تو نصاب کا ختم کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ یہ دلیل بالکل غلط ہے۔ طلبہ بہت جلد استاد کے مطالبات کو سمجھنے لگتے ہیں اور ان کی روشنی ہی میں اپنی عادتیں وضع کر لیتے ہیں۔ جو استاد اس بات کا عادی ہے کہ تیزی سے نصاب میں سے گذر جائے، خواہ طلبہ ہم قدم رہیں یا نہ رہیں، اس کے طلبہ بے توجہی اور بددلی کے عادی ہو جائیں گے۔ اب اگر وہ ان میں مستعدی اور سرگرمی کے جذبات دیکھنا چاہتا ہے تو اس کے لیے وقت چاہیے۔ لیکن جس استاد نے پہلے دن سے یہ مطالبہ کیا ہے کہ طلبا ہر وقت بیدار اور چوکس رہیں وہ تھوڑے دنوں میں ان کے اندر یہ عادتیں راسخ کر دے گا اور آئندہ کے لیے اس کا کام تیزی اور آسانی سے ہونے لگے گا۔

ایک کامیاب دیہاتی مدرس

محمد عنایت بیگ

دیہاتی مدرس کیا ہے وہ طاقت ہے جس کو جہالت اور اندھیرے کے مٹانے کے لیے بڑی عالی ہمتی سے کام لینا ہوتا ہے، چونکہ اس کو ایک نہایت ہی ناسازگار غیر تعلیمیافتہ ماحول میں زندگی بسر کرنے کا اتفاق ہوتا ہے اور ایک جاہل طبقہ کو جہالت کی تاریکیوں سے نکال کر شاہراہ ترقی کے پُرنور مناظر دکھانا ہے۔ اس لیے اسے دیہاتیوں سے متعلق ہونا اور ہر دلعزیزی حاصل کرنا ضروری ہے، دیہاتی اکثر جاہل ہوتے ہیں اسکی وجہ یہ ہے کہ ان کو اپنے اوقات کا صحیح استعمال نہیں بتایا جاتا۔ اس لئے وہ فرصت کا وقت گپ شپ میں ایک دوسرے کے خلاف سازشیں کرنے میں اور مقدمہ بازی کی تجاویز سوچنے میں گذار دیتے ہیں۔ نیز زیادہ وقت فتنہ و فساد میں گذار دیتے ہیں اور اپنی جہالت کے باعث الفتنۃ اشدُّ من القتل کی اہم جھڑکی کو کھیر لے رہتے ہیں، اور دوسرے ذاتی کام کاج میں گذار دیتے ہیں۔ اس لیے دیہاتی مدرس کو اپنے اصلاحی اور رہنمائی جذبہ کو کام میں لاکر ان کے اوقات فرصت کو منضبط کرنے کے لئے مختلف قسموں کی تحریکات کا اجرا کرنا چاہیے، اور اس مقولہ کو "ملک اور قوم کا سب سے بڑا رہنما مدرس ہے" پیش نظر رکھ کر دیہاتی لوگوں میں ہر دلعزیزی حاصل کرنے کے لیے سعی بلیغ سے کام لینا چاہئے اور حسب ذیل عبارت پر عمل کرنے کے لیے کمر ہمت کسنی چاہیے۔

(۱) کبھی کبھی طلبہ کے والدین اور عوام کو جمع کرکے جلسے کیے جائیں ان کی کمزوریوں کو انہیں محسوس کرایا جائے۔ ان کو حفظانِ صحت کے اصول بتائے جائیں۔ فتنہ فساد مقدمہ بازی اور جہالت کے نقائص کو واضح کیا جائے۔

(۲) اصلاحی جذبہ کے ماتحت مدارس شبینہ کا اجرا کیا جائے تاکہ ان پڑھ دیہاتی تعلیم حاصل کرسکیں یہ تعلیم محض کتابی یا رسمی نہ ہو۔ بلکہ اصلاحی ہو۔ انہیں راہ راست پر لانے کی صحیح صحیح کوشش کی جائے۔

اور الدّال علی الخیر کفاعلہ کے پاک کلمات پر عمل پیرا ہو کر ثواب دارین حاصل کیا جائے ان کو اچھے مسلمان بن کر زندگی گذارنے کا ڈھنگ سکھایا جائے۔ تاکہ وہ "اِنَّ بطش ربّک لشدید" کی پاداش میں نہ آجائیں۔

(۳) گاؤں اور گاؤں والوں کے لئے جذبہ اصلاح ومحبت ہو۔ ان کے اسکول کو کامیاب بنانے میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑی جائے۔ ان کو محسوس بھی نہ ہو کہ مدرس ہمارے گاؤں اور اسکول کے حق میں جذبۂ تخریبی سے کام لے رہا ہے۔ ان کی حالت بہتر بنانے کی ہر ممکن کوشش کی جائے۔ ان کے اسکول سے ہمدردی ظاہر کی جائے۔

(۴) گاؤں والوں کے افلاس کے عام وجوہ ان کی شادی اور بیاہ نیز مرنے جلنے کے موقعوں پر فضول خرچیوں اور مقدمہ بازی کے مصارف سے بچانے کے لیے تعاریر اور تدابیر سے کام لینا چاہیے۔ گاؤں میں زمیندارہ بنک کھلوانا چاہیے جس سے ان کی ہر وقت جائز مالی امداد کی جا سکے۔

(۵) اسے مدرس معلم، مقرر اور طبیب وغیرہ کی صفات کا معجون مرکب ہونا چاہئے۔ تاکہ دیہاتی موقع کے مطابق شاہراہِ ترقی پر گامزن ہونے کے لیے مدرس کی رہنمائی حاصل کر سکیں۔

(۶) مدرس کو گاؤں والوں کی شادی اور غم کے مواقع پر بڑی ہمدردی سے شریک ہونا چاہیئے اور ہر موقع پر تعلیم کے فوائد پر روشنی ڈالنی چاہیے جس سے ان کے دلوں میں تعلیم پانے کا شوق پیدا ہو۔

(۷) کاشتکاروں کو بہتر آلاتِ زراعت، بیج، کھاد اور مویشی استعمال کرنے کی ترغیب دلائی جائے۔

(۸) مدرس کو دھڑا بندی اور نفاق کی لعنت کو دور کرنے کی کوشش کرنی چاہیے، اور انہیں مساوات اور بھائی بندی کا سبق دینا چاہیے۔ انہیں خدا کے ارشاد مبارک انما المؤمنون اخوۃ سے بہرہ ور کیا جائے اور لا تکونوا کالذین تفرقوا کا حکم سنایا جائے۔ ان پر واضح کیا جائے کہ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے اور بھائی بندی ایک دوسرے کی مدد کا بہترین ذریعہ ہے۔

(۹) مدرس کو خوددار، حرص وطمع سے پاک، خداترس، دیندار، ایک مصلح کل کی حیثیت کا مالک، معاملہ فہم ملنسار، خوش اخلاق، باوقع اور ہمدردی کا مجسمہ ہونا چاہیے۔

(۱۰۶) مدرس کو صفائی صحت۔ تربیت و تعلیم کا عمدہ نمونہ پیش کرنے کے لئے یوم والدین اور دیگر مشاہیر کے ایام ولادت و وفات منانا چاہییں مدرسے کی تعلیم کو دلچسپ بنایا جائے۔ ایسے موقعوں پر بذریعہ تقاریر صفائی تعلیم کفایت شعاری۔ دیانت۔ عبادت۔ صداقت۔ اتفاق و اتحاد وغیرہ کے فوائد سے اور ان جملہ امور کے متعلق ارشادات نبوی و خداوندی سے عوام الناس کو روشناس کرانا چاہیے۔ نیز مدرسے میں طلبا اور عوام کے لیے مختلف مشاغل کا انتظام کیا جائے۔

مدرس کی مشکلات اور ان کا حل

دیہات کے مدرس کو عام طور سے ان مشکلات کا سامنا کرنا ہوتا ہے (۱) والدین کی جہالت :- چونکہ گاؤں کا ماحول جہالت کا ہوتا ہے اور والدین عموماً ان پڑھ ہوتے ہیں، اس لیے مدرس کو گھر اور مدرسہ کے ارتباط میں بڑی دشواریاں پیش آتی ہیں جن کو دور کرنے کے لیے والدین کو جمع کر کے انہیں تعلیم کے فوائد فرائض والدین سے روشناس کرایا جائے اور ان کا تعاون حاصل کیا جائے۔

(۲) مکان اور سامان مدرسہ کی خرابی :- چوں کہ ہمارے ملک میں ابھی تعلیم کی اہمیت عام نہیں ہوئی ہے، اس لیے دیہاتی مدرسوں میں کہیں مکان کی دشواریاں پیش آتی ہیں کہیں سامان کی۔ مشاہدہ شدہ چیز ہے کہ کہیں تو سرے ہی سے مدرسہ کی عمارت ہی نہیں ہے۔ اگر ہے تو کسی کی چھت ایسی ہے کہ اگر مینہ ایک منٹ کے لیے برسے تو چھت گھنٹوں ٹپکتی رہتی ہے۔ کسی کی چار دیواری ہی نہیں اور کسی میں سامان نشست و خواند برائے طلبہ و اساتذہ کی کمی ہے جس سے تعلیم بے ربط و نظام مدرسہ درہم برہم ہے۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے مدرس کو متعلقہ افسران بالا سے درخواست کرنی چاہیے اور اس میں دیہاتیوں کا تعاون حاصل کرنا چاہیے، چندہ سے وغیرہ سے سامان مدرسہ کی تکمیل کرنی چاہیے، مختلف موقعوں (یوم والدین اور جلسوں) پر دیہاتیوں کے تعاون سے عمارت مدرسہ کے لیے کسی سے لکڑی کسی سے اینٹ وغیرہ کی امداد حاصل کرنی چاہیے اور گاؤں والوں کے باہمی ارتباط سے مدرسہ کو بہتر بنایا جائے۔

(۳) فراہمی اور حاضری طلبا کی دقت :- مدرس کے لیے یہ دونوں امور نہایت ہی تشویشناک ہوتے ہیں اول تو گاؤں والے بچوں کو پڑھنے کے لئے نہیں بھیجتے کہ ان کے کاروبار میں رکاوٹ پیش آتی ہے

دوسرے مدرسے کا ماحول دل چسپ نہیں ہوتا تعلیم و تدریس دل چسپ نہیں۔ طلبہ سے ہمدردی نہیں برتی جاتی۔ سامانِ مدرسہ مکمل نہیں ہوتا بعض بچے غریب والدین کے ہوتے ہیں جو معارف مدرسہ برداشت نہیں کرسکتے۔ ان چیزوں کو دور کرنے کے لیے مدرس کو ہمدرد اور شفیق ہونا چاہیئے تعلیم و تدریس کو دل چسپ بنانا چاہیئے۔ غریب بچوں کے تعلیمی مصارف کو پورا کرنے کے لیے مدد کی جائے۔ مدرسہ کو گھر بنایا جائے اور ایسے مشاغل کا انتظام کیا جائے جن سے بچوں کو دلچسپی حاصل ہو اور وہ غیر حاضر نہ رہیں۔ مدرس کو طلبہ کے لیے ہر عمل کا نمونہ ہونا چاہیئے۔ ایسا نہ ہو کہ خدا تعالےٰ کی عبرڈ کا مرتکب ہو۔ لِمَ تقولون ما لا تفعلون ہے۔ طلبہ سے پوری پوری ہمدردی ہو اور خدا کے اس حکم کو ہر وقت یاد رکھیئے۔ لا یرحم اللّٰہ من لم یرحم الناس اور اس پاک حدیث (من لم یرحم صغیرنا فلیس منّا) کو اسے طلبہ کی فراہمی کے لیے گاؤں کے سربرآوردہ لوگوں کا تعاون حاصل کرنا چاہیے۔ نیز فیملی سسٹم کا اجرا کرنا چاہیے۔

(۴) عملہ کی کمی :۔ دیہاتی مدرسوں میں بعض اوقات ایک مدرس کو کئی کئی جماعتیں پڑھانی پڑتی ہیں جس سے اس کے لیئے اپنے فرض منصبی کو صحت اور اصول کے مطابق سرانجام دینا دشوار ہوتا ہے۔ واقعی ایک مدرس والے مدرسے قوم کے لیے فائدہ مند ہونے کے بجائے محض رسمی مدرسے ہوتے ہیں اور ان سے وہ تعلیم حاصل نہیں ہوسکتی جو آزاد ممالک کے بچوں کے شایانِ شان ہو۔ مگر دشواریوں کو حسن و خوبی سے نبا ہنا بھی مدرس کی صفات میں داخل ہے۔ اس لیئے مدرس کو ایسی صورتوں میں نظام الاوقات کو اس طریقہ سے ترتیب دینا چاہیے کہ کوئی جماعت بے کار نہ رہے۔ وہ اس طرح کرے کہ خود ایک جماعت کو اردو پڑھائے، دوسری جماعت زیرِ نگرانی مانیٹر کے لکھنے کا کام کرے۔ تیسری نقشہ کشی کرے اور ایک پہاڑے پڑھے وغیرہ ؂

تعلیمی دنیا پر ایک نظر

لازمی تعلیم کا جائزہ

دنیا کے چند بر اعظموں نے پچھلی ایک صدی میں بہت کچھ ترقی حاصل کر لی ہے لیکن اس کے باوجود بچوں کے لئے تعلیمی سہولتوں کا سوال اب بھی ایک اہم مسئلہ بنا ہوا ہے۔ اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت دنیا کے نصف سے زیادہ بچے کسی مدرسے میں داخل نہیں ہیں۔ صرف ایک طبقے یعنی جنوبی ایشیا اور بحر الکاہل کے علاقے میں ۵ کروڑ ۵ لاکھ بچے مدرسے کی تعلیم و تربیت سے محروم ہیں۔

اقوام متحدہ کے تعلیمی سائنسی اور ثقافتی ادارے (یونیسکو) نے ان حالات کو دیکھتے ہوئے تعین کر لیا کہ جہالت کو دور کرنے کا سب سے موثر طریقہ یہ ہے کہ طویل المدت پروگرام بنائے جائیں جن کے بموجب مدرسے جانے والی عمر کے تمام بچوں کو مفت اور لازمی تعلیم دی جائے۔ چنانچہ اس نے جولائی ۱۹۵۱ء میں اس موضوع پر ایک بین الاقوامی کانفرنس جنیوا میں طلب کی اور اس سلسلے میں تعلیم کے بین الاقوامی اداروں کا تعاون بھی حاصل کیا۔ اس کے علاوہ یونیسکو نے بہت سی طبقاتی کانفرنسیں منعقد کرنے کا منصوبہ بھی بنایا تاکہ ہر جگہ کے حالات کا مطالعہ کیا جائے اور اس کی بنیاد پر لازمی اور عالمگیر تعلیم کا جامع پروگرام مرتب کیا جا سکے۔

حسن اتفاق سے جنوبی ایشیا اور بحر الکاہل کا علاقہ پہلی طبقاتی کانفرنس منعقد کرنے کے لئے پسند کیا گیا ہے۔ دوسری کانفرنس جو عرب ریاستوں کے لئے مخصوص ہے اس سال دسمبر میں مصر میں منعقد ہوگی۔ پہلی کانفرنس بمبئی کے مقام پر دسمبر ۱۹۵۲ء میں منعقد ہوئی تھی جس میں ۱۵ ملکوں کے اعلیٰ ماہرین تعلیم نے حصہ لیا تھا اس موقع پر جو سفارشات منظور ہوئیں ان میں زور دیا گیا کہ اس تمام علاقے میں لازمی تعلیم کے اصول کو عملی جامہ پہنایا جائے۔

اس کے ساتھ ہی یونیسکو نے لازمی تعلیم کے موضوع پر ایک سلسلہ مطبوعات شروع کر دیا چنانچہ [illegible]

علاقے میں لازمی تعلیم" اس کتابچے میں علاقے کے تمام تعلیمی مسائل پر بحث کی گئی ہے اور کانفرنس میں جو فیصلے ہوئے تھے، ان کا مفصل حال بھی اس میں درج ہے۔

پہلے باب میں لازمی تعلیم کے ان اصولوں پر بحث کی گئی ہے جن کو مدنظر رکھتے ہوئے اولین قدم اٹھانا مناسب ہے۔

پاکستان میں ہیلتھ وزیٹروں کی تربیت

عالمی ادارۂ صحت اور اقوام متحدہ کے بچوں کے فنڈ (یونی سیف) کے تعاون سے حکومت پاکستان کے زیر اہتمام کراچی میں ہیلتھ وزیٹروں کی تربیت کے ایک جامع پروگرام کو عملی جامہ پہنایا جا رہا ہے۔ نصاب کی مدت ۲۷ ماہ ہے۔ اس دوران میں نوجوان خواتین کو حفظانِ صحت کے طریقوں کو بہتر بنانے، حاملہ عورتوں کو امداد دینے اور نوزائیدہ بچوں کی نگہداشت کے ضمن میں ہدایات دینے کی تربیت دی جائے گی۔ تاکہ وہ گھروں کا دورہ کرتے ہوئے یہ فرائض انجام دے سکیں۔

اس تربیتی پروگرام کے لئے ایک نئی عمارت خاص طور سے تعمیر کی گئی ہے۔ پروگرام بالکل انہی منصوبوں کے مطابق ہوگا جنہیں اس سے قبل عالمی ادارۂ صحت اور یونی سیف کے تعاون سے لاہور، ڈھاکہ اور پشاور میں عملی جامہ پہنانا شروع کیا گیا ہے۔

نئے تربیتی مرکز کے لئے یونی سیف سامان فراہم کر رہا ہے۔ اور عالمی ادارہ صحت نے تربیت دینے کے لئے ماہرین کی ایک بین الاقوامی جماعت مقرر کی ہے۔ حکومت پاکستان اپنے ملک کا ایسا عملہ متعین کرے گی جو انجام کار مرکز کا سارا انتظام خود سنبھالے۔ حکومت عمارت کی تعمیر اور پروگرام کو عمل میں لانے کے جملہ اخراجات بھی برداشت کرے گی۔

صحت عامہ سے متعلق عالمی ادارۂ صحت کی چار نرسیں چند ہفتوں سے کراچی میں موجود ہیں جو تربیتی پروگرام کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔ ان کے نام یہ ہیں۔ مس آسٹرڈ جولینن (ڈنمارک) مس جون کورٹ (انگلستان) مس ڈلّی میٹرز (نیدرلینڈز) اور مس باربرا منٹگمری واکر (نیوزی لینڈ) اس جماعت کی قائد ڈاکٹر ایل جیپ مین ہیں جو جنوبی افریقہ کی رہنے والی ہیں اور ڈھاکہ کے تربیتی منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے میں مدد دے چکی ہیں۔

عالمی ادارہ صحت کی یہ جماعت پاکستانی ماہرین کے ساتھ کام کرتے ہوئے انہیں اس لائق بنا دے گی کہ تربیتی منصوبے کا پہلا دور ختم ہونے اور بین الاقوامی ماہرین کے واپس جانے کے وقت تک وہ خود اس کام کو سنبھال لیں۔

توقع ہے کہ ۳۰ طالبات کو ہر سال تربیت دی جائے گی، ۱۸ اور ۲۵ سال کے درمیان عمر کی خواتین اس نصاب میں شامل ہو سکیں گی۔ پروگرام میں شامل ہونے والی خواتین کا ایک جزو یہ بھی ہوگا کہ وہ مرکز کے آس پاس کے علاقوں میں گھروں کا دورہ کریں گی۔ تاکہ انہیں عملی طور پر تجربہ حاصل ہو سکے، وہ زچگی کے کام، بچوں کی نگہداشت، حاملہ عورتوں کی خبر گیری اور حفظانِ صحت کے عام اصولوں سے اس طرح زیادہ سے زیادہ واقف ہو جائیں گی۔

کراچی کے نئے تربیتی مرکز میں متعین ہونے والی ایک نرس مس جون کورٹ نے لاہور کے تربیتی مرکز میں بھی کام کیا تھا۔ انہوں نے پچھلے سال اپنے فرائض ختم کرتے ہوئے جو رپورٹ پیش کی وہ عالمی ادارۂ صحت کے "خبر نامے" میں شائع ہوئی ہے، اس کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ لاہور میں ۲۷ طالبات ہیلتھ وزیٹر کی تربیت حاصل کر چکی ہیں۔ علاوہ ازیں مرکز سے متعلق شفا خانے سے ۱۹۵۱ء میں ۲۵ خاندانوں کو امداد ملی تھی، ۱۹۵۳ء تک یہ تعداد ۷۰۰ ہو گئی۔ زچگی سے قبل مشورہ لینے والی حاملہ عورتوں کی تعداد تین گنی ہو گئی ان کی اوسط ۳۵۰ تھی۔ مس کورٹ نے لکھا ہے پچھلے سال ہم نے جائزہ لیا تھا کہ پیدائش کے وقت بچوں کا وزن کیا ہوتا ہے، دوسرا جائزہ حال ہی میں ختم کیا ہے، ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یونی سیف کی امداد سے ماؤں اور بچوں کو خوب فائدہ ہو رہا ہے کیونکہ ۷۵ فیصد نوزائیدہ بچوں کا وزن سابقہ بچوں کی بہ نسبت ۸ اونس بڑھ گیا ہے۔

کاغذ کے عالمگیر خرچ میں اضافہ

پچھلے چالیس سال کے عرصہ میں کاغذ کا عالمگیر خرچ چار گنا ہو گیا ہے اور آج کل تقریباً ۵ کروڑ ٹن کاغذ ہر سال تیار ہوتا اور استعمال ہو جاتا ہے۔ لیکن اس مقدار کا ۸۷ فی صد حصہ یورپ، شمالی امریکہ، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ میں رہنے والی دنیا کی صرف ۲۳ فی صد آبادی میں صرف ہو جاتا ہے۔ ان ملکوں میں تقریباً

ڈیڑھ سو پونڈ کاغذ فی کس سالانہ کے حساب سے خرچ ہوتا ہے۔ اس کے برعکس جنوبی امریکہ، افریقہ اور مشرق قریب و بعید کے پس ماندہ علاقوں میں صرف ۵ پونڈ فی کس کاغذ استعمال ہوتا ہے۔

حال ہی میں ان اعداد و شمار کو ریڈیو سے نشر کرتے ہوئے مسٹر جی ویلیشن نے جو ادارۂ خوراک و زراعت میں گودے اور کاغذ کے ماہر ہیں اس نازک صورت حال کی طرف متوجہ کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ پس ماندہ ملکوں میں تعلیم کو بڑی تیزی سے فروغ حاصل ہو رہا ہے، اس لئے ظاہر ہے کہ وہاں مستقبل قریب میں کاغذ کی مانگ بہت بڑھ جائے گی۔ انہوں نے اس امر پر زور دیا کہ موجودہ حالات کے ماتحت یہ ملک کاغذ کی بہت ہی قلیل مقدار بنا سکیں گے جبکہ ان کی ضرورت بے پناہ ہوگی اور سب سے بڑی دشواری یہ ہے کہ کاغذ درآمد کرنے کے لئے ان کے پاس کافی مقدار میں غیر ملکی زر مبادلہ بھی نہیں ہوگا۔

مسٹر ویلیشن کو یقین ہے کہ اس مسئلے کا حل دو طرح ممکن ہے (۱) ان علاقوں میں اگنے والے درختوں کے گودے سے کاغذ کی صنعت کو ترقی دینے کے تجربات کئے جائیں (۲) ایسے درختوں کی نہایت وسیع پیمانے پر کاشت کی جائے جو عمدہ کاغذ کے لئے سب سے زیادہ موزوں ہیں اور جو ان پس ماندہ علاقوں میں آسانی سے اگ سکتے ہیں۔ اس سال کے آخر تک ادارۂ خوراک و زراعت کے زیر اہتمام دو بین الاقوامی کانفرنسیں منعقد ہوں گی جن میں مسٹر ویلیشن کے مشوروں اور ایسے ہی دوسرے پروگراموں پر غور کیا جائے گا۔ پہلی کانفرنس اسی مہینے بیونس آئرس میں منعقد ہوگی جس میں فنی، اقتصادی اور مالیاتی اعتبار سے جنوبی امریکہ میں کاغذ کی صنعت کے مسائل پر غور کیا جائے گا، دوسری کانفرنس بھارت میں ہوگی۔

آزادیٔ فکر کے لئے آہنی پردہ

امریکہ کی نیشنل ایجوکیشن ایسوسی ایشن کے ترجمان این۔ ای۔ اے جرنل میں فرانسس ایچ ہارن کے قلم سے ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں مضمون نگار نے امریکی کالجوں اور یونی ورسٹیوں کے خلاف سرکاری تحقیقات کو آزادیٔ فکر کے لئے آہنی پردہ قرار دیا ہے۔ امریکی کانگرس نے کئی سالوں سے تعلیمی اداروں کو "سرخ استادوں" سے پاک کرنے کی مہم جاری کر رکھی ہے۔ کانگرس کی "غیر امریکی سرگرمیوں کی کمیٹی" کے صدر مسٹر ویلڈی نے پچھلے سال کے شروع میں ایک اخباری نمائندہ کو بتایا تھا کہ اب ان کی کمیٹی اپنی زیادہ

تعلیمی اداروں غیر قومی کارروائیوں کا خاتمہ کرنے پر مبذول کرے گی۔ اب تک اس معاملہ کو صرف چھوا گیا ہے۔ زیادہ گہرا کھودنے سے بہتر نتائج پیدا ہونے کی توقع ہے۔ اسی قسم کا ایک بیان سینیٹر میکارتھی نے دیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ ہم اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں صرف اشتراکیوں کو منظر عام پر نہیں لائیں گے بلکہ اشتراکی تذکرہ کرنے والے استادوں کو بھی، اس کے ساتھ ہی اس نے یہ الفاظ بھی جوڑ دیئے تھے کہ یہ کام نہایت ناخوش گوار اور غیر معقول ثابت ہو گا۔ کیونکہ جوں ہی اس کام کو ہاتھ ڈالا گیا ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک نکتہ چینی کے شعلے جہنم کی طرح بھڑک اٹھیں گے، اور اسی کام کو علمی آزادی میں مداخلت قرار دیا جائے گا۔

استادوں کے خلاف کانگریس کی ان تادیبی کارروائیوں کا ذکر کرتے ہوئے مضمون نگار نے کہا ہے کہ امریکی تاریخ میں پہلے بھی ایسا ہو چکا ہے۔ امریکی خانہ جنگی سے پہلے ملک کی پیچھے ہٹی ہوئی سرحد پر جو اعلیٰ تعلیمی ادارے کھولے گئے تھے مشرقی ریاستوں کے بعض لوگوں نے انہیں اس بنا پر امداد دینے سے انکار کر دیا تھا کہ وہ معاشرتی اور معاشی آزاد خیالی کے اڈے ہیں۔

تعلیمی اور اخلاقی بلندی کی مثال

لاہور کارپوریشن کے امتحان وظائف جماعت پنجم ۱۹۵۳ء کے سلسلہ میں کارپوریشن پرائمری اسکول موچی دروازہ لاہور کے ۱۴ طلبا نے وظیفہ حاصل کیا۔ پنجاب کے محکمہ تعلیم میں آج تک ایسی کوئی مثال موجود نہیں۔ اس کارکردگی کے صلہ میں کارپوریشن نے اس مدرسہ کے صدر معلم علم دین صاحب کو ایک مزید ترقی اور ماسٹر رحمت خاں صاحب انچارج جماعت کو مزید تین ترقیاں دی ہیں۔

اس اطلاع میں مدرسین کی بلند اخلاقی کی بھی ایک سبق آموز اور نادر مثال موجود ہے۔ جبکہ کارپوریشن کے سپرنٹنڈنٹ تعلیم نے انچارج جماعت کو مزید تین ترقیاں دینے کی سفارش کی تو چیف ایگزیکٹو آفیسر صاحب نے غلطی سے صدر معلم کے لئے ان ترقیوں کی منظوری دے دی، جب اس منظوری کی اطلاع صدر معلم کو پہنچی تو اس نے سپرنٹنڈنٹ صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا کہ حضور ان ترقیوں کا صحیح حقدار انچارج جماعت ہے جس کی محنت سے میرے مدرسہ کو یہ عزت ملی ہے۔ یہ عزت مجھے ترقیوں سے زیادہ عزیز ہے

لہذا آپ میری بجائے یہ تین ترقیاں ماسٹر رحمت خاں صاحب انچارج جماعت کو دیں جو ان کا مستحق ہے ۔
جب یہ گفتگو چیف ایجوکیشن آفیسر نے سنی تو وہ صدر معلم کی حق پسندی پر بہت خوش ہوئے اور ان کے مدرسہ کے انچارج جماعت ماسٹر رحمت خاں کے نام تین ترقیاں لکھ دیں اور صدر معلم کو ایک ۔

(غلام حسین صدر کارپوریشن ٹیچرز یونین لاہور)

انگلستان کی تعلیمی رپورٹ

حال ہی میں انگلستان کی تعلیمی رپورٹ برائے ۱۹۵۳ء شائع ہوئی ہے ۔ جو طرح طرح کی تعلیمی معلومات کا ایک خزانہ ہے ۔ اس کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وزارت تعلیم سارا سال اس کٹھن سوال کے حل کرنے میں لگی رہی کہ تعلیم کی توسیع سے مدرسے کی عمارتوں اور اساتذہ کی فراہمی کے متعلق جو مشکلات پیدا ہوگئی ہیں ان پر کس طرح قابو پایا جائے ۔ رپورٹ میں بعض مایوس کن حقائق کا ذکر بھی ہے ۔ لیکن اس کے ساتھ ہی امید کی جھلک بھی صاف نظر آرہی ہے ۔ رپورٹ میں اس بات کو تسلیم کیا گیا ہے کہ ملک کے پاس ذرائع محدود ہیں اس لیے اس کے سوا چارہ نہیں کہ تقدیم و تاخیر کے معیار کو استعمال کیا جائے ۔ اس وقت عمارتوں کی رفتار یہ ہے کہ ہر ماہ اوسطاً بیس ہزار بچوں کے لیے مکانیت کی تیاری ہو رہی ہے ۔ اس سے یہ یقین ہو گیا ہے ، کہ سال کے خاتمہ تک ساڑھے گیارہ لاکھ نئے بچوں کے لیے مکانیت کی فراہمی کا جو منصوبہ جنگ کے خاتمہ پر تیار کیا گیا تھا وہ پورا ہو جائے گا ۔ اس وقت ہر چھ بچوں میں سے ایک بچہ نئی مکانیت استعمال کر رہا ہے جو ایک بے نظیر کامیابی ہے ۔ لیکن پھر بھی ملک کے آدھے بچے غیر معمولی طور پر بڑی جماعتوں میں پڑھ رہے ہیں اور بعض علاقوں میں بھیڑ کی حالت ناگفتہ بہ ہے ۔ لیکن اس صورت حال کا علاج رفتہ رفتہ نئی مکانیت کی تعمیر ہی سے ہوگا اور اس کے ساتھ ہی نئے استاد بھی فراہم کرنے پڑیں گے ۔

پرائیویٹ مدرسوں کی رجسٹری

برطانیہ کی وزارت تعلیم نے فیصلہ کیا ہے کہ جو مدرسے سرکاری گرانٹ نہیں لے رہے انہیں ۱۹۵۷ء تک اپنے آپ کو رجسٹر کرانا ہوگا منظوری حاصل کرنے کے لیے انہیں مکانیت اور اساتذہ کی قابلیت کے وہی معیار پورے کرنے ہوں گے جو وزارت تعلیم نے مقرر کیے ہیں ۔ اس وقت وزیر تعلیم مس ہورس بیو

اس کوشش میں ہیں کہ قانون تعلیم ۱۹۴۴ء کے تیسرے حصے کو عملی جامہ پہنایا جائے جو آزاد مدرسوں سے متعلق ہے۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ اب برطانوی بچوں کے لیے موزوں مکانیت اور اساتذہ کے حصول کے امکانات روشن ہیں۔ اگر قانون کے اس حصے کو عملی جامہ پہنایا جائے جو آزاد مدرسوں سے متعلق ہے۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ اب برطانوی بچوں کے لیے موزوں مکانیت اور اساتذہ کے حصول کے امکانات روشن ہیں۔ اگر قانون کے اس حصے کو عملی جامہ پہنانے کی قبل از وقت کوشش کی گئی تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا، کہ پرائیویٹ مدرسے آئندہ پست سیاروں ہی سے مطمئن ہو جائیں گے۔ اس میں شک نہیں کہ وزارت نے یہ فیصلہ اس عوامی احتجاج سے متاثر ہو کر کیا ہے کہ پرائیویٹ مدرسوں میں پڑھنے والے بچوں کو ایسے استادوں سے بچایا جائے جو سنگین جرائم کے مرتکب ہو چکے ہیں۔ لیکن وزارت کو یہ بات نہ بھولنی چاہیئے کہ اگر اس نے ایک دفعہ ایسے مدرسوں کو رجسٹر کر لیا جن کے سیار بہت پست تھے اور عمارتیں خراب تو پھر ایسے مدرسوں کی منظوری منسوخ نہ ہو سکے گی۔ منظوری اسی صورت میں منسوخ ہو سکتی ہے جب کوئی مدرسہ ان سیاروں سے نیچا گر جائے جو منظوری کے وقت موجود تھے۔

اُستادوں کا مسئلہ

برطانوی وزارت تعلیم کو اطمینان ہے کہ نئے اساتذہ کی بہم رسانی کا سوال تسلی بخش طور پر حل ہو جائے گا۔ اس کے لیے استادوں کی سبکدوشی کی عمر بڑھا دی گئی ہے اور شادی شدہ عورتوں کو استانیاں بننے کی اجازت دی گئی ہے۔ لیکن ابھی ریاضی اور سائنس میں استادوں کی کمی کا کوئی حل نظر نہیں آتا۔ گریجویٹ استادوں کی ایک خاصی تعداد ثانوی مدرسوں کے علمی کام کے نااہل ثابت ہو رہی ہے۔ علاقائی تربیتی منصوبوں اور انڈر گریجویٹ استادوں کے لیے اعلیٰ نصابوں کی فراہمی سے اور بعض مقامی اداروں کی پہلے سے زیادہ سرگرمی سے خواہ کچھ بھی فائدہ پہونچا ہو لیکن تعلیمی انسٹی ٹیوٹوں کا یہ حال ہے کہ وہ ایک دوسرے سے ماتحت رتبہ اور دوسری باتوں میں افسوسناک طور پر مختلف ہے۔ ابھی یہ طے ہی نہیں کیا جا سکا کہ اساتذہ کی تربیت کا مقصد کیا ہونا چاہیئے۔ یہ تو سب تسلیم کرتے ہیں کہ موجودہ دو سالہ نصاب کی جگہ تین سالہ نصاب رائج کیا جائے لیکن اس بات پر اتفاق رائے نہیں کہ نصاب میں کیا شامل ہو اور نہ ہی اس بات پر کہ تعلیمی

سرکاری جریدہ کے اعلانات

صیغہ رجال ـــــــ شعبہ مدارس

ای/۳۹۹۹۷ م۔ محمد شریف۔ ایف۔ اے۔ ڈپلوما۔ ایم۔ ایس۔ اے۔ ایک امیدوار کو م۔ عبدالواحد صدیقی کی جگہ جو
۲۵ نومبر ۱۹۵۲ء لاپتہ ہیں۔ تاریخ حاضری سے ۶۰ ـــ ۱۴۰ کے عام پیمانہ تنخواہ میں عارضی ڈرائنگ ماسٹر گورنمنٹ
ہائی اسکول میاں والی مقرر کیا گیا۔

ای/۳۹۹۹۸ م۔ عزیز عبداللہ ایف۔ اے (پی۔ ٹی۔ والٹن) ایک امیدوار کو م۔ غلام رسول کی جگہ جن کی
۲۵ نومبر ۱۹۵۲ء تقرری ہوئی تھی لیکن حاضر نہیں ہوئے، تاریخ حاضری سے ۶۰ ـــ ۱۴۰ کے عام پیمانہ تنخواہ میں
قائم مقام ورزش ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول میاں والی مقرر کیا گیا۔

ای/۴۰۰۰۲ م۔ علی حسین میٹرک ایس۔ وی (۶۰ ـــ ۱۴۰) قائم مقام اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول
۲۵ نومبر ۱۹۵۲ء کمالیہ کو تاریخ حاضری سے م۔ محبوب حسین کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر قائم مقام
اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول سانگلہ مقرر کیا گیا۔

" م۔ محبوب حسین (۶۰ ـــ ۱۴۰) اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول سانگلہ (رخصتی) کو تاریخ
حاضری سے م۔ علی حسین کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول
کمالیہ (رخصتی) مقرر کیا گیا۔

" ج۔ بشیر احمد سندھو میٹرک۔ ایس۔ وی۔ ایک امیدوار کو تاریخ حاضری سے م۔ محبوب حسین کی
جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے ۶۰ ـــ ۱۴۰ کے عام پیمانہ تنخواہ میں قائم مقام اردو مدرس گورنمنٹ
ہائی اسکول کمالیہ مقرر کیا گیا۔

ای/۴۰۰۰ م۔ سعید احمد بی۔ کام۔ بی۔ ٹی ایک امیدوار کو تاریخ حاضری سے م۔ عبدالعزیز بٹ کی جگہ جو ۱۰ اپریل
۲۱ نومبر ۱۹۵۲ء ۱۹۵۳ء تک رخصت پر ہیں ۹۰ ـــ ۲۵۰ کے عام پیمانہ تنخواہ میں ۔/۱۳۰ روپے ماہوار پر

قائم مقام انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول رینالہ خورد مقرر کیا گیا ۔

۲۹۶۳۱ م۔عبدالحق ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی (۱۳۰ ــ ۲۵۰) قائم مقام انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول

ستمبر ۵۰ء رینالہ خورد کو تاریخ حاضری سے م۔عبدالعزیز بٹ کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر

قائم مقام انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول چونیاں مقرر کیا گیا ۔

ر م۔عبدالعزیز بٹ بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (۱۳۰ ــ ۲۵۰) انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول

چونیاں (رخصتی) کو تاریخ حاضری سے م۔عبدالحق کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر

انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول رینالہ خورد مقرر کیا گیا ۔

۲۹۹۵۱/ م۔محمد یوسف میٹرک ایس۔ وی۔ قائم مقام اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول پسرور کو

۱ نومبر ۵۰ء جو م۔سیف الملوک کی رخصت کے سلسلہ میں ۳۱ اکتوبر ۵۰ء تک کام کر رہے ہیں

م۔سیف الملوک کی جگہ جنہیں بلا تنخواہ چھٹی دی گئی ہے ۶۰ ــ ۱۴۰ کے عام پیمانہ

تنخواہ میں قائم مقام اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول پسرور مقرر کیا گیا ۔

۲۹۰۱۶/ م۔محمد ارشاد بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (۱۳۰ ــ ۲۵۰) انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول تلہ گنگ

۱ نومبر ۵۰ء کو تاریخ حاضری سے م۔مظفر حسین کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر انگریزی

مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول لیہ مقرر کیا گیا ۔

ر م۔مظفر حسین ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی (۱۳۰ ــ ۲۵۰) قائم مقام انگریزی مدرس گورنمنٹ

ہائی اسکول لیہ کو تاریخ حاضری سے م۔اصغر علی شاہ گردیزی کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا

ہے اپنی تنخواہ پر قائم مقام انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول مظفر گڑھ مقرر کیا گیا ۔

ر م۔اصغر علی شاہ گردیزی بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (۱۳۰ ــ ۲۵۰) انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی

اسکول مظفر گڑھ (آزمائشی رخصتی) کو تاریخ حاضری سے بطور ایک زائد استاد انگریزی

مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول پاک پٹن (آزمائشی رخصتی) مقرر کیا گیا ۔

ر م۔اسد اللہ شاہ بی۔ اے۔ بی۔ ٹی ایک امیدوار کو م۔اصغر علی شاہ کی جگہ جن کو رخصت

دی جا چکی ہے تاریخ حاضری سے ۱۳۰ ــ ۲۵۰ کے عام پیمانہ تنخواہ میں -/۱۳۰ روپے ماہوار پر قائم مقام انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول پاک پٹن مقرر کیا گیا۔

ای/۱۶/۹۰۱۳ م۔ محمد الطاف حسین۔ بی۔ اے۔ بی۔ ٹی ایک امیدوار کو م محمد ارشاد کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ تاریخ حاضری سے (۱۳۰ ــ ۲۵۰) کے عام پیمانہ تنخواہ میں -/۱۳۰ روپے ماہوار قائم مقام انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول منٹگمری مقرر کیا گیا۔
۱۸ نومبر ۱۹۵۳ء

ای/۳۸۸۲۸ ج۔ عبدالواحد بی۔ ایس سی۔ بی۔ ٹی۔ پی۔ ای۔ ایس (دوم) ڈی آئی مدارس لائل پور کو ۲۷ ستمبر ۱۹۵۳ء سے مسٹر این سکندر خان کی جگہ جو تبدیل ہو کر انسپکٹر ٹریننگ مدارس مقرر ہو چکے ہیں اپنی تنخواہ پر صدر معلم سنٹرل ماڈل ہائی اسکول لاہور مقرر کیا گیا۔
۱۷ نومبر ۱۹۵۳ء

ای/۱۶۳۳۲/۴۴ م۔ عبدالخالق۔ بی اے۔ بی۔ ٹی (۱۳۰ ــ ۲۵۰) عارضی انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول جہلم کو تاریخ حاضری سے م مظفر حسین کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر عارضی انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول تلہ گنگ مقرر کیا گیا۔
۱۵ نومبر ۱۹۵۳ء

" م۔ مظفر حسین بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (۱۳۰ ــ ۲۵۰) انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول تلہ گنگ کو تاریخ حاضری سے م۔ عبدالخالق کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول جہلم مقرر کیا گیا۔

ای/۱/۳۸۳۷ م۔ عبداللطیف خاں بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (۱۳۰ ــ ۲۵۰) انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول قصور کو ۱۸ نومبر ۱۹۵۳ء یا اس کے مابعد کی کسی تاریخ سے م۔ حمید اللہ صدیقی کی جگہ جو ۱۸ نومبر ۱۹۵۳ء کو سبکدوش ہونے والے ہیں اپنی تنخواہ پر انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول باغبانپورہ مقرر کیا گیا۔
۱۱ نومبر ۱۹۵۳ء

" م۔ محمد شفیع چوہدری۔ بی۔ ایس سی۔ بی۔ ٹی (۱۳۰ ــ ۲۵۰) قائم مقام سائنس ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول پاک پٹن م۔ عبداللطیف خاں کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے ۱۸ نومبر ۱۹۵۳ء یا مابعد کی تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر قائم مقام سائنس ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول قصور مقرر کیا گیا۔

" م محمد عالم سعید ایف۔ اے۔ ایس سی۔ ایم اے۔ بی ٹی ایک امیدوار کو ۱۹ نومبر ۱۹۵۳ء یا مابعد کی

کسی تاریخ سے م۔ محمد شفیع چوہدری کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے (۱۳۰ ــ ۲۵۰) کے عام پیمانہ تنخواہ میں ۔/۱۳۰ روپے ماہوار پر قائم مقام سائنس ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول پاک پٹن مقرر کیا گیا۔

ای/۳۸۳۷۱ ۱۱ نومبر ۵۸ء م۔ نذیر احمد بھٹی بی۔ ایس سی۔ بی۔ ٹی (۱۳۰ ــ ۲۵۰) قائم مقام انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول حضرو کو تاریخ حاضری سے م۔ محمد عطاء الرحمان کی جگہ جو ایم۔ ایس سی میں داخل ہو چکے ہیں۔ اپنی تنخواہ پر قائم مقام سائنس ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول کھاریاں مقرر کیا گیا۔

" م۔ معین الدین بی۔ ایس سی۔ بی۔ ٹی ایک امیدوار کو م۔ نذر محمد بھٹی کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ تاریخ حاضری سے (۱۳۰ ــ ۲۵۰) کے عام پیمانہ تنخواہ میں ۔/۱۳۰ روپے ماہوار پر قائم مقام سائنس ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول حضرو مقرر کیا گیا۔

ای/۳۸۴۱۷ ۱۰ نومبر ۵۸ء حافظ محمود الحسن منشی فاضل، مولوی فاضل او۔ ٹی ایک امیدوار کو تاریخ حاضری سے م۔ حاتم علی کی جگہ جو بلا رخصت غیر حاضر ہیں اور جن کو علیحدہ کرنے کا سوال زیر غور ہے تاریخ حاضری سے (۶۰ ــ ۱۴۰) کے عام پیمانہ تنخواہ میں قائم مقام معلم السنہ شرقیہ گورنمنٹ ہائی اسکول فتح جنگ مقرر کیا گیا۔

ای/۳۸۱۲۹ ۸ نومبر ۵۸ء خان جمال لیاقت بی۔ اے۔ بی۔ ٹی کو جن کے احکام تقرری برائے گورنمنٹ ہائی اسکول مری جاری ہو چکے تھے۔ ۱۰ نومبر ۵۸ء یا اس کے مابعد کی تاریخ حاضری سے م۔ محمد عمر کی جگہ جو ۱۰ نومبر ۵۸ء کو سبکدوش ہونے والے ہیں (۱۳۰ ــ ۲۵۰) کے عام پیمانہ تنخواہ میں ۔/۱۳۰ روپے ماہوار پر قائم مقام انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول چونیاں مقرر کیا گیا۔

ای/۳۷۹۶۰ ۸ نومبر ۵۸ء م۔ محمد حیات میٹرک، مولوی فاضل، ادیب فاضل۔ جے۔ وی (۶۰ ــ ۱۴۰) عربی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول شکانہ کو تاریخ حاضری سے م۔ فضل کریم کی جگہ جو سبکدوش ہو چکے ہیں اپنی تنخواہ پر عربی مدرس گورنمنٹ نارمل اسکول لالہ موسی مقرر کیا گیا۔

" محمد انیس احمد صدیقی منشی فاضل او۔ ٹی (۶۰ ــ ۱۴۰) معلم السنہ شرقیہ گورنمنٹ ہائی اسکول

نوشہرہ کو تاریخ حاضری سے م۔ محمد حیات کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے ...... اپنی تنخواہ پہ معلم السنہ شرقیہ گورنمنٹ ہائی اسکول منکانہ مقرر کیا گیا۔

ای/۲۷۶۶۰ — ۸ نومبر ۵۸ء — سید خورشید حسین مولوی فاضل، منشی فاضل، میٹرک۔ او۔ ٹی ایک امیدوار کو تاریخ حاضری سے م۔ انیس احمد صدیقی کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے (۶۰ — ۱۴۰) کے عام پیمانہ تنخواہ میں قائم مقام معلم السنہ شرقیہ گورنمنٹ ہائی اسکول نوشہرہ مقرر کیا گیا۔

ای/۲۸۰۳۵ — ۸ نومبر ۵۸ء — م۔ نواب دین میٹرک، مولوی فاضل، او۔ ٹی (۶۰ — ۱۴۰) عربی مدرس گورنمنٹ نارمل اسکول نارووال کو تاریخ حاضری سے س۔ عابد علی عابد کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر عربی مدرس گورنمنٹ نارمل اسکول پسرور مقرر کیا گیا۔

" — س۔ عابد علی عابد۔ منشی فاضل، مولوی فاضل، او۔ ٹی (۶۰ — ۱۴۰) عربی مدرس گورنمنٹ نارمل اسکول پسرور کو تاریخ حاضری سے م۔ نواب دین کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ اپنی تنخواہ پر عربی مدرس گورنمنٹ نارمل اسکول نارووال مقرر کیا گیا۔

ای/۲۸۰۳۳ — ۸ نومبر ۵۸ء — م۔ بشیر احمد شبلی بی۔ اے۔ ایس۔ اے۔ وی (۲۵۰ — ۳۵۵) صدر معلم گورنمنٹ ہائی اسکول پسرور کو تاریخ حاضری سے م۔ محمد مختار صادق کی جگہ جو انگلستان تعلیم کے لیے گئے ہیں اپنی تنخواہ صدر معلم گورنمنٹ ہائی اسکول گجرانوالہ مقرر کیا گیا۔

" — م۔ بدر الدین ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی (۲۵۰ — ۳۵۵) معاون انسپکٹر قسمت ملتان کو تاریخ حاضری سے م۔ محمد شفیع کی جگہ جو تعلیم کے لیے باہر گئے ہیں اپنی تنخواہ پر صدر معلم گورنمنٹ نارمل اسکول مظفر گڑھ مقرر کیا گیا۔

" — م۔ عبد المجید بی۔ ایس۔ سی۔ ایس۔ اے۔ وی (۲۵۰ — ۳۵۵) اے ڈی۔ آئی گجرانوالہ کو تاریخ حاضری سے مرزا مسعود بیگ کی جگہ جن کا تبادلہ پسرور ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر صدر معلم گورنمنٹ ہائی اسکول چونیاں مقرر کیا گیا۔

" — م۔ بشیر محمد بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (۲۵۰ — ۳۵۵) انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسک

چکوال کو تاریخ حاضری سے م۔ محمد اکرم کی جگہ ۱۱ نومبر ۱۹۵۸ء سے سبکدوش ہونے والے ہیں اپنی تنخواہ پر صدر معلم گورنمنٹ ہائی اسکول تلہ مقرر کیا گیا۔

۱۱/۷۸۰۲۱ نومبر ۱۹۵۸ء — م۔ مختار احمد میٹرک ڈی۔ ایم (۹۰ — ۱۵۰) ڈرائنگ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول عیسےٰ خیل کو تاریخ حاضری سے مع اپنی آسامی اپنی تنخواہ پر ڈرائنگ ماسٹر گورنمنٹ نارمل اسکول شاہ پور مقرر کیا گیا۔

" — م۔ بشیر محمد ایک امیدوار کو م۔ نذیر الحسن کی جگہ جو انگریزی کے شعبہ میں کام کر رہے ہیں تاریخ حاضری سے (۶۰ — ۱۴۰) کے عام پیمانہ تنخواہ میں عارضی ڈرائنگ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول عیسےٰ خیل مقرر کیا گیا۔

۱۱/۷۹۰۸/ نومبر ۱۹۵۸ء — م۔ ثنار الدین۔ بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (۱۳۰ — ۲۵۰) انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول نوشہرہ کو تاریخ حاضری سے مع اپنی آسامی بطور ایک زائد مدرس اور اپنی تنخواہ پر انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول سرگودھا مقرر کیا گیا۔

" — م۔ محمد عبد اللہ قریشی ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی (۱۳۰ — ۲۵۰) کو جو آج کل قاضی فضل الٰہی کی چھٹی کے سلسلے میں بطور قائم مقام اے۔ ڈی۔ آئی میانوالی کام کر رہے ہیں تاریخ حاضری سے م۔ ثناء الدین کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ مع اپنی آسامی موجودہ سلسلہ کے ختم ہونے پر اپنی تنخواہ پر انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول نوشہرہ مقرر کیا گیا۔

" — م۔ بہاول خان۔ ایف۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول میانوالی (آزمائشی) کو تاریخ حاضری سے بطور ایک زائد مدرس اپنی تنخواہ پر انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول بھکر (آزمائشی) مقرر کیا گیا۔ وہ اپنی آسامی اپنے ساتھ لے جائیں گے۔

" — م۔ محمد اصغر بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (۱۳۰ — ۲۵۰) انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول جہلم کو تاریخ حاضری سے بطور ایک زائد مدرس اپنی تنخواہ پر انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول شاہ پور صدر (آزمائشی) مقرر کیا گیا۔ وہ اپنی آسامی اپنے ساتھ لے جائیں گے۔

ای/۲۷۷۷۵ م۔عمرحیات۔ بی۔ ایس سی۔ بی۔ ٹی (۱۳۰ ــ ۲۵۰) سائنس ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول سیالکوٹ
۴ نومبر ۱۹۵۵ء کو تاریخ حاضری سے م۔محمد ذکی رضوی کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر سائنس ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول میاں والی مقرر کیا گیا۔

" م۔محمد ذکی رضوی ایف۔ ایس سی، بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (۱۳۰ ــ ۲۵۰) سائنس ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول میاں والی (آزمائشی) کو تاریخ حاضری سے م۔عمرحیات کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر سائنس ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول سیالکوٹ (آزمائشی) مقرر کیا گیا۔

ای/۳۷۷۸۶ م۔فتح شیر خان۔ بی۔ اے۔ ایس۔ اے وی (۲۵۰ ــ ۳۵۵) صدر معلم گورنمنٹ ہائی اسکول
۴ نومبر ۱۹۵۵ء حسن ابدال کو م۔محمد صدیق کی جگہ جن کا تبادلہ چکوال میں ہو چکا ہے۔ ۱۱ جون ۱۹۵۵ء قبل دوپہر سے اپنی تنخواہ پر صدر معلم گورنمنٹ ہائی اسکول خوشاب مقرر کیا گیا۔

ای/۳۷۴۵۰ م۔عبدالرؤف۔ بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (۱۳۰ ــ ۲۵۰) انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول
۲ نومبر ۱۹۵۵ء حضرو (آزمائشی) کو تاریخ حاضری سے م۔محمد اصغر علی کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول چکوال (آزمائشی) مقرر کیا گیا۔

ای/۳۷۴۴۷ م۔میر علی شاہ۔ ایس۔ وی ایک امیدوار کو تاریخ حاضری سے م۔علم الدین کی جگہ
۲ نومبر ۱۹۵۵ء جو مستعفی ہو چکے ہیں (۶۰ ــ ۱۴۰) کے عام پیمانہ تنخواہ میں قائم مقام اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول تنکانہ مقرر کیا گیا۔

ای/[illegible]۶۶۴۴ م۔ظفر علی ملک بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (۱۳۰ ــ ۲۵۰) انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول
۳۰ اکتوبر ۱۹۵۵ء شاہ پور کو تاریخ حاضری سے ش۔اصغر علی کی جگہ جو جونیئر لکچرار مقرر ہو چکے ہیں انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول باغبان پورہ مقرر کیا گیا۔

" خ عبدالحفیظ بی۔ اے۔ بی۔ ٹی ایک امیدوار کو تاریخ حاضری سے م۔ظفر علی ملک کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے (۱۳۰ ــ ۲۵۰) کے عام پیمانہ تنخواہ میں ۱۳۰/ روپے ماہوار پر

قائم مقام انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول شاہپور مقرر کیا گیا۔

ای/۲۷۱۶۶ م۔عبدالعلیم بی۔اے۔بی ٹی (۱۳۰ -- ۲۵۰) انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول جہلم کو ۳۰ اکتوبر ۱۹۵۸ء تاریخ حاضری سے م۔عبدالعزیز بیٹ کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول چونیاں مقرر کیا گیا۔

" م۔عبدالعزیز بیٹ بی۔اے۔بی۔ٹی (۱۳۰ -- ۲۵۰) انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول چونیاں (رخصتی) کو م۔عبدالحفیظ کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔محمد عبدالعلیم کے فارغ ہونے کی تاریخ سے انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول جہلم (رخصتی) مقرر کیا گیا۔

" م۔مشتاق محمود خاں چوہدری بی۔اے۔بی۔ٹی ایک امیدوار کو تاریخ حاضری سے م۔عبدالعزیز کی جگہ جن کو رخصت مل چکی ہے (۱۳۰ -- ۲۵۰) کے عام پیمانہ تنخواہ میں -/۱۳۰ روپے ماہوار پر قائم مقام انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول جہلم مقرر کیا گیا۔

ای/۲۶۴۰۱ م۔مختار احمد ایس۔وی (۶۰ -- ۱۴۰) قائم مقام اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول حضرو کو ۲۸ اکتوبر ۱۹۵۸ء تاریخ حاضری سے ق۔رشید احمد کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر قائم مقام اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول خوشاب مقرر کیا گیا۔

" م۔نذیر احمد ایس۔وی ایک امیدوار کو تاریخ حاضری سے م۔مختار احمد کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے (۶۰ -- ۱۴۰) کے عام پیمانہ تنخواہ میں قائم مقام اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول حضرو مقرر کیا گیا

ای/۲۶۵۳۹ م۔غلام رسول خاں نثار ایس۔وی (۶۰ -- ۱۴۰) اردو مدرس گورنمنٹ نارمل اسکول ڈیرہ غازی خان کو ۲۵ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو تاریخ حاضری سے م۔فضل احمد خاں کی جگہ جن کا تبادلہ پنڈی بھٹیاں میں ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر اردو مدرس گورنمنٹ نارمل اسکول لالہ موسیٰ مقرر کیا گیا۔

جلد ۷ شمارہ ۹] لاہور [د

اس شمارہ میں

ادارہ تحریر: پروفیسر سراج الدین، قاضی محمد اسلم، ...
معاونین: عبدالغفور چو...، فضل احمد

آموزش
لاہور

دسمبر سنہ ۱۹۵۴ء

جلد ——— ۷

شمارہ ——— ۹

سالانہ چندہ

پاکستان کے لیے ۶ روپے

غیر ممالک کے لیے ۸ روپے

قیمت فی پرچہ دس آنے

پبلشرز

یونی ورسٹی بک ایجنسی لاہور

ایچ۔ڈی خالد پرنٹر پبلشر نے دین محمدی پریس لاہور میں طبع کرا کے
یونی ورسٹی بک ایجنسی ۲ کچہری روڈ لاہور سے شائع کیا

اداریہ

پروفیسر سراج الدین

انگریزی اور اردو پڑھانے والے استادوں کے سامنے بڑا سوال جس کے حل کی سخت ضرورت ہے۔ تدریس کے مختلف پہلوؤں کا باہمی ربط ہے۔ لیکن اس سوال کا حل صرف زبان کے استاد پر موقوف نہیں۔ اس کا حل تمام استادوں کی توجہ کا محتاج ہے خواہ یہ استاد کوئی سے مضامین پڑھاتے ہوں۔

تدریس زبان کے متعلق تین بڑے بڑے مسائل حل طلب ہیں :-

(۱) لسانی تکنیکوں کا مسئلہ

(۲) زبانی اظہار کا مسئلہ اور

(۳) تحریری کام کا مسئلہ

طالب علم کو اس قابل ہونے کے لیے کہ وہ ایک مربوط منظم شکل میں اپنے خیالات کو الفاظ تحریر کا جامہ پہنا سکے ضروری ہے کہ اس کے پاس زبان کی ایک تکنیک موجود ہو۔ اس تکنیک کی شکل پذیری کی ایک ہی صورت ہے، وہ یہ کہ تقریر اور تحریر کے بنیادی اصولوں کی خوب مشق ہو۔ قواعد زبان صرف وہی سکھانے چاہئیں جن کی عملی افادیت ہو۔ پچھلے بیس سالوں میں نصاب میں گرامر کا مقام بہت کچھ بدل چکا ہے، اس کے مندرجات کی تعداد گھٹا دی گئی ہے اور اب زور قواعد کے علم کی بجائے ان کی عملی مہارت پر دیا جاتا ہے، یہ بہت غیر اغلب ہے کہ وہ وقت کہ

ہ آئے جب گرامر میں وہ تمام باتیں شامل ہوا کرتی تھیں جو قواعد زبان کے ماہروں کو معلوم ہوتی
ں لیکن اس کے باوجود آج بھی ہمارے مدرسوں میں گرامر کی تدریس بہت زیادہ رسمی قسم کی ہے
ہمارے تدریسی نظام میں اغلاط دور کرنے والی گرامر کی ضرورت ہے لیکن یہ گرامر طالب علم کو
ہی قوت بیان عطا نہیں کر سکتی، عمدہ قوت بیان رسمی اور درست بیان سے ایک الگ چیز ہے،
رہ بیان وفصاحت حسن اور تاثیر کے اجزا کا مرکب ہوا کرتا ہے، اس کے برعکس درست بیان
ے لیے صرف اس قدر کافی ہے کہ کتاب میں دیئے ہوئے قواعد بیان کا لحاظ رکھ لیا جائے۔ بہتر
ہے کہ ہمارے مدرسوں میں عمدہ بیان پر پہلے سے زیادہ زور دیا جائے، اسوقت حالت یہ ہے کہ
صرف درست یا رسمی انداز بیان سکھانے کی کوشش کی جاتی ہے بلکہ بعض اوقات اتنا بھی نہیں
لیا جاتا۔

سب سے پہلے ہمیں طالب علموں کی بول چال کی طرف توجہ کرنی چاہیئے، نصاب کو چاہیئے
کہ طالب علموں میں اتنی استعداد پیدا کر دے کہ وہ:-

(۱) سوالوں کے جواب درست دے سکیں۔

(۲) مزے کے ساتھ بات چیت کر سکیں

(۳) کسی بات کو پیش کر سکیں، اور

(۴) اونچی آواز سے سمجھ کر قابل فہم انداز میں پڑھ سکیں۔

تقریری مہارت کا مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ بچے کی آواز کی تربیت اس طور پر ہو جائے کہ جب
بھی وہ زبان کھولے اس کے الفاظ سُنے اور سمجھے جا سکیں اور یہ الفاظ سننے والے کے ادراک
اور خوش خلقی کو اپنی طرف متوجہ کر لیں، اس طور پر سننے والوں اور بولنے والوں ہر دو کی تربیت
ہونی چاہیئے۔

ماہرین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ بالغ دنیا میں تحریر کی بڑی ضرورت خط نویسی ہے۔ اس کے
باوجود ہمارے مدرسوں میں خط نویسی کو کم سے کم توجہ ملتی ہے بمضمون نگاری کے نصاب میں خط نویسی کی

موجودہ صورت کے مقابلہ میں بہت زیادہ زور دینا چاہیے۔

زبان کی تدریس میں طالب علم کو دوسرے مضامین کے تحریری کام کے لیے تیار کرنا چاہیے اس میں اتنی صلاحیت پیدا ہو جانی چاہیے کہ وہ

(۱) اپنے مشاہدات کو درست طور پر بیان کر سکے۔

(۲) آسان اصولوں کو پھیلا کر بیان کر سکے۔

(۳) تاریخ کے کسی دور یا کسی عظیم المرتبت انسان کی کہانی سنا سکے اور

(۴) اردو سے انگریزی اور انگریزی سے اردو میں با محاورہ ترجمہ کر سکے۔ زبان آخر کار کیا ہے، یہ محض ایک آلہ ہے اور بس۔ یہ محض حصول مقصد کا ایک ذریعہ ہے۔

بہت سے اساتذہ اس نظریے سے اتفاق رکھتے ہیں کہ علم ادب زندگی پر ایک تنقید ہے لیکن یہ احساس بہت کم استادوں کو ہوگا کہ مضمون نگاری بھی یہی غایت پوری کرتی ہے۔ مضمون نگاری کی اس افادیت کی مثالیں آسانی سے تین حصوں میں بانٹی جا سکتی ہیں۔

تخلیقی تحریریں جن سے عموماً مراد طالب علموں کی لکھی ہوئی نظمیں، کہانیاں اور ڈرامے ہوتے ہیں۔ بدیہی طور پر زندگی کے ساتھ وہی رشتہ رکھتی ہیں جو مسلّمہ علم و ادب۔ اس میں شک نہیں کہ ایسی تحریریں پڑھنے والے کے لیے کم دلچسپ اور کم موثر ہوتی ہیں۔ لیکن لکھنے والوں کے لیے یہ غالب اور آزاد کی تحریروں سے کم پر تاثیر نہیں۔ استاد کا ایک اہم فرض یہ بھی ہے کہ نوجوان مصنفوں کو زندگی کی تعبیر بیان کرنے میں مدد دے۔

ہر وہ تحریر تخلیقی ہے جس کا موضوع کوئی ایسا تجربہ ہو جس کی قدر و قیمت کا لکھنے والے کو یقین ہو اور جس کی خاطر اس نے اسے دوسروں تک پہونچانے کا کام اپنے ذمے لیا ہو۔ قدر و قیمت کا اعتراف دراصل تنقید زندگی کے مترادف ہے۔

مضمون نگاری کو زندگی پر تنقید کا دوسرا موقع اس وقت ہاتھ لگتا ہے جب ان اخلاقی اور جمالیاتی مسائل کو موضوع بحث بنایا جائے جو ثانوی مدرسے کے دوسرے مضامین کے

سلمہ دائروں سے باہر ہیں، یہ کہنا کہ کم عمر نوجوانوں کو اخلاقی اور جمالیاتی مسائل کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں ہوتی، ان کے متعلق بالکل غلط رائے قائم کرنا ہے۔ بے شک اگر اخلاقیات یا جمالیات کو نظریات کے رنگ میں پیش کیا جائے تو ان میں سے اکثریت اس رسمی بحث سے متاثر نہیں ہوگی۔ لیکن ان کے سامنے کوئی خاص واقعہ پیش کر کے دیکھیے جس میں غلط اور درست کے درمیان انتخاب کا سوال پیدا ہوتا ہو۔ آپ دیکھیں گے کہ وہ پرجوش یقین سے خاصے بھرپور ہیں۔ طریق کار کے دو اصول بہت ناگزیر نظر آتے ہیں، استاد کو خاص اور منفرد واقعات سے ابتدا کرنی چاہیے اسے اپنی اقدار کا وعظ نہیں کرنا چاہیے اور نہ یہ اقدار ٹھونسنی چاہئیں۔ ہم نہاد پسندی اور تلقین اخلاق سے اتنے ڈر گئے ہیں کہ ہم نے اخلاق اور اقدار کے پیوست طبیعت کرنے کی کوشش ہی تقریباً تقریباً چھوڑ دی ہے اور یہ کام گھٹیا اخباروں اور سستی فلموں کے حوالے کر دیا ہے کہ ہمارے نوجوانوں کو زندگی کی تنقید فراہم کریں۔

مضمون نگاری کا تیسرا کام پہلے دو کاموں کے ساتھ بہت کچھ مشترک ہے لیکن وہ ان ہر دو سے علیحدہ ہے، یہ کام مختلف مضامین سے حاصل شدہ واقفیت اور تصورات کو ایک لڑی میں پرونا ہے، یہاں ان کی قدر و قیمت سے اس قدر بحث نہیں ہوگی جتنی ان کے درمیان ربط قائم کرنے سے ثانوی مدرسے کے آخری سالوں میں خاص طور پر ایسے کھلے مباحثے جماعتی بحث و تمحیص اور تحریری مناظرے منعقد کیے جا سکتے ہیں جن کے موضوع نہ صرف متذکرہ صدر خاص موضوع ہوں بلکہ زیادہ عام اور نظریاتی موضوع بھی۔ بے شک یہاں استاد یہ توقع نہیں رکھ سکتا کہ طالب علموں کی تقریر و تحریر میں ادبی نظر فریبی یا فلسفیانہ وسعت اور گہرائی ہوگی لیکن اس کے باوجود اسے ان کی نشوونما کا پورا یقین رکھنا چاہیے۔

مضمون نگاری کے یہ تمام مشاغل ذاتی جواب مضمون کی طرح اظہار نفس کے ذرائع ہیں۔ بہت سے مفکرین ان تمام کو تخلیقی بیان کا نام دیں گے۔ لیکن یہ بات بذات خود اہم نہیں، اصل نکتہ یہ ہے کہ مسائل پر گرمجوشی سے دعاوا بولنے اور واضح بیان کی بدولت ذہن نشوونما پاتا ہے، چوں کہ — مضمون نگاری میں ازبر کرنے والے مواد کا بوجھ نسبتاً کم ہے، اس لیے اس کی مدد سے سچی ذہنی زندگی

[illegible]

کے شٹل ورتھ (۱۸۰۴ - ۷۷ ۱۸ء)

انیس الدین انصاری

زمانۂ قدیم میں ہر شخص معلم کا پیشہ اختیار کر سکتا تھا، دورِ جدید میں معلمی کے لیے مخصوص تربیت کو ضروری قرار دیا گیا ہے۔ ہمارے ملک میں ایسی درس گاہیں جہاں معلموں کو مخصوص فن تدریس کے لیے تعلیم و تربیت دی جائے نارمل اسکول یا ٹریننگ کالج کہتے ہیں، ان درس گاہوں کے قیام کا تصور انگلستان سے لیا گیا ہے۔ اس لیے اس شخص کے حالات زندگی معلوم کرنا جس نے انگلستان میں سب سے پہلے ٹریننگ کالج کی بنیاد رکھی اور ٹیچر کے لیے ٹریننگ ضروری قرار دی دل چسپ اور مفید ثابت ہوگا

انگلستان کی تاریخ کے ممتاز ماہرینِ تعلیم میں جان لاک، ٹامس آرنلڈ ہیڈ ماسٹر رگبی اسکول رابرٹ اوون۔ ہربرٹ اسپنسر بہت مشہور شخصیتیں ہیں لیکن تعلیمی تاریخ کو گہری نظر سے دیکھنے والے متفق ہیں کہ سر جیمز کے شٹل ورتھ کا درجہ بہت بلند ہے۔

کے شٹل ورتھ انگلستان کا پہلا سکریٹری وزارت تعلیمات ہوا ۱۸۳۹ء میں یہ عہدہ قائم ہوا اور اس پر اس کا تقرر ہوا۔ کے شٹل ورتھ کی عظمت اس کی اعلیٰ قابلیت یا جدید تعلیمی اصولوں کی اشاعت میں نہیں ہے۔ وہ تعلیمی نظم و نسق کا نہایت کامیاب منتظم ثابت ہوا ہے۔ تعلیمی دفاتر میں اس کی نظیر اس لیے بیان کی جاتی ہے کہ تعلیمی دفتری احکام اس سے بہتر کسی دوسرے شخص نے نہیں جاری کیے۔ انگلستان کی وزارت کے شعبۂ تعلیمات اور پارلیمنٹ میں اس کی تعلیمی جدوجہد ملک کے لیے نہایت مفید ثابت ہوئی۔ گلیڈ اسٹون کے وزارتی دور میں تعلیمی مسودہ قانون پیش کرتے ہوئے ۱۸۷۰ء میں مسٹر فارسٹر نے یہ الفاظ کہے تھے کہ "ہمارے قومی تعلیمی نظام میں کے شٹل ورتھ سے زیادہ کسی دوسرے شخص کی خدمات زیادہ قیمتی نہیں کہی جا سکتی ہیں"

میتھو آرنلڈ نے۔ کے شٹل ورتھ کے لیے جو الفاظ تحریر کیے ہیں وہ دل چسپ اور سبق آموز ہیں۔

وہ ادبی لحاظ سے تحریر میں بلند درجہ نہیں رکھتا تھا۔ وہ اچھا مقرر بھی نہیں تھا۔ وہ گفتگو میں دلکش انداز کا مالک نہیں تھا۔ بعض اوقات اس کے متعلق یہ رائے قائم ہو سکتی تھی کہ وہ پارٹی بنانے اور اپنے مطلب حاصل کرنے کے لیے بلند اخلاقی سے کچھ پستی کی طرف آ سکتا تھا لیکن فی الواقع وہ اس میں اشاعت تعلیم کے لیے یہ تدابیر اختیار کرتا تھا اور اس کا مقصد ہمیشہ شریفانہ اور ملی ہوتا تھا۔ اس کا پختہ عقیدہ تھا کہ تعلیم صرف معلومات حاصل کرنا نہیں ہے۔ بلکہ حصولِ معلومات تعلیم کے وسیع مفہوم کے ایک خاص جزو کو ظاہر کرتا ہے"

انگلستان میں جب لنکاسٹر اور بیل کے مانیٹری اصول کے مدرسے عام ہو رہے تھے اور ان مدرسوں کی وہی حالت تھی جو آج کل ہمارے ملک میں تاجرانہ انداز کے مدرسوں کی ہو رہی ہے تو کے شٹل ورتھ نے ایک مضمون لکھا کہ لنکاسٹر اور بیل کے مانیٹری طرز کے مدرسے ملک کے لیے بے حد نقصان دہ ثابت ہو رہے ہیں۔ اس کی اس تنبیہ کا اثر ملک میں بہت اچھا ہوا۔

۱۸۳۸ء میں اس نے ایک تحریر میں حسب ذیل خیالات کا اظہار کیا:-

معلّم کو اپنے شاگردوں میں سزا کے خوف یا انعام کی امید میں کام کرنے کی عادت نہ ڈالنا چاہیے۔ علم کا قدرتی شوق ہر بچہ میں موجود ہے۔ اس لیے اس فطری رجحانِ معلومات کو کام میں لا کر اگر تعلیم دی جائے تو نتائج اچھے حاصل ہوں گے۔ اس فطری شوق کو ابھارنے کے لیے سادہ اور جدید طریقے اختیار کرنا ضروری ہے"

اسی زمانہ میں، کے شٹل ورتھ نے بیٹرسی (BATTERSEA) میں پہلا ٹریننگ کالج اپنے ذاتی مصارف سے قائم کیا جس میں معلمین کی ٹریننگ کی ابتدا کی اور اس طرح انگلستان میں ٹریننگ کالج اور نارمل اسکولوں کی ابتدا ہوئی۔ اس کی یہ تعلیمی خدمت تاریخی اہمیت رکھتی ہے اور اس کی وسیع النظری اور دوراندیشی مسلمہ ہے۔ کے شٹل ورتھ مذہبی انسان تھا لیکن وہ تنگ نظر پادریوں سے نفرت کرتا تھا

۱۸۳۹ء میں جب وہ وزارت تعلیمی کے سیکرٹری کے عہدے پر فائز ہوا تو سب سے پہلے سرکاری ٹیچرز ٹریننگ کالج اور پریکٹس اسکول قائم کرنے کی طرف متوجہ ہوا جس میں ترقی یافتہ طریقۂ تعلیم

ٹیچرز کو باخبر کیا جائے اور اصول تعلیم پر لکچر دیئے جائیں اور طریقۂ تدریس کی مشق کا انتظام کیا جائے
کے ٹِشَل ورتھ نے انگلستان کے اسکولوں میں طریقۂ تعلیم کی اصلاح میں بڑی جدوجہد کی
وہ بار بار یہ ہدایات جاری کرتا رہا کہ اسکولوں کی تعلیم کا اندازہ امتحانات کے نتیجوں سے ہرگز نہ کیا جائے
بلکہ اسکولوں کا گہرا معائنہ کیا جائے۔ ان کے تدریس کے طریقوں کو دیکھا جائے اور معلوم کیا جائے
کہ طریقہ ہائے تعلیم نفسیاتی اصولوں پر کہاں تک اختیار کیے گئے ہیں۔ اگر بچوں میں علم کا شوق
پیدا کیا جارہا ہو تو گرانٹ دی جائے ورنہ نہیں محض امتحان کے نتیجوں پر گرانٹ نہ دی جائے۔
اس نے انسپکٹروں کے معائنوں کے طریقوں کو بدلا۔ ان کے معائنہ کے طریقہ اعداد و شمار جمع کرنا
اور حصول علم میں بچوں میں کہاں تک شوق پیدا ہوا ہے اس کی جانچ نہیں ہوتی تھی۔ کے ٹِشَل ورتھ
نے انسپکٹروں کو متوجہ کیا کہ وہ علم کے صحیح شوق کو ابھارنے کے طریقوں کو اسکولوں میں جانچا کریں
اور جن اسکولوں میں اچھے طریقے رائج ہوں ان طریقوں کو دوسرے اسکولوں میں رائج کرانے کی
کوشش کی جائے۔ انسپکٹروں کا کام اُستادوں کی خوابیں معلوم کرنا نہیں ہے۔ بلکہ ان کو تعلیم کے
اچھے طریقوں سے واقف کرنا ہے اور انسپکٹر کا یہ فرض ہے کہ اگر کسی مدرسہ میں کوئی اچھی بات رائج
ہے تو اس سے دیگر مدرسوں کے استادوں کو واقف کر دیا جائے۔ بتذکرہ بالا اصولوں کو کے ٹِشَل ورتھ
نے انگلستان کے مدرسوں میں اچھی طرح جاری کرا دیا۔

تعلیمی تاریخ میں اس ماہر تعلیم کی عظمت اس وجہ سے بھی ہے کہ یہ اس دور میں جبکہ تعلیم کی
ترقی تعداد طلبہ کے اضافہ سے شمار کی جاتی تھی اس نے تعلیم کے صحیح معیار کو قائم کیا اور تعلیمی ترقی کا
جائزہ اضافۂ تعداد سے نہیں بلکہ معیار تعلیم کی بلندی سے قرار دیتا تھا۔

ہمارے ملک میں تعلیمی نظام کی اصلاح ہو رہی ہے۔ ضرورت ہے کہ تعلیم کا مفہوم محض
حصولِ معلومات یا حصولِ فنون نہ قرار دیا جائے بلکہ نوعمروں کے فطری رجحانات کی مکمل نشو و نما تعلیم کا بنیادی
قرار دی جائے۔ اور ہمارے اسکولوں کے طریقۂ تعلیم میں اساسی اصلاح فوراً جاری کی جائے
کہ وہ طالب علموں کے دلی شوق کا جائزہ لے کر اس کا مکمل ریکارڈ رکھیں اور اپنی تعلیم کو ایسے انداز سے
جاری رکھیں کہ نوعمروں کے شوق کو سنوارا جائے۔ تاکہ ان کی دلی خواہشات پسندیدہ انداز میں ظاہر

بے ڈھب والدین کا گروہی علاج

فضل احمد

مدرسہ بچوں میں بعض مخصوص دلچسپیاں اور نقطہ ہائے نگاہ پیدا کرنا چاہتا ہے۔ یہ مقصد حاصل کرنے کے لیے وہ اپنی چاردیواری میں ایک خاص قسم کی فضا پیدا کرتا ہے۔ اگر بچے دن رات اس فضا میں رہتے تو مدرسے کا کام بڑا آسان ہو جاتا۔ لیکن بچوں کو چوبیس گھنٹے اس مصنوعی ماحول میں رکھنا ممکن نہیں، وہ وقت کا زیادہ حصہ اپنے گھروں میں گذارتے ہیں اور صرف پانچ چھ گھنٹے روزانہ مدرسے کی تحویل میں رہتے ہیں، یہ امر مدرسے کے لیے اکثر صورتوں میں کافی مشکل مسائل پیدا کر دیتا ہے۔ کئی حالتوں میں مدرسے کا اثر بچے کو ایک سمت میں کھینچتا ہے تو گھر کے اثرات اسے بالکل مخالف سمت میں کھینچتے ہیں، مدرسے کی ساری محنت پر پانی پھرتا نظر آتا ہے اور استاد مایوسی میں یہ سوال پوچھنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ ایسے بے ڈھب بچوں کا کیا علاج ہو۔

نفسیاتی طور پر اب یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ اکثر بے ڈھب بچوں کے والدین بھی بے ڈھب واقع ہوئے ہوتے ہیں، یہ لوگ خود غیر متوازن جذباتی کیفیتوں کا شکار ہوتے ہیں اور یہ مرض اپنے بچوں میں بھی منتقل کر دیتے ہیں، ان میں سے بعض والدین احساس برتری کا شکار ہوتے ہیں، یہ نفسیاتی مرض عموماً سفید پوش وضعدار اور نمائش پرست والدین کو لاحق ہوتا ہے، ان کے نزدیک یہ خیال ہی ناقابل برداشت ہوا کرتا ہے کہ ان کا نور نظر بھی کسی کوتاہی کا مرتکب ہو سکتا ہے، ممکن ہے گھر کے تجربہ کی بنا پر انہیں اپنے بچوں کی کمزوریوں کا کبھی کبھار احساس ہو جاتا ہو لیکن وہ کسی کے سامنے اس بات کا اقرار کرنے کو کبھی تیار نہیں ہوتے۔ ان کا بچہ اور قصوروار ؟ اس سے بڑی اہانت بھلا اور کیا ہوگی ؟ نہیں نہیں ان کا بچہ ہرگز خطاکار نہیں ہو سکتا، جو شخص یہ کہتا ہے "

جھک مارتا ہے یا غلط فہمی کا شکار ہے۔ ہر استاد اس قسم کے کئی والدین سے آگاہ ہوگا۔ راقم کو ایک ایسے والدین کا واقعہ اب تک یاد ہے۔ یہ صاحب پولیس کے ریٹائرڈ سب انسپکٹر تھے۔ ان کا بچہ خاصا ذہین تھا لیکن تھا پڑا لاپرواہ۔ گھر سے جو کام کرنے کو دیا جاتا وہ شاذ و نادر ہی کر کے لایا۔ راقم نے بچے کی معرفت اس کے والد کو پیغام بھیجا کسی روز مدرسہ میں تشریف لائیں۔ گو یہ بزرگوار سراپا فرصت تھے۔ ان کے احساس برتری نے اس بات کی اجازت نہ دی کہ ایک مدرس کے بلانے پر مدرسے میں آئیں، جب اس طرح ان کا تعاون حاصل نہ ہو سکا تو راقم نے بچے کے ہاتھ انہیں ایک پرچہ لکھ بھیجا جس میں لڑکے کے باقاعدہ کام نہ کرنے کی تفصیل درج تھی۔ انہوں نے اسی کاغذ کی پشت پر لکھ بھیجا کہ افسوس۔ برخوردار آپ کے بیان کی تصدیق نہیں کرتا۔ ظاہر ہے کہ بے ڈھب بچوں کی اصلاح والدین کے تعاون کے بغیر ممکن نہیں۔ لیکن جہاں والدین خود بے ڈھب ہوں وہاں اصلاح کی کیا صورت ہو؟

بعض والدین ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنے آپ کو زندگی میں بے حد زخم خوردہ خیال کرتے ہیں۔ انہیں عموماً ہر شخص سے شکایت رہتی ہے۔ اس لیے اگر خدانخواستہ مدرسہ ان کے پاس کوئی شکایت بھیج بیٹھے تو ان کی ساری تلخی استادوں اور مدرسے کی طرف امڈ آتی ہے۔ ایسے والدین کو اگر خود بچوں کی طرف سے کوئی مایوسی ہو تو وہ فوراً اس کی ساری ذمہ داری بھی استادوں کے سر تھوپنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ راقم کو ایک ایسے معمر والد کا علم ہے جو پیشہ کے لحاظ سے ڈاکٹر ہیں۔ کثیر العیال ہیں۔ بدقسمتی سے ان کی بڑی آرزوؤں کے باوجود ان کے صاحبزادوں میں سے کوئی بھی تعلیمی طور پر اچھا ثابت نہیں ہوا۔ انہیں پوری دیانت داری کے ساتھ یہ یقین ہے کہ اس کی ساری ذمے داری استادوں پر ہے، جب وہ خود ہر قسم کے مرض کا علاج کامیابی سے کر لیتے ہیں تو آخر کیا وجہ ہے کہ مدرسہ ان کے بچوں میں سے کسی کو بھی اچھی تعلیمی قابلیت عطا نہیں کر سکا؟ بظاہر طور پر اس کی وجہ استادوں کی لاپرواہی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے والد کو کوئی شخص اس بات کا قائل نہیں کر سکتا کہ کمی خود ان کے بچوں میں ہے۔ مدرسے یا استادوں میں نہیں۔

استاد کی مجبوری ہمارے نقطۂ نگاہ سے اہم سوال یہ ہے کہ استاد ان بے ڈھب بچوں کے بارے میں کیا کرے جن کے والدین بھی بے ڈھب ہوں؛ صریحاً ایسی صورت میں درست طریق کار یہ ہے کہ پہلے والدین کے نفسیاتی امراض کا علاج کیا جائے، جونہی ان کی نفسیاتی صحت درست ہو جائے گی ان کے بچے بڑی تیزی سے صحت مند عادات وخصائل اختیار کرنے لگیں گے لیکن یہ کام کسی نفسیاتی ماہر کے کرنے کا ہے۔ استاد کی چند در چند مصروفیتیں اور اس کی محدود تربیت اسے اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ وہ اس کٹھن کام کو ہاتھ ڈالے۔

نفسیاتی امراض کے دفعیہ اور ذہنی صحت کی بحالی کے لیے گروہی علاج کا طریقہ بڑا کارگر ثابت ہو چکا ہے، ذہنی بیماریوں کے بہت سے مریض جب ایک ساتھ کسی ماہر معالج کی زیر نگرانی مل کر بیٹھتے ہیں تو انہیں رفتہ رفتہ اپنی ذہنی بیماریوں کا احساس ہونے لگتا ہے۔ یہ احساس صحت یابی کی طرف پہلا اور ضروری قدم ہے اس کے بعد صحت یابی کی رفتار تیز ہو جاتی ہے، والدین کے اس طرح شفایاب ہونے کے ساتھ ہی بچوں کی ذہنی عادات میں انقلاب آنے لگتا ہے اور بے ڈھب بچے دیکھتے دیکھتے اچھے بھلے ہو جاتے ہیں۔ لیکن جیسا کہا جا چکا ہے یہ کام استاد کے کرنے کا نہیں ماہر نفسیات کے کرنے کا ہے۔

قومی نقصان ہمارے یہاں بے ڈھب بچوں کے متعلق کوئی زیادہ تردد نہیں کیا جاتا، پر ہجوم جماعتیں استاد کو اتنی مہلت نہیں دیتیں کہ وہ ان کے متعلق زیادہ چھان بین کرے اگر وہ زیادہ حساس طبع واقع ہوا ہے تو زیادہ سے زیادہ اتنا کرے گا کہ ان کے والدین کو ایک مرتبہ آگاہ کر دے اگر والدین کی طرف سے سرگرم تعاون ہوا تو بچہ سدھر گیا۔ لیکن اگر والدین بھی بے ڈھب ثابت ہوئے تو معاملہ وہیں ختم ہو گیا، بچہ اپنے حال پر چھوڑ دیا گیا، اس کی غیر پسندیدہ ذہنی عادات پختہ ہوتی چلی گئیں اور وہ آگے چل کر سماج دشمن عناصر میں اضافہ کا موجب ہوا۔ بڑے ہو کر اس نے اپنی ذہنی امراض اپنی اولاد میں منتقل کیں اور ذہنی امراض کا یہ چکر معاشرتی سالمیت کو تہ و بالا کرتا رہا۔ قومی سطح پر یہ نقصان اس قدر ہولناک ثابت ہو سکتا ہے اور اس کی پیش قدمی اتنی بلا خیز ثابت ہو سکتی ہے کہ

کوئی روشن خیال قوم اس معاملہ کو معمولی سمجھ کر نظر انداز نہیں کر سکتی ۔ بے ڈھب والدین کے گروہی علاج پر
بے شک وقت اور روپیہ صرف ہوگا لیکن اس قومی نقصان کے مقابلہ میں کہیں کم ہوگا جو بے ڈھب
بچوں کو ان کے اپنے حال پر چھوڑنے سے لامحالہ پیدا ہوگا ۔ یہی بچے بڑے ہو کر طرح طرح کے جرائم کا
ارتکاب کریں گے اور معاشرے کی سالمیت کے لیے ایک حقیقی خطرہ بن جائیں گے ۔ انہی وجوہ نے
ترقی یافتہ ملکوں کو اس بات پر آمادہ کیا ہے کہ بے ڈھب والدین کی ذہنی صحت کے لیے موثر
قدم اٹھائیں ۔

ایک مثال ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے مشہور سینٹ لوئس کے مدرسوں کو حال ہی میں
جرائم اطفال اور دوسرے مسائل کا سامنا تھا ، دس سال سے زیادہ عرصہ سے اس شہر میں والدین کی
تعلیم کے لیے ایک کونسل قائم تھی ۔ یہ کونسل لیکچروں ، فلموں اور علمی مباحثوں کے ذریعے سے والدین
کو تعلیمی مسائل سے باخبر رکھنے اور انہیں مدرسے سے قریب تر لانے کی کوشش کر رہی تھی ، یہ کوششیں
اپنی جگہ بہت خوب تھیں لیکن ان کے نتائج زیادہ امید افزا ثابت نہ ہوئے ۔

ذہنی اعصابی بیماریوں بعض کہنہ امراض اور جذباتی تکلیفوں کے لیے گروہی علاج کی
تکنیک کافی پرانی ہے ۔ اسے بچوں اور بالغوں ہر دو پر آزمایا جا چکا ہے ۔ اسے تعلیمی مقاصد کے لیے
بھی استعمال کیا گیا ہے ۔ لیکن سینٹ لوئس کے مدرسوں میں ابھی تک اس سے کام نہیں لیا گیا
تھا تعلیمی بورڈ کی صدارت جب ایک عالم نفسیات کے ہاتھ میں آئی تو انہوں نے تجویز پیش کی
کہ بے ڈھب والدین کی ذہنی صحت کی بحالی کے لیے مدرسوں کو ذریعہ بنایا جائے ۔ اس میں مصلحت
یہ تھی کہ چونکہ مدرسوں کی طرف سے عموماً والدین کو بچوں کے متعلق اطلاعات بھیجی جاتی ہیں
اور بعض اوقات انہیں مدرسوں میں بلایا بھی جاتا ہے اس لیے ان کی طرف جو بلاوا پہنچے گا
اسے کوئی غیر معمولی چیز نہیں سمجھا جائے گا ، اس بنا پر تعلیمی بورڈ نے کونسل برائے تعلیم والدین کو
یہ اختیار دے دیا کہ وہ شہر کے کچھ مدرسوں میں بے ڈھب والدین کے سدھار کے لیے
تجربے کرے ۔

بعض ابتدائی معاملات طے کرنے کے بعد کونسل نے مقامی یونیورسٹی کے ماہر نفسیات کو دو سال کے لیے نصف وقت ملازم رکھ لیا۔ تجربے کے لیے دو ایسے مدرسے چنے گئے جن میں سے کوئی بھی معاشی لحاظ سے انتہائی حالات کا نمائندہ نہیں تھا۔ ان میں سے ایک مدرسہ شہر کے غریب حصہ میں واقع تھا۔ تاہم یہاں سب کے سب والدین خود کفیل تھے۔ ان میں سے اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جو جنگ کے زمانہ میں گاؤں چھوڑ کر شہر آئے تھے۔ یہ لوگ کارخانوں میں کام کرنے آئے تھے۔ اس لیے عموماً کم تعلیم یافتہ تھے اور کسی خاص کسب کے ماہر نہیں تھے۔ اکثر گھرانوں میں مائیں بھی محنت مزدوری کرتی تھیں تاکہ کنبے کی بسر اوقات ہو سکے۔ بعض حالتوں میں میاں بیوی میں علیحدگی ہو چکی تھی۔ ایسی صورت میں ہی سارے گھر کا بوجھ اٹھائے ہوئے تھیں۔ بہر حال اس مدرسہ میں پڑھنے والے بچوں کی اکثریت ایسی تھی جن کی گھر پر کافی نگہداشت نہ ہوتی تھی۔

دوسرا مدرسہ شہر کے نسبتاً خوش حال حصے میں واقع تھا۔ لیکن اس حصے کے لوگوں کا شمار امراء میں نہیں تھا۔ یہاں زیادہ تر ایسے لوگ آباد تھے جو دوسرے ملکوں میں پیدا ہوئے مگر بعد میں ہجرت کر کے ریاست ہائے متحدہ میں آ گئے۔ شہر کے اس حصے کا ثقافتی ماحول مختلف تھا۔ لوگ عموماً کافی پڑھے لکھے تھے۔ یہ لوگ اپنے کاروبار کے خود مالک تھے۔ مائیں نوکری کرنے کی بجائے ساری توجہ بچوں کی دیکھ بھال پر صرف کرتی تھیں۔ بچوں پر ماؤں کا اثر غیر معمولی تھا۔ بعض حالتوں میں دادا دادی کا اثر بھی بہت کافی تھا۔ الغرض یہ مدرسہ پہلے مدرسے سے تقریباً ہر بات میں مختلف تھا۔

دونوں مدرسوں کے جداگانہ معاشرتی ماحول نے ہر دو مدرسوں میں مختلف قسم کے مسائل پیدا کر رکھے تھے۔ مثال کے طور پر پہلے مدرسے میں جرائم اطفال کے واقعات نسبتاً زیادہ ہوتے تھے۔ اس کے مقابلے میں دوسرے مدرسے کے بچے نسبتاً عصبی مزاج اور جذباتی طور پر غیر متوازن تھے۔ نفسیاتی طور پر یہ بات واضح تھی کہ اول الذکر بچوں کا گھریلو ماحول ایسے ذہنی تناؤ کا شکار تھا جو سماج دشمن رجحانات کی پرورش کرنے والا تھا۔ اس کے برعکس ثانی الذکر بچوں کا گھریلو ماحول ایسی ذہنی کھچاوٹ سے بھرپور تھا جو مضر ذات رجحانات کو ابھارنے والی تھی۔ اس اختلاف کی بنا پر دونوں گروہوں کے

ذہنی علاج کے لیے مختلف تکنیکیں استعمال کرنی پڑیں، دونوں صورتوں میں اصل دشواری گروہی علاج کی داغ بیل ڈالنے میں پیش آئی، جب اس کام کا آغاز ہو گیا تو پھر یہ کام کم وبیش آسانی سے جاری رہا۔

تفصیلات دونوں صورتوں میں آغاز کار کے لیے ماہر نفسیات نے پہلے مدرسے کے اساتذہ کے ساتھ بات چیت کی۔ انہیں اپنا مقصد سمجھایا۔ اور یہ وضاحت بھی کی کہ استاد اس مقصد کی کامیابی میں کیا مدد دے سکتے ہیں۔ ماہر نے جب اساتذہ سے دوسری مرتبہ ملاقات کی تو انہوں نے ان طلبہ کے نام پیش کیے جن کا عام رویہ، یہ ظاہر کرتا تھا کہ وہ مدرسے کی زندگی کے ساتھ ہم آہنگ نہیں۔ اب گروہی معالج نے استادوں سے ہر بچے کے متعلق تفصیلی معلومات جمع کیں، اس ضمن میں اس نے ہر استاد کے ذہنی پس منظر کا بھی اچھی طرح مقابلہ کیا۔ اگلا قدم والدین سے ملاقات کا تھا۔ دراصل گروہی معالج کی مشکلات کا آغاز اسی قدم سے ہوا بعض والدین نے آنے کی دعوت کو ٹھکرادیا جنہوں نے یہ دعوت قبول کی ان میں سے کچھ اتنے ضعیف العقل یا جذباتی طور پر اتنے سقیم تھے کہ ان کے ساتھ کوئی بحث ومباحث ممکن نہ تھا، غرض ساری کوششوں کے باوجود دو سال کے عرصے میں ان والدین میں سے جنہیں آنے کی دعوت دی گئی تھی کوئی ایک تہائی نے ایک یا ایک سے زیادہ جلسوں میں شرکت کی۔

غریب علاقہ میں واقع مدرسہ میں پہلا جلسہ شام کے وقت منعقد کیا گیا، تاکہ مائیں محنت مزدوری سے فارغ ہو کر شرکت کر سکیں۔ پہلے جلسے میں صرف چھ ماؤں نے شرکت کی، وہ سب ایک دوسرے سے ناواقف تھیں، جلسے میں بیٹھیں تو ان سب کو عدم اطمینان کا ایک عجیب احساس ستا رہا تھا، انہیں خبر نہیں تھی کہ ان سے کس چیز کی توقع کی جائے گی، ان میں سے مسز ٹیلر نامی ایک ماں غیر معمولی طور پر برہم ہو رہی تھی۔ پانچ برس گذرے وہ خاوند سے الگ ہوئی تھی، اس وقت سے اب تک وہ اکیلی اپنے تینوں بچوں کی پرورش کے لیے لگاتار محنت مشقت میں لگی تھی، اس مشکل کام میں اسے کسی طرف سے کبھی کوئی مدد نہیں ملی تھی، اس کے تینوں بچے جن میں سے بڑی لڑکی تھی

ایک ہی مدرسے میں پڑھتے تھے۔ لڑکی اب کافی سیانی تھی، اس کی طرف سے مسز ٹیلر کو فکر دامن گیر رہنے لگی تھی کہ اس کی روز افزوں خود پسندی کہیں کوئی گل نہ کھلائے۔ تاہم وہ گھر میں پورا ضبط قائم رکھتی تھی۔ اس بارے میں اسے کبھی دقت پیش نہ آتی تھی، اس لیے جب مدرسے کی طرف سے آنے کی دعوت موصول ہوئی تو اس کا پہلا ردِّ عمل سخت ناراضگی کا تھا، اس کے دل میں رہ رہ کر یہ خیال آتا تھا کہ آخر یہ مدرسے والے خود کس مرض کی دوا ہیں، جب میں گھر پر بچوں کو قابو میں رکھتی ہوں تو یہ مدرسے میں ایسا کیوں نہیں کر سکتے؛ اب مجھے مدد کے لیے بلایا جا رہا ہے۔ میں پیٹ کا دھندا کروں یا استادوں کے دردِ سر میں شریک بنوں؟

ان خیالات نے اسے تقریباً نہ جانے پر آمادہ کر ہی لیا تھا، جب اسے پھر اپنی نوجوان لڑکی کا خیال آیا، وہ اپنی اس تشویش کو کسی پر ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی، آخر اسی تشویش نے اسے مدرسے کی دعوت قبول کرنے پر آمادہ کر لیا، اس نے آدھے دن کے لیے کام سے چھٹی کی اور مدرسے پہونچی۔ صدر معلم کے کمرے میں داخل ہوئی تو وہاں اس کے ہمراہ ایک اور شخص کو بیٹھے ہوئے پایا۔ صدر معلم نے مسز ٹیلر کا اس سے تعارف یہ کہہ کر کرایا کہ یہ ہماری یونی ورسٹی کے ماہر نفسیات ہیں اور میری درخواست پر مدرسے کے بعض بچوں کی ذاتی دشواریاں حل کرنے کے لیے تشریف لائے ہیں۔ اس کے بعد مسز ٹیلر کی ساری بات چیت اس گروہی معالج ہی کے ساتھ ہوئی۔ بات چیت کے خاتمہ پر جب وہ صدر معلم کے دفتر سے باہر نکلی تو اگلی شام کو ہونے والے جلسہ میں شرکت کا وعدہ کر کے نکلی۔

حسبِ وعدہ مسز ٹیلر جلسہ میں شامل ہونے آئی، اس کے علاوہ پانچ اور مائیں بھی آئی ہوئی تھیں۔ گروہی معالج نے جلسہ کی صدارت کے فرائض اپنے ذمے لیے۔ مسز ٹیلر کو اس گروہ میں بیٹھے بیٹھے ایک عجیب ناگوار احساس ستا رہا تھا، اس احساس نے اس کے دل میں غصہ کی آگ بھڑکا دی، دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے اس نے شکایت آمیز تلخ لہجہ میں باتیں کرنی شروع کیں، نیم سہمے ہوئے اور نیم تلخ لہجہ میں وہ استادوں اور مدرسے پر برسنے لگی، دوسری مائیں جن کے چہرے مسز ٹیلر کے سے جذبات کی غمازی کر رہے تھے اس کی تلخ گوئی پر بہت خوش ہوئیں، ان کی

طرف سے اس کے ہر الزام اور ہر شکایت کی پرزور تائید ہوتی تھی۔ لیکن ان تند و تلخ باتوں سے گروہی معالج کے ماتھے پر بل تک نہ پڑا۔ وہ کمال خندہ پیشانی کے ساتھ یہ سب کچھ سنتا رہا اور بڑے ہمدردانہ لہجہ میں اس بات پر اظہار افسوس کرتا رہا کہ مسز ٹیلر اور دوسری ماؤں کو دن بھر کے دھندوں کے بعد ایک شام کے وقت مدرسہ کے مسائل نے پریشان کر رکھا تھا۔

گروہی معالج کے ہمدردانہ لہجہ سے حوصلہ پا کر دوسری ماؤں نے بھی اپنے دلوں کی بھڑاس نکالنی شروع کی، ان میں سے ہر ایک نے مدرسے اور استادوں کو قصوروار ٹھہرایا اور کہا کہ استاد بچوں کو قابو میں رکھنے سے بالکل قاصر رہے ہیں۔ لیکن کسی ماں نے بھی یہ اعتراف نہ کیا کہ اس کا بچہ گھر پر بھی تکلیف کا باعث بنتا ہے۔ ان سب نے استادوں اور مدرسوں کو جی بھر کر کوسا اور اس تنقید سے بڑی لذت محسوس کی، اس جلسے میں صرف والدین کے نقطۂ نگاہ کو پوری خندہ پیشانی اور ہمدردی کے ساتھ سنا گیا۔ جلسہ کے خاتمہ پر صدر جلسہ نے حاضرین کی تواضع چائے اور بسکٹوں سے کی اور جلسہ کمال گرمجوشی کے جذبات کے ساتھ ختم ہوا۔

اس گروہ کے جلسے اسی طرح ہفتہ میں ایک بار ہوتے رہے اور یہ چھے کی چھے مائیں باقاعدگی سے شمولیت کرتی رہیں۔ گروہ کی خاطر تواضع کا سلسلہ بھی بدستور جاری رہا۔ سب سے پہلے مسز ٹیلر نے باقی ساتھ والیوں کی تواضع چائے وغیرہ سے کی۔ ازاں بعد ہر ماں باری باری یہ خوش گوار خدمت اپنے ذمے لیتی رہی۔ رفتہ رفتہ یہ چھوٹا سا گروہ جو مجلسی مراسم کے سلسلے میں اول اول بالکل صفر تھا ہر گرم اور پرخلوص مجلسی تعلقات کا مرکز بن گیا۔ مسز ٹیلر نے بہت جلد قائدانہ حیثیت اختیار کر لی۔ اس سے اسے بہت بڑا جذباتی سکون حاصل ہوا۔ وہ ایک مضبوط ارادہ اور باأثر شخصیت رکھتی تھی۔ اس کی زندگی کے مخصوص حالات نے اسے آہنی سانچہ میں ڈھال رکھا تھا۔ وہ چھوٹی عمر میں یتیم رہ گئی تھی اور ایک بے کیف بورڈنگ ہاؤس میں پل کر جوان ہوئی تھی۔ اس نے ایک زندہ دل شخص کے ساتھ شادی کر لی۔ یہ شخص شراب کا بڑا عادی تھا۔ پورے بیس سال تک اس نے خاوند کے ساتھ نباہ کرنے کی کوشش کی۔ آخر تنگ آ کر اس نے اس شرابی سے کنارہ کشی کر لی اور بیٹے کو

چلی آئی جہاں کام کاج کے بآسانی مل جانے کی امید تھی۔ اس کے کل پانچ بچے تھے جن میں سے تین چھوٹے ابھی گھر ہی پر تھے۔ وہ ان تین بچوں کو بھی ساتھ لے آئی۔

اس شہر میں اسے کام مل گیا۔ طبیعت سخت کوش اور برتری پسند تھی، اس لیے یہاں اسے زندگی میں پہلی بار چین کا سانس نصیب ہوا، چوں کہ وہ طبعاً ایک جابر شخصیت رکھتی تھی اس لیے اس پر تحکم پسندی کا عنصر غالب آ تا گیا، اپنے بچوں کے ساتھ بالخصوص وہ تحکمانہ برتاؤ کو پسند کرتی تھی، دراصل اپنے بچوں کے بارے میں اس کا طرز عمل دو کھلی ہوئی متضادوں کا مجموعہ تھا، یہ بچے اس کے اپنے تن بدن کا حصہ تھے، اسے ان کے اپنے ہونے کا اتنا قوی احساس تھا کہ اس کے لیے یہ خیال بھی ناقابل برداشت تھا کہ کوئی دوسرا کبھی ان پر کوئی حق رکھ سکتا ہے، اس کے ساتھ ہی وہ ان بچوں کے وجود سے ایک طور پر خفا رہتی تھی، چوں کہ وہ اس کے لیے زندگی کے گوناگوں بوجھوں کی جیتی جاگتی علامتیں تھے، اسے ان کے متعلق سب سے بڑی فکر یہ رہتی تھی کہ اب جبکہ وہ سیانے ہوتے جاتے ہیں وہ کسی نازیبا حرکت کے باعث اس کے لیے بدنامی کا سبب نہ بنیں۔ اسی خوف نے اسے مدرسے میں آنے پر مجبور کیا تھا، سچ یہ ہے کہ جن ماؤں نے صدر معلم کی دعوت قبول کر کے مدرسے میں آنا پسند کیا تھا، ان سب کو یہ فکر دامن گیر تھی، اگرچہ ان میں سے غالباً کوئی بھی اس امر کا اعتراف کرنے کو تیار نہ تھی۔

دوسرے مدرسے میں بھی اس قسم کا پروگرام جاری کیا گیا۔ یہاں بھی کچھ بچوں کی مائیں ہفتہ میں ایک شام مل کر بیٹھتی تھیں، گروہی معالج ان کے نقطۂ نگاہ میں تبدیلی پیدا کرنے کا سامان کر رہا تھا۔ لیکن دونوں گروہوں میں ایک نمایاں فرق نظر آتا تھا۔ چوں کہ ثانی الذکر مدرسہ میں نسبتاً کھاتے پیتے لوگوں کے بچے پڑھتے تھے، اس لئے ان ماؤں کا طرز عمل پہلے ہی دن سے اور نوعیت کا تھا انہوں نے معاملہ کو ذاتی رنگ کی بجائے نظریاتی رنگ میں لیا، وہ اس خیال ہی سے بری طرح بدکتی تھیں کہ انہیں کوئی ذاتی الجھن درپیش ہے، جسے حل کرنے کے لیے مدرسہ ان کا ہاتھ بٹا رہا ہے، یہ امر ان کی عزت نفس کو سخت دھکا لگاتا تھا کہ سیکڑوں ماؤں میں سے صرف انہی چند کو

علاج معالجہ کے لیے چن لیا جائے، اس احساس کا نتیجہ یہ تھا کہ جب اس معاملہ کو ذاتی رنگ میں دیکھنے کی کوشش کی جاتی وہ کسی نہ کسی بہانے بات چیت کا رخ کسی اور طرف پھیر دیتیں بحث مباحثہ میں جذباتی گرمی ناپید تھی، جلسوں میں حاضری بھی بے قاعدہ رہتی۔

تاہم گروہی معالج نے اپنا کام جاری رکھا۔ ایک سال کے خاتمہ پر اس گروہ کا جذباتی تناؤ بھی کم ہو گیا۔ انہوں نے ایک دوسرے کے ساتھ سرگرم ذاتی مراسم قائم کرنے شروع کیے۔ ظاہرداری اور رسم پرستی کی جگہ حقیقت پسندی اور خلوص نے لے لی۔ یہاں بھی جلسوں میں جائے اور سکیلوں سے تو اضح ہونے لگی۔ اب ہر ایک نے اپنی ذاتی مشکلات بلا ہچکچاہٹ بیان کرنا شروع کیں پہلے جن باتوں کا اعتراف کرنا عار سمجھا جاتا تھا۔ اب وہ بے جھجک موضوع بحث بننے لگیں اور گروہ نے اپنی اس نئی حاصل شدہ بصیرت پر فخر کرنا شروع کیا۔

تجربے کے نتائج اس تجربے میں زیادہ قابل ذکر بات یہ ہے کہ جونہی ماؤں کے نقطہ ہائے نگاہ میں تبدیلی آنے لگی ان کے بچوں کا رویہ بھی ساتھ ساتھ بدلنے لگا، جن بچوں کی مائیں جلسوں میں عموماً شرکت کرتی رہیں ان میں سے پچاس فی صد کے متعلق استادوں نے رپورٹ کی کہ ان کی ذہنی صحت اس حد تک ترقی کر گئی ہے کہ انہیں بالکل صحت مند بچے کہا جا سکتا ہے۔ باقی تیس فی صد کے متعلق کہا گیا کہ انہیں نمایاں فائدہ حاصل ہوا ہے۔ مسز ہیلر کے تینوں بچوں کے رویہ میں حیرت انگیز اصلاح ہوئی۔ ابھی ایک ہی سال گذرا تھا کہ معاشرتی طور پر بالکل ہم آہنگ ہو گئے۔

جن بچوں کے رویے میں کوئی اصلاح نظر نہ آئی ایک استثنا کے علاوہ وہ سب ایسے تھے جن کی مائیں باقاعدہ جلسوں میں شریک نہیں ہوئی تھیں، یا جنہوں نے ایک دو جلسوں میں شامل ہونے کے بعد آنا بند کر دیا تھا، یہی تجربہ جب دوسرے مدرسوں میں دہرایا گیا تو وہاں بھی حیرت انگیز طور پر اسی قسم کے نتائج پیدا ہوئے۔

گروہی طریق علاج کی خصوصیات بے ڈھب والدین کے گروہی علاج کی جو تفصیلیں اوپر درج ہوئی ہیں وہ بے حد دلچسپ ہیں، ان سے یہ حقیقت ثابت ہو جاتی ہے کہ جو بچے مدرسے کے لیے

ہو سرین جاتے ہیں ان کا مداوا اکثر حالتوں میں استاد کے بس سے باہر ہو جاتا ہے۔ ان کا ذہن اور جذباتی عدم توازن مدرسے کی منظم زندگی کے خلاف بار بار سر اٹھاتا ہے، ان میں یہ صلاحیت ہی نہیں ہوتی کہ مدرسے کی اجتماعی زندگی کے ساتھ ہم آہنگ ہو سکیں، اس عدم صلاحیت کی جڑیں گھریلو ماحول میں ہوتی ہیں جو ماں باپ کی ذہنی اور جذباتی کیفیتوں کی پیداوار ہوتا ہے۔ اگر ماں باپ ذہنی طور پر صحت مند نہیں تو گھریلو ماحول غیر صحت بخش ہوگا، جو بچے اس ماحول میں پلیں گے وہ لازمی طور پر غیر پسندیدہ اوضاع و اطوار اختیار کریں گے۔ مدرسے کا ماحول لاکھ صحت بخش ہو جب تک اسے گھریلو ماحول سے سہارا نہیں ملے گا وہ پائدار ذہنی تبدیلی پیدا نہیں کر سکے گا۔

اکثر حالتوں میں ذہنی طور پر بیمار بچوں کی صحت مندی کی ایک ہی صورت ہوتی ہے وہ یہ کہ والدین کی ذہنی صحت بحال کی جائے یہ استاد کے بس کا روگ نہیں، ایسے والدین استادوں سے تعاون پر آمادہ ہونے کی بجائے الٹا انہیں کوستے نہیں تھکتے، وہ ہر اس شخص کو دشمن خیال کرتے ہیں جو ذمہ داری ان پر ڈالے، یہ صورت حال کافی مایوس کن نظر آتی ہے۔ لیکن جیسا ہم اوپر کی مثال میں دیکھ چکے ہیں گروہی طریق علاج پر خرچ ضرور ہوتا ہے۔ مدرسے کو کسی ماہر نفسیات اور کچھ معاشرتی کارکنوں کی خدمات حاصل کرنا پڑتی ہیں، لیکن یہ خرچ اس نقصان کے مقابلہ میں کہیں کم ہے جو معاشرہ کو سماج دشمن رجحانات کے پرورش پانے سے اٹھانا پڑتا ہے۔

گروہی طریق علاج کی کامیابی کا سارا مدار گروہی معالج کی معاملہ فہمی اور ہوشیاری پر ہے وہ خود حتی الامکان پس منظر میں رہتا ہے لیکن اس کے باوجود گروہ کے معاملات کو پوری طرح اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے، وہ گروہ کو یہ احساس نہیں ہونے دیتا کہ اسے متاثر کیا جا رہا ہے۔ آغاز کار میں طرح طرح کے سوال اٹھانے اور بات چیت جاری رکھنے کا کام وہ خود انجام دیتا ہے لیکن جونہی گروہ احساس جرم کے بوجھ کو اتار پھینکنے میں کامیاب ہو جاتا ہے، گروہ میں سے ایسے لوگ پیدا ہو جاتے ہیں جو بحث و تمحیص میں قائدانہ حیثیت اختیار کر لیتے ہیں، اب گروہی معالج پس منظر میں بیٹھا صرف اس بات پر نگاہ رکھتا ہے کہ بات چیت کا رخ اصل مقصد سے بہت دور نہ ہٹنے پائے۔

گروہی علاج میں صحت یابی کی طرف سب سے پہلا قدم یہ ہے کہ والدین بچوں کے رویے کی ذمہ داری قبول کرنے پر آمادہ ہو جائیں۔ مندرجہ بالا تجربہ میں جن ماؤں نے آخری دم تک یہ ذمہ داری قبول نہیں کی تھی ان کے بچوں میں کوئی قابل ذکر اصلاح نہ ہو سکی۔ بچوں کے رویے کی ذمہ داری قبول کر لینے کے بعد صحت یابی کی رفتار بہت تیز ہو جاتی ہے۔ اب والدین میں صرف چند سادہ نفسیاتی حقائق کا فہم پیدا کرنا باقی رہ جاتا ہے۔ ان میں سے پہلی حقیقت یہ ہے کہ بھائی بہنوں میں تدریجی محبت کے پہلو بہ پہلو قدرتی رقابت بھی موجود ہوتی ہے۔ دوسری یہ کہ بعض اسباب ایسے بھی ہیں جن کی بنا پر والدین بچوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں تیسری یہ کہ بچہ اگر ایک طرف محبت اور سلامتی کے احساس کا بھوکا رہتا ہے، تو دوسری طرف وہ آزادیٔ عمل کا۔ ان بصیرتوں کے پیدا ہونے ہی والدین کے اپنے طرز عمل میں نمایاں فرق نظر آنے لگتا ہے، اس کے ساتھ ہی بچوں کا طرز عمل بھی بدل جاتا ہے۔

ترقی یافتہ ملکوں میں بھی ابھی ذہنی صحت کی بحالی کے لئے گروہی طریق علاج کا استعمال زیادہ وسیع پیمانہ پر نہیں کیا گیا۔ تاہم اب تک جتنے تجربے ہوئے ہیں ان سے یہ بات پوری طرح ثابت ہو گئی ہے کہ جرائم اطفال کی روک تھام اور بہتر معاشرتی ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے یہ طریق علاج بہت کارآمد ہے۔ گروہی طریق علاج کی تکنیکوں کو مکمل کرنے کا کام ابھی جاری ہے۔

نظم و ضبط اور جمہوریت

محمد عبد العزیز

سیاسی اعتبار ہی سے نہیں ذہنی اور فکری لحاظ سے بھی ہم ایک عبوری دور سے گذر رہے ہیں اور آج پرانے ایوانِ فکر کو ڈھا کر جدید ادارۂ فکر کی تاسیس و تشکیل کا مسئلہ ہمیں زندگی اور اس کے حقائق کے سمجھنے اور سمجھانے کی دعوت دے رہا ہے اور یہ کش مکش اس لیے جاری ہے کہ قدیم معاشرتی تقاضے ہماری موجودہ رفتار ترقی کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ اس لیے منزل تک پہونچنے کے لیے تیز گام ہو کر ہمیں ترقی پسندی کی راہوں کو جگمگانا ہوگا ورنہ ہم اپنی تنگ نائے سے نکل کر زندگی کی وسعتوں اور اس کی ہمہ گیریوں کا کبھی جائزہ نہیں لے سکیں گے۔

یہ فکری تبدیلیاں بعض اوقات زندگی کو حقائق امروز فردا کے شعور و وجدان سے بھی ماورا لے جاتی ہیں۔ لیکن ان کی رفتار اتنی تیز، اور ان کی منزل اتنی مختلف ہوتی ہے کہ وحدتِ فکر اور یکسانیٔ کار کے مواقع کم اور زیادہ ہوتے رہتے ہیں جس سے ذہنی افلاس اور سماجی تعطل پیدا ہونے کا اندیشہ بھی لاحق تھا ہے۔ آج اس معاشری اور سماجی انقلاب کا اثر زندگی کے مختلف شعبوں پر پڑ رہا ہے اور اپنی ہمہ گیری کے نقوش مرتسم کر رہا ہے، اس سے ہمارے مدرسے بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے، کیوں کہ ہماری سماجی زندگی کا مرکز، مدرسہ ہوتا ہے، فیضان کے سرچشمے یہیں سے پھوٹتے ہیں۔ قوم کی تعمیر و تخریب کی بنیاد کی خشت اول یہیں رکھی جاتی ہے اور معاشرے کو بنانے یا بگاڑنے کی ابتدا یہیں سے ہوتی ہے، اس لیے اگر مدرسے میں آزادیِ فکر اور آزادیِ عمل کے مواقع نہ ہوئے تو ملک و قوم کی سیاسی اور اقتصادی بقا کے امکانات ضعیف ہو جاتے ہیں، اس سے صرف ترقی کے راستے ہی مسدود نہیں ہو جاتے، زندگی کی بالیدگی اور توانائی بھی ختم ہو جاتی ہے اور ایک ایسے گھٹے ہوئے ماحول میں شیروں کا روباہ مزاج ہو جانا بھی کوئی بعید از قیاس بات نہیں۔

ہمارا ملک ایک جمہوری ملک ہے جس کے دستور کو قرآن وسنن نبوی کی روشنی میں مرتب کرنے کے وسائل کا جائزہ لیا جارہا ہے۔ ان حالات میں ہماری ذمہ داریاں اور بڑھ جاتی ہیں۔ جس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے انسانی زندگی کا تابع نظم وضبط ہونا ازبس ضروری ہے۔ وہ معاشرہ جس میں نظم وضبط فقدان ہو۔ زندگی کے سوز وساز سے یکسر خالی ہوتا ہے اور انتشار سماج کی یک جہتی کو کچھ اس طرح توڑ دیتا ہے کہ ہم زندگی سے بہت دور تخیل وتصور کی ایک موہوم دنیا میں قلابازیاں کھاتے رہتے ہیں اور بے کار محض ہو کر سماج کو تباہ کرنے کے درپے ہو جاتے ہیں۔ اس لیے تمدن کے اس بنیادی اصول سے اگر مدرسوں ہی میں اغماض برتا گیا تو قوم کی ترقیوں کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکتا۔

جمہوری نظام | کسی جمہوری نظام کی بنیادوں کو مضبوط اور استوار بنانے کے لیے اچھے کارکنوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیوں کہ یہی کارکن اپنے اشتراک عمل اور تعاون کا رسے اس جمہوری معاشرے کو ترقی دے سکتے ہیں، یہ ان کی اپنی ذمہ داری ہوتی ہے۔ اس لیے اگر یہی کارکن جو دراصل اس عمارت میں چونے گارے کا کام دیتے ہیں اس احساس سے خالی ہوں تو جمہوری اقدار حیات کی تربیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس معاشرے میں اگر ہمیں کچھ حقوق حاصل ہیں تو ہماری کچھ ذمہ داریاں بھی ہیں۔ اگر ہمیں آزادیِ فکر اور آزادیِ عمل حاصل ہے تو دوسروں کے احساسات کا احترام بھی ہمارا فرض ہے۔ ہمیں اس سے مفر نہیں۔ اور اگر ہم اس سے بیگانہ ہو کر محض اپنی ذات کو مقدم رکھنا ہی ہمارا شعار ہوگا تو ہم معاشری فلاح کو اپنے ذاتی مفاد پر کبھی ترجیح نہ دے سکیں گے۔ لیکن یہاں قومی اور اجتماعی مفاد کے پیش نظر ہمیں اپنی خواہشات کو قربان کرنا پڑتا ہے اور یہی ایثار یا قیود اور پابندیاں جو دراصل اجتماعی مفاد کے لیے ہم اپنی ذات پر خود عائد کرتے ہیں نظم وضبط کہلاتی ہیں

مفہوم | مدرسوں میں نظم وضبط کا مفہوم ہمیشہ بدلتا رہا۔ پرانے اور روایاتی مدارس میں آج بھی نظم وضبط سے مراد سکوت اور خاموشی ہوتی ہے جس میں طلبا کا مدرس کے سامنے دم بخود ہو کر بیٹھنا اور اس کے اشارۂ چشم وابرو کے مطابق ہی نقل وحرکت کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ ایک ایسے ماحول میں مدرس معلم نہیں، آمر کی حیثیت سے محض اپنے احکام کی پابندی کراتا رہتا ہے اور اسی پر سر

دھتکار رہتا ہے یہ ایک ظلم بے جا ہے کہ بچے کی ذاتی صلاحیتوں کو بالکل فراموش کر کے اسے ناکارہ بنا دیا جائے لیکن صدیوں سے ایسا ہی ہوتا آیا ہے اور مدرسین کا ایک بڑا طبقہ آج بھی اسی طریقے پر عمل کر رہا ہے۔ مگر کسی جمہوری نظام میں بچوں کی تخلیقی قوتوں کو اس طرح برباد کرنا فی الواقع اس قوم کی ہئیت ترکیبی کے اجزا کو منتشر کرنے کے مترادف ہے۔ اس میں قصور متعلم کا کم مدرس کا زیادہ ہے اور ایک ماہر تعلیم کے الفاظ میں "اے طبیب پہلے تو آپ اپنا علاج کرائیے دل و دماغ سے ان پردوں کو ہٹا دو جو تمہیں بچے کی شخصیت کی صحیح تشخیص سے دور رکھتے ہیں"

مدرس کی ایک تھوڑی سی غفلت سے بچے کی زندگی کے تباہ و برباد ہو جانے کا ہر وقت خطرہ رہتا ہے، مجھے خود اس قسم کے ایک ایسے واقعے کا علم ہے جس میں مدرس کے موہوم وقار کے بے جا تصور نے ایک بچے کو ایسا برباد کیا کہ وہ آگے چل کر نظم و ضبط سے گریزاں ہی نہیں ننگ معاشرہ بن گیا۔ حالاں کہ اگر مدرس ذرا محبت و خلوص اور ہمدردی سے کام لیتا تو جو برے نتائج اس ضمن میں پیدا ہوئے وہ یقیناً نہ ہوتے۔ اس کی تیزیٔ طبع کو مدرس نے اپنے مبلغ علم پر ڈاکہ سمجھا اس کے استفسارات کو اس نے بے ادبی پر محمول کیا۔ اس کے تبسم کو مدرس نے طنز و تشنیع گردانا۔ اس کی چمکتی ہوئی آنکھوں میں اس نے شرارت کی جھلک دیکھی۔ ان خیالات سے مدرس کا ذہنی توازن قائم نہ رہ سکا۔ اس نے بچے کو ڈانٹا۔ اسے برا بھلا کہا۔ اسے ایک ایک بات پر مطعون کیا۔ اس کی اچھی باتوں کو برا سمجھا۔ اور اگر یہ بات محض بات کی حد سے آگے نہ بڑھتی تو شاید نتائج اتنے خراب نہ ہوتے۔ لیکن تنبیہاً ایک دن اسے اتنا مارا گیا کہ اس نے اس برے سلوک کے خلاف آوازۂ احتجاج بلند کیا۔ یہ احتجاج اس کا دوسرا جرم تھا۔ اس سے اسے مزید جسمانی سزا ملی۔ اس سزا کا ردعمل یہ ہوا کہ اسے تعلیم سے، مدرس سے، اور مدرسے سے ایسی نفرت ہو گئی کہ اس نے مدرسہ جانا ہی چھوڑ دیا۔ اور سمجھانے بجھانے کے باوجود اس نے اپنے اسی فیصلے کو ناطق سمجھا۔ وہ مدرس آج بھی اسی جبر و تشدد کے ساتھ مصروف کار ہے۔ شاید بچوں کی زندگی کی اصلاح ہیں۔ لیکن غالباً اسے یہ احساس نہیں ہے کہ اس نے ایسی زندگی کو نذر حوادث کر دیا ہے، جو مستقبل میں ہمارے لیے زیادہ

مفید ثابت ہو سکتی ۔

عدم انتشار | بعض مدرسین کے نزدیک نظم و ضبط کا مفہوم عدم انتشار ہوتا ہے یعنی جماعت میں ایک ایسی فضا پیدا نہ ہونے پائے جو مدرسی نظام ہی کو درہم برہم کردے۔ نظم و ضبط کا یہ مفہوم نظری اعتبار سے تو درست ہے لیکن اس نظریے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے فکر و عمل کی وسعت کی ضرورت ہے۔ جماعت میں عدم انتشار سے بچنے کے لیے مدرس کی اپنی ذات ہی سب سے بڑی معین و مددگار ہوتی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ مدرس کس طرح اور کس عنوان سے اپنے اقتدار کو قائم کرتا ہے اور کس طرح جماعت میں اتنا نظم و ضبط پیدا کر لیتا ہے کہ بچے آمادۂ کار ہو جاتے ہیں۔ کیوں کہ بچہ طبعاً گریز پا ہوتا ہے۔ اگر اسے جماعت میں نظم و ضبط کے توڑنے کا موقع مل جائے تو وہ اس سے احتراز نہیں کرتا۔ بلکہ اس سے فائدہ اٹھا کر ایک شور ہائے ہُو برپا کر دیتا ہے۔ قطع نظر اس سے کہ اس کے نتائج کیا ہوں گے اچھے یا برے اس کے سوچنے کی اسے فرصت کہاں۔ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے اس کی ایک وجہ تو بچے کے کردار کی ناپختگی ہے اور دوسرے اس عمر میں وہ طبعاً فعّال ہوتا ہے اسے کچھ بولنے اور کچھ کرنے کے مواقع حاصل ہوں وہ زیادہ دیر تک کس بندھ کر نہیں بیٹھ سکتا۔ پچھلے دنوں وارو کشائر ٹیچرز ایسوسی ایشن (انگلستان) نے نظم و ضبط پر توسیعی تقریروں کا ایک سلسلہ شروع کیا جس میں مختلف اساتذہ نے حصہ لیا۔ ایک نشست میں الن ڈیل نے ایک تقریر کی۔ موضوع تقریر یہ تھا۔ "جماعت میں نظم و ضبط"۔ ڈیل خود مدرس ہے اس نے نظم و ضبط کے اس مفہوم کو اپنے تجربات کی روشنی میں کچھ اس طرح بیان کیا کہ اس سے لوگ بہت ہی زیادہ متاثر ہوئے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ میں کس طرح پڑھاتا ہوں کس طرح لڑکوں سے برتاؤ کرتا ہوں۔ طلبہ کا ردِ عمل کیا ہوتا ہے۔ اور مختلف حالات میں ان کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہوں اس کے خیال میں اچھے نظم و ضبط کے لیے مدرس کا اپنے اعمال و کردار میں متوازن اور مستقل رہنا ضروری ہے۔ طلبہ غلطیاں کر سکتے ہیں، بلکہ غلطیاں کرنا ان کا شعار ہے اور مدرس کا کام انہی غلطیوں کا درست کرنا اور ان خرابیوں کو دور کرنا ہے جو بچے میں پیدا ہو جاتی ہیں۔ بعض اوقات

اس کی کسی غلطی پر اسے ٹوک دینا اچھا ہوتا ہے اور بعض اوقات اس کی کسی حرکت پر جسے مدرس قبیح اور مذموم سمجھتا ہے آنکھیں بند کر لینا مناسب ہوتا ہے۔ اگر بچوں کو اس میانہ روی سے چلایا گیا تو وہ زندگی کی ماہیت کو سمجھنے میں صبر و ہمت سے کام لے کر اپنی زندگی کو ایک ایسے سانچے میں ڈھال سکیں گے جو انہیں منزل آشنا بنا سکے ورنہ ان کے بگڑ جانے کا امکان زیادہ قوی ہوتا ہے۔

اس سلسلے میں مجھے ایک متعلم کا ذاتی تجربہ ہے، یہ خود بہت ذہین اور تیز طرار ہے۔ لیکن کسی جگہ خاموشی اور سکون کے ساتھ بیٹھ کر کام کرنا اس کے بس کا روگ نہیں، میں دو ایک مرتبہ اس پر برہم بھی ہوا۔ اسے سمجھانے بجھانے کی کوشش بھی کی لیکن اس پر میری باتوں کا کوئی خوش گوار اثر نہ ہوا۔ اب مجھے یہ محسوس ہونے لگا کہ اسے تعلیم سے کوئی دلچسپی نہیں اور محض تفنن طبع کے لیے یہاں آتا ہے۔ میں نے اس پر مزید سختی کا فیصلہ کیا۔ لیکن کسی اقدام سے پہلے میں نے اس کی ایک ایک بات کا پھر تجزیہ کیا اور اپنے پچھلے فیصلے پر نظر ثانی کی، دو چار دن تک تو میں نے اس کی طرف کوئی خاص توجہ نہ دی، نہ اس سے تعرض کیا اور نہ اس سے کوئی سوال پوچھا نہ اسے برا بھلا کہا اور نہ اس کو تھپتھپانے کی کوشش کی وہ بھی جماعت میں دم بخود بیٹھا رہا اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یارائے گفتگو نہیں یا کچھ بولنا چاہتا ہے تو بولنے کو جی نہیں چاہتا۔ وہ نگاہیں اوپر اٹھاتا اور پھر خاموشی سے سر جھکا کر بیٹھ جاتا اس کی ذہنی کش مکش دو تین دن تک جاری رہی۔ لیکن میں ایسے بے پرواہ ہوا جیسے مجھے کچھ علم ہی نہ ہو۔ یہ متعلم ایک عمدہ کھلاڑی بھی ہے۔ اس کی اس ذہنی کش مکش کے ایام میں ایک روز دوران تدریس میں کھیل کا ذکر آیا تو میں نے اس سے دریافت کیا،، احمد تم نے کھیل میں کیا سیکھا،، میرے لہجے میں قدرے تلخی تھی، اس نے جواب دیا،، صبر،، اس کی نگاہیں نیچی تھیں اور اس کے بعد اس نے مزید کچھ نہ کہا۔ اس کے اس جواب سے میں بہت ہی متاثر ہوا۔ اسی دن چھٹی کے بعد میں نے اس سے علاحدہ بات چیت کی، وہ سہما سہما میرے پاس آیا دو چار باتوں ہی کے بعد اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے اور وہ کچھ نہ کہہ سکا میں نے اس کی ڈھارس بندھائی اور جب اسے یہ احساس ہو گیا کہ میرا مقصد اسے مزید سزا دینا نہیں بلکہ اس کی پریشانیوں میں اس کا ساتھ دینا ہے تو اس نے

ل کر اپنی دقتوں کو بیان کیا اور کہا، ہوں کہ جو کچھ آپ پڑھاتے ہیں بنیادی طور پر یہ چیز یں مجھے
ہیں آتیں اس لیے میں سبق میں اپنی دل چسپی کو قائم نہیں رکھ سکتا" میں نے اسے تسلی دی اور
سمجھایا کہ "یہ تو کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ تم بہت جلد اپنی دقت پر قابو پالو گے"۔ اور محض دو ماہ کی
معمولی سی ملاحظۂ تدریس سے احمد اپنے ساتھیوں کے برابر آگیا۔ اب وہ بالکل بدل گیا ہے شوخ و شنگ
ور ہے لیکن مودب اور سلیقہ شعار۔

مدریس | جماعت میں نظم و ضبط کا انحصار بالعموم اچھی تدریس پر ہوتا ہے۔ اگر مدرس سبق کو اس
ندا ز میں پیش کرتا ہے کہ اس میں طلبہ کی دل چسپیاں قائم رہتی ہیں ان کے ذوق معلومات کو
راک ملتی ہے تو ان کے متجسد ذہنوں میں خود ارتعاش پیدا ہوتا ہے اور وہ سبق کے ساتھ ساتھ
گے بڑھتے رہتے ہیں لیکن اس کے برعکس مدرس کا انداز بیان غیر دل چسپ، بھونڈا اور اس کی
ندگی سے غیر مربوط ہوگا تو مدرس کی کوشش کوہ کندن و کاہ برآوردن سے زیادہ وقیع نہ ہوں گی۔
رس کی تدریس ہی نظم و ضبط کی ضامن ہوتی ہے اور یہی نظم و ضبط ایک ایسی چیز ہے جس کی
مدرس کو اپنی جماعت میں ہر وقت ضرورت رہتی ہے، بلکہ یہی اس کی متاع اور اس کا سرمایہ
ہوتا ہے، اس کے مقصد کے حصول کے لیے مدرس کو جس تدریسی تکنیک کی ضرورت ہوتی ہے اس سے
ٹ کر جماعت میں مدرس کا کام یاب ہوجانا ممکن نہیں اور یہ تکنیک اچھی تدریس کے سوا اور کچھ
ی نہیں ہے۔ اس کے علاوہ جو کچھ بھی ہے اس کا براہ راست تعلق مدرس کی ذات اور اس کی
خصیت سے ہے۔ آیا وہ طلبہ کی زندگی میں حرارت اور سرگرمی عمل پیدا کر سکتا ہے یا نہیں۔ اگر وہ
نہیں متاثر کر سکتا ہے تو اس کی تکنیک کام یاب اور اگر اسے اس میں کام یابی نہیں ہوتی تو اس کی
ریس ناکامی یاد ورادکا ری ہوتی ہے۔

سپیرا اپنی بین بجا کر سانپ کو رام کرلیتا ہے۔ اس کی خوش آہنگ دھن سانپ کو مبہوت بنا دیتی
ہے، وہ جھومتا ہے، ناچتا ہے اور سپیرے کے قدموں پر لوٹنے لگتا ہے اور یہ انسان دشمن اپنی
طرت کو بھول کر سپیرے کے افسوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس بے خودی کے عالم میں سپیرا اس سے

وہ کچھ کام لیتا ہے جن کی عام حالات میں توقع نہیں ہوتی۔ مدرس کی حیثیت بعینہٖ اس سپیرے کی سی ہوتی ہے اس لیے اگر ایک زہریلا جانور جو انسانی فہم و فراست سے عاری ہے، انسان کی سحر آفریں تانوں سے متاثر ہو جاتا ہے تو پھر عقیل و فہیم بچوں کو اپنی تدریس سے متاثر کرنا اتنا مشکل نہیں ضرورت صرف بچوں کی فطرت، ان کی ذہنی سطح اور ان کے کردار و عمل کو سمجھنے کی ہے۔ اگر مدرس اس کوشش میں کامیاب ہو جاتا ہے تو اگلی منزلیں آسان سے آسان تر ہو جاتی ہیں۔

معاشرتی ضرورت | اپنی ایک تقریر میں ڈاکٹر الکرنڈر نے نظم و ضبط کے مفہوم کی وضاحت کرتے ہوئے یہ بیان کیا کہ نظم و ضبط کے مختلف پہلو مختلف انداز میں طلبہ اور مدرس کی زندگی پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں، اور اسے ہر شخص اپنے اپنے زاویۂ نگاہ سے اچھا یا برا سمجھ سکتا ہے یا بنا سکتا ہے۔ لیکن میرے خیال میں نظم و ضبط کا مفہوم صرف جماعت میں بچوں کو تدریس کے لیے خاموش رکھنا نہیں ہے، بلکہ یہ ایک "معاشرتی ضرورت ہے" اور معاشرے کو حق ہے کہ وہ ہم سے اس کی صحیح تربیت کا مطالبہ کرے۔"

نظم و ضبط فی الواقع ایک معاشرتی اور قومی ضرورت ہے۔ جمہوریت کی بقا کے لیے نظم و ضبط اور اصلاح حال کی اتنی ہی ضرورت ہوتی ہے جتنی ہمیں اپنی زندگی کی بقا کے لیے خوراک کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر انسان کو ایک دن خوراک نہ ملے تو موت و زیست کی کش مکش میں گرفتار ہو کر زندگی کی اعلیٰ اقدار کو کھو سکتا ہے۔ اس لیے طلبہ کو نظم و ضبط کا پابند بنا کر اصولی طور پر اس کی تربیت انہیں اس کی ذمہ داری کا احساس دلا سکتی ہے، ورنہ معاشرے کو اپنے ہر رکن سے جن اوصاف حمیدہ کی توقع ہے وہ ان میں ناپید ہوں گی، اور وہ معاشرے کے لیے ایک مصیبت بن جائیں گے، اس لیے تعلیم گاہوں کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے طلبہ کو زندگی کے اس پہلو سے بھی روشناس کریں۔ کیونکہ وہ دنیا جو مدرسے کی فضا سے دور شہر اور ہنگامہ آرا ماحول میں ہے اس سے بالکل مختلف ہے۔ اگر وہ آج ان ذمہ داریوں کو محسوس کر کے ان پابندیوں کو اپنی زندگی کا جزو نہیں بنائیں گے تو وہ اپنے سماج کی کوئی معتدبہ خدمت نہیں کر سکیں گے۔

نظم وضبط کا یہ مفہوم اور ذمہ داری کے احساس کا یہ نظریہ اہم بھی ہے اور وقیع بھی۔ اور اس کا ایک دلچسپ پہلو یہ ہے کہ ایک جدید جمہوریت کے لیے اس کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے ہمارے ملک میں ابھی صحیح جمہوری فضا قائم نہیں ہو سکی اور اس کے لیے ابھی ایک طویل مدت درکار ہے۔ اس لیے ایک جمہوری نظام کو صحیح خطوط پر چلانے کی خاطر نظم وضبط کی ضرورت اور شدید ہو جاتی ہے اور اس کے ایک ایک فرد کا اجتماعی فلاح کے پیش نظر اپنی ذات کو رضاکارانہ طور پر نظم وضبط کا خوگر بنانا ضروری ہے۔ ہمارا ایک غلط اقدام۔ ہماری ایک قانون شکنی ہمیں برسوں پیچھے ہٹا سکتی ہے اور زمانہ اس تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہا ہے کہ ہم اس کا اس وقت ساتھ دے سکیں گے جب اجتماعی مفاد کے پیش نظر ہم اپنی ذات اور اپنے مفاد کو قربان کر سکیں گے ورنہ ہماری ایک لغزش ہمیں منزل سے بہت دور کر دے گی۔

یہی وہ نظم وضبط ہے جو مدرسے کی فضا سے دور جماعتوں کو اکثریت کے فیصلے کا تابع بناتا ہے یا ورنہ یہ ملک کسی وقت بھی نذر انتشار ہو سکتا ہے۔ جمہوریت کی بقا کے لیے عوام کا پڑھا لکھا اور تربیت یافتہ ہونا بہت ضروری ہے تعلیم کا فقدان کسی وقت بھی سیاسی اور سماجی بدنظمی کا پیش خیمہ بن سکتا ہے کیا جمہوریت کے ان ابتدائی ایام میں ہم کسی ایسے خطرے کو برداشت کر سکتے ہیں؟

شہریت | جمہوریت کی بقا کے لیے معاشرتی تنظیم بھی بہت اہم ہوتی ہے، ورنہ دوسروں کی خدمت کا جذبہ، عوامی مفاد کا احساس کب اور کیسے پیدا ہوگا۔ اگر ہر شخص اپنی باتوں کو دوسروں پر مسلط کرنے کی فکر کرے گا تو نظم وضبط اور تربیت و تنظیم کی جملہ خوبیاں ختم ہو جائیں گی، اس لیے بنیادی طور پر معاشرہ کے ہر رکن کے لیے شہریت کی تعلیم و تربیت لازمی بلکہ ناگزیر ہو جاتی ہے۔ معاشرے میں دوسروں کے احساسات کا احترام ہی ہمیں حقائق آشنا بنا سکتا ہے۔

ڈاکٹر الکو نذر نے اپنی تقریر میں ان خطرات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جو آج جمہوریت کو لاحق ہیں۔ اگر معاشرے کا ایک ایک فرد اپنے نمائندوں کے وضع کردہ قوانین کا احترام نہیں کرتا یا فکری اور نظری اعتبار سے وہ ان سے اختلاف رکھتا ہے اور اس کے خلاف احتجاج کرے، جائز نہیں بلکہ

یسے طریقے اختیار کرتا ہے جس سے قوم کی صریحی تخریب ہوتی ہے۔ لیکن اگر مدرسے کی فضا میں ایک ایسا احول پیدا کر دیا جائے جس میں بچے بجائے خود دلچسپی لیں، اپنے بھلے برے کو جانچیں اور پھر اپنی زندگی کو اس ڈگر پر ڈالنے کی کوشش کریں جو ان میں خود اعتمادی اور احساس کار پیدا کر سکے تو یہی زندگی قابل رشک بن جائے اور مدرسہ اس انتشار میں امن و اصلاح کی ایک ایسی فضا پیدا کر سکتا ہے جو معاشری استحکام کی ضامن ہو سکتی ہے، دراصل ان کے ہاتھ میں تلوار ہے جس سے وہ قوم و ملت کی عظمت کر سکتے ہیں۔ ہر بلا اور ہر مصیبت کا مقابلہ کر کے وہ خون آشام گروہوں سے اپنی سلامت طبع اور ذہنی بلندی کا اعتراف کرا سکتے ہیں۔ اس تلوار کی باڑھ جوہر اور اسی قسم کے دوسرے تباہ کن اسلحہ سے کہیں زیادہ شدید اور نتیجہ خیز ہو سکتی ہے۔

کیا جمہوریت بیمار ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا جمہوریت واقعی بیمار ہے۔ آیا اس کے دکھوں کا علاج نظم و ضبط کی یہی پابندی ہے اور کیا مدرسے اس اہم معاشری ضرورت کو پورا کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں، اس کا جواب ہمیں اس جماعتی نظم و ضبط میں مل سکتا ہے جو ہر اچھے مدرسے کا خاصہ ہے۔

جو تبدیلیاں اس وقت مدرسوں میں رونما ہو رہی ہیں یا نظم و ضبط کو جس عنوان سے ان مدرسوں میں جاری کیا جا رہا ہے، یہ بھی دراصل دور جدید کے رجحانات فکر کی ترجمانی ہے، معاشرے کو اس کی ضرورت تھی۔ افراد اس کے آرزومند تھے، جمہوریت اس کی متقضی تھی، دو عالمگیر لڑائیاں ہمارے نظام خیال میں بنیادی تبدیلیاں پیدا کر چکی ہیں، اس لیے اگر اس وقت مدرسے میں نظم و ضبط کے پرانے نظریات کو بروئے کار لانے کی کوشش بھی کی جائے تو یہ کوشش بے معنی اور ناممکن العمل ہوگی۔ گھریلو زندگی اور معاشرہ اور ان کے تمام مظاہر اس کے خلاف ہوں گے، بلکہ پرانے ساز و مینا لے کر محفل آرائی کا خیال بہت ہی مضحکہ خیز ہوگا۔ البتہ یہ درست ہے کہ مدرسہ مروجہ طرق فکر اور زندگی کے آداب و اطوار میں ایک نمایاں تغیر پیدا کر سکتا ہے، وہ اسے بہت آگے لے جا سکتا ہے۔ ہماری توقعات سے بھی آگے۔ کیوں کہ اگر بچہ مدرسے میں اپنی حدود سے متجاوز نہیں کرتا تو وہ اپنی سماجی زندگی میں بھی ایک اچھے کردار اور ایک اچھے نظم و ضبط کا نمونہ پیش کر سکے گا۔ یہ صحیح نظم و ضبط کسی کو سکھایا

نہیں جا سکتا، اس کا دھارا تو دراصل بچے کے اپنے اطمینان سے پھوٹتا ہے، وہ کس طرح اپنے اقدارِ حیات کو اپناتا ہے کس طرح ان کا اظہار کرتا ہے کس طرح اور کیسے معاشرے میں اپنے لیے مقام پیدا کرتا ہے۔ یہ وہ باتیں ہیں جو ایک بچے کی زندگی کو بہتر بنا سکتی ہیں اور یہی کلیات معاشرے پر بھی پوری طرح منطبق ہوتے ہیں۔ اگر معاشرہ بھی اپنے ہر رکن کے لیے ایسے ہی حالات پیدا کر دے جو ایک اچھے مدرسے میں بچوں کو میسر آتے ہیں تو یقیناً ہماری بہت سی دشواریاں آپ سے آپ حل ہو جائیں۔

لیکن ہمارے موجودہ ماحول میں اس قسم کے حالات نہ تو مدرسے میں پیدا کیے جا سکتے ہیں اور نہ معاشرے میں ایسی فکری عادات کی طرح ڈالی جا سکتی ہے جو اس کے ایک ایک فرد کو عملاً اور قولاً ایک حساس انسان بنا دیں، آخر ان مناسب اور جائز حد بندیوں کو توڑ کر ہی کون سی معاشرتی یا اخلاقی فلاح ممکن ہے؟ جمہوری نظام ہمارے لیے ایک تجربہ ہے ایک ایسا تجربہ جس میں ہم کامیاب بھی ہو سکتے ہیں اور ناکام یاب بھی، یہ ہمارے لیے مفید بھی ہو سکتا ہے اور غیر مفید بھی، اس لیے جمہوریت کو ایک ادارۂ فکر کی حیثیت ہی سے نہیں بلکہ اسے ایک عملی جولان گاہ بنا کر ہمارا کام زندگی کے نشیب و فراز اخلاق و کردار اور جہد و عمل کے صحیح خد و خال کو اجاگر کرنا ہے اور اس فکری بلندی اور اس ذہنی پرواز کے لیے نظم و ضبط کی پابندیوں کی ہر وقت ضرورت ہوتی ہے۔ ورنہ بقول گارڈنر ہماری مثال اس روسی عمر رسیدہ عورت کی ہو گی جو حصولِ آزادی کے بعد ماسکو کی ایک معروف شاہراہ میں کبھی اس طرف اور کبھی بیچ سڑک میں پھرتی رہی۔ اس سے لوگوں کی آمد و رفت اور ٹریفک میں بڑی دشواریاں پیش آنے لگیں، جب لوگوں نے اس کی اس ناعاقبت اندیشانہ حرکت کی طرف اس کی توجہ دلائی تو اس نے تلملا کر جواب دیا کہ ملک آزاد ہو چکا ہے۔ اب مجھے کوئی اس حق سے محروم نہیں کر سکتا۔ میں سڑک پر جس طرح چاہوں چلوں گی تم منع کرنے والے کون ہوتے ہو؟" لیکن اسے شاید یہ معلوم نہ تھا کہ وہ جسے آزادی کا نام دے رہی ہے، دراصل سماجی انتشار ہے اور اس کے اس اقدام نے کتنوں کو مصیبت میں مبتلا کر دیا ہے ✣

اُسوۂ معلّم

عبدالرشید علوی

ہنری شینڈل نے اپنے جلیل القدر استاد اور اس کے طریق تدریس کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس کا مطالعہ فائدے اور دلچسپی سے خالی نہ ہوگا ۔ فاضل مصنف رقم طراز ہے :

ہائی اسکول کے آخری درجہ میں انگریزی کی نئی جماعت مجھے اچھی طرح یاد ہے ۔ ہم سب لڑکے ایک ناقابل بیان اشتیاق دل میں لیے نئے استاد کی آمد کے منتظر تھے ۔ زیادہ دیر نہ گذری کہ تقریباً چالیس برس کا ایک لمبا بے رعب سا آدمی دروازے سے داخل ہوا ۔ اس نے شرماتے ہوئے سلام کیا ۔

"آداب عرض حضرات !"

نئے ماسٹر صاحب کی آواز اور لہجے میں اس قدر احترام تھا گویا وہ چند چھوکروں کو نہیں ، بلکہ عدالت عالیہ کو خطاب کر رہے ہوں ۔ انہوں نے تختہ سیاہ پر اپنا نام لکھا — ولمر ۔ ٹی ۔ سٹون ۔ پھر اپنی میز پر سامنے کی طرف بیٹھ گئے ۔ اپنی لمبی ٹانگ پھیلا دی ۔ ایک ہاتھ گھٹنے پر رکھ لیا اور کہنے لگے :

"حضرات ! اب ہم ان چھ مہینوں میں اکٹھے رہیں گے ، انگریزی پڑھنے کے لیے ۔ یہ آپ کی آخری ششماہی ہے ۔ میں سمجھتا ہوں یہ پڑھنے پڑھانے کا سلسلہ خاصا پر لطف رہے گا ۔ صحافت کے متعلق بھی ہم کچھ سیکھیں گے اور آپ کے اسکول کے ہفتہ وار رسالے کے لیے بھی کچھ نہ کچھ سر و سامان کرتے رہیں گے ۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ہم بہترین ادب سے روشناس ہونے کی کوشش کریں گے ۔ ہو سکتا ہے کہ ہم میں سے بعض واقعی لکھنے پڑھنے میں گہری دلچسپی لینا شروع کر دیں ۔ ایسے افراد کے متعلق میں وثوق سے کہہ سکوں گا کہ وہ ایسی شاندار ، پر عظمت اور باوقار زندگی بسر کریں گے جو اور کسی طرح حاصل نہیں ہو سکتی . . . . "

اسی طرح بے تکلفی سے وہ بولتے گئے ۔ ان کا انداز کلام نہایت دلکش ، پسندیدہ ، اور دعوت نامہ تھا

میرے دل میں ایک عجیب قسم کا ولولہ اور جوش پیدا ہو گیا۔ اس شخص کی گرم جوشی ہی کے دوران میں ایسی ہی گرم جوشی ہم سب میں سرایت کر گئی۔ مثال کے طور پر جب انہوں نے کیٹس کی ایک نظم پڑھی تو مزے لے لے کر کہنے لگے: "میں نہیں سمجھتا کہ ہم اس کو بہتر اسلوب میں پیش کر سکیں۔ آؤ تو ذرا دیکھیں ۔۔۔"

بس پھر کیا تھا، ہم سب طبع آزمائی کے لیے لنگر لنگوٹے کس کر میدان میں نکل آئے۔ ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر فکر و خیال کی جولانیاں دکھانے لگے، آخر کار اس ہنگامہ خیز مظاہرے کا طوفان تھم گیا تو ہم نے محسوس کر لیا کہ فی الحقیقت اس سے بہتر اسلوب اور کوئی نہیں۔ ایسے ہی دل چسپ طریقوں سے کام لے کر انہوں نے ہمارے دل میں زبان و ادب کے حسن و کمال کو سمجھنے کا صحیح ذوق پیدا کر دیا جماعت میں نشست و برخاست کے بہر حال کچھ نہ کچھ قاعدے اور ضابطے تو ہوتے ہی ہیں۔ لیکن اس شریف انسان نے کبھی بھول کر بھی ہمیں نہیں ٹوکا، حقیقت یہ ہے کہ وہ ہمارے ساتھ انتہائی شرافت اور اخلاق سے پیش آتے تھے۔ انہیں شکایت کا موقع دینا طبیعت کو سخت ناگوار ہوتا، اس کے علاوہ وہ ہمیں "حضرات" کے معزز القاب سے نوازتے تھے، اس لیے بھی ان کے سامنے لڑکپن کا مظاہرہ ہمارے لیے زیبا نہ تھا، سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کی باتیں ہی اتنی دل چسپ اور سحر کن ہوتی تھیں کہ ہم انہیں سننے کے لیے اکثر بے تاب رہا کرتے تھے۔ ایسے حول میں جاتیں اور شرارتیں کیسے سوجھتیں اور کیوں کر ہم ایک دوسرے سے تبادلۂ خیال کرتے۔ ہر شخص اپنے زاویۂ نگاہ اور اپنا نظریہ پیش کر دیتا۔ ہم اپنے سبق سے اتنی گہری دل چسپی لیتے جتنی کہ ایک بچہ نئے کھلونے سے۔ کہ بڑے شوق سے وہ اسے اپنے ہاتھوں میں اٹھا لیتا ہے پھر کبھی اس کو نیچے سے دیکھتا ہے کبھی اس کی ساخت پر غور کرتا ہے اور سوچتا رہتا ہے کہ یہ آخر چلتا کس طرح ہے۔

ہمارے یہ جلیل القدر استاد فرمایا کرتے تھے "مجھ سے اختلاف ظاہر کرنے میں گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں، کیوں کہ فی الحقیقت یہ اس امر کی دلیل ہے کہ آپ میں خود سوچنے کی صلاحیت پیدا ہو گئی ہے اور یہی اصل مقصد ہے جس کی خاطر آپ یہاں آتے ہیں"۔ ان باتوں نے ہم میں ایک گونہ خود اعتمادی کا جوہر پیدا کر دیا، اس سے ہمارے حوصلے اس قدر بڑھے کہ دل میں فیصلہ کر لیا کہ ماسٹر صاحب کے ناظمین کو

حق بجانب ثابت کریں گے اور واقعی ہم نے کر دکھایا۔

سٹون صاحب کو ناقص بیان اور خام تحریر سے سخت نفرت تھی، مجھے خوب یاد ہے کہ ایک دفعہ میں نے لکھا تھا AT THE TENDER AGE OF 17, HE" اسے دیکھ کر وہ تیزی سے بولے "اس میں کوئی شک نہیں اٹینڈر ایج کسی زمانے میں بڑی عمدہ ترکیب سمجھی جاتی تھی اور شروع شروع میں خاص مقبول بھی ہوئی لیکن اب تو یہ گھس پس کر پرانی جراب کی طرح فرسودہ ہو چکی ہے۔ کوئی نئی ترکیب سوچئے خود اپنے ذہن سے!"

سٹون صاحب نے ہمیں وہ گراں بہا گنجینہ عنایت فرمایا جو ایک بہترین استاد ہی عطا کر سکتا ہے، یعنی علم حاصل کرنے کا سچا جذبہ! ان کا ایک انوکھا دستور یہ بھی تھا کہ کسی افسانے کا حصہ، ایک ادبی کردار یا غیر معمولی تخیل ایسے دل فریب انداز میں ہمارے سامنے پیش کرتے کہ ہم مزید جاننے کے لیے بے تاب ہو جاتے، پھر وہ کہتے: "میرا خیال ہے کہ آپ نے فلاں کتاب تو دیکھی ہو گی" جب ہم نفی میں سر ہلا دیتے تو وہ تختہ سیاہ پر کتاب کا نام لکھ دیتے پھر ہم سے خطاب کرتے۔ اس طرح چند اور کتابیں ہیں جنہیں ایک بار پڑھ کر دوبارہ پڑھنے کی حسرت ہی رہ گئی —— مسرتوں کے کئی دروازے میرے لیے اب بند ہو چکے ہیں، لیکن آپ کے لیے وہ سب کھلے ہوئے ہیں۔"

وہ محدود نصاب سے باہر وسیع ترین مطالعہ کے حامی تھے۔ ایک دفعہ انہوں نے فرمایا۔ "اگر میں اپنی ساری نصیحتوں کو صرف ایک لفظ میں سمیٹ دینا چاہوں تو وہ لفظ ہو گا پڑھو، آپ کسی بھی لائبریری میں چلے جائیں۔ ہر زمانے اور ہر قوم کے بہترین خیالات و افکار، محسوسات و اقوال، نشریات و نگارشات۔ وہاں آپ کی راہ دیکھ رہی ہوں گی، آپ انہیں دیکھیں پرکھیں۔ بہت سی کتابوں کی ورق گردانی کریں۔ ہر ایک کتاب میں سے کچھ نہ کچھ ضرور دیکھیں، اسی طرح متعدد اور کثیر کتابوں پر نظر ڈال جائیں پھر جو کتابیں آپ کے مقاصد سے ہم آہنگ نظر آئیں، اور آپ کے ذوق کی تسکین کا سامان فراہم کر سکیں انہیں گھر لے جا کر بغور پڑھیں"

سلسلۂ بیان کو جاری رکھتے ہوئے انہوں نے دریافت کیا۔ "کبھی آپ نے یہ بھی سوچا ہے

کس صدی یا کس ملک میں لوگ کس طرح زندگی بسر کرتے تھے، ذرا فرانس کی حالت پر غور کیجیے اور انقلاب فرانس کے پر آشوب دور کا تصور کیجیے۔ آپ کیا دیکھیں گے؟ ——— وہ ایک لمحہ کے لیے رک گئے پھر تختہ سیاہ پر لکھا:

TALE OF TWO CITIES —— DICKENS (دو شہروں کی داستان۔ ڈکنز)

اب چودھویں صدی کی ہولناک جنگوں کا نقشہ سامنے لائیے۔ اگر ان لڑائیوں میں آپ کو حصہ لینا پڑے تو آپ کا کیا حال ہوگا؟ —— پھر انہوں نے آہستہ سے جا کر لکھا:

THE WHITE COMPANY DOYLE (اجتماع ابیض — ڈویل)

یا سلطنت روما کی سحر آفرینیوں میں آپ کھو جائیں؟

BEN HUR — WALLACE (ابنِ حُر — ویلیس)

پھر انہوں نے چاک رکھ دیا — "ایک آدمی جو بہت پڑھتا ہے وہ بہت سی زندگیاں بسر کرتا ہے اور جو نہیں پڑھتا وہ اس زمین پر سے اندھوں کی طرح گذر جاتا ہے"۔ ہماری جماعت کی مقررہ میعاد بہت جلد ختم ہو گئی ——

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد
روئے گل سیر نہ دیدیم و بہار آخر شد

اسکول سے رخصت ہونے سے ایک دن پیشتر صبح کو ہماری جماعت نے دفعتہً یہ متفقہ فیصلہ کر لیا کہ جناب سٹون صاحب سے باضابطہ رخصت ہونے کے لیے شام کو بزم ادب کا الوداعی اجلاس منعقد کر لیا جائے۔ اس تقریب کے لیے الوداع والفراق پر چند نظمیں اور گانے بھی تیار کر لیے گئے برقی شام نے "الوداع" کے عنوان سے شعر بافی شروع کی۔ بڑی دماغ سوزی اور عرق ریزی کے بعد ہم میں سے ہر ایک نے ایک آدھ مصرعہ کہہ کہا کر جوں توں کر کے اس نظم کا ناک نقشہ درست کیا پھر ہر ب گالے کو مضحک تنظیم (پیروڈی) کی سوجھی۔ گلبرٹ اینڈ سیلوان کی مشہور نظم ہے:

بیچارہ سپاہی نہیں خوش نصیب

(A POLICEMAN'S LOT IS NOT A HAPPY ONE)

ہم نے اس کو بے ادبی! تعرف اس طرح لکھ دیا ولمز بیچارہ نہیں خوش نصیب!

POOR WILMER'S LOT IS NOT A HAPPY ONE

جب ہم اس قسم کے اشعار آبدار مکمل کر چکے تو لاری ہنڈ نے اپنی انگلی لا لا کر اتی ہوئی تو مشق آدھ سے اسے گانا شروع کیا۔ اور ہم سب خوشی سے لوٹ پوٹ ہو گئے۔

اسی شام کو جب سٹون صاحب کمرہ نمبر ۳۱۸ میں آہستگی سے داخل ہوئے تو ہم نے انہیں پہلی قطار میں بٹھایا ۔۔۔ کیا آپ کو وہ پرانی طرز کی اسکول کی ڈسکیں یاد ہیں جن کی تنگ نشستوں پر ایک سمت سے بڑی مشکل سے گھسنا پڑتا تھا۔ اس کے آگے ایک ذرا ڈھلوان سی میز ہوتی تھی۔

طویل القامت سٹون صاحب پھنس کر بیٹھ گئے اور انہوں نے اپنی لمبی ٹانگیں سامنے پھیلا دیں۔ اس طرح وہ بزم کی کارروائی دیکھنے لگے۔

ہم میں سے ایک لڑکا جو ماسٹر صاحب کی کرسی پر ڈٹا ہوا تھا اس نے رٹی ہوئی تقریر بے تحاشا اگلنی شروع کی۔ باقی سب اس نئے گرد سن تھے۔ سٹون صاحب مضبوطی سے ہونٹ بھینچ کر بیٹھے ہوئے تھے۔ جب کارروائی اختتام کے قریب پہونچی تو انہوں نے آہستہ آہستہ پہلے دائیں طرف پھر بائیں طرف ہم میں سے ہر ایک کے چہرے کو بڑے غور سے اس طرح گھورنا شروع کیا جیسے وہ ہماری شکلیں اپنے قلب پر مرتسم کر لینا چاہتے ہوں۔

جب ہم مضحک تنظیم کے آخری مصرعے پر پہونچے تو ہم نے دیکھا کہ سٹون صاحب کے رخساروں کی ابھری ہوئی ہڈیوں پر جوئے اشک رواں ہے۔ انہوں نے اس کو صاف کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ ایک دو بار صرف آنکھیں ہی زور سے جھپک لیں۔ ہم تیز تر گانے لگے۔ تاکہ ایسا معلوم ہو گویا ہم نے کچھ دیکھا ہی نہیں۔ جب ہم کارروائی ختم کرنے لگے تو ہر ایک کے گلے میں ایک گولہ سا اٹک گیا جس کی وجہ سے گانا مشکل ہو گیا۔

سٹون صاحب اٹھ کھڑے ہوئے انہوں نے رومال نکالا اور اپنی ناک صاف کی پھر

منہ پوچھا، "لڑکو"، انہوں نے نہایت شفقت اور پیار سے کہنا شروع کیا اور ہم میں سے کسی نے اس کا خیال بھی نہیں کیا کہ اب وہ ہمیں حضرات نہیں کہہ رہے تھے۔ "ہم اہل امریکہ جذبات کے اظہار پر کچھ زیادہ قادر نہیں ہیں۔ لیکن میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ آپ نے مجھے ایک ایسی چیز دی ہے جسے میں کبھی فراموش نہیں کرسکتا"۔ ہم چپ چاپ ہمہ تن گوش ہوکر سن رہے تھے اور انہوں نے سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے ایک حقیقی و فطری استاد کی سی نرم، دل نشیں انداز میں کہنا شروع کیا۔

وہ اسرار حیات میں سے ایک اہم راز ہے۔ یعنی "دنیا" غالباً اس نصیحت کے ساتھ آپ کو رخصت کرنا زیادہ مناسب ہوگا کہ ہم حقیقی مسرت اس وقت محسوس کر سکتے ہیں جب ہم کچھ عطا کرتے ہیں کچھ دیتے ہیں، جن عظیم الشان مصنفین کا ہم مطالعہ کرتے رہے ہیں وہ اس لیے عظیم الشان ہوئے کیونکہ انہوں نے دیانت داری کے ساتھ اپنے آپ کو مکمل طور پر دے ڈالا تھا۔ ہم اتنے ہی بڑے یا چھوٹے ہیں جتنا کہ ہم دوسروں کی دست گیری کے لیے تیار رہتے ہیں"۔

تقریر ختم کرکے انہوں نے ہم میں سے ہر ایک کے ساتھ مصافحہ کیا ان کے آخری الفاظ یہ تھے "بعض اوقات میں محسوس کرتا ہوں کہ تعلیم و تدریس کے ذریعے روزی کمانے کا طریقہ نہایت ہی اندوہناک اور صبر آزما ہے"۔ پھر انہوں نے لڑکوں کی قطار پر نگاہ ڈالی جو انہیں بے حد احترام کی نظروں سے دیکھ رہے تھے اور انہوں نے ایک دل ربا تبسم کے ساتھ فیصلہ کن انداز میں ارشاد فرمایا:۔

"لیکن ان سب مشکلات کے باوجود میں اس پیشہ کو نہیں چھوڑوں گا۔ خواہ کچھ بھی ہو"۔

میں جانتا ہوں کہ دلمر سٹون کی ناقابل فراموش یاد ہم سب کے دلوں میں اب تک تازہ ہے اور ہمیشہ تازہ رہے گی۔ کمرہ ۲۱۸ کی ڈیسکوں پر سے جس نے بھی اس شفیق مخلص اور لائق استاد کو ایک مرتبہ دیکھ لیا وہ ساری عمر اس کو نہیں بھلا سکا۔ یہ ہمارے اسکول کی مسلمہ روایات میں سے ہے۔

ہم کیا کر سکتے ہیں؟

نذیر احمد

تربیتی درس گاہوں میں استادوں کو ان کے مقام کی اہمیت اور مواقع کار کے متعلق بہت کچھ بتایا جاتا ہے۔ تربیت ختم ہو جانے پر جب یہ لوگ مدرسے کی عملی دنیا میں قدم رکھتے ہیں تو حالات کو کئی ایک اہم تعلیمی اصولوں کے لیے ناساز گار پاتے ہیں۔ اس سے بعض کے دلوں میں یہ خیال پیدا ہونے لگتا ہے کہ یہ اصول صرف فنی کتابوں کی زینت ہی بن سکتے ہیں عملی دنیا میں ان کا کوئی کام نہیں۔ اس خیال کو پرانے اور ریٹائر رفقائے کار کی طرف سے بھی سہارا ملتا ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نوجوان اساتذہ میں سے کئی ایک تعلیم و تدریس کے سائنسی اصولوں ہی پر بھروسہ کھونے لگتے ہیں، اس کے ساتھ ہی ساتھ اہمیت نفس کا احساس گھٹنے لگتا ہے، اور نوجوان استاد ایک ایسے راستے پر چلنے لگتے ہیں جو نیچے ہی نیچے اترتا چلا جاتا ہے۔

نوجوان استادوں کو یہ نکتہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ ترقی اور پیش قدمی کا سارا مدار اس بات پر ہے کہ ہماری قوت یقین کتنی مضبوط ہے۔ آج سے کچھ سال پہلے پاکستان کا تصور مجذوب کی ایک بڑ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا تھا تقسیم ملک سے صرف کچھ مہینے پہلے قائد اعظم علیہ الرحمت نے تبادلہ آبادی کا ذکر کیا تو پنجاب کے انگریز گورنر نے اس خیال کو لغو قرار دیا۔ لیکن چند لوگوں کو ان ناممکن اور لغو چیزوں کے ممکن العمل اور معقول ہونے کا پورا یقین تھا۔ یہ انہی لوگوں کے یقین کا صدقہ تھا کہ پاکستان قائم ہوا۔ یہی حال سائنس اور ٹکنالوجی کی محیر العقول ایجادوں کا ہے۔ آج دنیا کو ان ایجادوں کے طفیل بڑی بڑی آسائشیں حاصل ہیں لیکن زیادہ دیر کی بات نہیں جب سائنس اور ٹکنالوجی کے ان کرشموں کو ناممکن خیال کیا جاتا تھا، اچھے پڑھے لکھے اور فہمیدہ لوگ ان چیزوں کو ان ہونی سمجھتے تھے لیکن وہ کون سی قوت تھی جس نے انہیں ممکن بنا دیا؟ وہ قوت اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ گنتی کے چند لوگوں کو

ں ناممکن چیزوں کے ممکن ہونے کا یقین تھا، وہ اس دھن میں لگے رہے اور آخر اپنی دھن میں
م یاب ہو گئے۔

آج اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ پاکستان کے نوجوان اساتذہ یہی اختراعی۔ تجرباتی
رغیر متزلزل طریق کار اختیار کریں۔ بلند مقاصد تک پہونچنے کے لیے اس کے سوا اور کوئی راہ
ہیں۔ وہ ایک ایسے وقت میں تعلیمی خدمت انجام دے رہے ہیں جب ملک اپنے تعلیمی اداروں
بہتر بنانے کے لیے کوشش کر رہا ہے۔ آج ہماری سب سے بڑی ضرورت زندگی کے ہر شعبہ میں پہلے سے
دہ فہمیدہ رہنمائی ہے۔ یہ ضرورت جن لوگوں کے ہاتھوں پوری ہوگی وہ مدرسوں میں تیار ہوں گے۔
ان استاد اس ضرورت کو اچھی طرح پورا کرنے میں بہت کچھ کر سکتے ہیں۔

گوناموافق ضرورت مواقع پیدا کرتی ہے، جہاں ضرورت موجود ہوگی وہاں مواقع بھی ہوں گے
شخص کو کچھ کرنے اور دلی سکون حاصل کرنے کی تمنا ہو اسے چاہیے کہ کوئی ضرورت تلاش کرے
اپنی زندگی اس کے لیے وقف کر دے، قوت فکر ہی انسان کو حیوان سے بلند کرتی ہے، قوت فکر کی
بی اور پائداری ہی انسانیت کا حقیقی معیار ہے، چوں کہ قوت فکر استاد کے ہاتھوں تربیت پاتی ہے
لیے تدریس وہ بلند ترین کام ہے جو ذہن انسانی کے تصور میں آ سکتا ہے، یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ
ہمارے ملک کی منہ بولتی ضرورت ہے۔ حکومت اور عوام تعلیمی سہولتیں بڑھانے کا سامان کر سکتے
لیکن ان روز افزوں سہولتوں سے پسندیدہ فکری صلاحیتیں پیدا کرنا استادوں کا کام ہے۔
یہ اہم کام تین طرح سے انجام دے سکتے ہیں۔

لف) طالب علموں کو انفرادی توجہ دے کر پڑھانا۔ تدریس کا نفس مضمون اور طریقۂ تدریس۔ وقت
، اور حالات کے لحاظ سے مختلف ہوں گے۔ لیکن تدریس کی بہترین کامیابی کے لیے اس میں دو
کا ہونا ضروری ہے، اول یہ کہ مدرس کو شاگردوں کے ساتھ دلی لگاؤ ہو، دوسرا یہ کہ وہ ان میں
نفس اور کسی مقصد کا احساس پیدا کر دے۔ جوں ہی کوئی طالب علم ایک بلند افق کو دیکھنے کے
ہو جائے گا اور وہ اپنی نشوونما کی ذمہ داری خود سنبھالنے کا عزم کرے گا، اس کی تعلیم زیادہ

تعلیم کی صورت اختیار کرتی جائے گی اور وہ اپنی خداداد استعدادوں سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کے قابل ہو جائے گا۔ کام کرنے کا یہ موقع اس قدر واضح ہے اور اس پر اساتذہ کی تربیت گاہوں میں اتنا زور دیا جاتا ہے کہ اس کے متعلق کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ تربیتی درس گاہوں کا پورا مقصد ہی یہ ہے کہ آئندہ بننے والے استادوں کو اس موقع پر خدمت سے آگاہ کریں اور انہیں اس موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کے قابل بنائیں۔

(ب) ہمارے اکثر استاد یہ خیال کرتے ہیں کہ استاد کے کام کے متعلق اوپر جو کچھ کہا گیا ہے وہ ان کی ذمہ داری کی آخری حد ہے، اس کے سوا ان کے لیے کام کرنے کا اور کوئی موقع نہیں۔ وہ مدرسے کو ایک ایسی دنیا سمجھتے ہیں جس کا بیرونی دنیا سے کوئی براہ راست تعلق نہیں۔ جدید تعلیم اس خیال کو درست نہیں سمجھتی۔ مدرسہ معاشرے کا ایک جزو لاینفک ہے، اسے اس کی ضرورتوں سے غافل نہیں رہنا چاہیے۔ اس نظریے کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ استاد کو دوسرے شہریوں کے ساتھ مل کر مدرسے اور مقامی معاشرے کی بہبود اور اصلاح کے لیے کام کرنا چاہیے۔ جدید معاشی اور ٹکنولوجیکل قوتیں جوں جوں معاشرتی زندگی کو زیادہ پیچیدہ بناتی جاتی ہیں اتنا ہی کام کرنے کا یہ میدان وسیع ہوتا جا رہا ہے۔ آزادی کے بعد ملک کی معاشی اور معاشرتی زندگی میں دوررس تبدیلیاں شروع ہو چکی ہیں۔ بعض لوگ ان تبدیلیوں پر کف افسوس ملتے نظر آتے ہیں۔ عوام کو یہ سمجھانا کہ یہ تبدیلیاں ناگزیر ہیں اور ان کی مدد سے معاشرتی زندگی کو پہلے سے زیادہ دل کش بنایا جا سکتا ہے، آج ایک بڑی ضرورت ہے۔ استاد اس ضرورت کے پورا کرنے میں بہت کام کر سکتا ہے۔ آج یہ شکایت عام سننے میں آتی ہے کہ اس دور کے بچے پہلے وقتوں کے بچوں کے مقابلہ میں زیادہ شریر ہیں۔ حقیقت حال اس سے مختلف ہے، اس دور کے بچے پہلے ادوار کے بچوں سے برے نہیں، البتہ آج بہت سے بچے اظہار خیال کے ان انوکھے ذرائع (سینما، ریڈیو، اشتہار وغیرہ) سے مسلسل اثر پذیر ہوتے ہیں جو پہلے وقتوں میں ناپید تھے۔ ان ذرائع کی بے پناہ اثر انگیزی مدرسے گھر اور مسجد کے تعمیری کام کو خاک میں ملا دیتی ہے۔ بے شمار دیہاتی والدین کسب معاش کے سلسلے میں شہروں اور قصبوں کا رخ کرتے ہیں۔ ان کے بچے یہاں ایک دم مخرب اخلاق اثرات سے گھر جاتے ہیں۔

دیہاتی فضاؤں میں والدین کی نگہبانی کے بغیر بھی ان میں سے اکثر پسندیدہ اخلاق کے مالک بن جاتے ہیں۔ شہروں
کی مسموم فضاؤں میں یہ بڑا مشکل ہے۔ کئی مہاجر بچوں کو ہجرت نے ناپسندیدہ اور غیر مانوس فضاؤں میں لا پھینکا
ہے۔ اس قسم کے تمام بچوں کی مناسب رہنمائی اور دستگیری ہونی چاہیئے۔ یہ کام اکیلے استادوں کے
کرنے کا نہیں۔ اس میں مدرسے، والدین اور مذہبی رہنماؤں کو مل کر حصہ لینا چاہیئے۔ تاہم اس
کام کی رہنمائی استاد ہی کرے گا۔ ہمارے اساتذہ ایسی رہنمائی کے لیے تیار نہیں، کیوں کہ
تعلیم کے دوران میں انہیں شہریت کی کتابی تعلیم دی گئی ہے عملی تربیت نہیں۔ اس کمی کو دوران
ملازمت پورا کیا جا سکتا ہے۔ مدرسہ کی غیر نصابی سرگرمیوں کا دائرہ وسیع کرنے سے نہ صرف طالب علموں
کی عملی تربیت کے مواقع پیدا کیے جا سکتے ہیں بلکہ ان کی بدولت استادوں کو شہری ذمہ داریاں نبھانے
اور شہری زندگی کی رہنمائی کرنے کے قابل بھی بنایا جا سکتا ہے۔

مروجہ نصاب کے گوناگوں مطالبوں اور استاد کی محدود حیثیت کو دیکھ کر بعض لوگ اس تجویز
کو شاید ناممکن العمل قرار دے دیں۔ یہ درست ہے کہ ایک استاد خالص انفرادی حیثیت میں اس
سمت میں کوئی موثر قدم نہیں اٹھا سکتا۔ تخلیقی رہنمائی کی ابتدا چوٹی سے ہونی چاہیئے۔ اگر صدر معلم
اور دوسرے ذمہ دار لوگ مدرسے کو مقامی معاشرے سے قریب تر لانے کے لیے شہری ذمہ داریوں
کو اپنانے لگیں تو استاد بھی لامحالہ اس میدان میں کام کرنے لگیں گے۔

(ج) کام کرنے کا تیسرا میدان پیشہ ورانہ تنظیم کا ہے۔ ہر پاکستانی استاد جانتا ہے کہ سینکڑوں
ہزاروں دوسرے استاد خود اس کی طرح اپنی زندگیاں بچوں کو پڑھانے کے لیے وقف کیے ہوئے
ہیں۔ تاہم ان تمام لوگوں کے درمیان کوئی مضبوط پیشہ ورانہ رشتہ موجود نہیں۔ استادوں کی کچھ مختلف
انجمنیں پچھلے چند سالوں سے قائم ہیں۔ لیکن ابھی قومی پیمانہ پر کوئی ہمہ گیر تنظیم موجود نہیں، جو چند انجمنیں
موجود ہیں ان کی رکنیت بھی محدود ہے اور ان کا کام ابھی معیاری سطح سے بہت نیچے ہے۔ استادوں کی
بالیدگی، پیشہ معلمی کی اصلاح، بچوں کے تحفظ اور قوم کی خدمت کرنے کے لیے ضروری ہے کہ استاد قومی
سطح پر ایک صحت مند اور باوقار تنظیم قائم کریں۔ ایسی تنظیم قائم کرنے اور اس کی مقامی شاخوں کے کام میں

سرگرم حصہ لینے ہی سے پاکستانی استاد، دوسری اور تیسری ذمہ داری کو سنبھالنے کی صلاحیت پیدا کر سکتے ہیں۔
پیشہ ورانہ تنظیم کا کام جب رضاکارانہ طور پر انجام پائے تو بے شک اس کی رفتار زیادہ تیز نہیں ہو گی۔ امریکہ جیسے ترقی یافتہ ملک میں بھی صرف آدھے استاد استادوں کی قومی انجمن کے رکن ہیں۔ لیکن ہمارے یہاں اس قومی انجمن کا وجود ہی نہیں۔ استادوں کی موجودہ انجمنوں میں سے ہر ایک نے اپنے آپ کو ایک محدود مفاد کے ساتھ وابستہ کر رکھا ہے۔ مثلاً ایک انجمن نے بورڈ مدارس میں کام کرنے والے استادوں کے مفاد کی نگہداشت اپنے ذمے لے رکھی ہے۔ دوسری نے پرائیویٹ مدارس میں کام کرنے والے استادوں کے مفاد کی۔ تیسری نے گورنمنٹ مدارس میں پڑھانے والے استادوں کے مفاد کی۔ ان کی آگے پھر شاخیں ہیں۔ مثلاً گورنمنٹ مدارس کے اساتذہ کی ایک انجمن انگریزی پڑھانے والے اساتذہ کی نمائندگی کرتی ہے، اور دوسری اردو۔ فارسی۔ عربی پڑھانے والے اساتذہ کی۔ ان جزوی تنظیموں کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ یہ اپنے گروہ کے معاشی مفاد کے سوا اور کسی چیز کو مرکز توجہ بنا ہی نہیں سکتیں۔ دوسرے ملکوں میں استادوں کی تنظیموں نے بڑی بڑی معرکہ آرا تعلیمی تحقیقات کی ہیں اور قوم کے تعلیمی مسائل حل کرنے میں قائدانہ حیثیت اختیار کی ہے۔ یہ قیادت اسی صورت میں ممکن ہے جب پیشے کو قومی سطح پر منظم کیا گیا ہو۔ گروہی تنظیمیں قدرتی طور پر گروہ کے معاشی مفاد کو اپنا معاملہ سمجھتی ہیں اور تعلیم کے وسیع تر قومی مسائل کو حکومت یا دوسرے لوگوں کی ذمہ داری خیال کرتی ہیں۔ اس افسوسناک صورت حال کا نتیجہ یہ ہے کہ ملک نہ صرف بیش قیمت تعلیمی رہنمائی سے محروم ہے، بلکہ استاد خود ایک بالیدگی آور شہری تربیت سے محروم ہیں۔

استادوں کی قومی تنظیم کا کام نوجوان استادوں کی قوت عمل کو دعوت دے رہا ہے۔ کیا نوجوان استاد اس دعوت کو قبول کریں گے؟ ٭

علم جغرافیہ کی تین ارتقائی منازل

فرحت اللہ خان

پرنسپل سراج الدین صاحب موجودہ ڈائرکٹر تعلیمات پنجاب نے ایک مرتبہ گورنمنٹ کالج لاہور میں جغرافیہ کے طلبا کے ساتھ تصویر کھنچواتے ہوئے اپنی خاص مزاحیہ طرز میں پوچھا بتاؤ "جغرافیہ پہلے بنا یا دنیا" گھبرا کر جغرافیہ کے طلبا اپنے اساتذہ کی طرف دیکھنے لگے سوال بہت پیچیدہ اور فلسفی طریقے کا تھا۔ پرنسپل صاحب نے میری طرف رُخ کیا تو میں نے عرض کی "جناب زمین پہلے بنی اور زمین کے بنتے ہی جغرافیہ شروع ہو گیا" جب ہم جمادات، نباتات، حیوانات اور انسان باقی ہیں زمین اور جغرافیہ کی کہانی ساتھ ساتھ چلے گی۔ علم جغرافیہ میں تو ہم یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ زمین سورج سے کیسے علیحدہ ہوئی، کیسے دور آکر ٹھوس بنی۔ پھر کیسے اپنے محور کے گرد گھومتی ہوئی سورج کے گرد چکر لگائے گی۔ کیسے انسان اور تسخیر قدرت کی طویل کہانی شروع ہوئی اور اب تک کن تین ارتقائی منازل میں سے گذر چکی ہے۔

چوں کہ ان ارتقائی منازل کا تدریس جغرافیہ پر اہم اثر پڑتا ہے۔ آیئے معلوم کریں، کہ انسان اپنی تین ضروریات یعنی خوراک، لباس اور مکان ابتدائی زمانے میں کیسے پورا کرتا رہا۔ اب کیسے کر رہا ہے اور آئندہ کیسے کرتا رہے گا تین ارتقائی منازل مندرجہ ذیل ہیں۔

اول منزل۔ آغاز ہستی سے دو ہزار سال قبل مسیح تک

اولین منزل میں انسان کمزور، مجبور اور ماحول کا غلام تھا۔ وہ جنگلی جانوروں کی طرح ننگا رہتا یا چند پتوں سے جسم کو ڈھانپتا۔ وہ پھل پھول اور گوشت کھا کر گزارا کرتا اور رات کو کسی غار یا درخت پر بسیرا کرتا۔ لیکن جلد ہی وہ متحدہ طاقت کو استعمال کرنا سیکھ گیا۔ کئی کئی انسان مل کر ہاتھی اور شیر کو مار ڈالتے، جب خوراک باسانی ملنے لگی تو فالتو وقت میں غور و فکر کرتا، پتھر سے آگ پیدا کی اور گوشت کو بھون کر کھانے لگا۔ پتوں اور کھالوں سے جسم ڈھانپنے لگا جانوروں کو پال کر کھیتی باڑی کر کے مزید خوراک حاصل کرنے لگا۔ مٹی

جانے۔ لکڑی اور پتھر سے مکان بنا کر اُن میں رہنے لگا کبھی کبھی نئی چراگاہوں کی تلاش میں اِدھر اُدھر مارا مارا پھرتا۔ اور کبھی دریاؤں کے کنارے کھیتی باڑی کر کے ہمیشہ کے لئے آباد ہو جاتا۔ تاریخ میں ہم اسے پتھروں اور دھاتوں کا زمانہ کہتے ہیں۔ دریاؤں اور جھیلوں کے کنارے اس دور میں بڑی بڑی تہذیبوں نے پرورش پائی۔ دریائے نیل کے کنارے مصری، دریائے گنگا اور جمنا کے کنارے آریہ اور دریائے سوانگ ہو کے کنارے چینی تہذیبوں کی بنیاد پڑی۔ اس دور میں بابل۔ نینوا۔ ہڑپہ اور موہنجو دارو بڑے پر رونق شہر تھے

دوم منزل دو ہزار سال قبل مسیح سے اٹھارہ سو سال بعد از مسیح تک

یہ منزل انسان کی فتح اور ماحول کی شکست کی کہانی ہے۔ جوں جوں انسان قدرتی ماحول پر قابو پاتا گیا، وہ حیوانات اور نباتات سے پورا پورا فائدہ اٹھانے لگا حیوانات سے باربرداری اور خوراک کا کام لینے لگا۔ جنگلات کی لکڑی مکان میں استعمال کی اور دریاؤں۔ کنوؤں اور نہروں سے پانی حاصل کر کے کھیتی باڑی کرنے لگا۔ انسان نے بڑے بڑے باغات لگائے۔ پختہ مکانات بنائے سڑکیں بنائیں۔ سمندری سفر جاری کیے اور تجارتی قافلے لے کر جگہ بہ جگہ جانے لگا۔ اہل یونان نے تہذیب کو معراج تک پہونچایا۔ ہیروڈوٹس نے علم جغرافیہ و تاریخ کی بنیاد رکھی۔ ارسطو۔ افلاطون اور دیگر علمائے جغرافیہ۔ تاریخ اور فلسفے کی بنیادوں کو مستحکم کیا۔ سکندر اعظم نے دنیا کو فتح کرنے کا خواب دیکھا اور ہندوستان تک ملکوں کو فتح کرتا چلا آیا۔ اس دور میں شمال مغربی دروں سے ہندوستان پر لگاتار یورشیں ہوئیں۔ تاتاری بادشاہ (گھوڑوں پر سوار ہو کر) ملکوں کو پامال کرتے ہوئے یورپ پر حملہ آور ہوئے، عرب مذہبی جذبہ لے کر جبرالٹر سے چین تک چھا گئے۔ زمین پر اونٹ نے اور سمندر میں ڈھاب (بادبانی کشتی) نے فاصلہ طے کرنے میں ان کی مدد کی۔ ابن حوقل۔ ابن فردادبہ۔ استخری المسعودی۔ ابن بطوطہ۔ البیرونی نے ملکوں کے جغرافیائی حالات لکھے۔

ہنری شاہ پرتگال نے اور فلپ شاہ سپین نے واسکوڈی گاما اور کولمبس کو بھیج کر سمندری راستہ معلوم کرنے کی کوشش کی۔ راس امید کا چکر لگا کر واسکوڈی گاما عرب ملاحوں کی مدد سے ہندوستان پہونچا۔ اگرچہ کولمبس ہندوستان نہ پہونچ سکا لیکن نئی دنیا (شمالی و جنوبی امریکہ) کو ڈھونڈ ڈالا سے

سچ ہے ع "ڈھونڈنے والے کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں"

اول تو اس دور میں تمام براعظم دریافت ہوئے۔ نوآبادیات قائم ہوئیں اور انسان نے سمندر کو فتح کر ڈالا۔ دوسرے کام کے بڑھنے سے پیشوں کی تقسیم ہوئی۔ سرد علاقوں میں شکاری۔ سمندری ساحلوں کے ماہی گیر۔ گھاس کے میدانوں میں گڈریے دریاؤں کی وادیوں میں کسان اور جنگلات میں لکڑ ہارے جمع ہو گئے۔ آہستہ آہستہ ہر جگہ آبادی کا سلسلہ بڑھتا گیا۔ کچھ گاؤں بنے۔ کچھ شہر آباد ہوئے۔ حکومتیں قائم ہوئیں۔ کہیں دفتروں میں ملازم۔ کہیں کاریگر اور مزدور نظر آنے لگے۔ عہد مغلیہ کا زرین عہد اس منزل کی تکمیل کا ایک معمولی نمونہ ہے۔ لیکن یورپ کا انسان سمندروں پر فتح پا کر اس دوڑ میں سب سے پیش پیش تھا۔ وہ آناً فاناً دنیا پر چھا گیا اور ہر جگہ قدرتی ماحول سے پورا پورا فائدہ اٹھا کر دنیا میں سب سے بڑی اور امیر طاقت بنا۔

تیسری منزل ۱۸۰۰ء سے ۱۹۵۵ء تک
صنعتی دور اور ایک دنیا

موجودہ منزل کو صنعتی دور کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ اس کا آغاز بھی یورپ میں ہوا، جب اہل یورپ کو بھاپ کا استعمال معلوم ہو گیا اور یورپ کے بہت سے ملکوں میں کوئلہ اور لوہا بہ کثرت ملنے لگا تو انہوں نے مشینیں بنائیں اور انہیں بھاپ کی طاقت سے چلایا۔ ایک مشین ہزاروں آدمیوں کا کام کرنے لگی یہی وجہ ہے کہ یورپ صنعت و حرفت کا مرکز بن گیا۔ امریکہ میں جہاں قدرتی دولتیں بے بہا تھیں انہیں پا کر انسان بہت امیر و کبیر بن گیا۔ شہر اور آبادی بڑھ گئے۔ ہر طرف بڑے بڑے کارخانے، بینک۔ ورکشاپیں، تجارتی منڈیاں نظر آنے لگیں۔ جنگی طریقے بدلے۔ طرز رہائش۔ خوراک اور لباس بدلے۔ طرز تعلیم بدلا۔ ریڈیو اور ہوائی جہاز نے اس وسیع دنیا کو ایک چھوٹی سی دنیا بنا دیا، اور ہر جگہ صنعتی ترقی نظر آنے لگی۔ لیکن آج کل آبادی اتنی سرعت سے بڑھ رہی ہے کہ ڈر ہے کہ ۱۹۶۶ء میں دنیا کی پیداوار لوگوں کی خوراک کے لیے کافی نہ ہو۔ اس دور میں آنے والی دنیا کی حالت کیا ہوگی اس کا جواب روس اور امریکہ کے لوگ سوچتے رہیں لیکن اہل پاکستان کے لیے ایک ہی راستہ عمدہ ہوگا اور وہ یہ کہ اپنے قدرتی ماحول سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائیں اور ملک کی پیداوار کو بڑھا کر لوگوں میں خوش حالی حب الوطنی۔ وسیع النظری قومیت اور ترقی کا جذبہ پیدا کریں۔ جغرافیہ اس جذبہ کو بیدار کرنے میں سب سے زیادہ مفید ثابت ہوگا ٭

کردار کی تشکیل میں سمعی بصری اعانات کا حصّہ

ایک جائزہ

شیخ محمد اقبال

تقریباً دو سال کا عرصہ ہوا محکمۂ تعلیم کے ارباب حل وعقد نے تعلیم و تدریس کے کام میں دل چسپی اور جاذبیت پیدا کرنے کے لیے سمعی بصری اعانات کی ترویج کے سلسلہ میں لاہور اور مری کے مقامات پر محکمۂ تعلیم کے افسران، چیدہ صدر مدرسین و اساتذہ کے لیے دس روزہ ریفریشر کورسوں کا اہتمام کیا۔ خوش قسمتی سے مجھے مری والے کورس میں شرکت کا موقع نصیب ہوا۔ جس خلوص اور نیک نیتی سے ان کورسوں کو نبھایا گیا وہ قابل ستائش ہے۔ مقام تشکر ہے کہ افسران اور اساتذہ نے کافی حد تک فائدہ حاصل کیا بلکہ اس فیض کو عام بھی کیا گیا اور وہ اس طرح کہ افسران نے اپنے متعلقہ حلقوں میں اساتذہ کے لیے ریفریشر کورس منعقد کیے اور ان جدید اور مفید اعانتوں سے روشناس کیا۔ نیز انہیں ہدایت کی کہ اسباق میں دل چسپی، تنوع اور جاذبیت پیدا کرنے کے لیے ان کا مناسب اور موزوں استعمال کیا جائے۔ ساتھ ساتھ یہ وضاحت بھی کر دی گئی کہ یہ اعانات مقصود بالذات نہیں بلکہ ہمارا مقصد اعلیٰ تدریس ہے اور یہ اعانات بطور معاون اور مددگار رہیں۔

اس سلسلہ میں مشہور امریکی ماہر تعلیم ایڈگر ڈیل صاحب کی تجربے کی تکون جس میں ان اعانات کو ایک خاص ترتیب دی گئی ہے کافی دل چسپی کا مرکز بنی۔ بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ ان اعانات کو سمجھنے اور جاننے کے لیے یہ تکون ایک خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اس لیے اسے یہاں درج کیا جاتا ہے

(یہ تکون اگلے صفحے پر ملاحظہ ہو)

ایڈگرڈیل صاحب کی مثلث اعانات

ان اعانات کی تشریح بے محل نہ ہوگی۔

(۱) براہ راست تجربات: وہ تمام تجربات جو بالارادہ کئے جاتے ہیں اور غرض یہ ہوتی ہے کہ پوری ذمہ داری سے ہم کوئی کام خود کرکے اس کو سیکھنے کی سعی کریں۔ مثلاً اپنی آنکھوں سے دیکھنا۔ کانوں سے سننا۔ کھانا پکانا اور چہل قدمی کرنا وغیرہ

(۲) خود ساختہ نمونے۔ یہاں براہ راست تجربہ میں مشکلات حائل ہوں۔ وہاں مدرس جو نمونے ماڈل یا کھلونے وغیرہ تیار کرتا ہے وہ خود ساختہ نمونے ہوتے ہیں۔

(۳) شرکت تمثیل: جن تجربات کو براہ راست حاصل کرنا ممکن نہیں، وہ ڈراما۔ تمثیل اور مکالمے کے ذریعے پیش کئے جا سکتے ہیں۔

(۴) توضیحی عمل: طلبہ کو نمونہ دے کر اور عمل کے ذریعہ کسی امر کی واقفیت دلانا۔ مثلاً فٹ بال کا کھیل سکھانے کے لیے طلبہ کو نمونہ دینا کہ کس طرح گیند کو ایک طالب علم سے دوسرے تک تیزی اور ہوشیاری سے پہونچایا جا سکتا ہے۔

(۵) تعلیمی سیر: مختلف مقامات۔ اجناس اور شبیری کی واقفیت دلانے میں سیر نہایت ہی مفید ہے۔ لفظی تشریح سے جو بات واضح کرنی ممکن نہیں ہوتی، وہ اسی طرح نہایت آسانی سے ذہن نشین کی جا سکتی ہے۔

(۶) اشیائے نمائش : نمائش کے لیے جو اشیا جمع کی جاتی ہیں اُن کی مدد سے طلبہ بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ ماڈل۔ دست کاری کے نمونے اور بے شمار مختلف قسم کی چیزیں بطور اشیائے نمائش استعمال کی جاسکتی ہیں۔

(۷ و ۸) ریڈیو۔ متحرک و غیر متحرک تصاویر : ان کی مدد سے کسی چیز کا تصور دینا زیادہ آسان ہے اور ان کی تعلیمی افادیت مسلمہ ہے۔

(۹) بصری علامات : بجائے حقیقی اشیا کے طلبہ کے سامنے چارٹ۔ گراف یا نقشے کے ذریعے تصویر کو پیش کرنا بصری علامات ہیں۔

(۱۰) لفظی علامات : ہماری اعانات کی یہ آخری کڑی ہے اور سب سے زیادہ اہم اس لئے کہ ہماری تعلیم سب کی سب بیشتر لفظی علامات کی رہین منت ہے۔ تمام الفاظ حقیقت میں ایسی علامات ہیں جو تدریج اصلی چیزوں کی جگہ لے لیتے ہیں۔

جس کاوش اور محنت سے یہ اعانات یک جا کیے گئے ہیں، اس سے انکار نا ممکن ہے۔ .... ان کی افادیت بھی واضح ہے حقیقت یہ ہے کہ اگر مدرس اپنی تدریس میں ان تمام اعانات کو یا ان میں سے چند کو پورے تدبر سے استعمال میں لائے تو وہ اپنی تعلیم کو دلچسپ اور مفید بنا سکتا ہے بلکہ اس طرح سے دی گئی تعلیم طلبہ کے لوح دل پر ایسے گہرے نقوش چھوڑنے کی ضامن ہو گی جو ابتدائی زمانہ کے باوجود ایک طویل عرصے تک ان مٹ رہیں گے۔ نتیجہ یہ ہو گا کہ بچے کا علم ٹھوس اور جامع ہو گا۔

میرا مضمون نہ تو ان اعانات کی تعلیمی حیثیت پر تبصرہ کرنا ہے اور نہ ہی ان پر کسی قسم کی نکتہ چینی مقصود ہے۔ میں تو انہیں ان کے درست مقام پر دیکھنے کا متمنی ہوں اور میری حقیر کوشش یہی ہے کہ اس مختصر مضمون میں ان اعانات کی اس جاذبیت، اہمیت اور مرکزیت کا ذکر کروں جو ابھی تک عام نظروں سے پوشیدہ اور مستور ہے اور جس کے اجاگر کرنے کی از بس ضرورت ہے۔

۱۵ مارچ ۱۹۵۸ء کو سٹوکراچی ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم پنجاب نے تعلیم کے اصل مقصد کو

جن الفاظ میں واضح کیا وہ درج ذیل ہیں۔

تعلیم کا اصلی مقصد عوام کی زندگی کا معیار بلند کرنا اور ان میں بہتر زندگی کے اصولوں اور لوازمات کا صحیح احساس اور ادراک پیدا کرنا ہے تعلیم عوام کو شہریت کے صحیح جمہوری اصولوں سے آشنا کرتی ہے، جب تک تعلیم کے ذریعے یہ مقاصد پورے نہ ہوں وہ ادھوری رہے گی۔

ظاہر ہے کہ تا حال ہم ان مقاصد کے حصول میں چنداں کامیاب نہیں ہوئے اور جب تک کامیابی حاصل نہ ہو ہماری تعلیمی جدوجہد خام رہے گی۔

اعانات پر ایک نگاہ دوڑائیے تو تعلیمی سیر جو شلٹ کے پانچویں زینے پر ہے ایک ایسی اعانت ہے جو ہر جگہ آسانی سے دستیاب ہوسکتی ہے۔ باقی اعانات کے لیے کسی قسم کی کد وکاوش کی ضرورت ہوتی ہے اور اخراجات کی بھی لیکن سیر کے لیے نہ تو کسی خاص خرچ کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ ہی کسی کاوش کی حاجت، جب بھی اور جس سمت بھی آپ باہر نکل پڑیں آپ قدرت کی رعنائیاں۔ قدرت کے جلوے۔ رنگینیاں اور زرنگاریاں یوں بکھری پائیں گے جتنا جی چاہے، آپ اپنے دامن مراد کو ان سے بھرلیں اور پھر یہ دیکھ کر ورطۂ حیرت میں غوطہ زن ہوں کہ اس خوشہ چینی سے ان رعنائیوں میں سرمو کمی پیدا نہیں ہوئی۔ بلکہ اگر نگاہ بصیر آجائے تو اس شعر کے مصداق ؎

برگِ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار
ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار

آپ قدرت کی رعنائیوں کو پتے پتے میں یوں جلوہ گر دیکھیں گے کہ ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیئے اور خامہ انگشت بدنداں اسے کیوں کر لکھیے۔

بہر حال میرا ناقص خیال ہے کہ اگر ہم سیر کو محض اس لیے اعانات کے زینے کی ایک کڑی تصور کرتے ہیں کہ بچوں کو باہر کھیتوں میں لے جانے یا اسکول کی چار دیواری کے اندر ہی مختلف اشیا، کو ان کے اصلی رنگ و روپ میں دیکھنے کے مواقع بہم پہونچانے سے کسی حد تک ان کے علم میں اضافہ ہوجاتا ہے اور وہ اشیا، کو ان کے اصلی رنگ و روپ میں دیکھنے کے مواقع بہم پہونچانے

بھی حد تک ان کے علم میں اضافہ ہو جاتا ہے اور وہ اشیا کو اصلی رنگ میں دیکھ کر ان کے متعلق زیادہ دیر پا اور مستحکم خیالات کو اپنے دل میں جگہ دے سکتے ہیں تو یقیناً یہ ایک نہایت ہی غلط قسم کی منفی تعلیم ہے بدقسمتی سے اعانات کے سلسلہ کی ایک کڑی ہونے کی وجہ سے تعلیمی سیر کو جو اہمیت حاصل ہے وہ محض اسی حد تک ہے کہ بچے ریلوے اسٹیشن تک جائیں تو وہ مختلف آدمیوں کو مختلف قسم کے کام کرتے ہوئے دیکھیں جب کتاب پڑھ سے ریلوے اسٹیشن کے سبق کو پڑھیں گے تو بہت سی باتیں ان کے ذہن میں یوں مرتسم ہو جائیں گی کہ ان کو مشکل ہی بھلایا جا سکے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ علم کا مقصد جیسا کہ جناب ڈائرکٹر صاحب سررشتہ تعلیم پنجاب نے فرمایا تھا اس سے کہیں زیادہ وسیع اور بلند ہے۔ علامہ اقبال رحمہ نے جو مقصد علم کے لیے وقف کیا ہے وہ درج ذیل ہے سہ

علم کا مقصود ہے پاکئ عقل و خرد
فقر کا مقصود ہے عفت قلب و نگاہ

بالفاظ دیگر عقل کو صیقل کرنا اور نکھارنا علم کا اولین مقصد ہے اور اگر عقل میں یہ نکھار اور رنگینی پیدا نہ ہو تو علم اپنے تمام تر مقاصد میں ناکام ہے۔ چنانچہ جب علم عقل کو یوں اُبھر نیا دے تو اس کے بعد مذہبی تعلیم سے قلب و نظر کو نہ صرف عفیف بنایا جا سکتا ہے بلکہ ان میں وہ جذب اور وسعت پیدا ہو جاتی ہے جو انسان کو انسان بنانے کی ضامن ہے۔

اگر نظر تعمق دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ایڈگر ڈیل صاحب کی مخروط میں تعلیمی سیر ایک مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔ تمام اعانات سمٹ سمٹا کر اس میں یوں مدغم ہو جاتے ہیں کہ ان سب کا ماحصل تعلیمی سیر ہی رہ جاتا ہے۔ غور کرو۔ قرآن حکیم میں سیر کی یوں ہدایت ہوتی ہے۔

فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ۔

اور سیر کرو اور دیکھو کہ دنیا میں کذب و افترا میں پھنسے ہوئے لوگوں کا کیا انجام ہوا۔ گویا اپنی چشم بصیرت کو کھولو۔ خیالات من و مانی کو چھوڑ کر اپنے گرد و پیش نظر دوڑاؤ۔ تاریخ عالم کی ورق گردانی کرو

اوران لوگوں کے حالات کا جائزہ لو جنہوں نے کذب کو اپنا شعار زندگی بنا کر دنیا میں کامرانی اور نا کامی کی راہ دیکھی، یقیناً تمہارے لیے یہ سیر سرمۂ بصیرت کا کام دے گی اور تم یہ جان کر حیران ہو گے کہ جادۂ مستقیم سے ہٹ کر راہ راست سے بھٹک کر اور غلط روی اور غلط بینی کو اپنا شعار بنا کر کوئی قوم بھی اپنی منزل مراد کو پا لینے میں کبھی کامیاب ہوئی ہے اور نہ ہو گی دوسرے لفظوں میں آپ کی اس سیر نے آپ کو اس حقیقت میں اور صداقت واضح سے یوں روشناس کر دیا کہ یہ نقوش آپ کے لوحِ دل سے کبھی بھی کسی صورت میں سوتے جاگتے، چلتے پھرتے، لیٹے غرض کسی حالت میں بھی معدوم ہو سکتے ہیں اور نہ مٹ سکتے ہیں۔ علامہ اقبال مرحوم اپنی نظم "روح ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے" میں آدم کے سلسلہ میں جن خیالات کا اظہار کرتے ہیں وہ بھی قابل غور ہیں۔ فرماتے ہیں ؎

کھول آنکھ زمیں دیکھ فلک دیکھ فضا دیکھ مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ
اس جلوۂ بے پردہ کو پردوں میں چھپا دیکھ ایامِ جدائی کے ستم دیکھ جفا دیکھ
بے تاب نہ ہو معرکۂ بیم و رجا دیکھ

ہیں تیرے تصرف میں یہ بادل یہ گھٹائیں یہ گنبد افلاک یہ خاموش فضائیں
یہ کوہ یہ صحرا یہ سمندر یہ ہوائیں تھیں پیش نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں
آئینۂ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ

سمجھے گا زمانہ تیری آنکھوں کے اشارے دیکھیں گے تجھے دور سے گردوں کے ستارے
ناپید تیرے بحرِ تخیل کے کنارے پہنچیں گے فلک تک تیری آہوں کے شرارے
تعمیر خودی کر اثرِ آہِ رسا دیکھ

ان کے نظریہ کے مطابق آدم کو جنت سے نکالا ہی اس غرض کے ماتحت گیا تھا کہ وہ زمین پر اپنے گرد و پیش کے حالات کا جائزہ لے کر قدرت کی رنگینی، رعنائی اور جلوہ گری سے متاثر ہو کر اپنی خودی کو یوں پروان چڑھائیں کہ ؎

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

کے مصداق خاک کا پتلا ہمدوش ثریا ہو سکے اور عروجِ آدمِ خاکی سے انجم اس طرح سہم کر رہ جائیں کہ کہیں یہ ٹوٹا ہوا تارا مہ کامل نہ بن جائے اور اس کارگہ حیات میں وہ مقام رفیع حاصل کرے جو فرشتوں کو تمام عمر کی عبادت اور قیام کے باوجود حاصل نہیں۔

علامہ اقبال کا خیال ہے کہ انسان کے تمام محاسن کو جلا دینے اور ان میں رفعت پیدا کرنے میں سیر کو ایک خاص مقام حاصل ہے چناں چہ وہ فرماتے ہیں ؎

یہی ہے سیر کلیمی ہر اک زمانے میں
ہوائے دشت و شعیب و شبانیٔ شب و روز

گویا موسیٰ علیہ السلام کو کلیمی عطا کرنے میں جہاں شعیب علیہ السلام جیسے شفیق اور باکمال استاد کی شفقت اور تعلیم کو دخل ہے وہاں ہوائے دشت اور شبانیٔ شب و روز کی اہمیت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ سچ پوچھو تو علامہ اقبال کے نزدیک سیر اور ہوائے دشت کی افادیت اس امر میں مضمر ہے کہ مناظرِ قدرت سے لطف اندوز ہونے کے بعد انسان "واند کے در خود نگر" پر عمل پیرا ہو۔ چناں چہ بہار کے موسم میں جب شاعرِ مشرق دشت نوردی کی ٹھانتا ہے اور دیکھتا ہے ؎

پھر چراغِ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن	مجھ کو پھر نغموں پہ اکسانے لگا مرغِ چمن
پھول ہیں صحرا میں یا پریاں قطار اندر قطار	اودے اودے نیلے نیلے پیلے پیلے پیرہن
برگِ گل پر رکھ گئی شبنم کا موتی بادِ صبح	اور چمکاتی ہے اس موتی کو سورج کی کرن
حسنِ بے پروا کو اپنی بے حجابی کے لیے	ہوں اگر شہروں سے بن پیارے تو شہر اچھے کہ بن

جب شاعر اس منظر سے پوری طرح فیض یاب ہو جاتا ہے تو شاید اس کے دل میں خیال پیدا ہوتا ہے کہ وہ خالقِ کون و مکاں جو ان تمام مناظر کا پیدا کرنے والا ہے اس نے انسان کو

بھی بے حقیقت پیدا نہیں کیا۔ چناں چہ وہ فوراً اپنے گرد و پیش سے نظر ہٹا کر اپنے آپ پر توجہ کرتا ہے
اور یوں کہتا ہے۔ ؎

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن

اس سے صاف ظاہر ہے کہ سیر کا مقصد طلبہ میں اسباق کے لیے دل چسپی پیدا کرنے کے
ماورا کچھ اور بھی ہے۔ چناں چہ اس مختصر مضمون میں اس مقصد کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے،
سیر سے کما حقہٗ فائدہ اسی صورت میں ممکن ہے جب کہ کوئی شفیق مدرس رہ نمائی، رہبری
اور ہدایت کے لیے ساتھ ہو جو ہر مقام پر نہ صرف قدرت کی رنگینیوں سے صحیح طور پر فیضیاب ہونے کی
راہ بتا سکے بلکہ جوان رنگینیوں سے وہ رنگ جدا کر سکے جو انسانی زندگی کو رنگین کرنے میں کام
آسکے۔ علامہ اقبال نے کیا خوب کہا ہے ؎

دم عارف نسیم صبح دم ہے اسی سے ریشۂ معنی میں نم ہے
اگر کوئی شعیب آئے میسر شبانی سے کلیمی دو قدم ہے

گویا صحیح استاد کا میسر آجانا تعلیمی سیر کے سلسلے کی پہلی اور اہم کڑی ہے، اس لیے اس بات کی
اشد ضرورت ہے کہ ہمارے نارمل اسکول اور ٹریننگ کالج کے مدرسین کو اسی ڈگر پر چلائیں کہ وہ
سیر سے صحیح طور پر لطف اندوز ہونے کی اہلیت حاصل کر سکیں اور تربیتی اداروں سے فارغ التحصیل
ہو کر جب وہ تعلیمی اداروں میں کام پر مامور ہوں تو وہ طلبہ کو اسی نہج پر چلا سکیں۔ بدقسمتی سے جو مدرسین
تربیت کے بعد ہمارے مدارس میں پہونچ رہے ہیں وہ اس قدر پست ہمت، متلون مزاج اور
ناپختہ کار ہوتے ہیں کہ بات بات پر روٹھ جانا اور معمولی سی تکلیف پر دامن صبر کو ہاتھ سے چھوڑ دینا
ان کا عام شیوہ ہے اور اسی پر بس نہیں بلکہ اپنی ہمہ دانی اور قابلیت پر آنا نازہے کہ کسی قسم
کی ہدایت اور اصلاح ان کی طبع نازک پر گراں ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ کئی سالوں تک وہ خود مدرسین
کے لیے ایک معمہ اور ایک مسئلہ لاینحل بنے ہوئے ان کی تکالیف اور ذمہ داریوں کا موجب بنے

بہت ہیں، اور یہ محض اس لیئے ہے کہ تربیت کے دوران میں ان کو تعلیمی سیر کے بہت کم مواقع مہیا کیئے جاتے ہیں، ورنہ وہ یوں سہل انگار اور تنگ مزاج نہ رہنے پائیں بلکہ ان میں مصائب کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کی اہلیت اور انکساری و علو ہمتی کے جوہر بدرجہ اتم موجود ہوں۔

موزوں رہنما اور رہبر ہاتھ آجانے کے بعد ہمیں سیر کے مقصد کی تعیین کرنا ضروری ہے۔ عام طور پر تعلیمی سیر کے مقاصد یہ ہوتے ہیں۔

(۱) معلومات حاصل کرنے کا شوق پیدا کرنا۔

(۲) علم کے کسی شعبے کے متعلق واقفیت حاصل کرنا

(۳) اشیا کی قدر و قیمت سے آگاہ ہونا

(۴) مل جل کر کام کرنے کی عادت پیدا کرنا

لیکن یہ مقاصد اتنے اہم اور ارفع نہیں ہیں کہ تعلیمی سیر کی اہمیت اور افادیت کو اجاگر کر سکیں۔ علامہ مرحوم کا ایک شعر ہے ؎

وہی جہاں ہے ترا جسکو تو کرے پیدا یہ سنگ و خشت نہیں جو تری نگاہ میں ہے

یعنی جہان دو ہیں۔ ایک وہ جہان آب و گل جس میں کہ ہم پیدا ہونے کے بعد اپنے آپ کو پاتے ہیں اور جہاں زرق برق کے لباس۔ فلک بوس عمارتیں۔ بجلی کے قمقمے اور مختلف اور چیزیں ہماری نگاہ کو ہر وقت خیرہ کرتی رہتی ہیں اور دوسرا جہان وہ ہے جس کو ہم اپنی علو ہمتی۔ منکسر المزاجی۔ محبت اور خلوص سے تعمیر کرتے ہیں اور یہ جہان چونے اور گارے سے تعمیر نہیں کیا جاتا بلکہ ہمارے شب و روز اس جہان کی تعمیر کا سامان ہیں جیسا کہ کسی انگریز شاعر نے کہا ہے۔

For the structure that we raise,
Time is with material filled.
Our to-days and yesterdays,
Are the blocks with which we build.

ان اینٹوں کو چنتے وقت ہمیں پوری توجہ اور کوشش سے کام لینا ہے۔ تاکہ کسی قسم کی کوئی خامی نہ رہنے پائے۔ ہمیں اس بات کا خیال نہیں کرنا چاہئے کہ کوئی آدمی ہمارے اس کام کو دیکھ نہیں سکتا اس لیے اسے جس طرح من میں آئے پورا کر دیں۔ جیسا کہ شاعر کہتا ہے۔

Truly shape and fashion these.
Leave no yawning gaps between
Think not because no man sees
Such things will remain unseen.

حقیقت یہ ہے کہ ہماری سیر کا اولین مقصد یہ ہے کہ ہم وہ محبت، ہمت، شوق اور فن کاری سیکھ سکیں جو ہمیں اس جہان کی تعمیر میں پوری مدد دے سکے۔ اس طرح اگر ہر فرد تعلیمی سیر سے اس قسم کے پاکیزہ جذبات اور فن کاری سیکھ لے گا تو نتیجہ یہ ہوگا کہ ہر کوئی امن، سلامتی، محبت اور اخوت کا عملی پرچار کرے گا اور اس طرح وہ بہت سی برائیاں جو ہمارے جہان کو ناپاک بنائے ہوئے ہیں مٹ جائیں گی۔

محبت، ہمت اور شوق میں ڈوبی ہوئی یہ فن کاری جو ہمیں اس جہان دیگر کی تعمیر میں کام دیتی ہے اسی کا دوسرا نام کردار ہے اور یہی کردار کی وہ راست تشکیل ہے جس کے ہم متمنی ہیں اور تمام صلح جو اور امن طلب لوگ خواہاں ہیں۔ گویا ہماری سیر کا مقصد کردار کی تشکیل ہے۔

مقام افسوس ہے کہ ایک طرف تو انسان دنیا کو آباد کرنے کے لیے ہر قسم کے قصر و ایوان فلک نشان اور فلک بوس محل تعمیر کر رہا ہے اور اُن کو ہر قسم کے مختلف النوع سامان تعیش سے آراستہ و پیراستہ کر رہا ہے اور دوسری طرف اصلاً متوجہ نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ امن کی فضا تار تار ہے اور برائی اور بد اخلاقی کا دور دورہ ہے، جب تک یہ جہان دیگر صحیح طور پر آباد نہ ہو اس وقت تک ہمارا جہانِ آب و گل ہر قسم کے سامان تعیش کے باوجود سنسان و ویران ہی نظر آئے گا۔

گذشتہ ربع صدی سے ہم ایک ایسا خلا محسوس کر رہے ہیں جس کو پُر کرنے کے لیے بڑے بڑے فلسفی اور سائنس دان میدان عمل میں کود کود گئے ہیں لیکن وہ خلا پُر نہیں ہو سکا

اشتراکیت۔ فاشزم نیشنلزم ۔ سوشلزم اور کئی اور ازم اسی خلا کو پُر کرنے کی کوششوں کے مختلف نام ہیں۔ کچھ عرصے سے اس خلا کو جنسیات سے پُر کرنے کی کوشش ہو رہی ہے بقول علامہ مرحوم

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس
آہ بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ معاملہ اس سے کہیں آگے بڑھ چکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر فعل اور ہر قول میں جنس کی تحریک کار فرما نظر آتی ہے اور فرائڈ کے ان بے ہودہ نظریات اور خیالات کی اشاعت اور تائید کھلم کھلا بڑی ڈھٹائی سے کی جاتی ہے۔ اس بے راہ روی اور بد روی کا نتیجہ وہ دھاندلی ہے جو ہر طرف مچی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ قانون۔ ضابطہ۔ پولیس اور عدالتوں کے باوجود ہر قسم کی برائیاں یوں عام ہیں گویا یہ تمام قوانین اور عدالتیں محض اس لیئے قائم ہیں کہ ان برائیوں کی ترویج ہو اور ان کے سرانجام پانے میں کوئی امر مانع نہ ہو۔

یہ یاس انگیز حالات محض اس لیئے رو بہ ترقی ہیں کہ ہم نے جہانِ دیگر کی طرف سے توجہ یکسر ہٹا رکھی ہے۔ جب تک اس جہان کو درست قدروں پر استوار نہ کیا جائے دنیا کے اخلاقی اقدار میں تغیر بہ اصلاح ممکن نہیں، دوسرے لفظوں میں جب تک کردار کی تشکیل میں تعلیمی سیر کو نمایاں حصّہ نہ دیا جائے ہماری اخلاقی پستی میں اصلاح خیال است و محال است و جنوں۔

تعلیمی سیر کس طرح دیگر اعانتوں کو اپنے اندر جذب کر لیتی ہے، اس کا تجزیہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ غور کرو، جب ایک شخص سیر کے لیئے نکلتا ہے تو وہ سورج کو مشرق سے طلوع ہوتے دیکھتا ہے۔ دریا۔ پہاڑ۔ کھیت اور سبزہ اس کے لیے انتہائی دلکشی کا سامان مہیا کرتے ہیں۔ وہ چلنے۔ دیکھنے، سونگھنے سے براہ راست بِاستعداد تجربات حاصل کرتا ہے۔ بجائے خود ساختہ نمونوں کے قدرت کے اصلی اور بے مثال مختلف النوع نوادر ہر سمت یوں دعوت نظارہ دیتے ہیں کہ خلّاق جہاں کی اس صناعی کو دیکھ کر انسان ضعیف البیان کم و در او ناتوان اپنے اور بے چارگی کا اقرار بطور ایک ادنےٰ خالق یوں کرتا ہے ؎

تو شب آفریدی چراغ آفریدم — سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیاباں و کہسار و راغ آفریدی — خیاباں و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم — من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

یہیں پر بس نہیں ہوتی۔ تمثیل کی بجائے وہ اصلی ڈرامے ہر طرف بہ یک وقت یوں جاری پاتا ہے کہ بے ساختہ اس کی زبان سے یہ الفاظ سنے جاتے ہیں ؎

فرد کی تنگ دامانی سے فریاد — تجلی کی فراوانی سے فریاد
گوارا ہے اسے نظارہ غیر — نگاہ کی نا مسلمانی سے فریاد

کہیں ایک نہایت ہی مختصر تمثیلچہ اس انداز سے پیش ہو رہا ہوتا ہے کہ ہمارے تمام تمثیلچے اور فن کاری کے دعوے ہیچ دکھائی دیتے ہیں اور رہ رہ کر یہ مصرع دہرانے کو جی چاہتا ہے کہ

دنیا ہیچ است و کار دنیا ہمہ ہیچ

اور لطف کی بات یہ ہے کہ بازار امکاں کا تماشائی ہوتے ہوئے ایک انسان خود بھی کسی ڈرامے میں لطور اداکار اپنا پارٹ نہایت غیر محسوس طور پر ادا کر رہا ہوتا ہے۔ شرکت تمثیل کو ہم تعلیمی اعانت کے طور پر کتنی ہی اہمیت کیوں نہ دیں لیکن یہ ناقابل فراموش حقیقت ہر وقت ہمارے پیش نظر رہتی ہے ؎

یہ کمال ہے تمثیل کا کہ تو نہ رہے
رہا نہ تو نہ سوز خودی نہ ساز حیات

اور آگے چلیے۔ اشیائے نمائش کی وہ فراوانی ہے کہ جدھر نظر اٹھائیں بقول شاعر ؎

فطرت زرکار کی نیرنگیاں تھیں جلوہ زا
تھا چراغ لالہ روشن اور نرگس محو خواب

کتنے نادر گراں بہا نمونے ہر سمت موجود ہیں بلکہ

نگاہ ہو تو بہائے نظارہ کچھ بھی نہیں — کہ فطرت بیچتی نہیں حسن و زیبائی

اگر نگاہ میسر آجائے تو ایک ایک نمونہ اپنے اندر لاکھوں جلوے اور کروڑوں دل چھپیاں لیے زبان حال سے یوں گویا ہے۔

اِنَّ فِی ذَالِكَ لَاٰیاتٍ لِاُولی الاَبصار

ریڈیو۔ صدابندی اور متحرک تصاویر کی بجائے ہر سمت زندہ جیتی جاگتی۔ بولتی اور گاتی ہوئی تصویریں اس طرح رقصاں و لرزاں اور تماشہ کناں ہیں کہ یہ سمعی اور بصری اعانات سامع اور ناظر کے ذہن پر ایسا اثر پیدا کرتی ہیں جو کہیں دیرپا اور گہرا ہوتا ہے۔

جب یہ تمام نظارے اور جلوے اس کو از خود رفتہ اور بے چین کر دیتے ہیں تو وہ ان کو اپنانے اور اپنے اندر جذب کرنے کے لیے بصری علامات اور لفظی علامات کی طرف رجوع کرتا ہے۔ چناں چہ کسی زرد پتے کو دیکھ کر اس کے سامنے موسم خزاں کی اس نہ بھولنے والی شام کا نقشہ کھنچ جانا یقینی ہے جبکہ وہ آلام سے چھٹکارا پانے کے لیے سیر کو نکلا تھا اور اسے ہر طرف اداسی اور مایوسی محیط نظر آئی۔ ناگاہ برگد کے تناور درخت سے ایک زرد پتہ ہوا کے جھونکوں کا سہارا لیتا ہوا اپنے رقص سے ایک غیر محسوس تموج پیدا کرتا ہوا آہستہ آہستہ اس کے سامنے آن گرا اور اس کے خیالات کو بکھیرتا ہوا علامہ اقبال کے اس شعر کی سراپا تشریح بن گیا۔ ؎

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

لفظی علامات بھی اکثر اس کی خوابیدہ راحتوں اور کلفتوں کو بیدار کرنے میں اس کی مدد کرتی ہیں مثلاً جب وہ جوئبار کے لفظ کو پڑھتا ہے تو معاً اس کے دل میں اک کسک سی پیدا ہوتی ہے، جبکہ اس کے سامنے ایک بہت پرانا بھولا بسرا ہوا واقعہ اس طرح پھر جاتا ہے جیسے یہ کل کی بات ہے کہ کس طرح اس کے دوست نے ندی کے کنارے پیمانِ وفا باندھا اور جلد ہی اپنی بے وفائی سے اس کی تمام امیدوں کو ہمیشہ کے لیے پامال کر دیا لیکن ندی کا صاف پانی بدستور رواں دواں ہے۔ لیکن یہ سبھی کچھ اسی صورت میں ممکن ہے جبکہ کوئی سیر کو جائے اس کے ساتھ ایک شفیق معلم ہو جو ہر ہر گام پر اس کی رہنمائی کرے اور اس کو نیرنگیوں کی طرف متوجہ کرے۔ مثلاً جب یہ مختلف رنگ کے پھول دیکھے تو وہ سوچے اور غور کرے کہ ان پھولوں میں یہ رنگ کہاں سے آگیا ہے۔ بقول شاعر مشرق ؎

تو نے دیکھا ہے کبھی اے دیدۂ عبرت کہ گل ہو کے پیدا خاک سے رنگیں قبا کیسے ہوا

اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہر ایک چیز کی حقیقت ایک ہی ہے، جیسا کہ علامہ صاحب نے کیا خوب کہا ہے ؎

حقیقت ایک ہے ہر چیز کی نوری ہو کہ ناری ہو لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرے کا دل چیریں

یعنی ہر چیز کو پیدا کرنے والا، اس کو رنگ اور حسن دینے والا، اس میں خوشبو اور مہک پیدا کرنے والا اس کو تازگی اور تابندگی عطا کرنے والا وہی خالق حقیقی مالک کل ہے جس نے انسان کو بنایا اور اس کو بزرگی عطا کی، اگر ہر انسان ہر روز اسی خالق حقیقی کی حمد و توصیف پرندوں کے چہچہوں میں سنے اور وادی کوہسار میں بلبل کے تار تار میں۔ ہر درخت کے برگ و بار میں اس کی صناعی اور نیرنگی کو جلوہ گر دیکھے تو یقیناً اس کی چشم بصیرت کھل جائے گی اور وہ اپنے دل میں یہ محسوس کرے گا کہ خدا کی نعمتوں کا شکر ادا کرنا انسان پر بھی فرض ہے اور وہ شکر اس طرح ادا کیا جا سکتا ہے کہ اس کے بتائے ہوئے راستوں پر سیدھا چلے اور بھٹکے ہوؤں کو بھی ساتھ لے کر چلے۔

ہر فرد اگر اس قسم کے خیالات اور جذبات سے متاثر ہو جائے گا تو نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ تمام برائیاں جو آجکل پورے جوبن پر ہیں رفتہ رفتہ کم ہوتی چلی جائیں گی اور یہ عریض و بسیط دنیا سمٹ کر ایک ایسی وحدت بن جائیں گی جہاں ہر انسان شاد اور خرم ہوگا۔ غالباً اسی جذبے کو علامہ اقبال مرحوم نے یوں شعر کا جامہ عطا کیا ہے ؎

خودی سے اس طلسم رنگ و بو کو توڑ سکتے ہیں یہی توحید تھی جس کو نہ تو سمجھا نہ میں سمجھا

عرفان نفس کا سب سے بڑا ذریعہ سیر ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ ہمارے تعلیم کے قائد اور رہنما ضرور تعلیمی سیر کی طرف پوری توجہ دے کر اس سے وہ فائدے حاصل کریں گے جو میں نے اوپر بیان کیے ہیں اور اس طرح سمعی بصری معاونات کو محدود فوائد سے ہٹا کر ایک اعلیٰ اور ارفع فائدے کے حصول کے لیے عمل میں لانے کی سعی فرمائیں گے۔

(اس مضمون میں بعض باتیں ایسی کہہ دی گئی ہیں جو اصولاً درست نہیں۔ ان پر اگلی اشاعت میں تبصرہ ہوگا)

(مدیر معاون)

تعلیمی دُنیا پر ایک نظر

نیسکو کا سالانہ جلسہ

۱۲ نومبر ۱۹۵۴ء کو مونٹی ویڈیو میں ۷۲ ملکوں کے نمائندے یونیسکو کے آٹھویں سالانہ جلسے کے لیے جمع ہوئے، اس جلسے میں جو مہینہ بھر جاری رہا، اگلے دو سالوں کا میزانیہ منظور کیا گیا، ڈائرکٹر جنرل نے اخراجات میں ۲۰ فی صد اضافہ کا مطالبہ کیا تھا لیکن یہ اضافہ نئے ملکوں کے رکن بن جانے سے نہ صرف پورا ہو جائے گا بلکہ اس زائد آمدنی سے کچھ رقم بچ بھی رہے گی۔ نئے اراکین میں روس بھی شامل ہے س کا نتیجہ یہ ہوا کہ کسی ملک سے زائد روپے کا مطالبہ نہیں کیا گیا۔ اس جلسے میں جو لائحہ عمل پیش ہوا، اس میں وئی چیز غیر معمولی نوعیت کی نہیں تھی۔ پس ماندہ ملکوں کی مدد پر کافی زور دیا گیا، یہ مدد مالی بھی ہو گی اور فنی بھی۔ اس کانفرنس میں دلچسپی اور توجہ کا بڑا مرکز روس کا طرز عمل رہا۔ یونیسکو کو مالی امداد دینے کے عتبار سے روس کا درجہ دوسرا ہے، تمام ممبر ممالک یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ یونیسکو کا یہ نیا رکن اس عالمگیر علیمی ثقافتی اور سائنسی ادارے کے معاملات میں کیا طریق کار اختیار کرتا ہے، دلچسپی کا دوسرا بڑا مرکز یہ معاملہ تھا کہ ریاستہائے متحدہ امریکہ اپنے ان شہریوں کے بارے میں کیا طرز عمل اختیار کرے گا جو یونیسکو کے ملازم ہیں اور جنہوں نے امریکی حکومت کی تحقیقات وفاداری کو ٹھکرا دیا تھا۔ یونیسکو کے ڈائرکٹر جنرل نے اپنے چار امریکی ملازموں کو اسی جرم کی بنا پر برطرف کر دیا تھا۔ ان ملازموں نے اپیل بورڈ کے پاس اپیل کی۔ بورڈ نے فیصلہ دیا کہ ڈائرکٹر جنرل کا اقدام خلاف آئین ہے۔ اب امریکہ اس کوشش میں ہے کہ یونیسکو کے آئین میں مناسب تبدیلی کرائے۔

انگلستان میں گرجے کے مدرسے

۱۹۴۴ء کے قانون تعلیم نے منظور شدہ مدرسوں کے لیے جو قواعد و ضوابط مقرر کیے تھے ان کو دیکھ کر اکثر لوگوں کو یقین تھا کہ انگلستان میں گرجے کے سب مدرسے بند ہو جائیں گے۔ اس سال

چرچ آف انگلینڈ کی تعلیمی کونسل نے جو رپورٹ شائع کی ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ خدشات پوری طرح درست ثابت نہیں ہوئے۔ پھر بھی کونسل کا اندازہ ہے کہ گرجے کے کم وبیش ایک ہزار مدرسے ضرور بند ہو جائیں گے۔ باقی رہنے والے مدرسوں کی عمارتوں اور ساز وسامان پر ایک کروڑ بیس لاکھ پونڈ لاگت آئے گی۔ رپورٹ میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ زمانہ مابعد جنگ میں ۱۸۰۰ نئے کھلنے والے مدرسوں میں سے صرف ۱۶۷ چرچ آف انگلینڈ کے مدرسے ہیں۔ گرجے کے جو مدرسے بند ہوئے ہیں ان میں زیادہ تعداد دیہاتی مدرسوں کی تھی۔

یونی ورسٹی طلبہ کا معاشرتی پس منظر

مختلف برطانوی یونی ورسٹیوں سے آج کل بیس ہزار طلبہ ہر سال فارغ التحصیل ہو رہے ہیں ان کے معاشرتی پس منظر کے مطالعہ کے لیے ایک انجمن "سیاسی اور معاشی منصوبہ بندی" کے نام سے قائم کی گئی تھی۔ حال ہی میں اس انجمن کی دوسری رپورٹ شائع ہوئی ہے۔ اس رپورٹ میں جو بات زیادہ نمایاں نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ پچھلے پانچ سالوں میں چھوٹے طبقے کے نوجوان زیادہ تعداد میں اعلیٰ تعلیم پانے لگے ہیں۔ پہلے مزدوروں، کلرکوں، دکانوں کے کارندوں اور چھوٹے ملازموں کے لڑکے لڑکیوں کی تعداد کل یونی ورسٹی طلبہ کا ایک تہائی ہوا کرتی تھی، اب ان کی تعداد نصف کے برابر ہوگئی ہے، اس کے مقابلہ میں اعلیٰ طبقوں کے طلبہ کا تناسب گھٹ گیا ہے۔ سمندر پار سے تعلیم پانے والے طلبہ کی تعداد ۱۹۳۸ء میں ۵۰۴۸ تھی۔ ۵۳-۱۹۵۲ء میں یہ تعداد ۳ ۶۳ ۴ ۶ کو جا پہونچی تھی۔ اسی طرح ایسے غیر ملکی طلبہ کی تعداد جو جز وی وقت کے لیے تعلیم حاصل کرتے ہیں ۱۹۳۸ء کے مقابلہ میں دوچند ہوگئی ہے۔

باہمت استادوں کے لیے مواقع

انگلستان میں ایک انجمن قائم ہے جس کا نام ہے "سمندر پار ملازمت کا دفتر" یہ انجمن ہمنفرز نوآبادیوں اور دوسرے ملکوں میں کام کرنے کے مواقع معلوم کرتی ہے اور خواہش مند لوگوں کو ان کی اطلاع دیتی ہے۔ حال ہی میں ایک برطانوی استاد نے جسے اس دفتر کی وساطت سے گولڈ کوسٹ

(مغربی افریقہ) میں جانے کا موقع ملا تھا، اپنے تاثرات ان لفظوں میں بیان کئے ہیں، مجھے بہت خوشی ہے کہ ہمیں مغربی افریقہ میں آنے کا موقع ملا۔ اس جگہ لامحدود پیشہ ورانہ مواقع موجود ہیں۔ مذہبی خدمت کے میدان میں یہاں بے شمار مواقع ہیں، اس کے علاوہ معاشرتی میل ملاپ سے انسان یہاں ہر درجے کے لوگوں کے ساتھ مراسم بڑھا سکتا ہے، اس جگہ زندگی کبھی بے کیف نہیں ہوتی۔ ہر وقت یہ احساس رہتا ہے کہ انسان بھرپور زندگی گذار رہا ہے، کیوں کہ اس زندگی میں ایک مقصد نظر آتا ہے۔

نوجوانوں کے لیے وزارت

فرانس کے وزیر اعظم موسیو مینڈس فرانس نے ٹیلی ویژن پر تقریر کرتے ہوئے اپنی اس تجویز کا انکشاف کیا جس کی رو سے فرانسیسی نوجوانوں کی رہنمائی اور تربیت کے لیے ایک وزارت قائم کی جائے گی۔ انہوں نے کہا یہ خیال پہلی بار گذشتہ جون میں ظاہر کیا گیا تھا، اس وقت اس تجویز پر لمبی چوڑی بحثیں چھڑ گئی تھیں۔ اس تجویز کا منشا یہ نہیں تھا کہ نوجوانوں کی تنظیموں میں سرکاری مداخلت ہو بلکہ غرض یہ تھی کہ نوجوانوں کو سرکاری معاملات میں تربیت دی جائے۔ موسیو مینڈس فرانس نے کہا میں بہت جلد ان وزارتوں میں جن کا تعلق نوجوانوں سے ہے (یعنی وزارت تعلیم، وزارت داخلہ، وزارت اطلاعات) ایک ایک خاص محکمہ قائم کرنے والا ہوں۔ ان محکموں کا کام سرکاری افسروں اور نوجوانوں کے نمائندوں کے ہاتھوں میں سونپ دیا جائے گا، یہ محکمے جو تجاویز اور منصوبے تیار کریں گے وہ ایک خاص افسر کے حوالے ہوا کریں گے جو وزیر اعظم کے سامنے جواب دہ ہوگا۔

وزیر اعظم نے کہا، ملکی نظام تعلیم میں وسیع تبدیلیاں کرنے کا خیال نیا نہیں، پچھلی وزارت نے اس مطلب کے لیے ایک مسودہ قانون اسمبلی کے سامنے پیش کیا تھا، لیکن اسمبلی نے اسے اس بنا پر رد کر دیا تھا کہ یہ اپنے اغراض و مقاصد میں نہ صرف ناکافی تھا بلکہ جانب دار بھی، موجودہ تعلیمی حالت سخت بے اطمینانی کا باعث بن رہی ہے۔ استادوں کو ناکافی تنخواہوں کی شکایت ہے۔ جب کہ اساتذہ اور والدین دونوں کو اس بات کا شدید احساس ہے کہ طلبہ کو نہایت ناتسلی بخش حالات میں کام کرنا پڑتا ہے۔ سائنس اور ٹکنالوجی کے استادوں کی خاص طور پر کمی ہے، موسیو مینڈس فرانس نے

یقین دلایا کہ وہ ان نقائص کو دور کرنے کے لیے امکان بھر کوشش کریں گے۔ انہوں نے کہا کہ حکومت پہلی فرصت میں زیادہ استاد زیادہ کرے اور زیادہ تجربہ گاہیں فراہم کرے گی۔

استاد کے خلاف مقدمہ

بربد (انگلستان) کے جدید ثانوی مدرسے کے ایک استاد مسٹر گارڈن کینتھ ڈینس کے خلاف پانچ طلبہ کی طرف سے یہ مقدمہ دائر کیا گیا کہ انہوں نے ۱۷ اکتوبر کو ان تیرہ سالہ لڑکوں کو بید سے سزا دی۔ عدالت میں یہ شکایت ان لڑکوں کے والدین کی طرف سے کی گئی تھی۔

استغاثہ کے وکیل نے کہا کہ ڈینس نے سب طلبہ کو تین چار مرتبہ بید سے پیٹا، وجہ یہ تھی کہ کچھ طلبہ نے سیڑھیوں پر زور زور سے پاؤں مار کر شور مچایا تھا، ڈینس سزا کی مدد سے قصوروار طلبہ کا کھوج لگانا چاہتا تھا۔ ایک لڑکے نے گواہی دیتے ہوئے کہا کہ جماعت ٹیکنیکل ڈرائنگ کے لیے جا رہی تھی راستے میں بعض طلبہ نے سیڑھیوں پر پاؤں مار کر دھما کا پیدا کرنا شروع کیا۔ ڈینس نے اونچی آواز میں کہا کہ اگر یہ حرکت بند نہ کی گئی تو وہ سزا دے گا۔ ہم کمرۂ جماعت میں پہونچے تو اس نے اعتراف قصور کے لیے ایک منٹ دیا، جب کوئی بھی اعتراف کرنے کو نہ اٹھا تو اس نے ساری جماعت کو ایک ایک بید لگایا۔ اس نے ایک منٹ پھر سوچنے کو دیا جب اس پر بھی کسی نے اعتراف نہ کیا تو سب کو ایک ایک بید پھر لگایا، اسی طرح چار مرتبہ کیا گیا۔

ڈینس نے صفائی کی گواہی دیتے ہوئے کہا کہ مدرسے کی عمارت ابھی پوری طرح مکمل نہیں ہوئی تھی، اس لیے سب استادوں کو کڑی ہدایات تھیں کہ سیڑھیوں کے استعمال میں احتیاط اور ضبط سے کام لیا جائے تاکہ کوئی حادثہ نہ ہو جائے۔ متذکرہ صدر تاریخ کو سات لڑکے سیڑھیوں پر جا رہے تھے۔ انہوں نے مل کر ٹاپ مارنا شروع کیا، یہ حکم کی صریح خلاف ورزی تھی، اس نے جماعت میں آکر اعتراف جرم کے لیے کہا لیکن کوئی نہ بولا۔ اس پر اس نے بید پس پشت تھام کر جماعت میں چکر لگایا لیکن اس سے مقصد طلبہ کو دہشت زدہ کرنا نہیں تھا۔ ہاں اس نے چار مرتبہ سب کو ایک ایک بید ضرور لگایا۔

عدالت کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے گواہ نے کہا کہ اسے ضبط قائم رکھنے کے لیے بید
استعمال کرنے کا اختیار دیا گیا تھا۔ اور اس نے اس سزا کا اندراج سزا کے رجسٹر میں کر دیا تھا۔
وکیل صفائی نے کہا کہ استاد کا اقدام بالکل جائز اور منصفانہ تھا۔ ہمیں نوجوانوں اور نو خیز طلبہ میں
عدم ضبط کی عام شکایت ہے، یہ شکایت خود والدین کو بھی ہے۔ استادوں کے مضبوط طرز عمل کی حمایت
کیے بغیر اس شکایت کو دور نہیں کیا جا سکتا۔ جب طلبہ عدم ضبط پر تل جائیں تو استاد کے لیے سزا دینے کے
سوا اور کون سا راستہ کھلا رہ جاتا ہے؟

ججوں نے جن میں ایک عورت بھی شامل تھی تمام دلائل پر تفصیلی دقت میں غور کیا۔ جب وہ دوبارہ
جمع ہوئے تو انہوں نے استاد کے اقدام کو جائز اور ضروری قرار دیتے ہوئے پانچوں مقدمے خارج کر دیے۔

طلبہ کی بھیڑ

ایک برطانوی تعلیمی رسالے کے نمائندے نے بہت سے استادوں سے بات چیت کرنے کے
بعد یہ انکشاف کیا ہے کہ اکثر استادوں کو پر ہجوم جماعتوں کی شکایت ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ امسال
طلبہ کی تعداد پچھلے سال سے بھی بڑھ گئی ہے۔ نامہ نگار کا کہنا ہے کہ یہ ہجوم بچوں کی اس فوج کے صرف
ہراول دستے ہیں جو سن ۱۹۷۰ء تک ثانوی مدارس پر دھاوا بولنے والی ہے۔ نامہ نگار کا کہنا ہے کہ زیادہ افسوسناک
بات یہ ہے کہ اکثر استادوں کو ان تجاویز کی کچھ خبر نہیں جو تعلیمی حکام اس سیلاب سے نپٹنے کے لیے اختیار
کر رہے ہیں۔ تاہم یہ حقیقت ناقابل انکار ہے کہ جو جدید ثانوی مدرسے آج پر ہجوم جماعتوں کا شکار ہیں
چند سالوں تک ان کے بچے ادھر ادھر پڑتے نظر آئیں گے۔